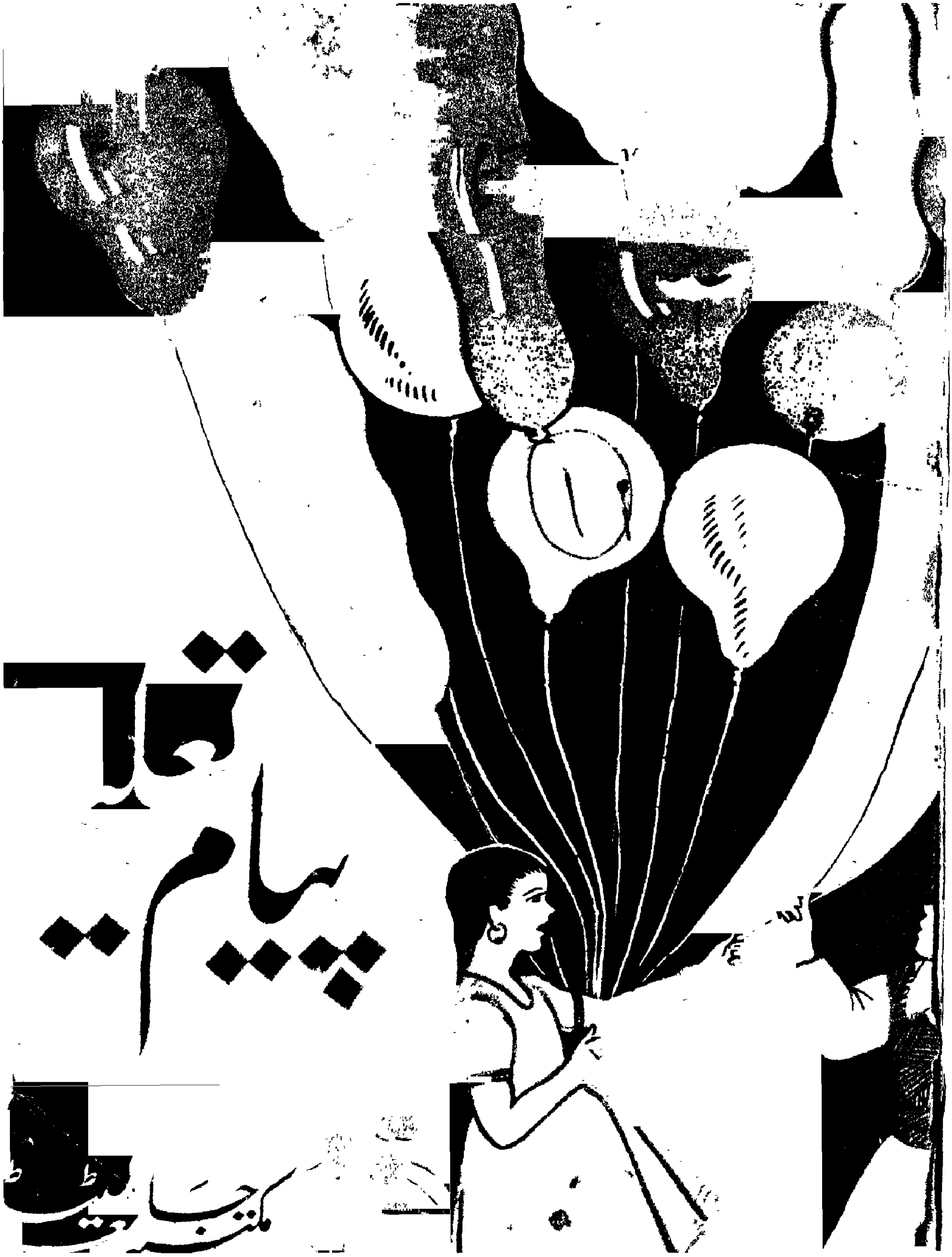

پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ



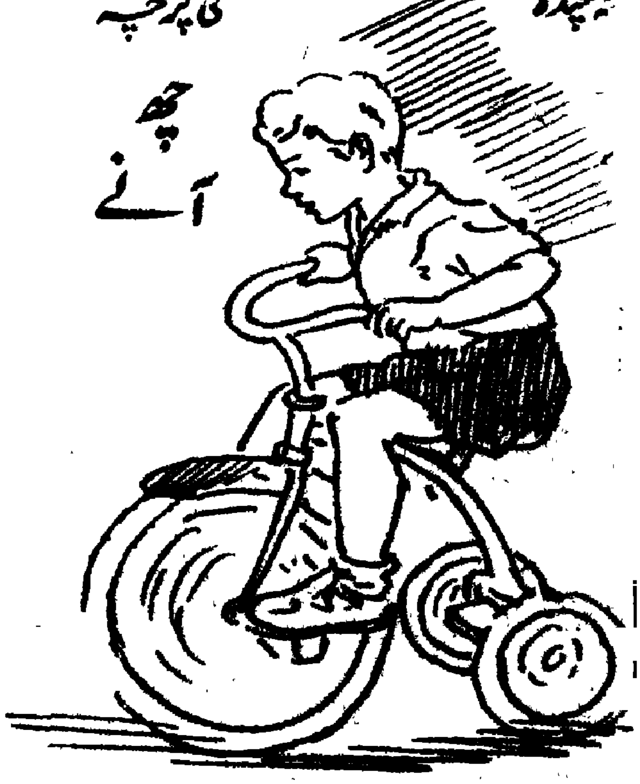
پنڈت نہرو بچوں کے ساتھ تعلیمی میلے میں

...ری ۱۹۵۳ء

پیامِ تعلیم

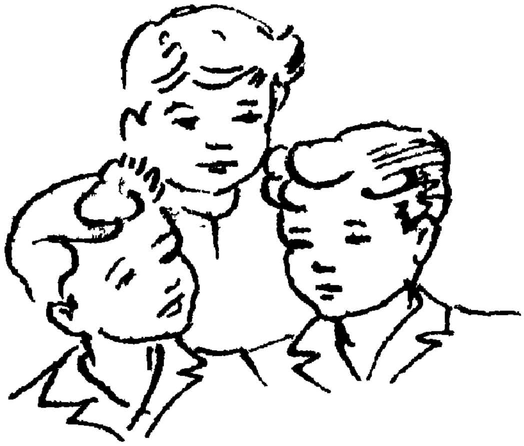
مدیران:- حامد علی خاں بی، اے (جامعہ)
اطہر پرویز ایم، اے (علیگ)

...چندہ
فی پرچہ
چھ
آنے



فہرست

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی



نیا سال مبارک

لیجئے انتظار کرتے کرتے نیا سال بھی آگیا
اس نئے سال کی خوشی میں آپ سب کے ساتھ پیام تعلیم بھی شریک ہے۔ یہ پرچہ آپ کو اس وقت ملے گا، جب آپ نئے سال کی خوشی منا رہے ہوں گے۔ ہماری طرف سے نئے سال کی مبارک باد قبول فرمائیے۔

نئے سال کے استقبال میں آپ کے اپنے شاعر جناب محمد شفیع الدین نیّر صاحب نے پیام تعلیم کے لئے ایک مزیدار نظم لکھی ہے۔ نیّر صاحب کی نظمیں یوں تو آپ نے ان کی مشہور کتاب "بچوں کا کھلونا" میں پڑھی ہوں گی۔ جو مکتبہ جامعہ سے چھپی ہے۔

آپ میں سے بہتوں نے آل انڈیا ریڈیو سے بچوں کے پروگرام میں میلا سنا ہوگا۔ لیکن نیّر صاحب نے ہمارے لئے خاص طور پر ایک مضمون میلے لکھا ہے۔ آپ اسے پڑھتے جائیں گے اور ہر ہر جملے پر آپ کے سامنے میدان نظر آئے گا۔ جیسے آپ خود ہی تو یہ میلا دیکھ رہے ہیں۔

ہم نے پچھلے پرچہ سے کارٹونوں والی کہانی کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس بار چُنّو
کی چالاکی کی کہانی ہے۔ کس طرح چُنّو مُنّو نے اپنی چالاکی سے مرغیوں کو دھوکا دیا۔
آپ نے یہ سلسلہ پسند کیا تو ہم اس کو آئندہ بھی جاری رکھیں گے۔

ہمیں خوشی ہے کہ پیامی، غوث انصاری صاحب کا سفرنامہ بڑی دلچسپی سے پڑھ
ہے ہیں۔ اب یہ سفرنامہ فروری کے بعد ختم ہو جائے گا۔ پیامیوں کو یہ سن کر خوشی
ی کہ غوث انصاری صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پیام تعلیم کے لئے انگلستان کے بارے
، اچھے اچھے اور مزیدار مضامین بھیجیں گے۔ پیام تعلیم کے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ
، اتنی دور جاکر بھی اُسے نہیں بھولے۔

چین ہمارا پڑوسی ملک ہے۔ اس سے ہمارے دیس کے بڑے پرانے تعلقات ہیں۔ ہندستان
رح چین میں بھی مختلف مذہبوں کے لوگ رہتے ہیں۔ وہاں مسلمان بھی رہتے ہیں۔ لیکن مذہب
نام پر چینی کبھی ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا نہیں کرتے۔ وہ مسلمان، بدھ، اور چینی
نے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں۔
راشد حسن قادری صاحب نے چینی مسلمانوں کا حال اپنے مضمون میں لکھا ہے۔ یہ مضمون
رہونے کے باوجود دلچسپ اور معلوماتی ہے۔

جناب اسرار احمد صاحب ندوی کے نام سے پیامی خوب واقف ہوں گے۔ اسرار صاحب
ے پرانے ساتھی ہیں۔ اب انھوں نے بہت دنوں کے بعد پیام تعلیم کے لئے ایک کہانی "سیٹھ چندو
، لکھی ہے۔ اس نمبر کی ایک اور خصوصیت اصغر علی انصاری صاحب کا مضمون اور سید منیرالحسن
یا کی کہانی ہے۔ یہ دونوں بے حد دلچسپ ہیں۔

محمد شفیع الدین نیّر

آئیے میلا ہمارا د

آئیے میلا ہمارا دیکھئے
جامعہ کی سیر بھی کر لیجئے
دیکھئے اس کی عمارت کی بہار
چلتے پھرتے رہئے اس میلے میں آپ
ان دکانوں میں قرینے سے سجا
کچھ کھیا لو کچھ مٹھائی کھائیے
جامعہ کے مختلف شعبوں کا کام
ہو اگر اچھی کتابوں کی تلاش

اک نئی بچوں کی دنیا دیکھئے
اپنا تعلیمی ادارہ دیکھئے
باغ کا منظر سہانا ہے
اس کی دو کانوں کا نقشا دیکھئے
اک اک اچھا کھلونا دیکھئے
منہ میں پانی کیوں بھر آیا دیکھئے
ایک جا آکر ہیّا دیکھئے
مکتبہ نے کیا ہے چھاپا دیکھئے

آئیے بچوں کو اپنے لائیے
مانیئے نیّر کا کہنا دیکھئے



پیغامات

تم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جامعہ کی سب سے پہلی عمارت کا سنگ بنیاد ایک چھوٹے بچے نے رکھا تھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ جامعہ کے بنانے والے اصل میں بچے ہیں۔ جامعہ صرف اینٹ اور چونے کی عمارت کا نام نہیں جس کے اندر تم رہتے ہو بلکہ صفائی اور خدمت کی وہ روح بھی جو تمہارے اندر رہتی ہے، جامعہ ہے اور اس کے بنانے والے بھی تم ہو۔ خدا تم کو یہ توفیق دے کہ تم باہر کی جامعہ اور اندر کی جامعہ دونوں کو اسی طرح سجاتے اور سنوارتے رہو جیسے تم نے آج میلے کے دن سجایا اور سنوارا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین

تعلیم نے بچوں کو پڑھنے لکھنے کا شوق تو دلایا ہے مگر اس سے بڑا کام اس نے یہ کیا ہے کہ بچوں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیا ہے۔

جامعہ کے تعلیمی میلے کے دنوں میں اس کا ایک روزانہ ایڈیشن شائع ہونے والا ہے۔ اس خبر سے فائدہ اٹھا کر میں پیامیوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

"آپ جس دیس میں رہتے ہیں۔ اس کے سَو میں سے اسّی آدمی اَن پڑھ ہیں۔ علم کا دیا ہے پر اس کی روشنی دور تک نہیں پھیلی ہے آپ کے ہاتھ میں ایک دیا تو ہے لیکن آپ کے آس پاس اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ اور اگر آپ آگے کی طرف بڑھنا چاہیں تو اندھیرے میں بھٹک جائیں گے۔ اس لئے آپ کے پاس جو روشنی ہے اسے دور تک پھیلائیے۔ جب ہی آپ آگے بڑھ سکیں گے۔"

شفیق الرحمٰن قدوائی

آج بچوں کا میلا ہے۔ اور دہلی کے تمام اسکولوں کے بچے اور بچیاں ہندو، مسلمان سکھ سب ایک جگہ جمع ہوکر، ایک دوسرے سے مل جل کر ہنسی خوشی کھیل کود رہے ہیں اور سیر و تفریح کر رہے ہیں۔ کیسی خوشی ہوتی ہے یہ سماں دیکھ کر۔ خدا کرے کہ کل جب یہی بچے بڑے ہوکر اپنے اس شہر اور اس ملک کی باگ سنبھالیں اس وقت بھی ان میں آپس کا یہ پریم، محبت باقی رہے۔ اور اسی طرح ہنسی خوشی مل جل کر یہ دیش کا کام چلائیں اور دنیا میں اس کا نام روشن کریں۔

مولانا محمد حفظ الرحمٰن

ناظم جمعیۃ العلماء ہند

بچو! ہشاش بشاش رہو، تاکہ تم جسمانی اور ذہنی طور پر پھل پھول سکو۔ تم اپنے روز کے پروگرام میں کام میں لگے ہو یا کھیل کود میں اپنا دل بہلاتے ہو، جو بھی مشکلیں پڑیں ان کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک دن بڑے آدمی بنوگے۔

پدم چند

ڈائرکٹر بیسک اسکول، دہلی

مجھے یہ معلوم کرکے بے حد خوشی ہوئی کہ بچوں نے اپنی دن رات کی محنت سے اس میلے کو کامیاب بنانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ بچوں کا ہر کام معصوم ہوتا ہے، اس واسطے ان کو خدا کی مدد بغیر مانگے ہی مل جاتی ہے ہر وہ شخص جس کو تعلیم، بچوں اور بچوں کی تربیت سے دلچسپی ہے وہ ان کا دل بڑھانا اپنے لئے باعث راحت سمجھے گا۔

مرزا محمود بیگ

پرنسپل دہلی کالج

بقیہ "سونے کی گھڑی" صفحہ ۲۹ سے آگے

ٹوکیو شہر کی ہر گھڑی یہی چلا رہی تھی۔ بیچاری ایکی رونے لگی۔

"کیا ہوا ایکی؟ کیوں رو رہی ہو؟" بازار سے آتی ہوئی اس کی ماں نے پوچھا ایکی نے روتے روتے سب کچھ کہہ سنایا۔ اُسی وقت دونوں نے جاکر وہ سونے کی گھڑی دوکاندار کو واپس کر دی۔

اس کے بعد پھر کبھی ایکی کو کسی چیز کی لالچ نہیں ہوئی۔



محمد شفیع الدین نیّر

تعلیمی میلے کی دھوم

جامعہ میں کئی سال سے بچوں کا ایک تعلیمی میلا ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد اس سال تیسرا ا ہوا۔ اس میلے کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ہمارے ملک کے محبوب رہنما اور وزیر اعظم جناب پنڈت جواہر لال صاحب نہرو میلے کے دوسرے دن چار بجے کے قریب تشریف لائے پ کے آنے سے میلے میں تماشائیوں کا ایک ہجوم اُمنڈ پڑا۔ اور جس طرح پروانے شمع پر گرتے ہیں، اسی طرح لوگ دوڑ دوڑ کر آپ کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔

تعلیمی میلا ۱۵ر نومبر کو نو بجے اس طرح شروع ہوا کہ جامعہ کے مدرسہ ابتدائی کے ایک چھوٹے سے بچے نے ٹھیک نو بجے جامعہ کا پرچم لہرایا۔ اور پھر دو بچوں نے "جامعہ کا پرچم" کے عنوان سے ایک گیت گایا۔ جس سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ ن کے بعد ساڑھے نو بجے ڈاکٹر کیسکر صاحب وزیر اطلاعات حکومت ہند نے میلے افتتاح کیا۔ اس تقریب سے پہلے جامعہ کے شیخ الجامعہ یعنی وائس چانسلر جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب نے ایک موثر تقریر، تحریر کی صورت میں پڑھ کر سنائی۔ جس یں جامعہ کی بستی کے قیام، جامعہ کے کام، اور جامعہ والوں کے آئندہ ارادوں اور

منصوبوں کا تذکرہ فرمایا۔ ڈاکٹر کیسکر صاحب نے بھی جامعہ کی خدمتوں کا ذکر فرمایا۔ اور اس پر اپنی دلی خوشنودگی ظاہر کی۔

اس تقریب کے بعد محفل مشاعرہ گرم ہوئی۔ اس میں جامعہ کے مدرسہ ابتدائی اور ثانوی کے علاوہ بچوں کا گھر دریا گنج، اور دلی ماڈل اسکول، اور باڑہ ہندو راؤ کے بچوں نے حصہ لیا۔ جناب بالمکند صاحب عرش ملسیانی اس کے صدر تھے۔ حاضرین نے بچوں کی نظموں سے بہت لطف اٹھایا۔ واہ واہ اور سبحان اللہ کی صداؤں سے محفل گونج اٹھی۔ یہ محفل بارہ بجے ختم ہوئی۔ اسی دن ٹھیک ڈھائی بجے جناب کرشنا نائر صاحب کی صدارت میں صوبہ دلی کی ایک دیہاتی کانفرنس ہوئی۔ اس میں کئی تجویزیں ایسی منظور ہوئیں کہ حکومت اور دیہاتی بھائی مل کر ان کو پورا کرائیں تو اس سے صوبہ والوں کو بڑا آرام ملے گا۔ شام کو ساڑھے چار بجے جسمانی مظاہرے ہوئے۔ یعنی مختلف اسکولوں اور جامعہ کے بچوں نے اپنے اپنے کھیل دکھائے بعض کھیل بہت دلچسپ رہے۔ رات کو کیمپ فائر ہوا۔ ۱۵ر نومبر کا پروگرام کیمپ فائر سے ختم ہوا۔

دوسرے دن ۱۶ر نومبر کو کہانیوں کا مقابلہ ہوا۔ بچوں نے اپنی اپنی کہانیاں پڑھ کر سنائیں جو بہت پسند کی گئیں۔ شیلڈ موڈرن ہائی اسکول نئی دہلی کے بچوں نے پائی۔ ڈھائی بجے پارلیمنٹ کی نقل ہوئی۔ یعنی پارلیمنٹ میں جس طرح تجویزیں پیش ہوکر منظور یا نامنظور ہوتی ہیں اور کسی تجویز کی موافقت یا مخالفت میں تقریریں کی جاتی ہیں۔ اسی طرح دلی کے مختلف کالجوں کے طالب علموں نے اس میں تقریریں کیں تجویزیں منظور یا نامنظور کیں۔ اس کی صدارت جناب مرزا محمود بیگ صاحب پرنسپل دلی کالج نے کی۔ اگر ایسی تقریبیں مناسب تیاری کے بعد کی جائیں تو یہ بہت مفید اور عام تعلیم کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ شام کو ساڑھے چار بجے جادو کے کھیل دکھائے گئے۔ اور رات کو تین بہت اچھے ڈرامے ہوئے۔

تماشائیوں کا آج خوب ہجوم رہا۔

لے میں ہر طرف بڑی چہل پہل نظر آئی ۔ رات
ڈراما بہت کامیاب رہا۔ تماشائی ہر طرح
لیں رخصت ہوئے ۔

۱۸ر نومبر کو میلے کا آخری دن تھا ۔
دن کی ساری تقریبیں بڑی دلچسپ رہیں۔
روز سب سے پہلی تقریب محفل موسیقی تھی
کی نگرانی جناب عبدالغفار صاحب مدھولی
ستاد مدرسہ ابتدائی کے سپرد تھی ۔ اس میں
پوں نے ساز پر اور زبانی نظمیں گائیں ۔ بہت
پُر لطف یہ صحبت رہی ۔ نغموں سے فضا
ونج گونج گئی ۔ واہ وا ، اور سبحان اللہ کی
صدائیں بلند ہوئیں ، لوگوں نے بڑی توجہ سے
یت سنے اور بعض بعض گیتوں پر سر دھنے
کی نوبت آگئی ۔

تیسرے پہر سمپوزیم ۔ یعنی دہلی کے اہل
م ، اور تعلیم کے مختلف ماہروں نے ثانوی تعلیم
پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور اپنے خیالات
ہر کئے ۔

اب ذرا کھیل کے میدان میں چلئے ، مسٹر
ٹ نے ہاکی کا میچ کرایا ہے ، کھلاڑیوں کی
دوڑ ، ان کی پھرتی اور چستی ، اور کھیل
کی ہنگامہ آرائی ۔ لوگوں میں زندگی کی لہر دوڑ
گئی ۔ یہ جوش بس دیکھنے کے قابل تھا ۔ رات
کو ایک ڈراما صرف عورتوں کے لئے سہیلی سبھا
کی طرف سے ہوا ۔ یہ ڈراما ہماری محترم بہن
جناب صالحہ عابد حسین صاحبہ نے لکھا تھا ۔
ہم نے دیکھا تو نہیں مگر سنا ہے کہ یہ ڈراما
بہت پُر لطف رہا ۔

اور پھر..... پھر وہی ہوا جو جامعہ
میں آئے دن ہوا ہی کرتا ہے ۔ یعنی فلمی
نمائش ۔ ابوالکلام صاحب ویسے ہی سارے
گاؤں کو اس "شو" میں گھسیٹ لیا کرتے
ہیں ۔ پھر آج تو خاص دن تھا......

کہئے ہمارے میلے کی یہ روداد سنتے سنتے
آپ گھبرا تو نہیں گئے ۔ اچھا رخصت ۔
پھر ملیں گے اگر خدا لایا ۔



سدھیر ساہنی ماڈرن اسکول، نئی دہلی

انگریز کا بیرا

انعامی مقابلے میں پہلا انعام پانے والی کہانی

ایک انگریز جو یورپ سے آیا تھا۔ اس کو زیادہ ہندی نہیں آتی تھی۔ وہ عام طور پر انگریزی ہی میں بولا کرتا تھا۔ اس نے ولایت میں انجینیرنگ پاس کی اور نوکری کے لئے بھارت چلا آیا۔

بھارت میں آکر وہ نہر کا انجینیر ہو گیا۔ اس کے یہاں جتنے نوکر تھے وہ سب گنوار تھے۔ ایک دن اس نے اپنے ایک نوکر سے کہا کہ "ہمارے لئے کل ایک بیرا لائے گا" نوکر نے کہا "بہت اچھا ججور" دوسرے دن وہ گاؤں کا سب سے بڑا بہرا پکڑ لایا اور اس نے اُسے صاحب کے سامنے کھڑا کر دیا۔ صاحب نے اس سے پوچھا "کیا تم ہمارا فوڈ بنا سکے گا؟"

نوکر۔ "ججور ہندی میں بولو اور تھوڑی تنک زور سے بولو۔ نہیں تو ججور سمجھ نہ پئی ہی۔ بہو بہرا ہیں۔

صاحب۔ "کیا تم ہمارا کھانا بنا سکتا ہے"

نوکر۔ "دم لگا کر بولو ججور۔ دم لگا کر"

صاحب۔ "(خوب زور سے) کیا تم ہمارا کھانا بنا سکتا ہے"

نوکر۔ "اس لاٹ صاحب کا منہ سِل گئو کا۔ ہم کا بلائی لیو اب ہم سے بات تک نہیں کرت۔ ہم جائی رہے۔ اب ہم یہاں نہیں رک ہی۔ (بہرہ چلا جاتا ہے)

شام کو صاحب نے بیٹھ کر سوچا کہ یہ کیسا آدمی لایا تھا جو سن بھی نہ سکتا تھا۔ شاید یہ بہرا ڈیف کو بولتے بھول گئے۔ پھر اس کے سمجھ میں آیا صاحب نے اس وقت اپنے ای نوکر سے کہا کہ "رات کو ٹیلی فون آئے گا تم اسے سن کر بتا دے گا ہمیں۔"

سویرے جب صاحب نے اس سے پوچھا تو اس نے جواب دیا "حضور رات کو گھنٹی جرور بجی تھی پر ہم اپنے پلنگا پے سوئے رہے اور ہم نے ہوئیں سے کہا کہ صاحب سوئے رہے ہیں تم سبیرے ملئی ہی اور اب ہمیں سوؤں دے ہی حضور بجلی کی چیز چھوئی، کہیں پکڑلے۔ اس لئے ہم نے کہہ دیو کہ سبیرے بلیو، اب تم دیکھؤ تھوڑی دیر میں گھنٹی بل ی۔"

صاحب کو بہت غصہ آیا، انھوں نے کہا آج رات کو ڈرنا مت اس کو اٹھا لینا اور سن لینا وہ پکڑے گا نہیں۔

رات کو جب گھنٹی بجی تو اس نے ڈرتے ہوئے اسے اٹھایا اور پھر کان میں لگایا تو اندر سے آواز آئی "ہلو" پہلے تو وہ کچھ سوچتا رہا اور پھر ہلنے لگا جب ٹیلیفون میں سے اور آواز آئی "ہلو" تو وہ ٹیلیفون میں چلّا کر بولا "ارے بڑی زور سے ہلت ہیں" جب صاحب سویرے اس سے پوچھتے ہیں تو کہتا ہے "ہم نے سب کچھ کر دؤ۔ اس نے ہم سے ہلنے کو کہو، ہم ہل دئے۔" صاحب نے جب اس کی بات سنی تو انھوں نے اس آدمی کو اسی وقت نکال دیا۔

ایک دن شام کو صاحب باہر بیٹھے تھے ان کو پنسل کی ضرورت ہوئی تو انھوں نے اپنے نوکر سے کہا کہ پلنگ پر پنسل پڑا ہوگا اسے اٹھا لاؤ۔ وہ نوکر اندر گیا اور بہت دیر گھومتا رہا جب اسے نہ ملی تو اس نے صاحب سے آکر کہا "حضور وہاں تو ہئی ہے ناہیں۔" تو صاحب نے کہا کہ وہاں کچھ پڑا ہے تو نوکر نے کہا "ہاں حضور وہاں پنسل تو ہے نہیں پر اتنی بڑی کلیا وہاں پڑی ہے سو کہو تو اٹھا لا دیں۔"

صاحب نے جب یہ سنا تو غصہ میں انھوں نے نوکری چھوڑ دی اور ولایت چلے گئے کہ یہ ہندوستانی بہت تنگ کرتے ہیں۔

محمد اسلم - صدر نونہال کلب
کوچہ رحمان، دہلی

"جادو کا قلعہ"

دوسرا انعام پانے والی کہانی

کسی گاؤں میں پاگل داس نامی ایک لڑکا رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ نہ تھے اور کوئی دور کے رشتہ دار بھی نہ تھے۔ ایک دن وہ جنگل میں پھر رہا تھا کہ اُسے ایک بڈھا ملا۔ بڈھے نے کہا کہ "ارے تو یہاں کہاں؟ یہ تو حسن خاں جنی جادوگر کا جنگل ہے۔"

پاگل داس نے کہا "وہ کہاں رہتا ہے اور اس کے پاس پہنچنے کی کیا ترکیب ہے؟" بڈھے نے جواب دیا کہ "یہیں کہیں رہتا ہوگا۔ یہاں سے کبھی کبھی ایک بچھڑا گذرتا ہے۔ جو کوئی اس پر سوار ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے پاس پہنچ جاتا ہے۔" پاگل داس نے پوچھا "بڑے صاحب تم کون ہو؟" اس نے کہا "میں حسن خاں کا بڑا بھائی مدار خاں ہوں۔" یہ کہہ کر بڈھا چل دیا۔

اتفاق سے وہاں سے بچھڑا گذرا۔ پاگل داس فوراً اس پر سوار ہو گیا۔ راستے میں ایک دریا پڑا۔ کنارے پر ایک شہزادی بیٹھی ہوئی تھی۔ پاگل داس نے کہا "کیا آپ کو دریا پار کرنا ہے؟" شہزادی نے کہا "جی ہاں"

پاگل داس نے کہا کہ "آئیے میرے بچھڑے پر۔" اب شہزادی پاگل داس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ یہ دونوں چلے جا رہے تھے تو پاگل داس نے پوچھا "حسن خاں جنی جادوگر کے مارنے کی

ترکیب ہے۔" شہزادی نے جواب دیا " جادوگر ...امر ہوتے ہیں۔ ہاں میرے پاس چند چیزیں ...، انگوٹھی، سیب، بولتی سپاری، ہنستا پان ...ب کو جو کھائے گا اُسے نشہ سا چڑھے گا ...ر انگوٹھی کو چھوتے ہی وہ مرجائے گا۔ بولتی ...پاری، ہنستا پان، اندھیرے میں اجالا کر ...ے گا۔"

اس عرصے میں دریا پار ہو چکا تھا۔ ...ل داس نے جلدی سے سیب اور انگوٹھی ...لی۔ سامنے حسن خاں جادوگر بیٹھا ہوا تھا۔ دیکھ کر کہ اس کے سال بھر کے بچھڑے پر ...لڑکا اور شہزادی سوار ہے، اسے بہت ...ہ آیا اور کہنے لگا " تم کون ہو؟" پاگل ...س نے کہا "چچا جان سلام۔ ابا جان نے یہ چیزیں بھیجی ہیں۔ سیب کھاؤ گے تو ساری زندہ رہو گے اور یہ عورت ہے جو پلک ...تے ہی تمہارا کام کرے گی۔ یہ سن کر حسن ...نے کہا " بیٹا، وہ سیب لاؤ۔"

پاگل داس نے وہ سیب دے دیا۔ ...خاں پر سیب کھاتے ہی نشہ سا طاری ...۔ پاگل داس نے فوراً اسے انگوٹھی سے چھو دیا۔ انگوٹھی چھونے کی دیر تھی کہ حسن خاں مرگیا۔ پاگل داس جادو کے قلعہ میں گیا اس نے بولتی سپاری اور ہنستے پان سے روشنی کی سامنے ایک ڈنڈا اور کٹورا پڑا ہوا تھا۔ پاگل داس نے جلدی سے دونوں چیزیں اٹھا لیں۔ اٹھانے کی دیر تھی کہ اکدم سے جادو کا قلعہ بارود کی طرح اڑ گیا۔ اور اب پاگل داس اس جگہ کھڑا تھا جہاں سے کہ وہ بچھڑے پر سوار ہوا تھا۔ پاگل داس نے شہزادی سے کہا۔ کہ" ان دونوں چیزوں سے کیا کام لیا جائے" شہزادی نے جواب دیا "جو تمہارے جی میں آئے" پاگل داس نے کہا کہ میرے تو جی میں آتا ہے کہ ایک بہت بڑا اسکول ہو جگہ جگہ جلسے ہو رہے ہوں۔ بچوں کی دوکانیں لگی ہوئی ہوں اور بچوں کا میلہ ہو رہا ہو۔ شہزادی نے کہا کہ یہ باتیں آنکھ بند کرکے کہو پاگل داس نے آنکھ بند کرکے کہا اور جب آنکھیں کھولیں تو میں جامعہ نگر میں محمد علی ٹرافی کے مقابلے میں تقریر کر رہا تھا اور ہزاروں آدمی میری تقریر سن کر خوش ہو رہے تھے کیونکہ مجھے مقابلے میں انعام ملنے والا تھا۔



میلے کی خبریں

تین دن کے روزانہ
پیام تعلیم کی ایک جھلک

تعلیمی میلے اور نمائش کا افتتاح

جامعہ نگر ۱۵ نومبر۔ آج صبح ۹ بجے تلاوت قرآن کے بعد جامعہ کے سب سے چھوٹے بچے نے پرچم کشائی کی رسم ادا کی۔ اس کے بعد "جامعہ کا ترانہ" ہوا اور پرچم کو سلامی دی گئی۔

نمائش اور تعلیمی میلے کا افتتاح وزیر اطلاعات حکومت ہند ڈاکٹر کیسکر نے کیا۔ ڈاکٹر کیسکر کی تقریر سے پہلے پروفیسر محمد مجیب شیخ الجامعہ نے ایک تقریر کی جس میں جامعہ کی تمام خدمات، اور اس کی سرگرمیوں کو پیش کیا اور پھر ڈاکٹر کیسکر سے افتتاح کرنے کی درخواست کی۔

ڈاکٹر کیسکر نے اپنی افتتاحیہ تقریر میں جامعہ کی سرگرمیوں اس کے تجربوں کو سراہا اور کہا کہ "جامعہ دوسرے تمام تعلیمی اداروں سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ وہ خصوصیت بھی رکھتی ہے۔ اس نے تجربے کئے ہیں اور کرتی رہتی ہے اور جامعہ ہی ایک ایسا ادارہ ہے جس کے تجربوں سے دوسروں نے سبق سیکھا ہے اور اس کام کو آگے بڑھایا ہے۔"

اس کے بعد اعلان کے مطابق جناب عرشؔ ملسیانی کی صدارت میں بچوں کا مشاعرہ ہوا۔

بچوں کا مشاعرہ

جامعہ نگر ۱۵ر نومبر۔ بچوں کے شاعرِ اعظم جناب ...ح الدین صاحب نیّر کی دلچسپی اور کوشش سے ...، سال بھی بچوں کا مشاعرہ بہت کامیاب رہا ...اعرے کے صدر جناب بال مکند عرش ملسیانی ...ے۔ بجی کے فرائض جناب غلام ربانی صاحب ...ں اور جناب سعید انصاری صاحب نے ...ام دئے۔

مشاعرے میں تقریباً چالیس طلباء نے ...ہ لیا۔ انعامات کے لحاظ سے دو گروپ بنائے تھے۔ ایک چھوٹے بچوں کا دوسرا بڑوں کا۔ ...ٹے بچوں کے گروپ میں پہلا انعام عثمان علی ...حب کو دوسرا بدرالحسن صاحب کو تیسرا اعذرا ...م صاحبہ کو اور چوتھا پانچواں محمد طارق ...حبا اور محمد حبیب حسان صاحب کو ملے۔

بڑے گروپ میں پہلا انعام خالد سیف اللہ ...بیا، دوسرا محمد ایوب صاحب، تیسرا احمد ...یا صاحب اور چوتھا پانچواں اظہر تقی صاحب ...یردیں چندر صاحب نے حاصل کیا۔

...کے بعد ساڑھے چار بجے جسمانی مظاہرے ہوئے۔

عبدالغفار صاحب کا بندر

جامعہ نگر ۱۵ر نومبر۔ مظاہرے ختم ہوتے ہوئے عبدالغفار صاحب مدھولی نے رات کے کیمپ فائر کا اعلان کیا۔ مگر اعلان کا طریقہ ایسا اچھوتا تھا جو ان جیسے تجربہ کار استاد کی شان کے مطابق ہے

عبدالغفار صاحب نے سید حسن صاحب کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا دیا جسے سید صاحب نے بندر کی طرح کندھے پر رکھ لیا۔ عبدالغفار صاحب ڈگڈگی بجاتے اور سید صاحب ناچ ناچ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے۔ پھر غفار صاحب اعلان کر دیتے کہ رات کو یہ جگہ فلاں مدرسے یا فلاں جماعت کے لئے مخصوص ہے۔ سب بچے یاد رکھیں کہ انھیں اپنی جگہ کے علاوہ اور کہیں نہ بیٹھنا چاہئیے۔

کیمپ فائر کے دلچسپ نظارے

جامعہ نگر ۱۵ر نومبر۔ کیمپ فائر کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ مقررہ وقت سے پہلے ہی حیدری پارک تماشائیوں سے بھر گیا تھا۔ ٹھیک ۷½ بجے ابن حسن صاحب رضوی کی سیٹی کی آواز

فضا میں گونجی اور پہلی نقل " لالچ کا نتیجہ " سے کیمپ فائر کے دلچسپ کھیل شروع ہو گئے۔ یہ نقل مدرسہ ابتدائی کی چوتھی جماعت نے پیش کی تھی۔

کیمپ فائر میں حصہ لینے والوں میں مدرسہ ابتدائی، ثانوی، کالج اور استادوں کا مدرسہ سب نے حصہ لیا۔ اس کے علاوہ بچوں کی برادری بچوں کے گھر، اوکھلے کے بنیادی مدرسہ والوں نے بھی جی کھول کر حصہ لیا۔ سب ہی نقلیں اپنی اپنی جگہ دلچسپ اور سبق آموز تھیں۔ ہر نقل میں سارا پارک قہقہوں سے گونج اٹھتا تھا۔ ہاتھی کی سیر، ریچھ کا تماشا اور چوہے کی نقلوں پر اصلیت کا گمان ہوتا تھا۔ کالج والوں کی نقل سودیشی عدالت، سماج سیوا خاص طور پر بہت پسند کی گئی۔

کہانیوں کا انعامی مقابلہ

(محمد علی ٹرافی)

جامعہ نگر ۱۷ر نومبر۔ آج کہانیوں کا ایک انعامی مقابلہ ہوا۔ جس کی صدارت محترمہ قدسیہ زیدی صاحبہ نے فرمائی۔ حسب ذیل اداروں کے بچوں نے اس مقابلے میں حصہ لیا۔

نونہال کلب، موڈرن اسکول، اینگلو عربک ایل، این گردھاری، مدرسہ ابتدائی، بچوں کا کلب، دلی ٹدل اسکول، باڑہ ہندو راؤ۔ اپنی کہانی سنانے میں پہلا انعام سدھیر ساہنی ماڈرن اسکول کو دوسرا محمد اسلم نونہال کلب اور تیسرا محمد اسلم اینگلو عربک اسکول کو ملا۔

چھوٹے بچوں نے دوسروں کی کہانی سنائی جن میں پہلا انعام آدرش کمار بچوں کا کلب دوسرا فیروز احمد مدرسہ ابتدائی اور تیسرا سلیم مرزا نے حاصل کیا۔ ٹرافی ماڈرن اسکول کو ملی۔ محترمہ صالحہ عابد حسین، جناب رشید نعمانی اور جناب اطہر پرویز نے جج کے فرائض انجام دئے۔

جادو کے کرتب

جامعہ نگر ۱۶ر نومبر۔ آج کے پروگرام کی جو دلچسپ اور مزے دار چیز تھی وہ تھے جادو کے کرتب۔ ان جادو کے کرتبوں میں سب سے پہلے تو تاش کے پتوں کا کھیل دکھایا جس کی خوبی یہ تھی کہ جادوگر پتوں کو بغیر دیکھے بتایا کرتا تھا۔ پوچھنے والے طرح طرح سے چکپے

جادوگر سے پتّوں کے نام پوچھتے تھے مگر وہ برابر بتاتا جارہا تھا۔ اس کے بعد ڈبّے کا کھیل دکھایا وہ یہ تھا کہ ایک ڈبّے میں چنے تھے اور دوسرے میں مُرمُرے۔ جادوگر کا اس کھیل میں خاص کمال یہ تھا کہ اس نے چنے والے ڈبّے میں مُرمُرے اور مُرمُرے والے ڈبّے میں چنے بنا کے دکھائے یہ بھی اچھا دلچسپ کھیل تھا۔ اس کھیل کے بعد جادوگر نے معمولی سادے پانی سے سوڈا لیمن بناکر دکھایا۔ جس میں بڑے زور شور کے جھاگ پیدا ہو رہے تھے۔ پروفیسر رفیق کے سارے کھیلوں میں سب سے زیادہ دلچسپ چیز جو تھی وہ تھی جانوروں کی بولیاں، مثلاً کوّا، طوطا بھینس، کتّے کا پلّا وغیرہ۔ اس کے علاوہ بہت سے جانوروں کی بولیاں بس سننے سے ہی تعلق رکھتی تھیں۔ پروفیسر رفیق کا کہنا تھا کہ یہ بولیاں انھوں نے بڑی محنت سے برسوں میں سیکھی ہیں پھر ایک بال سے باریک کھیل دکھایا گیا یعنی بال سے آدمی کو اٹھانا۔ حیرت ہوتی تھی یہ بات دیکھ کر۔

لیکن بھائی سچ تو یہ ہے کہ ان جادو کے کھیلوں میں کوئی خاص بات تعجب کی نہیں ہے بس ایک ٹرک یا ٹکل ہوتی ہے جو ذرا سی محنت سے آپ بھی سیکھ سکتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو میلے میں

جامعہ نگر ۱۶ رنومبر۔ آج میلے کا دوسرا دن ہے لوگ خاص طور پر بہت خوش ہیں۔ کیونکہ آج شام کو ہمارے اچھے پنڈت جی تشریف لا رہے ہیں۔ ہم لوگوں نے پنڈت جی کے سواگت کے لئے چھوٹے ساتھیوں کی ایک استقبالیہ کمیٹی بنائی ہے ہمیں معلوم ہے کہ پنڈت جی بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں۔

ٹھیک چار بجے پنڈت جی تشریف لائے۔ وہ مسکراتے ہوئے کار سے اترے۔ ہم سب نے بھی ہنستے ہوئے آپ کو خوش آمدید کہا۔ سب سے چھوٹے بچے نے آپ کو ہار پہنایا۔ والنٹیرز نے (گارڈ آف آنرز) دیا۔ اور پھر بچوں نے آپ کو میلے کی نمائش دکھائی۔ نمائش دیکھ کر پنڈت جی بہت خوش ہوئے۔ بھیڑ بہت تھی اس وجہ سے آپ کو کچھ تکلیف بھی ہوئی۔ لیکن آپ ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ چیزوں کے متعلق پوچھتے رہے اور بچوں کے چھوٹے چھوٹے

سوالوں کا جواب دیتے رہے۔

نمائش دیکھنے کے بعد پنڈت جی ٹی اسٹال میں آئے۔ آپ نے چائے پی اور بچوں سے دلچسپ باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر کچھ فوٹو لئے گئے۔ آپ نے یہاں (پارلیمنٹ) میں حصہ لینے والوں سے ملاقات کی۔ اس کے بعد آپ کو رخصت کرنے کے لئے بچے ان کی کار تک گئے۔ ایک چھوٹے بچے نے پوچھا۔ "پنڈت جی! اب آپ کب آئیں گے؟" آپ نے ہنس کر کہا "آپ کب بلائیں گے؟"

پھر انھوں نے بچوں سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہوئے۔ پنڈت جی میلے، نمائش اور سب سے زیادہ چھوٹے بچوں سے مل کر خوش ہوئے۔

موسیقی کا شاندار پروگرام

جامعہ نگر ۱۷ نومبر۔ جناب عبدالغفار صاحب مدھولی کی نگرانی میں موسیقی کا پروگرام ٹھیک ۱۰ بجے شروع ہوا۔ آج کے پروگرام کی خصوصیت یہ تھی کہ اُسے آل انڈیا ریڈیو نے ریکارڈ کیا۔ اس سے بچوں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی خاص طور پر جبکہ بدرالحسن طالب علم ابتدائی پنجم کی گائی ہوئی لوری کا ریکارڈ ریڈیو کے کارکنوں نے بجاکر سنایا تو پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا۔

پروگرام مدرسہ ثانوی کی ایک قوالی "اللہ ہو" سے شروع ہوا جو بے حد پسند کیا گیا۔ کالج کے طلباء کا پروگرام بھی بہت دلچسپ تھا۔ خاص طور پر قوالی تو بے حد پسند کی گئی۔

بقیہ مجید کی بات صفحہ ۴۹ سے آگے

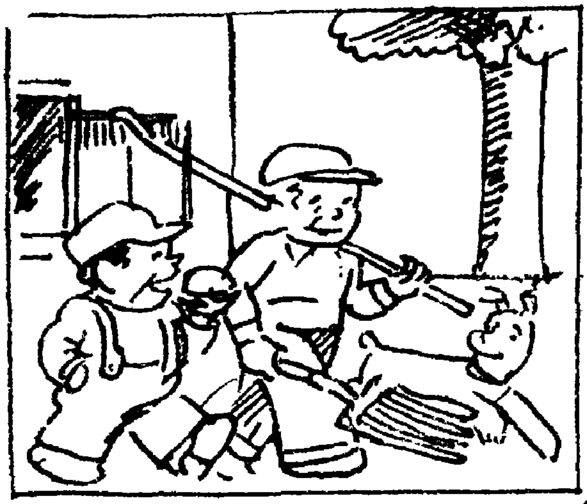
جب ریچھ بہت دور نکل گیا تو سعید پیڑ سے اُترا۔ اس نے مذاق کے طور پر اپنے ساتھی سے کہا "کہو دوست یہ ریچھ تم سے کیا کہہ رہا تھا۔" اس نے اپنا منہ بالکل تمھارے کان کے پاس لگا دیا تھا۔

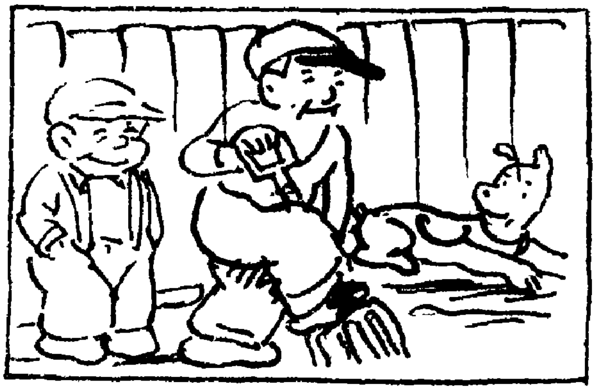
احمد نے جواب دیا۔ "ریچھ نے مجھ سے کوئی راز کی بات نہیں کہی تھی بلکہ سچ پوچھو تو عام بات ہی کہی تھی۔ وہ تم بھی سن لو۔ اس نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ ایسے دوست کی صحبت سے بچنا چاہئے جو مصیبت کے وقت ساتھ چھوڑ کر بھاگ جائے۔

یہ سُن کر سعید بہت شرمندہ ہوا۔

چُنّو مُنّو کی کہانی

چُنّو مُنّو باغبانی کرنے چلے۔ اُن کا کتّا بڑا سمجھ دار تھا۔ وہ بھی ساتھ ہو لیا۔ چُنّو کی جیب میں بونے کے لئے بیج تھے تو مُنّو کے ہات میں کُدال۔ اور کھیتی باڑی کا دوسرا سامان۔

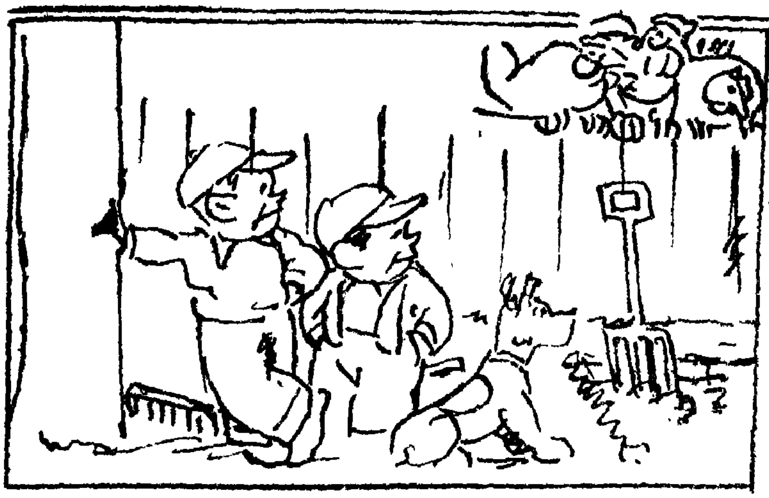




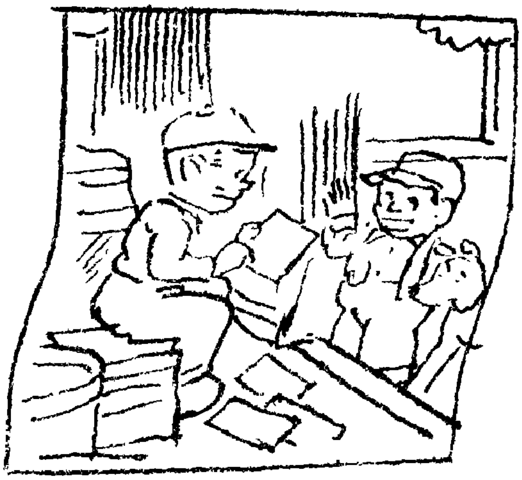
مگر جب وہ کھیت میں پہنچے تو زمین سخت ہو رہی تھی۔ منو نے اپنی سی کوشش کر ڈالی کہ زمین کچھ نرم ہو جائے۔ مگر اُن کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے یہ کام نہ ہو سکا۔



اتنے میں مُنّو کی نظر سامنے مرغے مرغیوں پر پڑی۔ مُنّو تھے ہوشیار، ان کے سمجھ میں ایک ترکیب آگئی۔

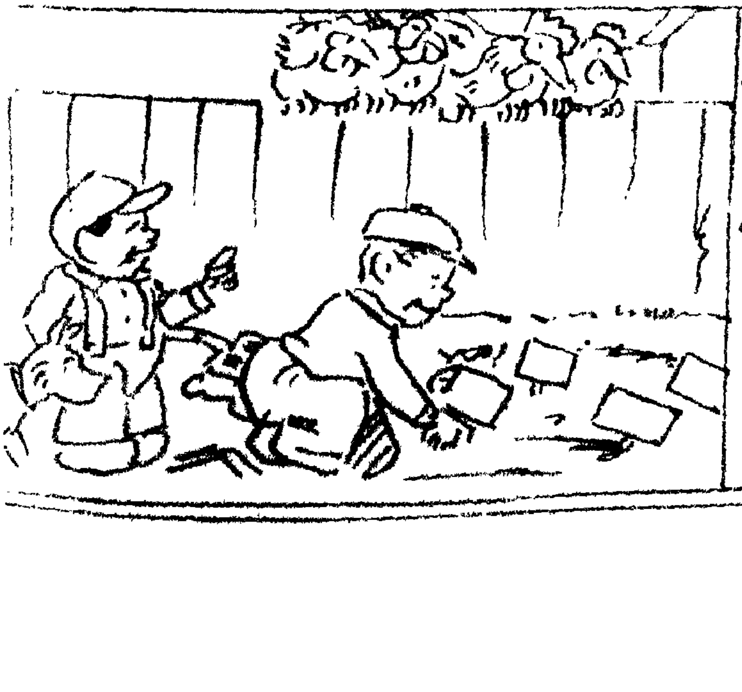


ترکیب سمجھ میں آئی تھی کہ وہ سب چھوڑ چھاڑ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ اور اپنی ترکیب مُنّو سے بتانے لگے۔



اب مُنّو نے بیجوں کے نام کاغذ پر لکھنے شروع کر دیئے۔ ان کا کتا بھی مزے سے سب کچھ دیکھتا رہا، جیسے سمجھ ہی تو رہا تھا۔

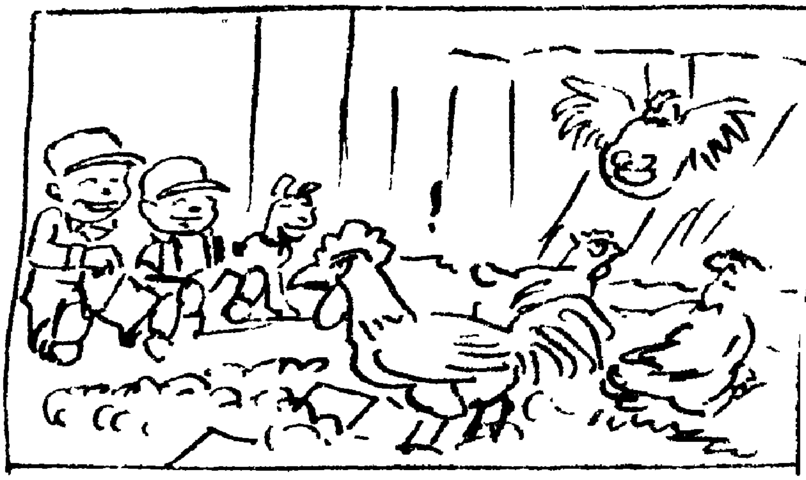
جب بیجوں کے نام کاغذ پر لکھ لئے تو ان کو تنکے میں لگا کر کھیت میں گاڑنا شروع کر د



مرغیاں دیوار پر بیٹھیں چپ چاپ یہ منظر دیکھتی رہیں۔ مُنّو کتے کو روکے ایک طرف کھڑے رہے کہ کتے سے ڈر کر کہیں یہ مرغیاں بھاگ نہ جائیں۔



اب ان کا کام ختم ہو گیا۔ اور چُنّو مُنّو ایک طرف بیٹھ گئے۔ مرغیوں نے جب یہ دیکھا کہ کھیت میں کوئی نہیں ہے تو وہ کھیت میں کود پڑیں۔



مرغیوں نے سارے کھیت میں چونچیں مار مار کر زمین کو کھود ڈالا۔ منّو چنّو الگ بیٹھے ہنستے رہے۔ ان کا کتا بھی تو سمجھ گیا تھا۔ وہ بھی کچھ نہیں بولا۔



اب سارا کھیت خوب اچھا ہو گیا تھا۔ کھدی ہوئی زمین میں دونوں نے بیج بو ڈالے اور مرغیاں ناامید ہو کر چلی گئیں۔ اس طرح چالاکی سے چُنّو مُنّو نے بیج بو دئے۔

غوث انصاری

بمبئی سے لندن تک

(۴)

نہر سوئز

۲۲ر اگست کی صبح کو جب ہم سوکر اُٹھے تو جہاز پورٹ سوڈان سے روانہ ہوچکا تھا، مگر اب بھی دیکھنے سے دور پر سوڈان کی عمارتیں اور پہاڑیاں دکھلائی دے رہی تھیں۔ جب نہا دھوکر ناشتہ وغیرہ کرنے کے بعد پھر عرشہ (چھت) پر آکر دیکھا تو یہ عمارتیں اتنی دور ہوچکی تھیں کہ صرف ایک ہلکا سا خاکہ دکھلائی دے رہا تھا۔

ابھی دو روز اور بحر احمر RED SEA میں چلنا تھا، اس کے بعد نہر سوئز تھی۔ آئیے پہلے آپ کو نہر سوئز کی تھوڑی سی تاریخ بتلا دیں ——— پرانے زمانے میں ہندوستان اور انگلستان کے درمیان آنے جانے کا صرف ایک ہی سمندری راستہ تھا اور وہ تھا برِ اعظم افریقہ کے نیچے سے ہوکر۔ لیکن یہ راستہ لمبا اور خطرناک تھا۔ ایک تو بہت زیادہ عرصہ لگتا تھا، پھر یہ کہ اکثر جہاز یا تو طوفان کی وجہ سے ڈوب جاتے تھے یا سمندری ڈاکو ان کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی وقت سے لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ بحر احمر RED SEA اور بحر روم MEDITERRANEAN SEA کو ملانے کے لئے ایک نہر کھود دی جائے تاکہ فاصلہ بھ

کم ہو سکے اور سمندری ڈاکوؤں سے نجات بھی مل جائے۔ ویسے تو کئی مرتبہ نہریں کھودی گئیں مگر ہر مرتبہ لاپرواہی کی وجہ سے وہ مٹی سے پُر ہو ہو گئیں۔ موجودہ نہر سوئز کی کھدائی کا سہرا ایک فرانسیسی انجینیر مسٹر لیسپس Mr. LESSEP کے سر ہے جنہوں نے ۱۸۴۹ء میں اس حصّہ کا خوب غور سے مطالعہ کیا اور شاہ مصر کی اجازت کے بعد ایک کمپنی بنی جس نے مسٹر لیسپس کی نگرانی میں کھدائی کا کام کوئی دس سال بعد، یعنی ۱۸۵۹ء میں شروع کر دیا۔ اس نہر کی کھدائی میں کام کرنے والوں کو بے حد مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال دس سال کی سخت محنت کے بعد ۱۸۶۹ء میں یہ نہر تیار ہوئی۔ اس نہر کے مشرقی دہانے، یعنی بحر احمر کی جانب مصر کا ایک بڑا اور مشہور شہر "سوئز" واقع ہے، اس لئے اس کا نام "نہر سوئز" رکھا گیا۔ اس نہر کی لمبائی تقریباً ۹۶ میل اور چوڑائی تقریباً ۶۰ گز ہے ۱۸۸۷ء کے بعد سے اس کے دونوں کناروں پر بجلی کی روشنی کا بھی انتظام کیا گیا ہے اور جہازوں کی طرح رات کو بھی گذر سکتے ہیں۔ اب ہم نہر سوئز کے بارے میں سوچتے ہیں تو یہ بڑی نعمت معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے ہمارا جہاز ۲۴ روز کے اندر اندر انگلستان جا پہنچے گا ورنہ اگر لمبے راستے سے جانا پڑتا تو کم سے کم ڈھائی مہینے لگ جاتے۔

ہاں تو ۲۴ر اگست کو دوپہر کے قریب ہمارا جہاز پورٹ سوئز کے قریب جا لگا۔ یہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ہمارا جہاز رات سے پہلے نہر سوئز سے نہیں گذر سکے گا کیونکہ نہر کی چوڑائی کی کمی کی وجہ سے ایک وقت میں صرف ایک ہی طرف کے جہاز جا سکتے تھے اس وقت چونکہ اُس طرف سے جہاز اِدھر آ رہے تھے اس لئے ہمارے جہاز کو انتظار کرنا پڑا۔ آگے جانے والے اور بھی کئی ایک جہاز آس پاس لنگر ڈالے ہوئے تھے۔ ہمارا جہاز ساحل سے ذرا دور تھا اور پھر یہ بھی یقین نہیں تھا کہ کس وقت اس کو روانگی کی اجازت مل جائے اس لئے ہم لوگوں کو شہر جانے کی ممانعت کر دی گئی تھی۔ البتہ کشتیوں پر بکنے کے لئے بہت سا سامان جہاز

پر ہی آگیا۔ جیسے طرح طرح کے چمڑے کے بٹوے اور بیگ، البم، ہاتھی دانت کا سامان مصری انگور وغیرہ۔ ہم لوگ سامان خریدتے رہے اور دور ہی سے شہر کی عمارتوں کو دیکھتے رہے۔ یہاں سات سات منزلہ عمارتیں تھیں، دیکھنے سے شہر بہت بڑا معلوم ہوتا تھا۔ یہاں پر چونکہ بحر احمر ختم ہو جاتا ہے اس لئے سمندر کے کنارے کنارے گولائی میں شہر آباد ہے، جس کے ایک کنارے سے نہر سوئز نکالی گئی ہے۔

رات کو تقریباً آٹھ بجے ہمارے جہاز کو روانگی کی اجازت ملی۔ ہر جہاز کو اس نہر سے گذرنے کے لئے خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے، پہلی چیز تو یہ کہ جہاز کے آگے کی طرف ایک تیز روشنی کا بڑا سا بلب لگانا پڑتا ہے، دوسرے یہ کہ وہاں کا رہنما ساتھ ساتھ چلتا ہے جو چلنے میں افسروں کو ہدایتیں دیتا رہتا ہے۔ مصری پولیس کے کچھ سپاہی جہاز پر رہتے ہیں اور جہاز بہت دھیرے دھیرے اس نہر سے گذرتا ہے۔

گو کہ اس وقت بالکل اندھیرا ہو چکا تھا، مگر سامنے سوئز کی عمارتوں میں بجلی کی روشنی ہو چکی تھی۔ جہاز جب نہر سوئز میں داخل ہوا تو دونوں طرف کچھ دور تک عمارتیں تھیں۔ بعد میں بالکل ریگستان کا علاقہ۔ ہم لوگوں کو اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ اندھیرے ہی اندھیرے جہاز نہر سوئز کو پار کر کے دوسرے روز صبح سویرے پورٹ سعید جا پہنچے گا اور ہم لوگ اس علاقہ کو نہ دیکھ سکیں گے۔

دوسرے روز صبح جب ہم سو کر اٹھے تو جہاز ایک خوبصورت بندرگاہ کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ ہم سب یہ سمجھے کہ پروگرام کے مطابق پورٹ سعید پہنچ گئے ہیں۔ مگر جب جہاز کے افسروں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ اسماعلیہ تھا۔ پورٹ اسماعلیہ تمسا جھیل کے کنارے آباد ہے۔ یہاں پر آکر نہر سوئز اس جھیل میں مل جاتی ہے۔ اور پھر آگے اسی جھیل سے بحر روم تک نہر کا دوسرا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں پر ایک آسانی یہ ہے کہ ایک طرف کے آنے والے جہاز اسماعلیہ میں آکر رک جاتے ہیں

اور دوسری طرف کے جہاز آگے جاتے ہیں۔ مگر ہمارے جہاز کو یہاں پر نہیں ٹھہرنا تھا اور محض ایک اتفاق کی بنا پر رک جانا پڑا۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ کوئی چار بجے رات کو سخت قسم کا کہرا گرا تھا، جس میں کوئی چیز دکھلائی نہیں دیتی تھی۔ اسی کہرے میں ہمارا جہاز ایک دوسرے جہاز سے ٹکراتے ٹکراتے بچ گیا۔ اس جگہ سے چونکہ اسماعلیہ کوئی ایک میل کے قریب تھا اس لئے اسماعلیہ ہی میں آکر ٹھہر گیا اور کہرا صاف ہونے کا انتظار ہونے لگا۔ اب ذرا اس پورٹ کا کچھ حال بھی سن لیجئے۔ اسماعلیہ بھی مصر کا بندرگاہ ہے اور جیسا کہ اوپر بتلا چکے ہیں، تمسا جھیل کے کنارے آباد ہے۔ دیکھنے میں بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ آس پاس پہاڑیاں ہیں اور ان کے دامن میں خوبصورت عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ ہم لوگ ناشتہ کرنے سے پہلے عرشہ پر کھڑے ہوئے اس خوبصورت شہر کو دیکھ رہے تھے کہ ایک مرتبہ پھر کہرا گرنا شروع ہوگیا اور جہاز کے چاروں طرف صرف ایک ہلکی سی سفیدی تو دکھلائی دیتی باقی کوئی چیز نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جب کہرا پوری طرح سے صاف ہوگیا تب جہاز آگے کی طرف روانہ ہوا۔

اب کافی روشنی ہوچکی تھی اور ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ ہم پھر نہر سوئز سے گذر رہے تھے۔ جہاز بہت دھیرے دھیرے چل رہا تھا اس لئے ہر چیز خوب غور سے دیکھ سکتے تھے۔ نہر کے دونوں جانب ریگستان ہے اور اس علاقہ میں دن کے وقت خوب گرمی پڑتی ہے۔ سامنے ریت اڑتی ہوئی دکھلائی دے رہی تھی، نہر کے کنارے کنارے ایک چھوٹی سی ریل کی پٹری خاص، اسی لئے بچھائی گئی ہے تاکہ چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں کنارے پر سے ریت صاف کرکے لے جائی جاسکے۔ اور سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ ان ریل کے ڈبوں کو انجن نہیں کھینچتا بلکہ خچر کھینچتے ہیں دوسرے کنارے پر نہر سوئز کے ساتھ ساتھ پورٹا سوئز سے پورٹا سعید تک ایک پختہ سڑک ہے جس پر بہت سی نئی نئی موٹریں دوڑتی ہوئی دکھلائی دیں۔ اس سڑک کے بعد ریلوے لائن تھی اور ریلوے لائن کے بعد ایک اور

پختہ سڑک ۔ نہر سے ذرا فاصلے پر دہاں کے دو تین گاؤں بھی دکھلائی پڑے ۔ فاصلہ چونکہ کچھ زیادہ تھا اس لئے مکانوں کی بناوٹ وغیرہ نہیں دیکھ سکے ۔ جگہ جگہ پر نہر کی حفاظت کے لئے فوجی چوکیاں تھیں جن میں مصر اور برطانیہ دونوں کے فوجی سپاہی تھے ۔ ایک جگہ پر نہر کے اوپر سے ریلوے لائن دوسری طرف گئی ہے ۔ اس پل کی خصوصیت یہ ہے کہ جب جہاز گذرتے ہیں تو ریلوے لائن بیچ سے ہٹ کر دونوں کناروں پر آجاتی ہے اور جہازوں کے لئے راستہ صاف ہو جاتا ہے ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ ریلوے لائن قاہرہ سے فلسطین کے شہر یروشلم کو جاتی ہے ۔

ہمارے جہاز پر جو مصری سپاہی چل رہے تھے ہم نے ان سے ان کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور کچھ اشاروں کی مدد سے بات چیت کی ۔ انھوں نے بتلایا کہ ہر مصری شاہ فاروق کے ہٹائے جانے سے بہت خوش ہے ، کیونکہ ان کے عہد میں ہر ایک کو تکلیف تھی اور مصر کا بہت سا روپیہ اُن کے عیش و آرام پر خرچ ہوتا تھا ۔ اب زمین تمام کسانوں میں برابر برابر تقسیم کر دی گئی ہے ، تمام لوگوں کی تنخواہیں بڑھادی گئی ہیں اور لوگ فوجی جنرل نجیب اور مصر کے وزیر اعظم علی مہر پاشا سے بہت خوش ہیں ۔ دوسری بات جو ان مصری سپاہیوں اور سامان بیچنے والوں میں دیکھی وہ یہ کہ ہر ایک اخبار ضرور پڑھتا ہے چنانچہ ہندوستان کی کئی باتیں ان سے پوچھیں اور انھوں نے صحیح صحیح جواب دیا ۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہاں سیاسی بیداری بہت کافی ہے ایک اور مزے کی بات یہ ہے کہ مصری لوگ دنیا کی تمام مصیبتوں کا ذمہ دار چرچل کو ٹھہراتے ہیں ۔ ہم نے جب انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ صرف چرچل ہی نہیں اور لوگ بھی ہیں تو وہ بگڑ گئے ۔ یہ لوگ ہندوستان اور روس کی بہت تعریف کرتے ہیں ۔ اب پتہ نہیں کہ واقعی ہندوستان کی دل سے تعریف کرتے تھے یا محض ہم لوگوں کو خوش کرنے کے لئے کہا تھا ۔

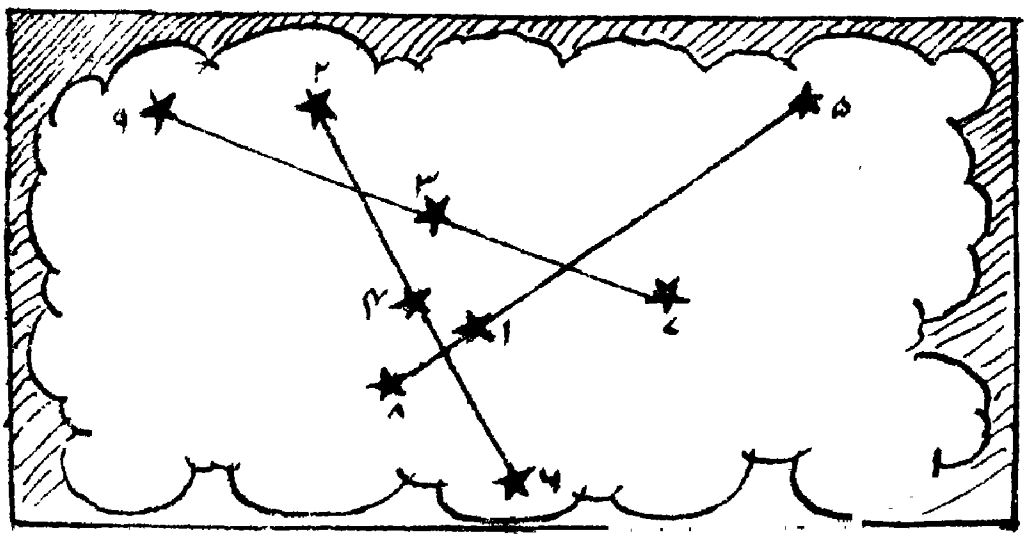
دوپہر کے قریب ہمارا جہاز پورٹ سعید جا پہنچا ۔ پورٹ سعید بھی مصری بندرگاہ ہے اور نہر سوئز کے دوسرے دہانے پر

بحر روم میں واقع ہے۔ دیکھنے میں یہ بھی بڑا شاندار شہر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں جہاز بالکل نہیں ٹھہرا، حالانکہ پروگرام کے مطابق یہاں ٹھہرنا تھا۔ سوچا تھا کہ یہاں بھی گھومنے کو ملے گا اور اسی لئے اپنے ایک رشتہ دار (محمد مہدی انصاری۔ ایک پرانے پیامی) کو یہاں ملنے کے لئے بلایا تھا، جو آج کل جامعہ ازہر قاہرہ میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مگر دونوں میں سے ایک چیز بھی پوری نہ ہو سکی۔

اب سامنے بحر روم ہے اور بدستور سمندری سفر۔ آج بمبئی سے روانہ ہوئے پورے تیرہ دن ہو چکے ہیں اور تقریباً دس دن اور جہاز پہ رہنا ہے۔ اب اجازت دیجئے اس وقت نیند آ رہی ہے۔

پورٹ سعید
۲۵ اگست ۱۹۵۲ء

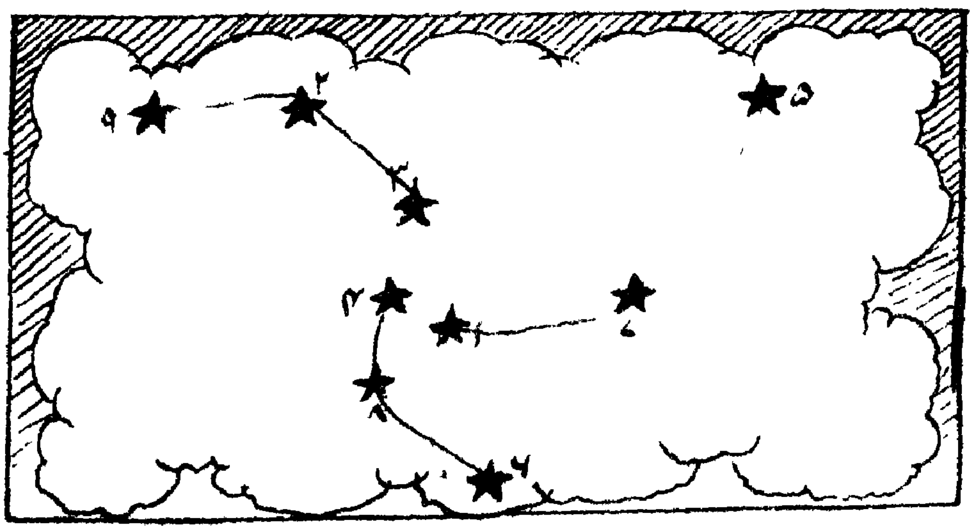
جواب ستاروں کو ملائیے صفحہ ۲۸ سے



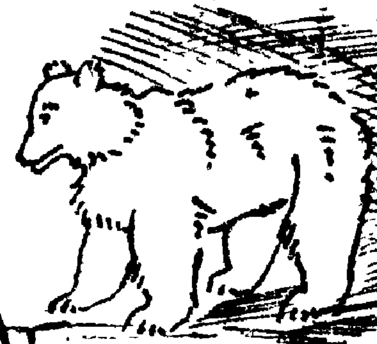


سلسلے وار نقطوں کو ملائیے پھر دیکھیے۔ کیا بنتا ہے

تین ایسی سیدھی لکیریں کھینچئے کہ ہر لکیر ایک بار ہر تین ستاروں کو ملائے۔



اس کا جواب صفحہ ۲۷ پر دیکھیے۔



سرکس کے جانور

ا۔ ع۔ انصاری۔ اسلام پوری

آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت دنیا کا سب سے مشہور سرکس ماسٹر کون ہے ؟ وہ ہے امریکہ کا ـــــ کلائیڈ بی ٹی۔

کلائیڈ بی ٹی کو چیتے کئی بار گھائل کر چکے ہیں۔ شیر اُس کی ٹانگوں کو اپنے خوفناک جبڑوں میں دبا چکے ہیں۔ وہ ہاتھیوں کے بھاری بھرکم پاؤں تلے کچلنے سے صاف بچ چکا ہے۔ ریچھوں کے نیچے بھی آچکا ہے۔ اکیسؔ بار اُسے خون میں لت پت سرکس سے اسپتال پہنچایا گیا ہے۔ وہی دنیا کا ایک ایسا سرکس ماسٹر ہے، جسے بیمہ کمپنیوں نے بیمہ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ انھیں اس بات کا ڈر تھا کہ اسے نہ جانے کب جنگلی جانور چیر پھاڑ ڈالیں اور اس کا کام تمام کر دیں۔ اور بیمہ کمپنی کو نہ جانے کب پوری رقم ادا کرنی پڑے۔

کلائیڈ بی ٹی کے کہنے کے مطابق شیر اور چیتوں کو اپنے بس میں کرنا سب سے مشکل کام ہے۔ اس نے تمام جانوروں کو بس میں کرکے دیکھا ہے۔ شیر، چیتے، تیندوے، ریچھ اور نی وغیرہ۔ لیکن آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سب سے خوفناک جانور سفید جنگلی ریچھ ہے ن اس کے ساتھ ہی وہ سب سے دلچسپ کھیل جو دکھاتا ہے وہ اسی سفید ریچھ کا ہوتا ہے

ریچھ کی پوری قلابازی اپنے ڈھنگ کا ایک ہی کھیل ہے۔ اس کا پتہ کلائیڈ کو اچانک لگ گیا۔ ایک دن وہ جب سرکس کے جنگلے میں کھڑا تھا، تو ایک سفید ریچھ نے اُس پر ایکا ایکی حملہ کر دیا۔ اپنے پنجوں اور دانتوں کو دکھاتا ہوا وہ ریچھ آگے بڑھا۔ اس کا حملہ اتنا تیز اور اچانک تھا کہ کلائیڈ نے وہی کیا، جو اُسے اس وقت سوجھا۔ اُس نے ریچھ کی ناک پر پورے زور سے گھونسہ جمایا۔ ناک کی چوٹ سب سے زیادہ تکلیف دینے والی ہوتی ہے۔ گھونسہ لگتے ہی ریچھ پیچھے کی طرف پوری قلابازی لگا گیا۔ اسی واقعہ سے کلائیڈ کو ریچھ کے اس کھیل کا پتہ چلا اور آج اُسی ریچھ کو قلابازی کھلانے کے لئے اسے اپنے ڈنڈے سے ریچھ کی ناک کو صرف چھو دینا پڑتا ہے۔

جنگلی جانوروں میں سب سے خطرناک دشمنی چیتے اور ہاتھی کی ہوتی ہے۔ ایک نوکر جو چیتے کے جنگلے کو صاف کرنے کے لئے ہی ہاتھی کے پاس گیا، تو وہ ہاتھی سے کچل جانے سے بال بال بچا۔ کیونکہ ہاتھی کو چیتے کی بدبو پہنچ گئی تھی۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ جانوروں کو سدھانے والے اُن کی آنکھوں میں گھور گھور کر اُنھیں اپنے بس میں کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے۔ شیر پر کسی کے گھورنے کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

کبھی کبھی یہ سوال بھی کیا جاتا ہے کہ اگر شیر اور چیتے میں لڑائی ہو، تو کون جیتے گا؟ اسے یقین کے ساتھ تو کوئی نہیں بتا سکتا۔ شیر اور چیتے کو بہت سے لوگوں نے لڑتے ہوئے دیکھا ہے اور ایک عجیب بات جو دیکھنے میں آئی وہ یہ ہے کہ لڑائی کے وقت شیر سب ایک طرف ہوکر ایک ساتھ حملہ کرتے ہیں اور چیتا ہمیشہ اکیلا ہی لڑتا ہے۔ جیسے ہی ایک شیر لڑائی شروع کرتا ہے، ویسے ہی آس پاس کے سارے شیر اس کی مدد کے لئے آجاتے ہیں۔ لیکن چیتوں میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ دوسرے چیتے ایک طرف الگ تھلگ بیٹھے اونگھتے رہتے ہیں اور ان کی آنکھوں کے سامنے ایک چیتا مار ڈالا جاتا ہے۔

مارٹن جونس ایک اور مشہور امریکی سرکس ماسٹر ہے اور وہ افریقہ کے جنگلوں، پہاڑوں میں بہت گھوما ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک پیاسا شیر، جو بھوکا نہ ہو اور جسے کسی انسان نے پریشان اور تنگ نہ کیا ہو، آدمی کی پروا نہیں کرتا۔

ایک بار اس کی موٹر پندرہ شیروں کے درمیان گھس گئی۔ سب کے سب پالتو بلیوں کی طرح ادھ کھلی آنکھوں سے اس کی طرف لیٹے ہوئے دیکھتے رہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ شیر ایک اچھے مزاج کا جانور ہے۔ شیر پر بھروسہ کرنا اپنی موت کو خود دعوت دینے کے برابر ہے۔ نہ جانے کب شک میں پڑکر آدمی پر حملہ کر بیٹھے۔ دنیا میں حملہ کرتے ہوئے شیر سے زیادہ خوفناک کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ اُس کے تھپڑ میں پچاس سیر وزن ہوتا ہے۔ شیر ایک چھلانگ میں چالیس فٹ سے بھی زیادہ کود سکتا ہے۔

بقیہ چین میں اسلام صفحہ ۱۴ سے آگے

پیدائش کے دن تمام چینی مسلمان عید مناتے ہیں مسجدوں میں جاکر نماز پڑھتے ہیں اور پھر قربانی کرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسے ہم لوگ عیدالضحیٰ یا بقرعید میں کرتے ہیں۔

چین میں مسلمانوں کے دو فرقے ہیں ایک تو "چن خوئی" کہلاتے ہیں اور دوسرے "خن خوئی" وہ مسلمان کہلاتے ہیں جو چینی ترکستان میں رہتے ہیں اور "خن خوئی" مسلمان چین میں رہتے ہیں۔

"چن خوئی" مسلمان زیادہ تر ترکی زبان بولتے ہیں اور "خن خوئی" مسلمان چینی زبان بولتے ہیں۔

چینی مسلمان اپنے ملک سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ وہ نہایت خلوص سے اپنے دیس کی خدمت کرتے ہیں۔ خصوصاً جنگ وغیرہ کے خطرناک موقع پر جان و مال سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

اسرار ندوی

سیٹھ چندو لال



جاوید میاں میں یوں تو ساری باتیں اچھی ہیں لیکن ان کو غصہ بہت جلد آ جاتا ہے آج ان کے کمرے میں ملازم جھاڑو دینا بھول گیا۔ بس پھر کیا تھا الو، بیل، گدھا، سور، پاجی، غرض "الف" سے "ی" ایک ہی سانس میں سب کچھ سنا گئے۔ ان کی آپا جان کہیں پاس ہی بیٹھی اپنا جمپر سی رہی تھیں۔ انھوں نے یہ سب سنا تو جاوید میاں کو اپنے پاس بلا لیا۔ "میاں تم میں یہ بڑی بری لت پڑ گئی ہے کہ تم بلاقی کو اس طرح بات بات پر ڈانٹا کرتے ہو، آدمی کو الو، گدھا کہنا بہت بری بات ہے۔ اسی میں سیٹھ چندو لال کی جان گئی تھی"۔ "آپا جان سیٹھ چندو لال کون تھے؟" پرویز میاں نے پوچھا۔ آپا بولیں "وہ شیو نگر کے ایک بڑے ساہوکار اور زمیندار تھے۔ لاکھوں من غلہ ان کے یہاں سڑا کرتا تھا اور کنجوس ایسے تھے کہ دانے دانے پر جان دیتے تھے"۔ "تب تو آپا اچھا ہی ہوا جو وہ مر گئے" جاوید میاں کے دوست سریندر نے کہا۔ "کنجوس، مکھی چوس۔ اچھا ان کی دولت کا کیا ہوا" جاوید میاں نے پوچھا۔ آپا بولیں "اس وقت مجھے سینے دو رات کے وقت سیٹھ چندو کی کہانی سنا دوں گی۔ دن میں کہانی نہیں کہا کرتے۔ ماموں راستہ بھول جاتے ہیں۔

میاں جاوید، پرویز اور ان کے پڑوسی دوست سریندر رات کا انتظار کرنے لگے۔ رات آتے ہی ان چاروں نے آپا جان کو گھیرا۔ انھوں نے کہانی شروع کی۔

کہتے ہیں شیدنگر میں ایک امیر کبیر سیٹھ جی رہتے تھے۔ جن کا نام تھا سیٹھ چندو لال۔ سیٹھ جی سود پر روپیہ چلاتے تھے اور اسی کاروبار میں وہ لکھ پتی بن گئے تھے۔ ایک سال کچھ ایسا ہوا کہ وقت پر بارش نہیں ہوئی۔ بیج کھیت ہی میں سوکھ کر رہ گئے۔ بڑے زوروں کا کال پڑا۔ ایسا کال کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے لوگ دانے دانے کے لئے ترس گئے۔ سیٹھ جی کی رعایا نے سوچا کہ اگلے سال کی فصل کے لئے سیٹھ جی سے قرض کی درخواست کریں۔ سب لوگ سیٹھ جی کی کوٹھی پر پہنچے اور دہائی دینے لگے۔ سیٹھ جی اس وقت اپنی ترسٹھویں سالگرہ منا رہے تھے ۔۔۔۔ "کیا ان کو خبر نہ ہوتی تھی کہ ان کی رعایا بھوکی مر رہی ہے؟" جاوید، پرویز، سریندر، سب ہی بول اٹھے۔ "بھیا ان کو کیا خبر، محلوں کے رہنے والوں کو کیا معلوم کہ جھونپڑوں میں رہنے والوں پر کیا بپتا پڑتی ہے ۔۔۔۔ ہاں تو سیٹھ جی کو جو یہ خبر ملی تو وہ مارے غصّے کے آگ بگولہ ہو گئے۔ "حرام زادوں کو مال گذاری ادا کرنے کی کوئی فکر نہیں۔ دو سال کا لگان باقی ہے اور چلے ہیں قرض لینے" وہ لپک کر باہر آئے اور چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ رعایا کی دکھ بھری کہانی سن کر تھوڑی دیر چپ رہے پھر بولے "تم لوگ کل اسی وقت آنا" انھوں نے کچھ سوچ کر کہا۔ بھوک اور بپتا کی ماری رعایا کی امیدیں بندھیں۔ وہ سیٹھ جی کو دعائیں دیتی ہوئی اپنے گھروں کو لوٹ گئی۔

گھڑیاں گن گن کر انھوں نے ۲۴ گھنٹے کاٹے۔ مقرر وقت پر گاؤں کے بہت سے مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب ان کی کوٹھی کے احاطے میں جمع ہو گئے۔ سیٹھ جی اسی طرح غصّہ میں بھرے گھر سے نکلے۔ چوکیدار کو حکم دیا کہ احاطے کا پھاٹک بند کر دو۔ پھاٹک بند کر دیا گیا۔ ان کے پیادے وہاں پہلے سے موجود تھے۔ تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی "آگ لگا دی گئی سب لڑکے چیخ اٹھے"۔ ہاں

بس نہ پوچھو بے چارے تڑپ تڑپ کر جل مرے۔ اور ظالم سیٹھ کھڑا دیکھتا رہا۔ جب سب جل بھن گئے تو کہنے لگا چلو دنیا کو اتنے سارے چوہوں سے نجات مل گئی۔ یہ الو، سور، بیل، گدھے سب سے چھٹکارا ملا۔

سیٹھ جی سویرے اٹھنے اور پوجا پاٹ کرنے کے عادی تھے۔ ایک روز سیٹھ جی پوجا پاٹ کر کے باہر آ ہی رہے تھے کہ ان کے دھام نگر کے نوکر آئے اور بولے "حضور وہاں جو غلّے کی کوٹھی تھی راتوں رات یکایک خالی ہو گئی اور اس میں چوہے ہی چوہے بھرے ہیں۔ سینکڑوں، ہزاروں چوہے" یہ سن کر سیٹھ جی کی حیرت ابھی کم بھی نہ ہوئی تھی کہ گھر کے چوکیدار نے کہنا شروع کیا "حضور یہاں بھی چوہوں کی بھاگ دوڑ رات اس قدر تھی کہ میرا ایک جگہ کھڑا ہونا مشکل تھا۔ حضور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بلا آنے والی ہے۔ پرماتما کرے کہ ایسا نہ ہو" سیٹھ جی سمجھے کہ یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹّے بٹّے ہیں۔ ساری باتیں محض بناوٹی ہیں۔ "کل دھام نگر کے ٹھور سنگھ جائیں گے تو معاملے کی جانچ کی جائے گی"

رات ہوئی سیٹھ جی ضروری ہدایتیں دے کر سو رہے۔ کوئی بارہ بجے ہوں گے کہ ان کی پالتو بلّی میاؤں میاؤں کرتی ہوئی ادھر سے اُدھر دوڑنے لگی۔ اس کی آنکھیں بالکل انگارے کی طرح لال تھیں۔ سیٹھ جی چارپائی سے اُٹھ بیٹھے۔ وہ ابھی کچھ سوچ بھی نہ پائے تھے کہ ان گنت چوہے دروازوں، کھڑکیوں اور بلوں سے نکل پڑے۔ سیٹھ جی نے بھاگنا چاہا۔ چوہوں نے راستہ روک لیا اور ایک دم ان پر ٹوٹ پڑے۔ سارے بدن کو کاٹ کاٹ کر لہو لہان کر دیا۔ ذرا سی دیر میں سیٹھ جی کی صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں رہ گئیں۔

لطیفے

سوار ۔ میاں لڑکے ذرا میرا گھوڑا تو پکڑلو، میں ذرا اس نل سے پانی پی لوں ۔

لڑکا ۔ گھوڑا کاٹتا تو نہیں ؟

سوار ۔ بالکل نہیں ۔

لڑکا ۔ دولتی تو نہیں مارتا ؟

سوار ۔ ہرگز نہیں ۔

لڑکا ۔ بھاگ تو نہیں جائے گا ؟

سوار ۔ نہیں ۔

لڑکا ۔ تو پھر مجھے پکڑنے کی کیا ضرورت ہے ۔

مسافر ۔ (ٹکٹ کلکٹر سے) بابوجی ! طوفان کب آئیگا ؟

ٹکٹ کلکٹر ۔ ۵ بجے شام کو ۔

مسافر ۔ پسنجر کب آئے گا ؟

ٹکٹ کلکٹر ۔ ۴ بجے آئے گا ؟

مسافر ۔ اور اکسپریس کب آئے گا ؟

ٹکٹ کلکٹر ۔ ۷ بجے ۔

مسافر ۔ کوئی مال گاڑی تو نہیں آئے گی ؟

ٹکٹ کلکٹر ۔ تم کو جانا کہاں ہے ؟

مسافر ۔ مجھے یہ پٹری پار کرنی ہے ۔

بیٹا ۔ امی ، یہ مُنّا کہاں سے آیا ہے ؟

ماں ۔ جنت سے ۔

بیٹا ۔ بڑا بیوقوف ہے ۔ ایسی اچھی جگہ چھوڑ کر یہاں آیا ہے ۔ اب مار پڑے گی تو معلوم ہوگا ۔

دو بیوقوف دوست گاڑی میں سفر کررہے تھے ۔ پہلے دوست نے گاڑی سے باہر جھانکا تو کہا " ارے یار ! زمین چل رہی ہے " دوسرا دوست ۔ تب تو خواہ مخواہ ٹکٹ لیا ۔ زمین ہی کے ساتھ چلے چلتے ۔

جسپال سنگھ بھاٹیا ۔ جگسلائی ۔

جج۔ (ملزم سے) تم نے بنئے کی دوکان میں
چوری کی؟
ملزم۔ جی میں بھوکا مر رہا تھا۔ بھوک سے تنگ
آکر میں نے یہ کام کیا۔
جج۔ مگر تم نے تو صرف روپئے ہی چرائے۔
کھانے کی کوئی چیز کیوں نہیں چرائی۔
ملزم۔ حضور میں خوددار آدمی ہوں۔ بغیر روپیہ
ادا کئے کوئی چیز نہیں خریدتا۔

ایک پڑوسن۔ (دوسری سے) اب پہلی سے ہم کو
اپنے نئے مکان میں اچھا پڑوس ملے گا۔
دوسری پڑوسن۔ اور ہمیں بھی تو۔
پہلی۔ کیا تم بھی مکان بدل رہی ہو۔
دوسری۔ نہیں ہم تو اسی جگہ رہیں گے۔

ایک لڑکا امتحان دیتے ہوئے کتاب میں
سے نقل کر رہا تھا کہ استاد نے دیکھ لیا اور قریب
آکر کہا۔
اُستاد۔ بتاؤ! تم کیوں نقل کر رہے ہو؟
لڑکا۔ آپ ہی نے تو کہا تھا کہ سوالوں کے جواب
صحیح صحیح لکھنا۔ اسی لئے تو میں کتاب میں
سے دیکھ دیکھ کر لکھ رہا ہوں تاکہ غلطی کا کوئی
امکان نہ رہے۔

مظہر شاہ۔ نیلور

مالک۔ (باورچی سے) جاؤ چار آدمیوں کا کھانا
پکاؤ۔
باورچی۔ حضور چار ہی آدمی ہوں گے اس سے
زیادہ تو نہ ہوں گے۔
مالک۔ گدھے چار سے زیادہ نہ ہوں گے۔
باورچی۔ کیا حضور کوئی آدمی نہ ہوگا۔ سب
گدھے ہی ہوں گے۔

اسمٰعیل حسین۔ بانکوٹ

ایک بہرہ (دوسرے بہرے سے) یہ کون سا اسٹیشن ہے
دوسرا بہرہ۔ آج اتوار ہے
پہلا۔ بس مجھے یہیں اُترنا ہے

جج۔ (ملزم سے) تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔
شرم آنی چاہئیے۔ آج تم ساتویں بار عدالت
میں پیش ہوئے ہو۔
ملزم۔ حضور گستاخی معاف، مجھ سے زیادہ تو آپ
کو شرم آنی چاہئیے جو ہر روز عدالت میں
تشریف لاتے ہیں۔

محمد اویس فاروقی۔ سکھر

سیّد منیر الحسن

سونے کی گھڑی

ایک جاپانی کہانی

یہ ایک جاپانی لوک کہانی ہے جو جاپان میں ہر جگہ مشہور ہے۔ جاپان ہندوستان کے اتر پورب کی طرف ایک دیس ہے۔ یہاں کے لوگ بڑے بہادر ہوتے ہیں۔ جس طرح ہندوستان کی راجدھانی "دلّی" ہے اسی طرح جاپان کی راجدھانی "ٹوکیو" ہے۔ یہ کہانی ٹوکیو شہر ہی کی ایک لڑکی کی ہے۔

کہتے ہیں کہ ٹوکیو شہر میں ایک لڑکی رہتی تھی جس کا نام "ایکی" تھا۔ وہ اتنی خوبصورت اور چنچل تھی کہ جب وہ گلیوں میں کھیلتی تو راستہ چلنے والے راہ گیر اُس کی طرف دیکھتے رہ جاتے۔ اس کی آنکھیں گول گول اور چمکیلی تھیں اور بال صاف ستھرے تھے جو اچھے اچھے خوبصورت پھولوں سے سجے رہتے۔ اس کے پیلے ریشمی فراک پر کلیوں کے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے۔ ایکی کے ماں باپ نے ایکی کو بڑے لاڈ پیار سے پالا پوسا تھا۔ اسی وجہ سے وہ کچھ ضدّی بھی ہوگئی تھی اور اسے جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی وہ بغیر لئے نہ مانتی

تھی۔ جب اس کی کوئی خواہش پوری نہ ہوتی تو وہ چپ چاپ بیٹھ کر سسکنے لگتی تھی۔

ایک دن وہ بازار میں چلی جا رہی تھی کہ اس نے ایک گھڑی ساز کی دوکان میں ایک خوبصورت گھڑی لٹکی ہوئی دیکھی۔ اس گھڑی میں سونے کی لمبی زنجیر تھی۔ یہ زنجیر سورج کی روشنی میں بہت چمکیلی معلوم ہو رہی تھی۔ اس زمانہ میں گھڑیوں کے دام بہت زیادہ تھے۔ صرف بڑے بڑے مالدار لوگ ہی سونے کی گھڑی خرید سکتے تھے۔ اسی لئے ایکی نے اس گھڑی کی طرف بڑی حسرت اور لالچ بھری نظر سے دیکھا اور دل میں یہ خیال کیا "میں یہ گھڑی ضرور لوں گی"۔ لیکن جب وہ گھر پہنچی اور اپنی ماں سے گھڑی کے لئے کہا تو ماں نے صاف صاف کہدیا "نہیں ایکی، تمہیں یہ گھڑی نہیں مل سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ ابھی ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں اور نہ تمہاری جیسی چھوٹی لڑکی کو اتنی قیمتی گھڑی نہیں رکھنی چاہئیے"۔ ایکی یہ سن کر سسکنے لگی اور تین دن تک روتی اور ضد کرتی رہی۔ لیکن اس کے ماں باپ کو سونے کی گھڑی خرید کر نہ دینی تھی نہ دی۔

کچھ ہی دن بعد ایکی کی ماں نے اسی دوکان پر ایک ٹوٹی زنجیر مرمت کے لئے بھیجی۔ ایکی گھڑی ساز کی دوکان پر گئی۔ اس کی نظر پاس کی میز پر پڑی جہاں وہی خوبصورت زنجیر والی سونے کی گھڑی رکھی تھی۔ ایکی نے جھک کر دیکھا تو اس گھڑی کی زنجیر پر سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں جس سے وہ چمک اٹھی تھی۔ اور اس چمک سے ایکی کا چہرہ بھی دمکنے لگا تھا۔ ایکی نے گھڑی کو بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا "کتنی اچھی گھڑی ہے کاش یہ گھڑی میرے پاس ہوتی۔

دُکاندار کسی کام سے اندر گیا۔ ایکی اکیلی کھڑی رہی۔ اس نے گھڑی کو چھو کر دیکھا، اُسے اٹھایا اور زنجیر کو بڑے شوق سے گھمانے لگی۔ اتنی دیر میں کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی اور ایکی نے ڈر کر گھڑی کو مٹھی میں بند کرکے آستین میں چھپا لیا۔

دوکاندار بولا "تمہاری زنجیر کل تک ٹھیک ہو جائے گی۔ تم سویرے آنا"

اس کا شکریہ ادا کر کے گھر کی طرف چلدی
ی ابا تک اس کے ہاتھوں میں تھی۔ اس
سوچا — "میں تو اسے لینا نہ چاہتی تھی،
ن کیا کروں، جو بھی ہو، یہ ہے بہت
جبورت میں گھر جا کر ضرور اسے پہنونگی۔"
یہ کہہ کر وہ گھر پہنچکر اپنے کمرے میں
اور گھڑی کو جیسے ہی چھوا۔ اسے ایسا
لوم ہوا جیسے گھڑی بول رہی ہے۔

ایکی تم نے چوری کی!
چھی چھی تم نے چوری کی!
ایکی تم نے چوری کی!!
چھی چھی تم نے چوری کی!!
ایکی تم نے چوری کی!!!
چھی چھی تم نے چوری کی!!!

ایکی نے گھڑی میز پر رکھ دی اور ماں
کمرے میں دوڑی دوڑی گئی۔ کمرہ خالی
۔ لیکن وہاں الماری میں بڑی گھڑی رکھی
تھی۔ جو ٹک ٹک، ٹک کر رہی تھی۔ یہاں
اس کو ایسا معلوم ہوا گویا اس کے پہنچتے
گھڑی کہنے لگی ——

ایکی تم نے چوری کی!
چھی چھی تم نے چوری کی!
ایکی تم نے چوری کی!!
چھی چھی تم نے چوری کی!!
ایکی تم نے چوری کی!!!
چھی چھی تم نے چوری کی!!!

اب ایکی گھبرا گئی۔ اس لئے کہ سارے گھر
کو اس کی چوری کا حال معلوم ہو جائے گا۔
کہ اس نے چوری کی ہے۔ وہ ماں کو تلاش
کرنے کے لئے باہر دوڑی۔ فوراً ہی بازار میں
پہنچی۔ جہاں شہر کا سب سے اونچا گھنٹہ گھر
تھا۔ جس سے لوگ وقت معلوم کیا کرتے
تھے۔ اس میں ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔
ایکی کے پہنچتے ہی گھڑی کی زوروں سے آواز نکلی۔

ایکی تم نے چوری کی!
چھی چھی تم نے چوری کی!
ایکی تم نے چوری کی!!
چھی چھی تم نے چوری کی!!
ایکی تم نے چوری کی!!!
چھی چھی تم نے چوری کی!!!

ایکی نے گھبرا کر گھڑی کی طرف دیکھا۔
اب کیا تھا؟ اب تو سارا لوگ یہ جان جائے گا

بقیہ صفحہ ۹ پر دیکھئے

راشد حسن قادری

چین میں اسلام

چین کی تاریخ میں اسلام کے رائج ہونے کے متعلق دو باتیں مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ چین کے "تان" خاندان کے بادشاہوں کے زمانے میں بادشاہِ وقت "تا ئے جون" نے ایک نمائندہ مدینہ منورہ بھیجا کہ کوئی آدمی اسلام کی تبلیغ کرنے کے لئے روانہ کیا جائے۔ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ایک مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص کو چند مسلمانوں کے ہمراہ اسلام کی اشاعت کے لئے چین روانہ کیا۔ یہ لوگ چین کے بندرگاہ "گوانجو" میں اترے۔ وہاں سے "چان ان" گئے۔ جو اس زمانے میں دارالحکومت تھا۔ بادشاہ "تا ئے جون" سے ملے۔ بادشاہ نے مسلمانوں سے اسلام کے متعلق سوالات کئے۔ جن کا جواب حضرت سعد بن ابی وقاص نے نہایت عمدہ طریقے سے دیا۔ بادشاہ نے کہا کہ یہ دین مشکل معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ پانچ وقت نماز پڑھنا ہر سال ایک مہینے کے روزے رکھنا، حج کے لئے مکہ معظمہ کا سفر کرنا اور زکواۃ دینا لوگوں کے لئے مشکل ہوگا۔ لیکن آپ لوگوں کو اجازت ہے کہ ملک چین میں اپنے مذہب کی تبلیغ اور اشاعت کریں

بادشاہ نے یہ بھی حکم دیا کہ پایۂ تخت "چان ان" میں مسلمانوں کے لئے مسجد تعمیر کی جائے۔ ملک چین میں یہ پہلی مسجد تھی جو اس وقت تک باقی ہے۔

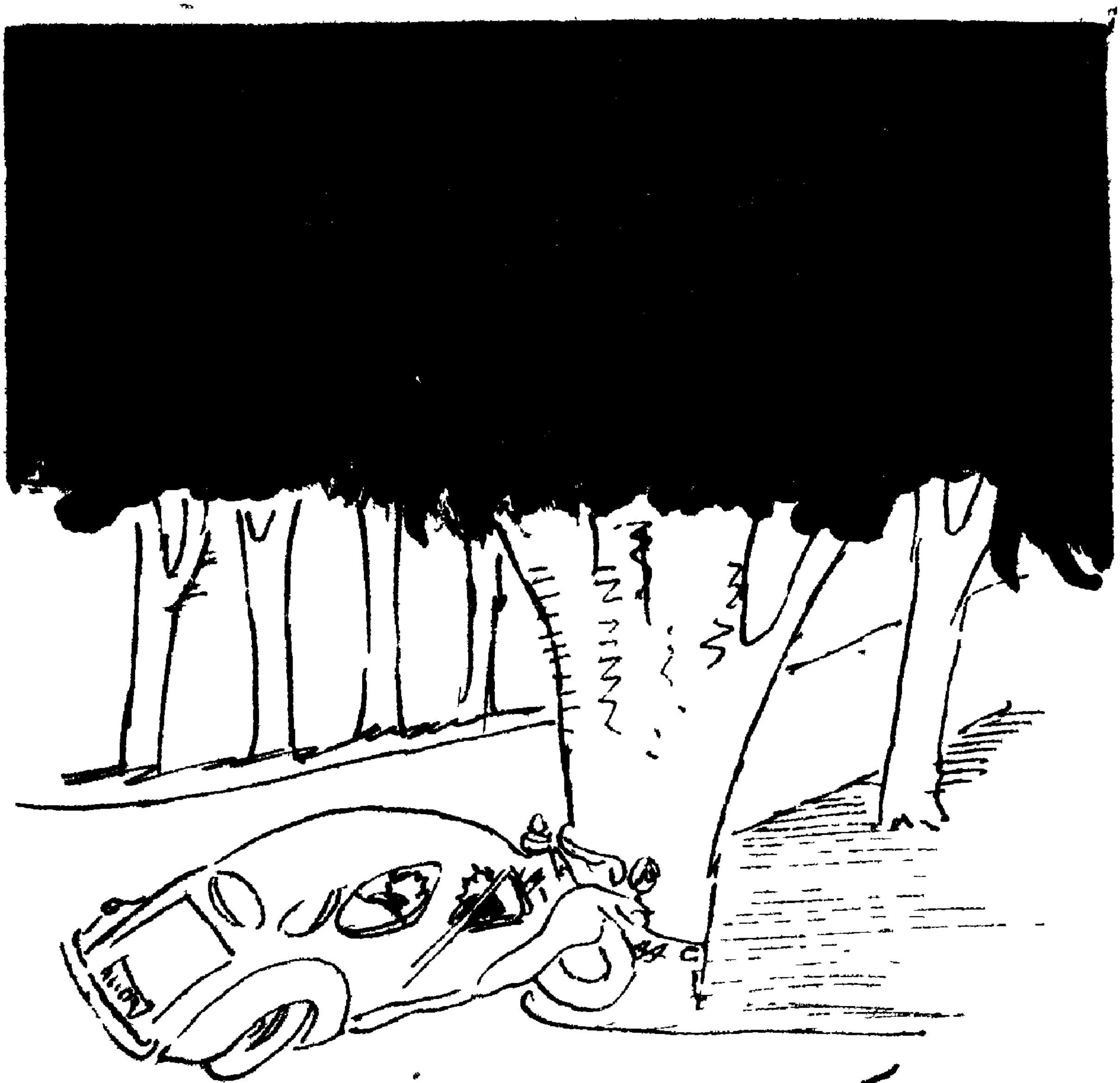
چین میں ایک عرصہ قیام کرنے اور اسلام کی اشاعت کرنے کے بعد حضرت بن ابی وقاص نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ واپس جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن بندرگاہ "کوانچو" پہونچکر حضرت سعد کا انتقال ہوگیا۔ وہ وہیں دفن ہوئے۔ بادشاہ کے حکم سے ان کا مقبرہ بنا اور ایک مسجد تعمیر کی گئی جو آج تک موجود ہے اس مسجد اور مقبرہ کا نام چینی زبان میں "خوسہ تن شی" ہے یعنی "پیغمبر اسلام کی یاد اور محبت کی یادگار مسجد اور مقبرہ۔"

چین میں اسلام کے پھیلنے کے بارے میں دوسرا بیان یہ ہے کہ "تان خاندان کے بادشاہ "سوزون" کی بادشاہت کے زمانے میں ملک چین میں دو شخص باغی ہوگئے تھے۔ بادشاہ نے بغاوت کو روکنے اور باغیوں کو گرفتار کرنے کے لئے حکومت ترکستان سے مدد چاہی۔ حکومت ترکستان نے آٹھ ہزار کا لشکر چین روانہ کردیا بادشاہ "سوزون" نے اس لشکر کی مدد سے ان باغیوں پر فتح پائی اور ان کو ہلاک کردیا اس کے بعد بادشاہ نے لشکر سے دریافت کیا کہ تم لوگ ترکستان جانا چاہتے ہو یا چین میں رہنا پسند کرتے ہو۔ انھوں نے چین کو اپنا وطن بنانا پسند کیا۔ بادشاہ نے اجازت دے دی اور لشکر کے آٹھ ہزار آدمی جو سب کے سب مسلمان تھے۔ راجدھانی "چان ان" میں رہنے لگے۔ بادشاہ نے لشکر کے ہر ایک شخص کے لئے ضرور سہولتیں اکٹھا کر دیں۔ اس طرح مسلمانوں کے خاندان کے خاندان آباد ہو گئے اور اسلام کو چین میں بڑی ترقی ہوئی۔

اس وقت چین میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ ہے اور تمام چین میں پانچ ہزار سے زیادہ مسجدیں ہیں۔

چین میں حضرت عائشہ صدیقی رضی اللہ عنہا کی پیدائش کے روز تمام مسلمان عورتیں عید کی سی خوشی مناتی ہیں اور عورتوں کی خاص مسجد میں جاکر نماز پڑھتی ہیں اور اس روز گھر گھر روٹی اور حلوا پکتا ہے۔ ہمارے پیارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی

بقیہ صفحہ ۳۱ پر دیکھئے

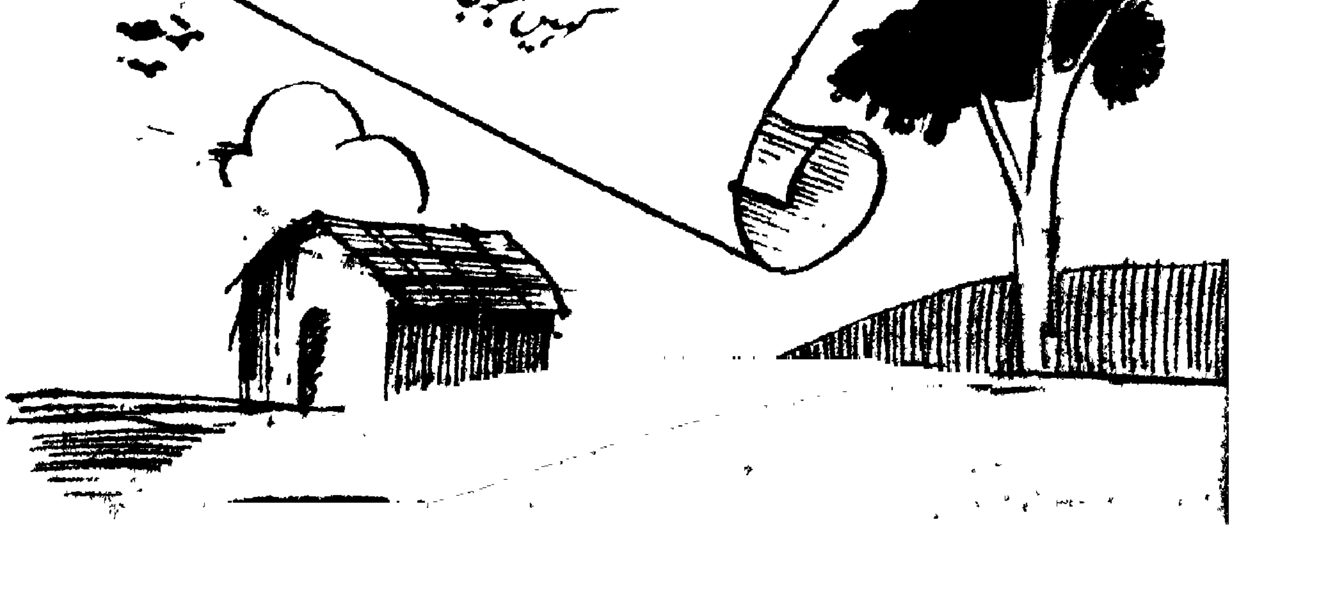


کمبختوں نے یہ درخت بھی کہاں لگایا۔

نئے سال کی دعا

شفیع الدین نیّر

خدایا نئے سال کا یہ اثر ہو
خوشی اور مسرت کا حاصل ثمر ہو
خوشی کی خوشی ہر طرف چھا رہی ہو
فضا میں نیا نور برسا رہی ہو
خوشی کے کھلیں پھول سارے جہاں میں
رہیں سب ہی شاداں وہاں تو یہاں میں
نہ سستی کبھی بھی شکل اپنی دکھائے
نہ دن کام کا کوئی بیکار جائے
پڑھائی لکھائی کا ہو کام پورا
کسی کام کو بھی نہ چھوڑیں ادھورا
نہ بیماریاں آ کے ہم کو ستائیں
نہ ناداریاں دل پہ بجلی گرائیں
موافقت بڑھانا ہی بس کام اپنا
محبت کی دنیا بنے دیس اپنا
یہ نیّر کی باتیں نہ دل سے بھلائیں
کہیں جو بھی اس سال وہ کر دکھائیں



بچوں کی کوشش

چالاک دوست

اکبر اور ماجد دو دوست تھے۔ ان میں سے اکبر ذرا شریر تھا۔ وہ ہر وقت نت نئی شرارت کرتا رہتا تھا۔ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے ساتھ اسکول جاتے اور ساتھ ہی کھیلتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے اکبر نے ماجد کو نہیں دیکھا۔ تلاش کی پر نہیں ملا۔ ناچار ماجد کے گھر کا راستہ لیا اور لگا پکارنے "ماجد۔ ماجد" پر اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب جو اکبر کو شرارت سوجھی تو جھٹ چاک کا ٹکڑا اٹھاکر دروازے پر موٹے حروف میں "احمق" لکھ دیا اور یہ جا وہ جا۔

دوسرے روز اس کی ملاقات ماجد سے ہوئی۔ وہ طنز آمیز لہجے میں بول اٹھا "ماجد! تم نے دیکھا کہ تمہارے دروازے پر کیا لکھا تھا"

ماجد نے ہوشیاری سے جواب دیا۔

"جی ہاں، کیوں نہیں۔ جناب کا اسم شریف تو لکھا تھا۔"

(عابد حمید الحلیم خاں لدّانی)

نٹ کھٹ لڑکا

کسی شہر میں ایک لڑکا اپنے ماں باپ کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ وہ بے حد شریر اور نٹ کھٹ تھا۔ ہمیشہ نئی نئی شرارتیں سوچتا رہتا تھا۔ جب وہ بڑا ہوا تو بھی اس کی شرارتیں کم نہ ہوئیں۔ آخر باپ نے تنگ آکر اس کو ایک کارخانے میں نوکر رکھا دیا۔ ماں اسے بے حد محبت کرتی تھی۔ لڑکے نے دو تین دن تو دل لگا کر کام کیا لیکن پھر اس کا دل نہ لگا۔ وہ دن بھر گھومتا پھرتا اور دوپہر کو باپ سے چھپ چھپا کر کھانا کھا جاتا۔ اور باپ سے یہی کہتا کہ وہ کام پر جاتا ہے۔ شام کے وقت وہ ماں سے پیسے لے کر باپ کو دیدیا کرتا تھا۔ اس کا باپ یہ سمجھتا کہ اب اس کا بیٹا لائق ہوگیا ہے اور وہ کام پر جاتا ہے مگر اسے تیسرے دن یہ معلوم ہوگیا۔ جب شام کو بیٹے نے پیسے رکھے تو باپ نے اٹھاکر باہر پھینک دئے۔ اس کی ماں نے اس سے کہا کہ بیٹا اب تجھے کام پر جانا چاہیئے۔ اب تو لڑکے کے سمجھ

میں آگیا اور وہ پھر کام پر گیا۔ اس نے دن بھر محنت کی اور مزدوری لے کر شام کو باپ کے ہاتھ پر پیسے رکھ دیئے۔ اس کا باپ تو غصے میں بھرا بیٹھا تھا اس نے پھر پھینکنے کا ارادہ کیا تھا کہ بیٹا چلّا اٹھا: ابّا جان آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ آپ ان پیسوں کو مت پھینکئے۔ یہ میری محنت کی کمائی ہے۔ مجھے بہت دکھ ہوگا۔" اب اس کا باپ سمجھ گیا کہ یہ پیسے یقیناً اس نے محنت کر کے کمائے ہیں۔ اسی لئے اس نے یہ روپیئے نہیں پھینکے۔

(کے، ایم سلیم ودہرہ)

جھوٹا نوکر

ایک امیر آدمی کا نوکر بہت جھوٹ بولا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے تنگ آکر نوکر سے کہا:۔
"بابا میں تمہیں چھ مہینے کی چھٹی دیتا ہوں تم جاؤ اور جھوٹ بولنے کی عادت چھوڑ آؤ" نوکر نے کہا: بہت اچھا" نوکر اپنے آقا سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔ چھ مہینے کے بجائے سال بھر کے بعد پھر آقا کے پاس آیا۔

آقا۔ "کہو اب تو جھوٹ بولنے کی عادت چھوڑ آئے"

نوکر۔ "جی ہاں حضور اب میں بالکل جھوٹ نہیں بولتا"

آقا۔ "مگر تم کو آنے میں اتنی دیر کیوں ہوئی؟"

نوکر۔ "حضور جب میں آرہا تھا تو راستہ میں ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔ میں نے اتفاق سے راستہ میں ایک جگہ سر جو اٹھایا تو ایک صندوقچی میری آنکھ میں آپڑی۔ بڑی مشکلوں سے آنکھ میں سے نکالا۔ اب کھول کر جو دیکھا تو اس کے اندر چالیس اونٹ تھے۔ راستہ میں ایک بڑھیا ملی تو میں نے اس کو دے دئے۔

آگے چلا تو ایک جنگلی ہاتھی نے میرا پیچھا کیا۔ میں وہاں سے بھاگا۔ راستہ میں ایک لوٹا پڑا تھا۔ میں ہاتھی کے ڈر سے اس میں گھس گیا۔ مگر وہ ہاتھی شریر تھا اس میں گھس گیا۔ یہ حال کہ میں لوٹے کی ٹونٹی کے راستہ نکلتا ہوں تو وہ اُسی کے راستہ گھستا ہے۔ خیر مجھے

پاکر بڑی پھرتی کے ساتھ میں ایک درخت پر چڑھ گیا وہ بھی میرے پیچھے ہو لیا۔ میں ٹہنی پر ہوں تو وہ پتوں پر ہے۔ میں پتوں پر ہوں تو وہ ٹہنی پر ہے۔ غرض بڑی مشکلوں سے آپ تک آیا ہوں "

امیر نے کہا " ہمیں تو یقین نہیں آتا کہ ایسا ہوا ہوگا مگر یقین ہی کرنا چاہئیے کیونکہ اب تم جھوٹ بولنا چھوڑ کر آئے ہو "

نجم الدین فاروقی درجہ ہشتم بھول محل اسکول بھوپال

شریر لڑکا

ایک لڑکا تھا۔ اسے مٹھائی کھانے کا بہت شوق تھا۔ اس کے والد جب دفتر سے واپس آتے تو مٹھائی ضرور لاتے تھے جسے اکثر وہ اکیلا ہی چٹ کر جاتا۔ ایک روز چند مہمان آنے والے تھے۔ ان کے لئے صبح ہی چیزیں منگائی گئیں۔ لڑکے کو اپنی بہن سے معلوم ہوگیا کہ مہمانوں کے لئے مٹھائی منگائی گئی ہے۔ لڑکا اپنی ماں کے پاس گیا اور اس نے مٹھائی مانگی۔ ماں نے کہا۔ بیٹا وہ تو مہمانوں کے لئے ہے۔ شام کو تمہارے ابا لائیں گے تو کھا لینا۔ مگر لڑکا نہ مانا اور ضد کرنے لگا۔ ماں نے کافی بُرا بھلا کہا اور تاکید کر دی کہ آئندہ مجھ سے مٹھائی ہرگز نہ مانگنا لڑکا اس وقت تو چپ چاپ ہوگیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد اٹھا اور الماری سے تمام مٹھائی نکال کر کھا گیا۔ ماں نے جب کسی کام کے لئے الماری کھولی تو مٹھائی نہ پاکر پہلے تو حیران ہوئی پھر خیال آیا کہ کہیں بیٹا نہ چٹ کر گیا ہو۔ بیٹے کو بلا کر پوچھا تو اس نے جواب دیا امی جان آپ ہی نے تو کہا تھا کہ مجھ سے مٹھائی نہ مانگنا۔ میں نے مٹھائی مانگی نہیں بلکہ خود اٹھا کر کھالی۔ ماں لڑکے کے جواب پر ہنس دی اور اس کا قصور معاف کر دیا۔ مگر آئندہ کے لئے نصیحت کر دی کہ " دیکھو بیٹا اس طرح کوئی چیز چھپا کر نہیں کھاتے "

(جاوید اشرف)

"نصیحت کا اثر"

رمضان کا مہینہ تھا۔ برف کی دوکان پر کافی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ہر ایک اس فکر میں تھا کہ اسے پہلے ملے۔ یہاں تک، کہ لڑائی جھگڑے تک کی نوبت آگئی۔ شکیل قریب ہی کھڑا یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک صاحب گھبرائے ہوئے آئے اور بھیڑ چیر کر گھسنے لگے۔ پیسہ نکالتے وقت ان کی جیب سے سو روپئے کا نوٹ نکل کر زمین پر گر گیا۔ انھیں نوٹ کے گرنے کی خبر نہ ہوئی شکیل کی نظر اس نوٹ پر پڑی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے شکیل نے نوٹ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب تو عیش ہو گئے۔ یہ خیال آتے ہی اس کی نظروں کے سامنے ماسٹر صاحب کی تصویر پھرنے لگی۔ جو بہت ہمدردی سے کہہ رہے تھے "میرے پیارے بچو! تم میں سے کچھ بچے آگے چل کر ملک کے رہنما ہوں گے۔ اچھے لڑکوں کو جھوٹ نہیں بولنا چاہئیے ہمیشہ سچ بولنا چاہئیے۔ اچھے اچھے کام کرنے چاہئیں ایمانداری ہماری سب سے بڑی دولت ہے۔ دوسروں کی چیزیں سونا ہی کیوں نہ ہو، اسے مٹی سمجھنا چاہئیے۔

یہ جملہ بار بار اس کے دماغ میں گردش کرنے لگا۔ اتنے میں وہ صاحب برف لیکر واپس آئے۔ شکیل نے اپنی جیب سے نوٹ نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔ وہ صاحب تعجب سے پوچھنے لگے" یہ روپیہ مجھے کیوں دے رہے ہو؟" شکیل نے کہا" یہ نوٹ آپ کی جیب سے گر گیا تھا آپ ہی کا ہے" وہ صاحب روپیہ لیتے ہوئے بولے" بیٹا تمہارا نام کیا ہے؟ اور کس اسکول میں پڑھتے ہو؟" "مجھے شکیل کہتے ہیں۔ میں نیو ایم، ای، اسکول میں پڑھتا ہوں" یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور مسکراتے ہوئے چلے گئے۔ اگلے دن سب درجوں میں نوٹس آیا اس کے مطابق سب اسکول کے ایک بڑے ہال میں جمع ہو گئے۔ میں ہیڈ ماسٹر صاحب کی میز کے سامنے کھڑا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اٹھے۔ اور میری تعریفوں کا پل باندھنے لگے۔ اور کل کا قصہ سب کو سنایا۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا جن صاحب کا نوٹ گرا تھا وہ ہیڈ ماسٹر صاحب کے بھائی تھے۔

(کیفی جمشید پوری)

میز پوش کا خوبصورت کونا



عذرا خانم

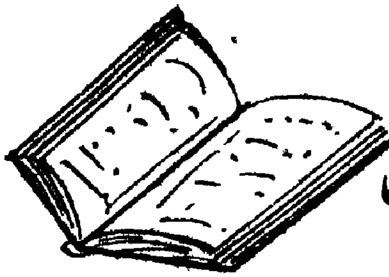
بھید کی بات



احمد اور سعید دو دوست تھے۔ ایک بار وہ ایک ساتھ سفر کر رہے تھے۔ راستہ میں ان کو ایک ریچھ ملا۔ ریچھ کو دیکھتے ہی سعید پاس والے درخت پر چڑھ گیا۔ اور وہیں چھپ کر بیٹھ گیا۔ احمد نے دیکھا کہ وہ اکیلے ریچھ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے اور کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ سڑک پر لمبا لمبا لیٹ گیا۔ اس نے کسی سے سنا تھا کہ ریچھ کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ مردہ جسم کو بالکل نہیں چھوتا۔ یہ خیال آنا تھا کہ اس نے روک روک کر سانس لینا شروع کر دیا۔

ریچھ نے جب احمد کو اس طرح پڑا پایا تو وہ اس کے قریب آ گیا اور لگا اُسے سونگھنے۔ اب احمد کا حال نہ پوچھئے کہ کیا ہوا۔ ڈر کے مارے، کاٹو تو خون نہیں بدن میں، اندر کا سانس اندر، اور باہر کا باہر رہ گیا۔ وہ تو یہ ہی سمجھا کہ اب ریچھ اس کو جان سے ہی مار ڈالے گا۔ مگر ریچھ فوراً ہی منہ اٹھا کر دوسری طرف چل دیا۔ وہ یہ سمجھا کہ کسی مردے کی لاش پڑی ہے۔

بقیہ صفحہ ۱۸ پر دیکھیے



نظموں کی ایک اچھی کتاب

"پیاری نظمیں"

ناشر۔ ادارہ فکروفن ۔ رحیم آباد، لکھنؤ۔ قیمت پانچ آنے ۔
مصنف ۔ اخگر مشتاق ۔

اخگر مشتاق صاحب کی آٹھ دلچسپ نظموں کا مجموعہ ہے۔ جن میں سے کئی ایک پیام تعلیم چھپ چکی ہیں اور پیامیوں نے انھیں پسند بھی کیا ہے۔ ان نظموں کی زبان بہت آسان ہے، کے اعتبار سے بھی یہ نظمیں بچیوں اور بچوں کی دلچسپی کا سامان رکھتی ہیں۔

بچوں کے لئے نظمیں لکھنا آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے زمانے میں بھی جب بقول ظریف لکھنوی مرحوم، تعلیم یافتہ تو سات فی صدی ہیں مگر شاعر اسّی فی صدی، ایسے شا کی بڑی کمی محسوس کیجا رہی ہے جو صحیح معنوں میں 'بچوں کے شاعر' کہلائے جا سکتے ہوں۔ بلاشبہ 'پیاری نظمیں' کے مصنف جناب اخگر مشتاق کا شمار ان شاعروں میں کیا جا ہے۔ جنھیں "بچوں کا شاعر" کہا جائے۔ اخگر صاحب۔ ایک نوجوان شاعر ہیں لیکن ان کے کلام میں پختگی پائی جاتی ہے۔ ان کے نظموں کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھیں بچوں کی دلچسپیاں اور ان کی زبان کا خیال ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ کتاب مقبول ہوگی اور پیامی بھائی بہنیں بھی اسے پڑھنا پسند کریں گے۔

ولی شاہجہانپوری

تاریخ ہند کی کہانیاں

حصۂ اول

پرانے زمانے کے بادشاہوں کے حالات بہت دلچسپ انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ قیمت چھ آنے

حصۂ دوم

مسلمان بادشاہوں کے عروج و زوال کی کہانی بہت آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ قیمت دس آنے

حصۂ سوم

اس حصے میں مغلوں کے آخری اور زبردست بادشاہ اورنگ زیب کے بعد سے ۱۸۵۷ء تک کے تمام حالات درج ہیں۔

قیمت دس آنے

محنت (ڈراما)

ایک مالدار مگر کاہل اور دوسرے غریب مگر محنتی آدمی کی زندگی کا ڈراما

قیمت سات آنے

پریم کی جیت (ڈراما)

پریم اور محبت کے برتاؤ سے شریر بدھو بھی نیک لڑکا بن گیا۔

قیمت چار آنے

مذہبی کتابیں۔

ہمارے نبی	٦ر	ہمارے رسول	١٢ر
آنحضرت	٨ر	خلفائے اربعہ	عہ/
عقائد اسلام	٨ر	ارکان اسلام	٦ر
نبیوں کے قصے	١٤ر	مسلمان بیبیاں	١٢ر

بچوں کا کھلونا (نظم)

نیرؔ صاحب کی ۳۱ اچھی اچھی نظموں کا مجموعہ

قیمت بارہ آنے

مزیدار پہیلیاں

چٹ پٹی پہیلیوں کی سب سے دلچسپ کتاب

قیمت دس آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی

پیامی معمّا نمبر ۷ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل — دائیں سے بائیں	صحیح حل — اوپر سے نیچے
۱۔ نواب	۱۔ نون
۲۔ جکڑ	۲۔ شہرت
۳۔ کٹری	۳۔ نانی
۸۔ گانا	۴۔ رونا
۹۔ نام	۵۔ منیم

صحیح حل صرف دو موصول ہوئے لہٰذا پہلا انعام مبلغ سات روپے دو حضرات پر ساڑھے تین روپے فی کس تقسیم کر دیے گئے۔

۱۔ اقبال احمد خاں صاحب۔ محلہ چوک۔ لکھنؤ۔ ۲۔ محمد شفیع صاحب۔ نیو ہوٹل۔ کلکتہ

دوسرا انعام ایک غلطی والا صرف ایک حل موصول ہوا۔

عبدالرحمٰن معرفت فضل الرحمٰن۔ نزد گھنٹہ گھر۔ کاسگنج

تیسرا انعام دو غلطی والے چھ اشخاص پر بحساب ۸ر آنے فی کس تقسیم کیا گیا۔

۱۔ سراج الدین۔ پٹنہ ۲۔ شہزاد محمد خاں۔ جبل پور ۳۔ مسٹر شمس رشید۔ جگن ناتھ پوری ۴۔ سید کلیم اللہ۔ عثمان آباد۔ ۵۔ نور محمد۔ محبوب بیگ۔ باگلکوٹ۔ ۶۔ اجیت سنگھ۔ اناوہ

نوٹ:۔ پیامی معمّوں سے دلچسپی لینے والے حضرات مندرجہ ذیل چار باتوں کا خیال ضرور رکھیں۔

۱۔ ٹکٹ کسی کاغذ پر ہرگز نہ چپکائیں۔

۲۔ پتہ پر معمّا نمبر ضرور لکھیں۔

۳۔ حل بھیجنے کے لئے آخری تاریخ کا انتظار نہ کریں۔

۴۔ معمّے کے بارے میں ہر قسم کی شکایت ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک ضرور آجانی چاہیئے۔

۲۰ روپے کے نقد انعامات

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں

فیس داخلہ ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں

داخلہ کی آخری تاریخ ۲۰ جنوری ۵۳ء ہے

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر مبلغ بارہ ۱۲ روپے۔ دوسرا انعام ایک غلطی پر مبلغ آٹھ روپے

دائیں سے بائیں

۱۔ جھوٹ بولنا بری ــــ ہے۔

۴۔ مریض کا ــــ ہوجانا تشویش کا باعث ہوتا ہے۔ (زرد۔ سرد)

۵۔ کبھی کبھی اس کا تبدیل کردینا مریض کے لئے مفید بھی ہوتا ہے۔ (دوا۔ قضا)

۶۔ جو لوگ ــــ کو معلوم کئے بغیر کام نہیں کرتے وہ ہمیشہ زندگی میں کامیاب رہتے ہیں (احکام۔ انجام)

۷۔ جمہوریت تو ــــ کے ہی زمانے میں تھی (اکبر۔ بابر)

اوپر سے نیچے

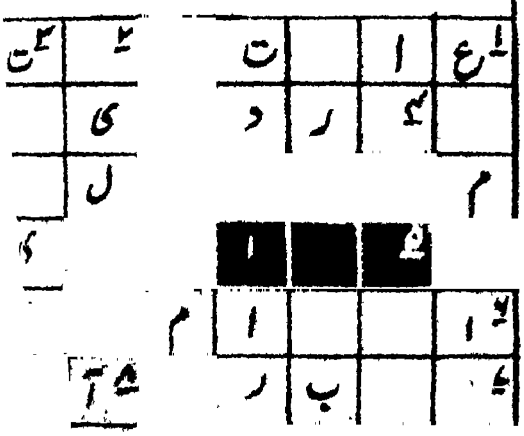
۱۔ ایک ایسی دولت جسے چور بھی نہیں چرا سکتا۔

۲۔ بعض لوگ ــــ میں ہی ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ (ریل۔ جیل)

۳۔ قوموں کی ترقی کا راز اس میں ہے۔ (تنظیم۔ تعلیم)

۸۔ انسان اس کی زد میں آکر کم ہی بچتا ہے (آگ۔ آب)

پیامی معمہ نمبر ۱۹



کوپن پیامی معمہ نمبر ۱۹

نام ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ

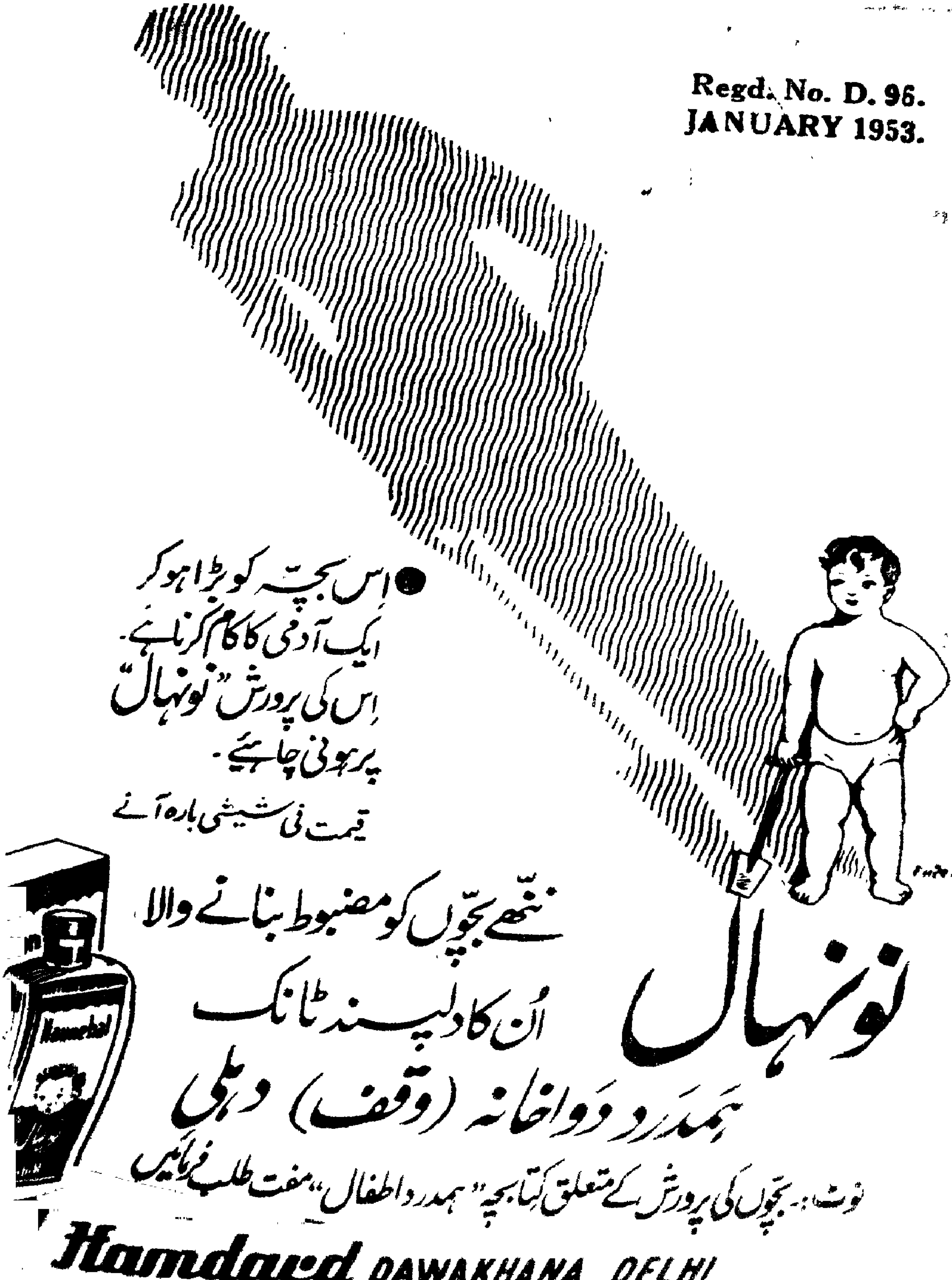
پتہ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ

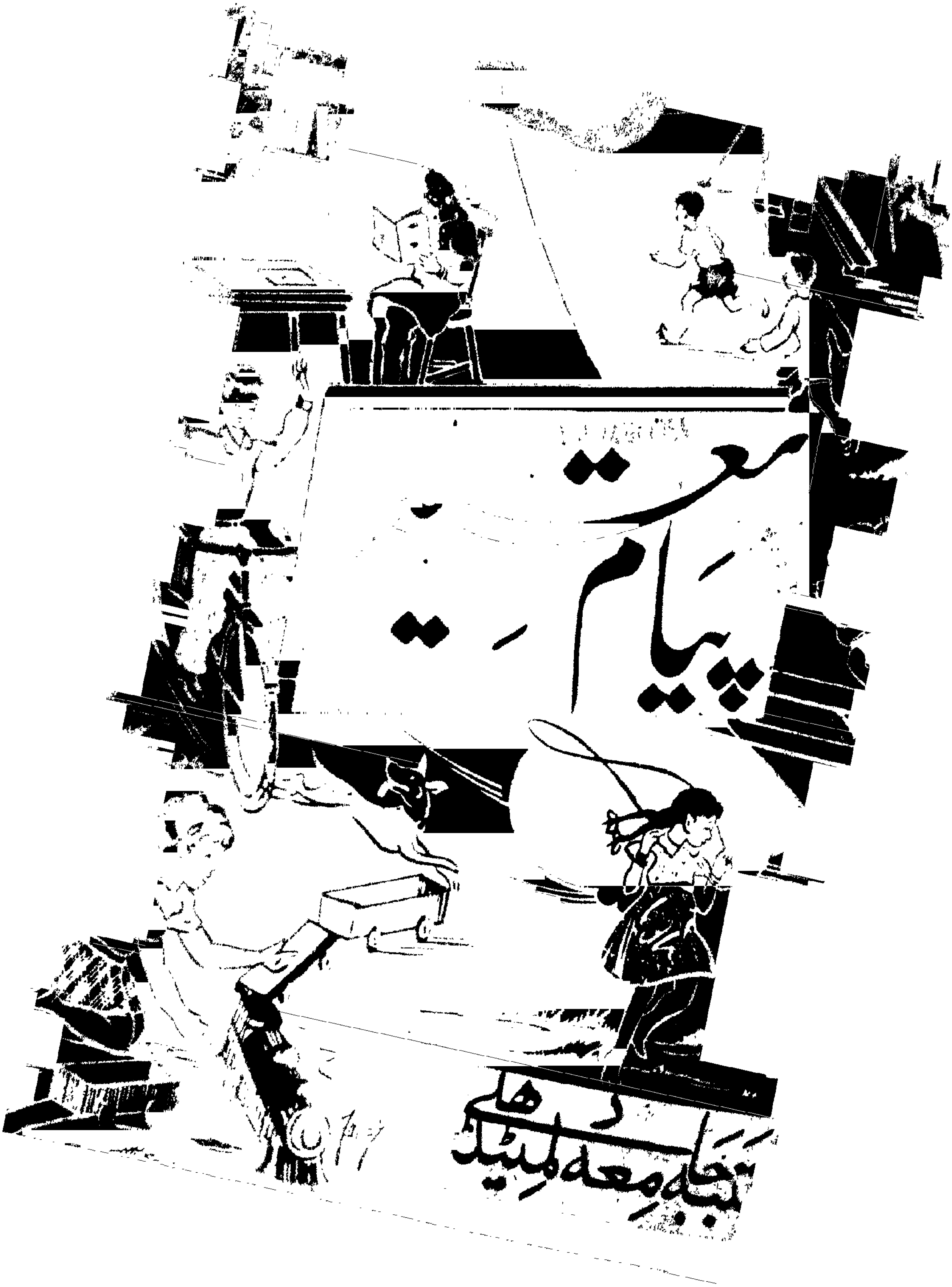
پرنٹر پبلشر حامد علی خاں



بیگم قدسیہ زیدی کہانیوں کے مقابلے میں
انعام پانے والے بچوں کے ساتھ

Regd. No. D. 96.
JANUARY 1953.




پیام



میں نے دیکھا اندھا نرا کندھے اوپر کاٹھ کا گھر
بارہ کوس کی منزل کرے، پھر وہ گھر کا گھر میں رہے

پیام تعلیم

مارچ سنہ ۱۹۵۳ء

ادارہ:- حامد علی خاں بی، اے (جامعہ)
اطہر پرویز ایم، اے (علیگ)

سالانہ چندہ
چار روپے
فی پرچہ
چھ آنے

فہرست





ہولی ہمارے دیس کا بہت بڑا تیوہار ہے۔ جو رنگ ڈال کر بھی منایا جاتا ہے اور گندگی پھینک کر بھی۔ ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی جامعہ میں خوب ہولی کھیلی گئی۔ ادھر ہولی کا جلوس نکلا اور اُدھر سب کے کپڑے رنگ میں تر مگر ایک گھنٹے کے اندر سب نہا دھو کر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ ہولی کے آتے ہی موسم بدل گیا۔ جاڑا اپنے موٹے موٹے لحاف، کمبل لے کر جا رہا ہے۔ اور کیوں نہ جائے، آخر گرمی جو آگئی۔ اب تو گرم کپڑے کے نام ہی سے گرمی لگتی ہے۔ باریک کپڑے پہننے کے دن آگئے۔ نہر میں نہانے کی باتیں ہونے لگیں دن بھی بڑا ہونے لگا۔ اب تو سورج بھی اونچا ہوتا نظر آ رہا ہے۔ الغرض گرمی کی آمد آمد ہے۔

کچھ دن پہلے مدرسہ ابتدائی میں "ایک دن کا مدرسہ"

ہیں بچّے ہی طالب علم تھے اور بچّے ہی اُستاد۔ یہاں تک کہ دفتر کا کام بھی طالب علم کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ گھنٹا بجانے سے لے کر تالیق کا کام بھی بچّوں ہی کے سپرد تھا۔ اس دن تمام اُستاد پک نک منانے چلے گئے تھے۔ لیکن بچّے اپنے کام کو اتنی اچھی طرح کر رہے تھے کہ ستادوں کے نہ ہونے کا خیال بھی نہ آیا۔ نگران مدرسہ جناب آزاد رسول صاحب کی جگہ ابتدائی کے ایک طالب علم حبیب حسان صاحب کام کر رہے تھے۔ اُن کی نگرانی میں دن بھر مدرسے کا کام چلا۔

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جو بچّے پڑھا رہے تھے۔ اُن کے پڑھانے کا انداز ایسا تھا گویا وہ ہمیشہ ہی سے وہاں اُستاد رہے ہوں۔ ہم مدرسے کے بچّوں کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ اگر اُن پر بھروسہ کیا جائے تو وہ اپنی ذمے داری سوس کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ہم اُستاد صاحبان کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ن کی کوششوں سے تعلیم کا کام اتنی اچھی طرح ہو رہا ہے کہ بچّے اپنا رسہ بھی چلا لیتے ہیں۔

اب جامعہ میں "کھلی ہوا کے مدرسے" کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس بار ررسہ حوض خاص پر ہوگا۔ یہاں نہ تو کلاس کے کمرے ہوں گے اور نہ بورڈنگ س۔ دن بھر بچّے کھلی ہوا میں پڑھیں گے۔ رات کو کیمپ فائر میں حصّہ لیں ر اور پھر اپنے درجوں کے خیموں میں سو جائیں گے۔ ہمیں یقین یہ مدرسہ بھی پچھلے سال کی طرح کامیاب ہوگا۔

اطہر پرویز



شیکسپیئر

ولیم شیکسپیئر کا نام آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ آئیے آج ہم آپ کو اس کی زندگی کی کہانی سنائیں اگر انگریز اس بات پر فخر کریں کہ ان کے یہاں دنیا کا سب سے بڑا ڈراما لکھنے والا پیدا ہوا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ آج ساری دنیا کے لوگ شیکسپیئر کی عظمت کو مانتے ہیں۔

ولیم شیکسپیئر اب سے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے ملکہ ایلزبیتھ کے زمانے میں ایک چھوٹے سے گاؤں اسٹریٹفورڈ میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں ایون ندی کے کنارے بسا ہوا ہے۔ اس کا باپ بہت غریب آدمی تھا۔ وہ اون کا چھوٹا موٹا کاروبار کرتا تھا۔ اس نے اپنے لڑکے کو ۱۴ سال کی عمر تک تھوڑی اچھی تعلیم دی۔ مگر پھر اس کی آمدنی اتنی گھٹ گئی کہ شیکسپیئر کو اپنی تعلیم چھوڑنی پڑی۔ لیکن وہ اتنا ذہین تھا کہ گاؤں کے لوگ اس کی ذہانت کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔

بچپن ہی سے اسے ناٹک اور تماشوں سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس نے تھیٹر کمپنی میں نوکری کر لی۔ نوکری مل تو گئی مگر کیسی؛ جو لوگ اپنے گھوڑوں پر کھیل دیکھنے آتے۔ وہ ان کے گھوڑوں کی نگرانی کرتا۔ اس کے علاوہ اسی طرح کے اور چھوٹے موٹے کام بھی کرتا۔ اس کے ذمّے پارٹس بانٹنے، اور ایکٹروں

کے کپڑے اِدھر سے اُدھر لے جانے کا کام بھی تھا۔ مگر بے چارا اس طرح کے کام کرنے پر مجبور تھا۔ اس زمانے میں انگلستان میں اسٹیج ایسا تو تھا نہیں جیسا کہ آج کل ہے۔ بلکہ ایک کھلے میدان میں لکڑی کے تختے کا اسٹیج بنایا جاتا تھا۔ اور تماشہ دیکھنے والے کھلی جگہ بیٹھ کر کھیل دیکھتے تھے۔

۱۵۹۲ء میں شیکسپیر نے لندن کا رُخ کیا اب اس کی عمر ۲۰ سال کی تھی۔ یہاں آکر اس نے ڈرامے میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ ڈرامے لکھنے بھی شروع کر دئے۔ یہ ڈرامے عوام میں بے حد پسند کئے گئے۔ اس کے ڈرامے کی خوبی یہ تھی کہ پڑھے لکھے لوگوں کے علاوہ عام لوگ بھی انھیں پسند کرتے تھے۔

شیکسپیر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے بڑی سے بڑی بات کو بہت آسان طریقہ سے پیش کیا ہے کہ اس کے دیکھنے والے اچھی طرح سمجھ جاتے تھے۔ وہ ہر طبقے اور ہر گروہ کے لوگوں میں مقبول ہوگیا۔ یہاں تک کہ چند روز میں یہ حالت ہوگئی کہ اس کے ڈراموں کا چرچا سارے لندن میں ہوگیا۔ اب تو ہر ایک تھیٹر کمپنی کی یہی خواہش ہوئی کہ شیکسپیر ان کے لئے ڈرامے لکھے۔

اس طرح ۲۵ سال لندن میں رہنے کے بعد وہ اپنے گاؤں واپس آیا۔

لندن کے قیام کے زمانے میں اس نے بڑے اچھے اچھے ڈرامے لکھے جو اس کی اپنی زندگی ہی میں مشہور ہو گئے، عمر کا آخری زمانہ اس نے اپنے گاؤں میں گزارا اب وہ کافی دولت مند بھی ہو گیا تھا۔ اس نے کافی جائداد خرید لی اور آخر عمر تک بڑے آرام سے رہا۔

۱۶۱۶ء میں ۵۲ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوگیا۔

ولیم شکیسپیر نے اپنے ڈراموں کے ذریعے اتنی شہرت حاصل کی جو دنیا کے کم ہی لوگوں کو نصیب ہوئی۔

وینس کا سوداگر

ولیم شیکسپیئر

اٹلی کے ایک شہر وینس میں دو سوداگر رہتے تھے۔ شائلاک اور انٹونیو شائلاک بہت ظالم تھا، لوگوں کو سود پر قرض دیتا اور بڑی سختی سے وصول کرتا۔ اسی لئے لوگ اس سے نفرت کرتے تھے۔ لیکن انٹونیو بڑا رحمدل اور نیک آدمی تھا۔ وہ سود نہ لیتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ وہ شائلاک کو بہت بُرا بھلا کہتا تھا۔

انٹونیو کا ایک دوست بسانیو نامی تھا۔ ایک دن بسانیو، اس کے پاس آیا اور بولا کہ "میں ایک عورت سے شادی کرنا چاہتا ہوں جو نیک دل ہونے کے ساتھ ساتھ دولت مند بھی ہے۔ مگر اس وقت شادی کرنے کے لئے تین ہزار روپوں کی ضرورت ہے۔"

اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت انٹونیو کے جہاز تجارت کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے تھے۔ اور ان میں سے کوئی بھی واپس نہ آیا تھا۔

انٹونیو فوراً شائلاک کے پاس گیا اور اس سے قرض مانگا۔ یہ سُن کر شائلاک نے سوچا کہ اب میں انٹونیو سے بدلہ لوں گا۔ چنانچہ اس نے کہا " تم کئی بار بیچ بازار میں مجھے ذلیل کر چکے ہو، اب میں تم کو کیسے قرض دوں "

انٹونیو نے جواب دیا کہ " شائلاک اگر تم مجھ کو روپیہ دے بھی دو گے تو بھی میں تم کو اسی طرح کہوں گا۔ تم مجھکو دوست نہیں بلکہ دشمن ہی سمجھ کر قرض دو۔ اور جو تاوان چاہے لے لو "

شائلاک نے تھوڑی دیر تو سوچا مگر پھر قرض دینے پر تیار ہو گیا۔ لیکن سود پر نہیں۔ اس نے ایک عجیب و غریب شرط رکھی۔ وہ شرط یہ تھی کہ اگر مقررّہ تاریخ تک روپیہ نہ ادا ہو جائے تو شائلاک کو حق ہو گا کہ انٹونیو کے بدن کے کسی حصے سے آدھ سیر گوشت کاٹ لے۔

انٹونیو اس پر تیار ہو گیا۔ بسانیو نے بہت منع کیا مگر وہ نہ مانا اور اس نے شرط منظور کر لی اور روپیہ لے کر بسانیو کو دے دیا۔

بسانیو جس عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا اس کا نام پورشیا تھا۔ چنانچہ روپیہ حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے دوست گراشیانو کو ساتھ لے کر پورشیا کے یہاں گیا۔

پورشیا اس سے مل کر بہت خوش ہوئی اور باوجودیکہ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ بسانیو کے پاس مال و دولت نہیں ہے تو بھی وہ شادی کے لئے تیار ہو گئی اور اس نے اپنی ساری دولت بسانیو کو دیدی اور اس کے ساتھ ہی ایک انگوٹھی بھی دی جسے بسانیو نے بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔ اس کے بعد گراشانیو کی شادی پورشیا کی خادمہ نرسیا کے ساتھ ہوئی۔

ابھی وہ شادی کی پوری خوشی بھی نہ منا سکے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی ایک خط لے کر آیا جسے پڑھ کر بسانیو کا رنگ فق ہو گیا۔ یہ خط انٹونیو کا

تھا جس میں لکھا تھا کہ " پیارے بسانیو! میرے جہاز سمندر میں تباہ ہو گئے اور قرض ادا کرنے کی مدّت بھی ختم ہو گئی۔ چنانچہ شرط کے مطابق میرا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ میری خواہش ہے کہ میں تم کو ایک بار دیکھ لوں ــــــ"

بسانیو نے پورشیا کو سارا حال کہہ سنایا۔ یہ سن کر پورشیا کو اور بھی افسوس ہوا اس لئے کہ اس کی وجہ سے ہی بچارے انٹونیو کی جان خطرے میں پڑ گئی۔ چنانچہ پورشیا نے بسانیو کو فوراً وہاں سے بھیجا۔ اور کہا کہ " جا کر کسی طرح بھی انٹونیو کی جان بچاؤ۔ اگر بیس گنا رقم دے کر بھی اس کی جان بچ جائے تو ضرور بچاؤ۔"

یہاں سے بسانیو جب وہیں پہنچا تو انٹونیو جیل میں بند تھا اور ظالم یہودی روپیہ لینے پر تیار نہ تھا۔ وہ تو شرط کے مطابق آدھ سیر گوشت لینا چاہتا تھا۔

پورشیا کا ایک رشتہ دار بہت بڑا وکیل تھا۔ اس نے سارا حال اس کو لکھ بھیجا۔ اس سے رائے مانگی اور ساتھ ہی اس کے وکیلوں والے کپڑے بھی۔ چنانچہ ایک قاصد اس کے مشورے کے ساتھ کپڑے بھی لے آیا۔

پورشیا نے خود وکیلوں والے کپڑے پہنے اور اس کی خادمہ نریسا نے کلرک کے کپڑے پہن لئے۔

اس طرح وہ بھیس بدل کر وہیں پہنچے۔ جب مقدمہ ڈیوک کی عدالت میں پیش ہوا تو پورشیا نے ڈاکٹر بالتھازار کے فرضی نام سے انٹونیو کی وکالت شروع کر دی۔ وہیں پر بسانیو بھی موجود تھا۔ مگر پورشیا نے اپنا بھیس کچھ اس طرح بدلا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو نہ پہچان سکا۔

وکالت کرتے ہوئے پورشیا نے لاکھ چاہا کہ شائلاک اپنے ارادے سے باز آجائے مگر شائلاک یہی

کہتا رہا کہ " میں تو شرط کے مطابق آدھ سیر گوشت ہی لوں گا۔" پورشیا نے رحم کی اچھائیوں پر ایک بہت اچھی تقریر کی، مگر شائلاک پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بسانیو اصل رقم سے کئی گنا زیادہ دینا چاہتا تھا مگر شائلاک ٹس سے مس نہ ہوا۔ تب مجبور ہو کر پورشیا نے کہا کہ " اچھا تم انٹونیو کے بدن سے آدھ سیر گوشت کاٹ لو۔"

اب تو شائلاک گوشت کاٹنے کے لئے چھری تیز کرنے لگا۔ پورشیا نے عدالت سے پوچھا کہ " کیا گوشت تولنے کے لئے ترازو تیار ہے؟" اور اس کے ساتھ ہی شائلاک سے کہا کہ " کسی ڈاکٹر کو بھی بلا لو کہیں ایسا نہ ہو کہ انٹونیو کے جسم سے خون بہہ جائے اور وہ مر جائے، آخر شریف آدمی کو کسی کی جان تو نہ لینی چاہئیے۔"

مگر یہودی اپنی بات پر اڑا رہا۔ تب پورشیا کو مجبوراً کہنا پڑا " شائلاک انٹونیو کے جسم کا آدھ سیر گوشت تمہارا ہے، اور تم یہ گوشت کاٹ سکتے ہو" یہ سُن کر شائلاک خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا فوراً بولا " ایک منصف مزاج شخص فیصلہ کرنے آیا ہے انٹونیو اب تیار ہو جاؤ۔"

مگر پورشیا نے فوراً ہی رخ پلٹا اور تیزی سے بولی " ذرا ٹھہرنا، معاہدے کے مطابق تم کو خون کا ایک قطرہ لینے کا بھی حق نہیں ہے۔ اس میں آدھ سیر گوشت لکھا ہے تم نے انٹونیو کے جسم سے

> ## رحم
>
> " رحم کا جذبہ ایسا ہے جیسے آسمان سے زمین پر ابر رحمت برستا ہے۔ رحم ایک ایسی رحمت ہے جو دینے والے اور لینے والے دونوں کو یکساں طور سے مالا مال کرتی ہے۔ یہ بادشاہوں کو ان کے تاج سے زیادہ زیب دیتی ہے۔ کیونکہ یہ خدا کی صفت ہے۔ جب عدل و انصاف رحم میں شامل ہو جاتا ہے تو زمین کی قوتیں خدا سے نزدیک ہو جاتی ہیں ——"
>
> پورشیا
> کی
> ایک تقریر سے

خون کا ایک قطرہ بھی گرایا تو وینس کی حکومت تمہارا سارا مال ضبط کرلے گی۔"

اب یہ بات کیسے ممکن تھی کہ شائلاک گوشت کاٹے اور خون کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکنے پائے۔ پورشیا کی اس دلیل سے سب لوگ حیران رہ گئے۔ اب تو انٹونیو کی جان بچ گئی۔ شائلاک کھسیانا سا ہو گیا۔ بسانیو فوراً بولا "لو شائلاک اب روپیہ لے لو" لیکن پورشیا نے اُسے روک دیا اور کہا "شائلاک کو روپیہ نہیں ملے گا صرف گوشت ملے گا معاہدے میں یہی لکھا ہے۔ شائلاک تم گوشت کاٹنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ بہر حال یاد رکھنا کہ اگر خون کا ایک قطرہ بھی بہایا رتّی بھر گوشت زیادہ کٹا تو وینس کے قانون کے مطابق تم کو موت کی سزا دی جائے گی۔"

اب تو شائلاک بہت گھبرایا۔ بالآخر ڈیوک نے اس شرط پر اس کو معاف کر دیا کہ وہ اپنی آدھی دولت ریاست کو اور آدھی انٹونیو کو دیدے۔

مگر انٹونیو نے کہا کہ "میں اپنے حصے کی دولت اس کو واپس کر دوں۔ بشرطیکہ وہ اسے اپنی بیٹی اور داماد کو دیدے۔"

شائلاک کی ایک لڑکی تھی جس نے ایک عیسائی سے شادی کرلی تھی۔ اسی لئے شائلاک نے اسے اپنی دولت سے محروم کر دیا تھا۔ انٹونیو کی اس شرط کو یہودی نے مان لیا۔ اب تو بسانیو کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے تین ہزار روپے وکیل کو دینے چاہے۔ مگر اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے تو یہ انگوٹھی دیدو جو تم پہنے ہو۔ وکیل کی یہ بات سن کر بسانیو بہت گھبرایا۔ اس لئے کہ اس نے اپنی بیوی سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی کو یہ انگوٹھی نہ دے گا۔ چنانچہ اس نے وکیل سے بھی کہا کہ اور جو چاہے لے لو، مگر یہ مت لو۔ اس پر پورشیا ناراض ہوگئی۔ مگر انٹونیو نے وہ انگوٹھی اسے دلوادی۔ اس طرح نرلیسا نے بھی جو وکیل کا کلرک بنی ہوئی تھی گراشیانو

کی انگوٹھی لے لی۔

اب پورشیا اور نریسا دونوں گھر آئیں اور انھوں نے اپنے مردانے کپڑے اُتار کر زنانے پہن لئے۔ تھوڑی دیر میں انٹونیو اور بسانیو بھی آگئے اور پورشیا کو یہ خبر سنائی۔ سب لوگ بے حد خوش ہوئے ذراسی دیر میں پاس کے کمرے سے گراشیانو اور نریسا کے لڑنے کی آواز آئی۔ جب سب لوگ وہاں گئے تو معلوم ہوا کہ نریسا اس لئے لڑ رہی ہے کہ گراشیانو نے وہ انگوٹھی کسی کو دیدی جو اس نے شادی کے دن دی تھی۔

گراشیانو نے کہا "میرے مالک بسانیو نے اپنی انگوٹھی ایک وکیل کو دی تھی۔ چنانچہ میری انگوٹھی اس کے کلرک نے لے لی۔

اب پورشیا کو بسانیو پر غصہ آیا کہ "میری انگوٹھی تم نے کس کو دے دی۔ حالانکہ وعدہ تو یہ تھا کہ اُسے اپنے پاس ہی رکھوگے"

بسانیو نے اُسے سارا قصہ سنایا۔ مگر اس کا غصہ کم نہ ہوا۔ تب انٹونیو نے بیچ میں پڑکر معاملہ طے کرایا۔ اور پورشیا نے انٹونیو سے کہا "اچھا اب تم یہ انگوٹھی اپنی ذمہ داری پر بسانیو کو دے دو۔ اس سے کہو کہ اسے پہلی انگوٹھی سے زیادہ احتیاط سے رکھے۔"

بسانیو اس انگوٹھی کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ اس لئے کہ یہ وہی انگوٹھی تھی جو اس نے وکیل کو دی تھی۔ تب پورشیا نے سارا حال کہہ سنایا۔ جسے سن کر سب لوگ دنگ رہ گئے۔

پورشیا نے پھر انٹونیو کو ایک اور خوشخبری دی۔ اس نے کچھ خط دئے جس سے معلوم ہوا کہ انٹونیو کے جہاز ڈوبے نہیں بلکہ صحیح سلامت کنارے پر پہنچ گئے۔

یہ خبر سن کر سب اور بھی خوش ہوئے۔

دہلی سے پیرس

مُشتاق بھائی

میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنے سفر کے حالات لکھ کر بھیجوں گا۔ یہ لیجئے دہلی سے پیرس تک کی رام کہانی حاضر ہے۔

مجھے ڈھائی بجے رات کو ہوائی اڈے پر پہنچنا تھا اس لئے رات بھر جاگتا رہا۔ گھر والوں کے ساتھ ساتھ بہت سے دوست اور ساتھی بھی اتنی رات کو مجھے ہوائی اڈے پر چھوڑنے آئے۔ آدمی جب کسی ایسی جگہ پہنچ جائے جہاں وہ کچھ جانتا نہ ہو تو اس کی حیثیت شہر میں آئے ہوئے دیہاتی کی سی ہو جاتی ہے۔ اڈے پر بالکل یہی حال میرا بھی تھا۔ نہ یہ معلوم کہ کسٹم میں کب جانا ہے؟ نہ یہ پتہ کہ پاسپورٹ وغیرہ کی جانچ کہاں ہوگی؟ اس کا بھی علم نہ تھا کہ ہوائی جہاز تک کس راستے سے پہنچنا چاہیئے؟ بس یہ ترکیب سوجھی کہ جدھر بھیڑ جائے اُدھر تم بھی ہو لو۔ اسی پر میں نے عمل کیا۔ چنانچہ تمام مرحلے بخیر و خوبی گزر گئے۔ پھر آکر باہر دوستوں اور بچوں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ سوچا تھا کہ رخصت ہوتے وقت لوگوں کا بہت بہت شکریہ ادا کروں گا۔ یکایک ایک ساتھی نے کہا کہ لوگ ادھر سے اُدھر

جا رہے ہیں "اتنا موقع بھی نہ ملا کہ ہر ایک سے ہاتھ ہی ملا لیتا۔ بس راشد کو گود میں اُٹھا سکا۔ ان کے رونے کی پوری آواز کانوں تک پہنچی بھی نہ تھی کہ میں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اب پیام تعلیم کے ان صفحات کے ذریعہ تمام دوستوں اور ساتھیوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ہوائی جہاز پر سفر کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ کمبخت دل رہ رہ کر دھک دھک کرنے لگتا تھا۔ اندر پہنچتے ہی ٹھنڈی ہوا نے خیر مقدم کیا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھا۔ جو ربر کے جھاگ کی بنی ہوئی تھی۔ بیٹھتے ہی اندر دھنس گیا۔ لیجئے ہوائی جہاز کے اندر کی تصویر دیکھئے ایک لمبا کمرا۔ بیچ میں راستہ۔ دونوں طرف دو دو کرسیوں کی قطار۔ اوپر سامان رکھنے کی دو پٹریاں سی۔ ان میں ننھے ننھے پنکھے۔ ان ہی کے نیچے بلب۔ اگر مسافر روشنی چاہے تو ٹھیک اس کی گود میں پڑے۔ وہیں میزبان، کو بلانے کی گھنٹی۔ پیچھے پاخانہ، پیشاب خانہ، منہ ہاتھ دھونے کی جگہ، کپڑے لٹکانے کی جگہ۔ غرض ضرورت کی ہر چیز موجود۔

تھوڑی دیر میں سگنل ہوا کہ اپنی اپنی پٹیاں باندھ لیجئے اور سگریٹ پینا بند کر دیجئے۔ کرسی سے بندھی ہوئی ایک پٹی ہوتی ہے جب جہاز اڑنے یا اترنے لگتا ہے تو اپنے کو اس سے باندھ لیتے ہیں۔ اس سے ذرا آرام ملتا ہے۔ جہاز نے رینگنا شروع کیا۔ اب تیز ہوا، اور تیز، بہت تیز، بالکل آندھی جیسا لیکن پہیے ابھی زمین کو چھو رہے ہیں۔ یہ لیجئے پہیوں نے زمین کو چھوڑ دیا۔ اور جہاز دھیرے دھیرے اوپر اُٹھنے لگا۔ اوپر اور اوپر۔ اعلان ہوا اب ہم ۳½ ہزار فٹ کی بلندی پر ہیں۔ ارے ظالم یہ کیا کیا۔ بجلی کی سی تیزی سے آگیا۔ پھر رکا، پھر اوپر، پھر نیچے، پھر اوپر، بس یہی اوپر نیچے مار ڈالتا ہے۔ پھر بھی بہت زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔

اب ہم ۱۴½ ہزار فٹ کی اونچائی پر پہنچ گئے۔ باہر دیکھا کہ جہاز کے نیچے بادل کے ٹکڑے بہے چلے جا رہے ہیں۔ زمین کا کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ اب جہاز ایک رفتار سے اُڑ رہا تھا۔ لیکن سچ پوچھیے تو یہ بتانا مشکل تھا کہ اڑ بھی رہا ہے۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک نہایت ہی آرام دہ کمرے میں چپکے بیٹھے ہیں۔ اور کمرہ بھی ایر کنڈیشن۔ جہاز ذرا بھی جنبش نہیں کرتا تھا۔ آواز ضرور آتی تھی۔ لیکن اتنی کہ آپ معمولی آواز میں گفتگو کر سکتے تھے۔ باہر دیکھنے سے بس کبھی کبھی یہ احساس ضرور ہوتا تھا کہ ہم چیونٹی کی رفتار سے چل رہے ہیں لیکن رفتار ڈھائی سو میل فی گھنٹہ سے کم کیا ہوگی۔

اب مسافروں پر نظر ڈالی۔ بیشتر ہندوستانی تھے۔ اصل میں یہ لوگ کمیونٹی پروجکٹ آفیسر تھے جو ایک وفد کی صورت میں نیویارک جا رہے تھے۔ کچھ انگریز بھی تھے۔ میرے بائیں بازو کی دو کرسیوں پر، ایک پر ایک انگریز تھا اور ایک پر ہندوستانی۔ بھلا آپس میں بات کیسے ہوتی۔ انگریز نے تکیہ لگایا، کمبل اوڑھا اور خرّاٹے بھرنے لگا۔ ہندوستانی صاحب بھی اونگھنے لگے۔ میں نے اپنے ساتھی کی طرف نظر کی تو سولھوں آنے ہندوستانی نظر آئے۔ جھٹ گفتگو پر اتر آیا۔ آپ کا نام سین گپتا تھا۔ آپ بنگال انجینیرنگ کالج کے پرنسپل تھے۔ اس وقت استنبول میں کسی کانفرنس میں تشریف لے جا رہے تھے۔ یہ ہوائی جہاز کا سفر کر چکے تھے۔ چنانچہ ان سے خاصی مدد ملی۔

میزبان نے پہلے گم چوسنے کے لئے دیا۔ کچھ دیر بعد کافی پینے کو ملی۔ کراچی قریب آ رہا تھا۔ اس سے پہلے ناشتہ ملا۔ ناشتے میں کافی، مکھن، جام دو عجیب طرح کے بسکٹ، انڈوں کے لچھے، لیکن بہت ہی لذیذ، اور آپ کو چپکے سے ایک بات بتاؤں، یہ سب مفت!

کوئی سات بجے کے قریب کراچی پہنچے تمام ہوائی اڈے شہر کے باہر ہوتے ہیں اس لئے اڈوں سے شہر یا شہری زندگی کا کوئی اندازا نہیں ہوتا۔ کراچی کے ہوائی اڈے کی عمارت میری نظر میں تو گھٹیا قسم کی ہے۔ بعض کمروں میں پاکستان کی بنی ہوئی چیزوں کی نمائش ہے۔ پاسپورٹ کی جانچ ہوئی۔ لوگ ادھر ادھر پھرتے رہے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد جہاز کراچی سے روانہ ہوا۔ اب ہمارا دوسرا اسٹیشن بصرہ تھا۔

کراچی سے بصرہ :-

جب تک جہاز ۲½ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچتا ہے تو بس دھندلا دھندلا عکس سا نظر آتا ہے۔ اونچے اونچے مکانات بلکہ پورا شہر کا شہر ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے کسی دیو نے تمام شہر کو دبا کر چپٹا کر دیا ہے۔ آدمی تو بالکل نظر نہیں آتے۔

بحر عرب اور خلیج فارس کو پار کر کے اب ہم بصرا سے قریب تھے۔ نیچے دیکھئے تو حدِ نگاہ تک ریت ہی ریت ہاں کہیں کہیں سوت جیسے باریک دریا بھی نظر آتے تھے۔ اتنے میں اعلان ہوا "وہ دیکھئے آپ کی داہنی طرف دریائے ہے اور اس کے کنارے تیل کا مشہور کارخانہ آبادان ہے۔ یہاں سے بصرہ ۵۵ میل دور ہے"

نیچے دیکھا تو جہاں تک نظر کام کرتی تھی، صحرا نظر آتا تھا۔ ہاں کہیں کہیں دریا۔ اور ان دریاؤں کے کنارے آبادی۔ کہیں چھوٹی کہیں بڑی۔ آبادان بھی ایک ایسا ہی شہر تھا۔ آبادان خلیج فارس کے ساحل پر آباد ہے۔ سمندر کی طرف دیکھئے تو پہلے خلیج فارس کا نیلا پانی، اس کے کنارے آبادان، آبادان کے ادھر ادھر کچھ نالے سے بہتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں کہیں درخت اور اس کے فوراً بعد لق و دق صحرا شروع ہو جاتا ہے۔ ہم اتنے اوپر تھے کہ تیل کے کارخانے ٹھیک سے نہ دیکھ

سکتے تھے۔ ایک جگہ المونیم کے بڑے بڑے پیپے سے چمکتے نظر آئے۔ غالباً یہ تیل جمع کرنے یا صاف کرنے کا ایک کارخانہ تھا۔

پانچ منٹ بعد اعلان ہوا "پٹکے باندھ لیجئے۔ سگریٹ پینا بند کر دیجئے۔ ہم بصرا کے اڈے پر اتر رہے ہیں۔" نیچے بصرہ تھا۔ وہی منظر یہاں بھی تھا جو ہم نے آبادان میں دیکھا تھا۔ حد نگاہ تک صحرا، کہیں کہیں دریا اور ان کے کنارے آبادی۔ ہاں یہاں کھجور کے باغ بکثرت تھے۔ یہ باغ آنکھوں کو بہت بھلے لگتے تھے۔ ادھر اُدھر ریت کے کبھی نہ ختم ہونے والے میدان، بیچ میں کھجور کے باغوں کی ایک لمبی پٹی۔ باغ کے پیڑ بہت ہی ترتیب سے لگے ہوئے تھے۔ انھی باغوں کے نیچے کہیں قصبے اور گاؤں تھے۔ بصرہ کے گاؤں مجھے اپنے یہاں کے گاؤں سے اچھے لگے۔ ہمارے یہاں کے گاؤں میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ یہاں کے گاؤں کی گلیاں سیدھی سیدھی نظر آئیں۔ گھر بھی کھلے کھلے دکھائی دئے۔ ویسے تھے سب مٹی کے۔

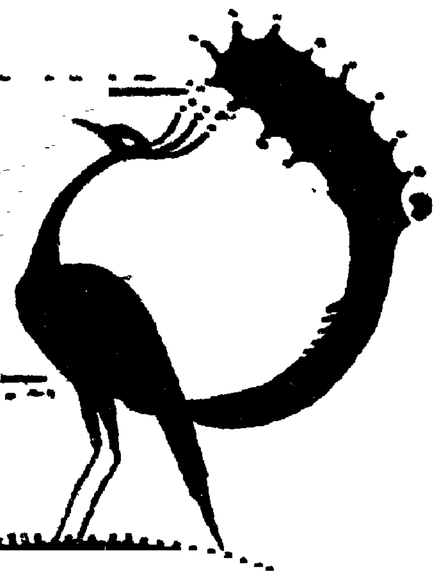
جہاز اترا اس وقت بصرہ میں دن کے ۱۱½ بجے تھے۔ دہلی میں اس وقت دن کے دو بجے ہوں گے۔ بلا کی گرمی اور لو تھی۔ ہم لوگ منہ چھپائے ہوئے اڈے میں داخل ہوئے۔ اڈا معمولی تھا۔ دروازوں پر جو تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان پر عربی زبان میں نام وغیرہ لکھے تھے۔ یہ لوگ لائن جیسے ریلوے لائن، ایر لائن، کو الخطوط لکھتے ہیں اڈے میں آرام دہ بیٹھنے کی جگہ تھی۔ بیٹھتے ہی کمپنی کی طرف سے شراب اور شربت سے تواضع کی گئی۔ اڈے سے بالکل ملا ہوا ایک دریا بہتا تھا۔ اس کے کنارے کنارے ہرے بھرے کھجور کے درخت تھے جو بہت خوبصورت لگتے تھے۔

میں نے چوکی دار سے انگریزی میں پوچھا کہ کیا یہ دریا ہے۔ تو اس نے

بقیہ صفحہ ۴۸ پر دیکھئے۔



میری چلتی پھرتی میز



ہرا مور اور لال مور

حیات اللہ انصاری

جنگل میں ایک اسکول تھا۔ وہاں دو مور پڑھتے تھے۔ ہرا مور اور لال مور۔ دونوں بڑے خوبصورت تھے۔

اسکول میں طوطا، مینا، کوّا اور جگنو بھی پڑھتے تھے۔ لال مور کی ان سب سے دوستی تھی۔ جب اسکول میں چھٹی ہو جاتی تو یہ پانچوں چھلی چھلیا کھیلتے۔

لال مور کا کوئی دوست اگر بیمار پڑ جاتا تو وہ اس کے گھر جاتا اور اپنا ناچ دکھا دکھا کر اس کا جی ایسا بہلاتا کہ وہ اچھا ہو جاتا۔

ہرے مور سے کسی سے دوستی نہیں تھی۔ نہ تو وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ چھلی چھلیا کھیلتا اور نہ کسی بیمار کے گھر آتا جاتا۔

ایک دن سب چڑیوں نے ہرے مور سے کہا "آج تو تم کو بھی کھیلنا پڑے گا" بہت کہنے سننے سے وہ راضی ہو گیا۔

کھیل ہونے لگا۔ تھوڑی دیر میں ہرا مور چور بن گیا۔ داؤں جو دینا

پڑی تو یہ دل ہی دل میں بہت بگڑا۔ کہیں مینا کا پاؤں اس کی دم پر پڑ گیا۔ بس پھر تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ لگا مینا کو اندھا اور بدتمیز کہنے۔ اور دوڑا مارنے۔ سب نے بڑی مشکل سے اس کو روکا۔ وہ خفا ہو کر چلا گیا۔

اس دن سے ہرا مور بالکل الگ تھلگ رہنے لگا۔

تھوڑے دنوں کے بعد لال مور ہرا مور، طوطا، مینا، کوّا اور جگنو، سب پڑھ لکھ کر اسکول سے چلے گئے اور اپنے کاموں میں لگ گئے۔

ہرے مور اور لال مور کے بڑی بھاری بھاری چمکدار دُمیں نکل آئیں۔ وہ خوب ناچنے لگے اور باغوں میں گھومنے لگے۔

ایک دن ہرے مور اور لال مور دونوں نے باغ میں مورنی کو دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں۔ نازک چونچ تھی۔ پَر ملائم ملائم تھے۔

دیکھتے ہی دونوں کی طبیعت آگئی۔

ہرے مور نے مورنی سے کہا —
"مورنی! مورنی! ہم سے شادی کرلو۔"

لال مور نے مورنی سے کہا —
"مورنی! مورنی! ہم سے شادی کرلو۔"

پھر دونوں نے مورنی کو اپنا اپنا ناچ دکھایا۔

مورنی نے دیکھا کہ دونوں مور بہت خوبصورت ہیں اور دونوں بہت اچھا ناچتے ہیں۔ وہ بڑی چکرائی کہ میں کس سے شادی کروں، اور کس سے نہ کروں۔ کہنے لگی — "جاؤ، میں تم دونوں کا امتحان لوں گی۔ جو اس میں پورا اُترا اسی کے ساتھ شادی کروں گی۔"

مورنی کی ایک سہیلی تھی — چوہیا! وہ شہر میں رہتی تھی۔ مورنی نے اس کو بلا بھیجا۔ جب وہ آئی تو مورنی نے اس سے کہا —

"ارے بہن چوہیا، تم تو آدمیوں میں رہتی ہو۔ ان کی باتیں جانتی ہو۔

تب جانوں کوئی ایسی تدبیر کرو جس سے یہ پتہ چل جائے کہ لال مور اچھا ہے یا برا۔" چوہیا نے جواب دیا۔" سہیلی! تم ذرا بھی فکر نہ کرو۔ میں ایسی تدبیر کرتی ہوں۔ تمھیں کیا ساری دنیا کو پتہ چل جائے گا کہ کون مور اچھا ہے۔"

جب آدھی رات ادھر، آدھی رات ادھر ہوئی اور سارا سنسار سو گیا تب چوہیا کالا کمبل اوڑھ کر نکلی۔ دبے پاؤں ہرے مور کے گھونسلے میں آئی۔ دیکھا کہ وہ پڑا بے خبر سو رہا ہے۔ یہ چپکے چپکے اس کے پر کترنے لگی۔

ہرا مور سوتے کا سوتا رہ گیا اور چوہیا اس کی دُم اور بدن بھر کے پر کاٹ کر چلتی بنی۔

پر جو کٹ گئے تو مور اندر سے لال لال گوشت کا ایسا نکل آیا۔

صبح ہرے مور کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میں بالکل ننڈ منڈ ہوں۔ وہ بہت گھبرایا کہ اب کیا کروں۔ کوئی دوست تو اس کا تھا ہی نہیں جو کوئی راہ بتاتا۔ وہ گھونسلے میں اکیلا پڑا رہا۔

ہرے مور کے پنکھ کٹ گئے تھے۔ اس لئے آج دانا چگنے بھی نہیں جا سکا۔ جب سارا دن بیت گیا اور بھوک پیاس سے بُری حالت ہوگئی تب کسی نہ کسی طرح پیڑ سے نیچے اترا اور کھیت کی طرف چلا۔

راستے میں اُسے بطخیں اور مرغیاں ملیں جو ہرے مور کو اس حالت میں دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ اور بطخیں کہنے لگیں۔

" فرافر، فرافر! کیسی بے شرم چڑیا ہے۔ اپنے پر اتارے بازار میں ننگی گھوم رہی ہے۔"

مرغیاں کہنے لگیں :-

"کٹ کٹ، کٹا کٹ! مارو تو اس ننگ دھڑنگ کو۔"

چوزوں نے جو دیکھا تو لگے تالیاں بجا بجا کر چڑھانے۔

"دُم کٹ گئی، پر جھڑ گئے، پھرتے ہیں لنڈ ورے۔"

ہے ہے میاں چرکٹ! ہے ہے میاں چرکٹ

یہ سُن کر ہرا مور بہت بگڑا۔ اور دوڑا چوزوں کو مارنے۔ جس چوزے کی طرف جاتا وہ تو بھاگتا اور سب پیچھے سے چلّانے لگتے:۔

"دُم کٹ گئی، پر جھڑ گئے، پھرتے ہیں لنڈورے
ہے ہے میاں چرکٹ! ہے ہے میاں چرکٹ!!"

کہیں گشت لگاتے ہوئے اُدھر آنکلے سپاہی بلّے۔ انھوں نے جو دیکھا مور کو تو سمجھے کہ بوٹی ہے۔ پھر تو وہ اُس پر جھپٹ پڑے اور یہ بھاگا اپنی جان لے کر۔

سپاہی بلّے چلّانے لگے ـــ

"ارے بوٹی بھاگی جا رہی ہے!
ارے بوٹی بھاگی جا رہی ہے!"

ہرے مور نے بھاگ کر بڑی مشکل سے اپنی جان بچائی۔ اور بلّوں کے ڈر سے ادھر اُدھر دبکتا پھرنے لگا۔ آخر جب بھوک پیاس سے مرنے لگا اور بہت عاجز آ گیا تو ایک گدھ کے دروازے جا کر کہنے لگا:۔

"اے بھائی تو مجھے کھا لے!"

پھر گدھ کو اس پر ترس آ گیا۔

ہرا مور وہیں دن گزارنے لگا۔ اس کا دیا ہوا سڑا ہوا گوشت کھاتا، سنڈاس کا پانی پیتا اور غلاموں کی طرح اس کا کام کاج کرتا رہتا۔

دوسری رات چوہیا نے لال مور کے پر بھی کاٹ ڈالے۔ لال مور نے جب دیکھا کہ میرے سب پر غائب ہیں تو رونے لگا کہ بھلا اب مورنی میرے ساتھ شادی کیوں کرنے لگی؟

مینا اور کوّا اُس دن جو اپنے دوست سے ملنے آئے تو اُن کو اس کی مصیبت کا پتہ چلا۔ وہ دونوں اُسے سمجھانے لگے کہ ایسی بیماریاں آتی رہتی ہیں ـــ گھبراؤ نہیں، کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔

مینا جا کر کہیں سے دانے بٹور لائی۔ کوّا ایک چپاتی اُڑا لایا۔ پھر تینوں نے مزے سے بیٹھ کر کھانا کھایا اور آپس میں ایسی ہنسی کی باتیں ہوئیں کہ لال مور اپنی مصیبت بھول گیا۔ جب

تینوں کھا پی چکے اور لال مور کی ڈھارس بندھ گئی تب مینا، کوّا بیٹھ کر سوچنے لگے کہ کیا کیا جائے جو لال مور کے پر پھر سے نکل آئیں۔

کوّے نے کہا "حکیم کی دوا سے پر نکل سکتے ہیں مگر اُس کے گھر کا راستہ بہت مشکل ہے۔ راہ میں دو بڑے بھیانک میدان پڑتے ہیں۔ پیلا میدان اور کالا میدان۔ پیلے میدان میں رات کو اولے پڑتے ہیں اور کالے میں دن کو۔ اس لئے پیلا میدان دن بھر میں پار کر لینا ہوگا نہیں تو اولوں سے سر پھٹ جائے گا۔ پھر بنا دم لئے رات بھر میں کالا میدان پار کرنا ہوگا"

لال مور نے کہا "میں پیدل بڑا تیز بھاگ سکتا ہوں۔ پار کر لونگا"

کوّے نے کہا "ایک مشکل اور ہے۔ زمین پر ایک بڑا بھاری سانپ رہتا ہے جو پیدل جانے والوں کو نگل جاتا ہے"

لال مور نے کہا "میں تو جاؤں گا۔ سانپ نگل جائے، نگل جائے۔ مورنی کے بغیر جینے سے مرنا اچھا ہے"

مینا بولی "بھائی کوّے، چلو ہم دونوں بھی لال مور کے ساتھ ساتھ چلیں۔ جہاں سانپ نکلا میں تم کو بتا دوں گی۔ پھر دونوں مل کر اس کو مار ڈالیں گے"

تینوں نے دوسرے دن چلنے کی ٹھان لی۔ اُس دن لال مور، کوّا اور مینا بھی حکیم کے گھر کو چلے۔ لال مور نیچے نیچے بھاگ رہا تھا اور کوّا اور مینا اسی کے اوپر اوپر اُڑ رہے تھے۔

سانپ ایک جھاڑی میں بیٹھا تھا کہ اُس کو لال مور نظر آیا۔ اُس نے کہا "آہا ہا! کیسی اچھی بوٹی بھاگی جا رہی ہے۔ میں ابھی اس کو کھاتا ہوں"

سانپ لال مور پر جھپٹا لیکن اُس کو اس کی سخت سزا ملی۔

مینا نے ٹیں ٹیں کرکے کوّے کو خبر دی کہ سانپ آرہا ہے۔ کوّے نے پیچھے سے آکر ایک چونچ سانپ کی دُم پر ماری۔ سانپ جو پلٹا کوّے

کی طرف تو مینا نے پھر پیچھے سے ایک چونچ رسید کی اُس کی دُم پر۔ پھر دونوں نے مل کر سانپ کو اتنی چونچیں ماریں کہ اس کا کچومر نکل گیا اور وہ مر گیا۔

سانپ کو مار کر پھر تینوں اپنی منزل کی طرف چل کھڑے ہوئے اور سورج ڈوبتے ڈوبتے پیلا میدان پار ہو گیا اور کالا میدان آ گیا۔

ایک تو میدان کالا، اس پر رات کا اندھیرا۔ لال مور گھبرا کر کہنے لگا۔

"بہن مینا اور بھائی کوّے، مجھے تو راستہ نہیں سوجھتا۔"

مینا بولی "بھیّا گھبراؤ نہیں، وہ سامنے جو روشنی دکھائی دے رہی ہے، یہ میاں جگنو کا گھر ہے۔ چلو ان سے کہیں کہ ہم کو روشنی دکھا دیں۔"

تینوں پہنچے جگنو کے گھر۔ اُس نے ان تینوں کی بڑی خاطر کی۔ چائے پلائی، کھانا کھلایا اور پھر روشنی دکھانے چل کھڑے ہوئے۔

کالا میدان سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ہر طرف بھیانک اندھیرا چھایا ہوا تھا اس میں آگے آگے میاں جگنو روشنی دکھا رہے تھے۔ پیچھے زمین پر لال مور بھاگ رہا تھا اور اُس کے اوپر مینا اور کوّا اُڑ رہے تھے۔

چاروں بھاگتے رہے۔ جیسے جیسے صبح قریب آتی جاتی مینا اور کوّا جگنو سے کہتے۔

"بھائی جگنو۔ اور تیز۔ اور تیز۔ نہیں تو اگر صبح ہو گئی تو اولے پڑنے لگیں گے۔ اور ہم لوگوں کا سر پھٹ جائے گا۔"

میاں جگنو کہتے۔ "ہم تھکے جا رہے ہیں۔ اتنا تیز نہیں چل سکتے۔"

مینا اور کوّا کہتے "بھائی ذرا ہمّت سے کام لو اور ہمارا کام بنا جاتا ہے۔"

صبح ہوتے ہوتے کالا میدان بھی پار ہو گیا۔ لال مور نے حکیم کے دروازے پر پہنچ کر کہا "میں آؤں؟ میں آؤں؟"

اندر سے حکیم صاحب کا کتا نکلا۔ اس نے کہا ـــ

"بھاگ! بھاگ! میں تجھے اندر نہیں گھسنے دوں گا، تیرے پر نہیں ہیں، تو کوڑھی ہے۔"

یہ کہہ کر کتا بھونکنے لگا۔ "بھوں، بھوں، بھوں، بھوں!"

اتنے میں کسی نے اوپر سے کہا۔

"بھائی لال مور! تم کہاں؟"

اوپر ایک پنجرے میں بھائی طوطے مٹھو میاں بنے بیٹھے تھے۔ لال مور نے ان کو اپنی بپتا کہہ سنائی۔ طوطا بولا۔

"بھائی لال مور، گھبراؤ نہیں، میں آدمی کی بولی جانتا ہوں۔ ابھی حکیم صاحب سے دوا دلواتا ہوں۔"

طوطے نے "دت، دت" کرکے کتے کو بھگا دیا۔ جب حکیم صاحب باہر آئے تو طوطے نے لال مور کو دوا دلوا دی۔ دوا کھاتے ہی لال مور کے پر اور دُم نکل آئی۔ اب وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت اور چمکدار ہو گیا۔"

لال مور کے اچھے ہونے کی مینا، کوّا، جگنو اور طوطے چاروں نے بڑی خوشی منائی۔ پھر مینا، کوّا، جگنو اور لال مور طوطے سے چھٹی لے کر جنگل آئے۔

مورنی نے لال مور کا سارا قصّہ جو سنا تو وہ بھی اُس پر عاشق ہو گئی۔ دل میں چوہیا کے امتحان کی تعریف کرنے لگی، جس سے صاف پتہ چل گیا کہ کون مور اچھا تھا کون بُرا۔"

پھر بڑی دھوم دھام سے لال مور اور مورنی کی شادی ہو گئی۔

وقار خلیل (شاہ پوری)

پودوں کی کہانی

کسان نے کھیت میں بیج بو دئے، اور کچھ دنوں بعد پودے نکل آئے، سارے کھیت میں مونگ پھلی کے ہرے بھرے پودے لہلہا رہے تھے اور کھیت کے بیچوں بیچ دو چار جوار اور کپاس کے پودے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

ایک دن سویرے ہی مونگ پھلی کے پودے کے نے جوار کے پودے سے کہا کہ "اے بھائی جوار یہ تو ہماری سبھا ہے اس میں تمہارا کیا کام، تم کیوں آئے ہماری نگری میں۔ اور پھر اپنی بڑائی جتا رہے ہو"

یہ سن کر جوار کا پودا جلنے لگا اور بولا "بہن! کیا یہ کھیت تمہاری جاگیر ہے جو مجھے ڈانٹ رہی ہو، اگر اپنا بھلا چاہتی ہو تو چپ ہو جاؤ، نہیں تو پھر....."

اب تو بی مونگ پھلی کو غصہ آگیا۔ پتوں سے جھاگ نکلنے لگا اور کہنے لگیں "نہیں تو پھر... کیا مار ڈالوگے.... یہی کہنا چاہتے ہو نا۔ اگر ایسا ہے تو آؤ مقابلہ کر لو، میدان سامنے ہے پھر دیکھنا۔

جوار نے انگڑائی لیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ "ہاں خوب جانتا ہوں، تم ایک حقیر چیز ہو، جسے

کھا کر لوگ بیماریاں مول لیتے ہیں۔ اور کھانستے کھانستے دم گھٹتا ہے۔ ایسی بے کار چیز ہوتے ہوئے بڑی آئی اپنی بڑائی جتانے والی۔ کیوں؟ چپ ہو گئی، ذرا پوچھ تو لے تیری سہیلیاں کیا کہتی ہیں؟

اتنے میں ایک اور بی مونگ پھلی نیند سے چونک پڑی اور بڑبڑانے لگی "اوی موا، بڑا آیا ہمیں نام رکھنے والا۔ ذرا اپنی بھی تو صورت دیکھ، پھر چاند پہ تھوکنا۔ کان کھول کر سُن لے کہ ہم کیا ہیں۔ دنیا ہم پہ جان دیتی ہے۔ ہم بچوں کے لئے من بھاتا کھا جا ہیں۔ اور وہ ہمیں اتنا چاہتے ہیں کہ اسکول جاتے وقت بھی ہمیں ساتھ لے چلتے ہیں اور مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ کھیل کے میدانوں میں ہمارا ہی تو راج ہوتا ہے، تماشہ دیکھنے والے ہمیں ہی تو مانگتے ہیں۔ اور تم نے سینما گھروں کے پاس یہ پکارتے ضرور سُنا ہوگا کہ "مونگ پھلی گرم گرم مونگ پھلی... مزے دار مونگ پھلی، ولایتی مونگ کی پھلی.... مزے دار ولایتی کاجو"

اب تو جوار اور بھی پیچ و تاب کھانے لگا اور کچھ کہتے نہ بنی۔ اتنے میں ایک اور مونگ پھلی کا پودا سر اٹھا کر بکنے لگا اور کھانستے ہوئے کہنا شروع کیا "بس جی، تمہیں تو اونٹ کی طرح لمبے ہونا آتا ہے، ذرا دیکھو تو تمہاری کون سی کل سیدھی ہے۔ ایک بے ڈھنگے روگی ہو، نہ تم شہروں کی سیر کر سکتے اور نہ جلسوں۔ سینما گھروں مدرسوں کو دیکھنے ہو، بلکہ کھیت سے سیدھے ایک ٹاٹ کے تھیلے میں قید ہو کر اندھیری کوٹھڑی میں پڑے سڑتے رہتے ہو اور اب آئے ہو اپنی شان بگھار جاؤ میاں کسی اور کے سامنے باتیں بنانا۔

یہ سن کر میاں جوار غصہ میں لال پیلے ہو گئے۔ اور اس تیزی سے جھکے کہ بی مونگ پھلی دو فیٹ پیچھے ہٹ گئیں۔ سب پودے سہم گئے۔ پھر گرجنے لگے، "معلوم ہوتا ہے تم گنوار ہو گنوار، شہروں میں پھرنے پر فخر کرتے ہو اور پھر یہ گنواروں کی سی باتیں..... سُنو! اگر میں نہ ہوتا تو ساری جنتا بھوکوں مر جاتی، لوگ میرے لئے خدا سے دعائیں مانگتے ہیں، کھیت میں ہل چلاتے جاتے ہیں اور جب میرا اناج پک کر تیار ہو جاتا ہے تو کسان اُسے کاٹتے ہیں۔ بیساکھی کا تہوار مناتے ہیں، خوشیوں کے میلے ہوتے ہیں۔ کیوں کہ اگر ہم اناج نہ اگاتے تو کسان کیا کرتا، اور پھر بغیر اناج کے وہ کام کاج کس طرح کرتا، آج دنیا بھر میں میری مانگ ہے۔ جیسے دیکھو ہمارے ہی گن گو

ہے۔ غریب ہمارے ہی وجہ سے زندہ رہتے ہیں اور امیر بھی کھاتے ہیں۔ مزدور ہمیں کھا کر کام کاج کرتے ہیں۔ اگر بچوں کو ایک وقت کا کھانا نہ ملے تو پھر دیکھو ان کی کیا حالت ہو جاتی ہے سارا گھر سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ بھوک بھوک چلّا کر سب کو پریشان کر دیتے ہیں۔ بتا...... کیا ایسے وقت تو ان کی بھوک مٹا سکتی ہے؟ اگر وہ تیرے چار دانے کھا جائیں تو کھانسی کا روگ لگ جاتا ہے۔ اور ماں باپ کی مار بھی انہیں کھانی پڑتی۔ مگر مجھے تو وہ دن میں تین چار وقت شوق سے کھاتے ہیں اور کبھی کوئی روک ٹوک بھی نہیں کرتا۔ نہ تو انہیں کھانسی ہوتی ہے اور نہ بخار۔ بلکہ بچے بڑے، خوب موٹے تازے اور تندرست ہو جاتے ہیں۔

جوار کی باتیں بی مونگ پھلی کو بُری لگیں۔ کیونکہ سچی بات ہمیشہ کڑوی لگتی ہے۔ آخر کار مونگ پھلی نے اوٹ پٹانگ بولنا شروع کیا کہ " بڑے آئے اپنا رعب جماتے، بڑے لوگ تو تمہیں منہ ہی نہیں لگاتے مگر مجھے وہ چاہتے ہیں اور میں ان کے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے چٹ پٹے اور تلن کی صورت میں دسترخوان پر موجود رہتی ہوں۔ اور پھر میرا تیل بھی نکالا جاتا ہے۔ میرے ہی تیل سے مزے دار سالن اور سوندھی پوریاں پکائی جاتی ہیں "

" بس، بس چُپ رہ " جوار نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا اور پاس کا ایک اور جوار کا پودا منہ چڑاتے ہوئے بی مونگ پھلی سے یوں مخاطب ہوا " بڑی آئی باتیں بنانے والی۔ بلی کی بہن، نوسو چوہے کھا کر حج کو جانے کا ارادہ معلوم ہوتا ہے۔ لوگ تیرا تیل کھا کر روگ ہی تو مول لیتے ہیں۔

اور یہ بحث بڑھنے لگی دور ایک طرف مسٹر کپاس بیٹھے گنگنا رہے تھے کہ ان کے جھگڑنے کی آواز سن کر پلٹے، تو کیا دیکھتے ہیں کہ یہاں معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ وہ بھی کچھ دیر تماشہ دیکھنے کے بعد بولے " بھائی جوار اور بہن مونگ پھلی! سنئے، اس طرح لڑنے سے کیا فائدہ، میری طرف دیکھئے، دنیا کے بہت سے کام میری بدولت چل رہے ہیں۔ سیٹھ لوگ مجھے بکوا کر تجوریاں بھر لیتے ہیں۔ کسان، امیر، غریب، مزدور اور طالبِ علم سبھی میرا استعمال کرتے ہیں۔ میرے ہی وجہ سے کارخانے اور

ملیں چلتے ہیں اور اس طرح ہزاروں لاکھوں آدمی میری بدولت اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ اگر میں نہ ہوتا تو لوگ پرانے زمانے کی طرح ننگے پھرا کرتے یا پھر درختوں کی چھالوں اور پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانکتے۔

ابھی مسٹر کپاس نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ جوار نے بڑھ کر ایک چانٹا رسید کیا اور مسٹر کپاس دبک کر چپ ہو رہے۔ اب جوار نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بی مونگ پھلی کی طرف دیکھا اور جھوم کر کہنے لگے

یہ بات ہے تو سنو ہم پانچ پودے تم سب پر قابو پا سکتے اور تگنی کا ناچ نچا سکتے ہیں، یاد رکھنا ہمیں کوئی طاقت بھی کھیت سے جدا نہیں کر سکتی، ہم تو کھیت کے راجہ ہیں راجہ اور تم سب ہماری پرجا ہو، اور یہ کپاس کا بچہ بھی الگ اپنی بڑائی جتا رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں۔

اور پھر مسٹر کپاس نے باریک آواز میں کہنا شروع کیا کہ " اگر جان کی اماں پاؤں تو عرض ہے کہ ہمارا اس طرح کا لڑنا جھگڑنا ٹھیک نہیں۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ کام کا ہے۔ میں نے اپنا ذکر بڑائی جتانے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ یونہی بات آ گئی تھی اور کہہ دیا۔ ایک بات سنو"

اور مسٹر کپاس ٹکٹکی باندھے ایک آنکھ سے جوار کو اور دوسری سے بی مونگ پھلی کی طرف دیکھنے لگے، پھر جوار نے کہا" ہاں کہو تم کیا کہنا چاہتے ہو ؟" بی مونگ پھلی نے بھی حامی بھری اور مسٹر کپاس ڈرتے ڈرتے کہنے لگے

" یہ سب قصور کسان کا ہے، اگر وہ ہمیں الگ الگ بو دیتا آج یہ ہاتا پائی کی نوبت نہ آتی، اور ہر ایک اپنی جگہ مزے میں رہتا۔ مگر اب پچھتانے اور لڑنے سے کیا فائدہ، بہتر ہے کہ یہ تھوڑے دن ہنسی خوشی گزار دیں۔

دنیا میں لڑنے والے ہمیشہ سے نقصان میں رہے ہیں۔ اس طرح لڑنے سے ایک تو وقت برباد ہوگا پھر آپس میں دشمنی الگ، اور پڑوسی کھیت کے پودے ہمیں لڑاکو کے نام سے پکارنے لگیں گے۔ بہتر تو یہ ہے کہ ہم مل جل کر رہیں اور خوب اناج اگائیں آج کل ہمارے دیش کی کیا حالت ہے۔ اتنا ہوتے پر بھی ہمارا اس طرح کا لڑنا جھگڑنا بے وقوفی کی بات ہوگی، ہمیں تو دیش کی

حالت سدھارنا اور خوب غلہ پیدا کرنا ہے، تاکہ سب کو روٹی مل سکے اور بچے خوش خوش پڑھنے جایا کریں، کھیلیں کودیں، اور بڑے ہو کر ہماری خدمت کریں، کہو تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟"

بی مونگ پھلی نے گردن نیچے کرتے ہوئے کہا کہ "میں کب جھگڑ رہی تھی، خیر چلو میں تمھاری بات پر عمل کروں گی، تم نے بڑی اچھی اچھی باتیں بتلائیں، کوئی مانے یا نہ مانے، میں اور میری سہیلیاں لڑنا چھوڑ کر دیش کی بھلائی کے لئے زیادہ بیج پیدا کریں گی!"

بی مونگ پھلی یہ کہہ ہی رہی تھیں کہ جوار بھی غصہ تھوکتے ہوئے مسکرانے لگے اور بولے کہ "واہ مسٹر کپاس، تم تو بڑے کام کے نکلے کون اچھی بات نہیں مانے گا۔ میں بھی خوب جی لگا کر اپنا کام کروں گا۔ جس سے کسان بھی خوش ہوگا اور دیش میں خوب اناج پیدا کرے گا" پھر مسٹر کپاس نے بی مونگ پھلی اور جوار میں صفائی کرا دی اور دونوں گلے ملے اور خوش خوش لہلہانے لگے۔

کچھ دنوں بعد فصل پک گئی، کسان خوش تھا کہ اس سال بڑی اچھی کاشت رہی۔ اس نے خدا سے دعا مانگی کہ اے مالک! تو نے اپنی مہربانی سے اس سال اتنا زیادہ اناج دیا ہے کہ ہم کھا کر دوسروں کو بھی دے سکتے ہیں، خدایا، تو بڑا رحیم ہے۔ اس سال میرا قرض بھی اتر جائے گا اور میں نصیر و رشیدہ کو اچھے اچھے کپڑے بھی بنا دوں گا۔ ان کے لئے شہر جا کر جوتے، ٹوپی اور کتابیں بھی خرید لاؤں گا، پھر ان کی پڑھائی کے لئے گاؤں کے مدرسے میں شریک کراوں گا۔ وہ پڑھیں گے، لکھیں گے اور دیش کے لئے اچھے اچھے کام کریں گے۔ تب نہ دیش میں قحط پڑے گا اور نہ لوگ بھوکوں مریں گے۔ چاروں طرف لوگ خوشی منائیں گے

یہ کہانی آل انڈیا ریڈیو
حیدرآباد دکن سے نشر کی گئی۔

سیّد منیر الحسن

تین چراغ

مصر ہمارے ہندوستان سے بہت دور پچھم میں ایک ملک ہے۔ یہ اسی ملک کی ایک مشہور کہانی ہے۔ مگر کہانی سنانے سے پہلے کچھ اور دلچسپ باتیں اس ملک کے رہنے والوں کی آپ کو سنانا چاہتا ہوں تاکہ آپ کو کہانی سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔

ہاں تو اس ملک میں ابھی کچھ دن ہوئے جب ایک بہت بڑا انقلاب ہوا مصر کے ایک فوجی جنرل نجیب نے مصر کے بادشاہ شاہ فاروق کو گدی سے اُتار دیا اور خود ان کی جگہ مصر کا سب سے بڑا آدمی بن گیا۔

مصر اور مصر کی زمین وغیرہ بہت کچھ ہمارے ملک سے ملتی جلتی ہے۔ ہمارے ملک کی طرح وہاں بھی بڑے بڑے میدان ہیں۔ اور زرخیز زمین۔ ان میدانوں کے بیچ سے ہو کر ایک بہت بڑا دریا گزرتا ہے۔ جس کا نام "دریائے نیل" ہے۔ یہ دریا اس طرح کا ہے جس طرح ہمارے ملک میں دریائے "گنگا"۔

اگر مصر میں دریائے نیل نہ ہوتا تو وہاں اتنی چہل پہل بھی نہ ہوتی۔

میں پانی نہیں برستا۔ لیکن سال میں ایک مرتبہ دریائے نیل میں بڑے زور کی باڑھ آتی ہے۔ باڑھ کا پانی سارے ملک میں پھیل جاتا ہے۔ اسی سے کھیتی باڑی ہوتی ہے۔

دریائے نیل کے کنارے جو لوگ آباد ہیں۔ انھیں فلاحین کہتے ہیں۔ یہ لوگ اچھے کسان ہوتے ہیں اور سال میں تین فصلیں پیدا کرتے ہیں۔ یہ قوم کے عرب ہیں اور ان کی زبان بھی عربی ہے۔ یہ لوگ مٹی کے چھوٹے چھوٹے گھروں میں رہتے ہیں۔ جنھیں یہ پھوس سے چھاتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر مکئی کی روٹی، پیاز کی مسالے دار ترکاری سے کھاتے ہیں۔ فلاحین بہت سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ مگر قانون کے بڑے پابند۔ ان کا آپس میں لڑنے کا ڈھنگ عجیب ہوتا ہے۔ جب دو آدمی لڑتے ہیں تو دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ایک دوسرے کے قریب منھ لے جاتے ہیں اور زور سے چلاتے ہیں۔ مگر ان میں مار پیٹ بہت کم ہوتی ہے۔

انھیں کام کرنا پسند ہے۔ وہ کام کرتے جاتے ہیں اور گاتے جاتے ہیں۔ لڑکے تو کچھ اس طرح گاتے ہیں جیسے کوئل کوکتی ہو۔ کبھی کبھی بہت سے لوگ مل کر ساتھ گاتے ہیں۔ پہلے ایک آدمی کچھ گاتا ہے پھر سب اُسی کو دہراتے ہیں۔ ان کی عورتوں کے خوشی کے گانے اور رنج و غم کے گانے دونوں ایک ہی سے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ایک ساتھ مل کر بہت زور سے چیختی ہیں۔

تو ایسے ہیں جناب یہ لوگ جہاں کے بچوں کی کہانی میں آپ کو سناتا ہوں۔

بہت دنوں کی بات ہے مصر میں ایک کسان رہتا تھا۔ اس کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ کسان بہت خوش ہوا۔ چھٹی کے دن کسان نے ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ اس کے گھر میں بہت سی عورتیں جمع ہوئیں۔ ان کے بیچ میں لڑکے کی ماں لڑکے کو گود میں لے کر

بیٹھی۔ خوب گانا بجانا ہوا۔

شام کے وقت تین چراغ جلائے گئے۔ اور تینوں چراغوں کا الگ الگ نام رکھ دیا گیا۔ کچھ لوگ ان چراغوں کو غور سے دیکھنے لگے۔ اور آپس میں کہنے لگے کہ انھیں چراغوں میں سے کسی چراغ کے نام پر لڑکے کا نام رکھا جائے گا۔ اسی طرح کئی گھنٹے گزر گئے۔

اس بیچ میں جلتے جلتے ایک چراغ بجھ گیا۔ ایک آدمی بولا یہ چراغ جلدی بجھ گیا۔ اس کے نام پر لڑکے کا نام نہیں رکھا جائے گا۔ کچھ دیر بعد دوسرا چراغ بھی بجھ گیا۔ تب دوسرا بولا یہ چراغ بھی بجھ گیا۔ اس کے نام پر بھی لڑکے کا نام نہیں رکھا جا سکتا۔ تیسرا چراغ برابر جلتا رہا۔ اس کا نام ابراہیم تھا۔ چنانچہ اسی چراغ کے نام پر لڑکے کا نام بھی ابراہیم رکھا گیا۔

جب جلسہ ختم ہونے لگا تب ابراہیم کی دائی نے اس کے کان کے پاس کھرل بجا بجا کر کہا۔ "دیکھو ابراہیم۔ جب تمہاری ماں گھر کی صفائی کر رہی ہوں تو تم شور نہ کرنا۔ جب وہ کھانا پکا رہی ہوں تو ان کو ذرا بھی تکلیف نہ دینا۔ جس وقت وہ سینے پرونے میں لگی ہوں تو چپ چاپ آنکھیں بند کر کے سو رہنا۔"

ابراہیم اس وقت چھوٹا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوا اس نے اپنی ماں کے آرام کا بہت خیال رکھا۔



انسان اور رنگ و نسل

آپ نے کبھی کوئی بندرگاہ دیکھا ہے۔ وہی بندرگاہ۔ جہاں دنیا کے مختلف ملکوں کے پانی کے جہاز آکر ٹھہرتے ہیں۔ ان بندرگاہوں پر کئی ملکوں کے جہاز آتے جاتے ہیں۔ جن میں ان ملکوں کے لوگ آتے رہتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر آپ فوراً کہہ دیں گے کہ یہ غیر ملکی ہیں۔ یہ انگریز ہے، یہ جاپانی ہے اور یہ حبشی۔ لیکن یہ فرق شکل و صورت کا نہیں ہے بلکہ نسلی ہے۔ اس لئے کہ شکل و صورت تو ہر ایک کی جُدا جُدا ہوتی ہے۔ دنیا میں کئی طرح کے رنگ کے لوگ ہوتے ہیں۔ گورے کالے، زرد اور بھورے، لیکن آپ غور سے دیکھیں گے تو ایک ہی رنگ میں آپ کو مختلف شکلیں دکھائی دیں گی۔ چینی اور انگریز دونوں ہی گورے ہوتے ہیں مگر دونوں میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ہمارے دیس میں کشمیری بھی بڑے گورے ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی ان کو دیکھ کر ہم کبھی یہ شک بھی نہیں کر سکتے کہ یہ انگریز ہوں گے۔

نسلوں کی اصلیت معلوم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بڑے بڑے

سائنس دان اس کی کھوج میں لگے ہیں اس لئے کہ جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا۔ آمدورفت کے ذرائع بڑھتے گئے لوگ آسانی سے ادھر سے اُدھر آنے جانے لگے۔ کچھ لوگ اپنا ملک چھوڑ کر کسی دوسرے ملک میں بس گئے غرض اس کی وجہ سے مختلف نسلیں ایک دوسرے سے گھل مل گئیں۔ یہاں تک کہ ان میں فرق معلوم کرنا مشکل ہوگیا لیکن اگر کسی نسل نے اپنی اصلیت کو برقرار رکھا ہے تو وہ حبشی ہیں۔ وہ بالکل الگ تھلگ رہے۔



پچھلے سائنس دانوں نے دنیا بھر کی نسلوں کو اسی وجہ سے رنگوں کی بنا پر تقسیم کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ دنیا میں پانچ قسم کی نسلیں ہیں۔ جن کے رنگ گورے، کالے، پیلے، لال اور بھورے ہیں۔ مگر موجودہ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ نسلوں کی یہ تقسیم رنگ کے لحاظ سے غلط ہے اس لئے کہ رنگ کا تعلق تو آب و ہوا سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اگر کوئی گورا آدمی افریقہ کے ریگستانوں میں پہنچ جائے تو اس کا رنگ تھوڑے دنوں میں سیاہی مائل ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے جدید سائنس دانوں کا خیال ہے کہ نسلوں کا فرق رنگوں کے ذریعے معلوم کرنا درست نہیں ہے۔

بلکہ اس کے بجائے ہڈیوں کی بناوٹ ان کے سر، ناک اور کسی حد تک ان کے بالوں سے بھی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ہڈیوں کے علاوہ خون سے بھی نسلوں کا گہرا تعلق ہے۔ لیکن خون کے بارے میں ابھی

سائنس دانوں کی ایک رائے نہیں ہے البتہ ہڈیوں کے بارے میں سب کی رائے ایک ہے۔ چہرے، سر اور آنکھ ناک نسلوں کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے، مثلاً منگول نسل جس سے چینی، جاپانی، اور تبت وغیرہ کی قومیں تعلق رکھتی ہیں ان کی ناک چپٹی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں۔

اس سلسلے میں آپ کو ایک بات اور بتائیں، آپ کو دنیا میں ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کا یہ خیال ہے کہ رنگ و خون کا اثر انسان کی ذہانت پر بھی پڑتا ہے۔ اور اسی لئے ان کا خیال ہے کہ بعض نسلیں دوسری نسلوں سے زیادہ ذہین ہوتی ہیں۔ لیکن یہ خیال عوام میں مقبول نہیں ہے۔ اور جدید سائنس داں اس خیال کو قطعی غلط سمجھتے ہیں در اصل انگریزوں نے ہی اس خیال کو دنیا بھر میں پھیلایا کہ رنگ ہی کے ذریعے نسلوں کی پہچان ہو سکتی ہے۔ اور سفید رنگ کے لوگوں کو دوسرے لوگوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اور اسی خیال کو لے کر سفید قوموں نے دنیا بھر میں اپنا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ پندرھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی تک انھوں نے حیرت انگیز ترقی کی اور دنیا کے لوگوں کو یہ یقین دلا دیا کہ سفید نسل دوسری نسلوں کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

پندرھویں صدی میں سفید نسل ۲۰ لاکھ مربع میل تک کرۂ ارض میں پھیلی ہوئی تھی اور دوسری قومیں پانچ کروڑ ۱۰ لاکھ مربع میل پر بسی ہوئی تھیں۔ لیکن انیسویں صدی میں یہ عالم تھا کہ ان کا اقتدار بڑھتے بڑھتے دو کروڑ بیس لاکھ مربع میل پر ہو گیا۔ یوں سمجھئے کہ پورے کرۂ ارض کے ایک تہائی حصے پر اُن کا قبضہ ہو گیا۔

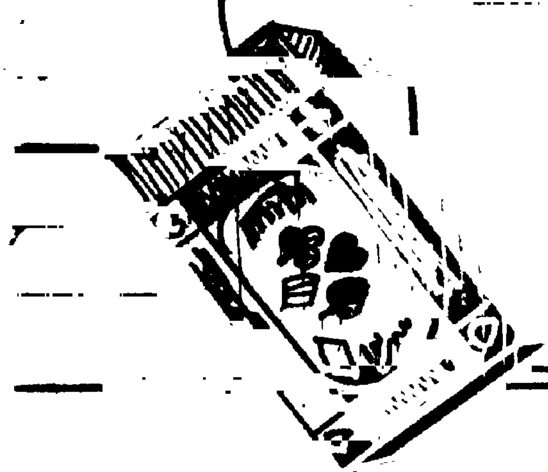
لیکن اس عرصے میں انھوں نے دوسری نسلوں پر جو ظلم و تشدد کئے۔ اس سے اُن کے لئے کافی

نفرت پھیلی اور سفید نسل کے خلاف دوسری نسلوں نے جدوجہد شروع کر دی۔ اسی نسلی فرق کے سوال پر ہمارے مہاتما گاندھی نے افریقہ میں ستیہ گرہ بھی کی تھی۔ دھیرے دھیرے یہی سوال ہندستان میں بھی زور پکڑ گیا۔ اب تو انگریزوں کا یہ بھرم ٹوٹنے لگا۔ اس درمیان میں بڑے سائنس دانوں نے بھی اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا کہ رنگ کا اثر کبھی انسان کے ذہنوں پر نہیں پڑتا ہے۔ کالا آدمی بھی اتنا ہی ذہین ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک گورا آدمی، بشرطیکہ اس کو اپنے دماغی نشو و نما کا اتنا ہی موقع ملے اور اس کے برخلاف ایک جاہل گورا آدمی بھی اتنا ہی بیوقوف ہو سکتا ہے جتنا کہ ایک سیاہ فام حبشی، جس کو زندگی بھر تعلیم و تربیت کا موقع نہ ملا ہو۔ آخر کار بیسویں صدی کے شروع ہی سے سفید قوموں کا اثر ختم ہونے لگا ہے۔ اب لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ رنگ کا اثر ۔ ۔ ۔ ۔ نسلوں پر نہیں پڑتا ہے بلکہ اس کا تعلق آب و ہوا سے ہے۔ اس کا اثر ذہن پر بھی نہیں پڑتا۔ اصل چیز علم و ہنر ہے اور اسی کی بدولت قومیں ترقی کرتی ہیں۔ قدیم ہندستان تو ہزاروں برس اسی رنگ کے باوجود دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک تھا اور یورپ کے لوگ گورے ہونے کے باوجود پچھڑے ہوئے تھے مگر تعلیم نے ان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اور اب جبکہ ہمارا ملک بھی تعلیم اور ترقی کے راستے پر لگ گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہم کچھ سال کے بعد کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کیجئے۔

محمد شمیم الاسلام

دیاسلائی کا کمال



آج سے سو سال قبل ایک سپاہی شیر سنگھ نامی رہتا تھا جس نے صرف معمولی دیا سلائی سے ایک قلعہ پر فتح پالی۔ یہ سُن کر آپ کو تعجب تو بہت ہوگا اور آپ اپنے دل ہی دل میں ہنسیں گے کہ ایسی معمولی چیز سے اس نے اتنا بڑا کام کیسے لیا۔ آج کل دیا سلائی سے سبھی واقف ہیں۔ شیر سنگھ کے زمانے میں اس کی ایجاد کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور بہت کم لوگ اُسے جانتے تھے۔

شیر سنگھ پہاڑی باشندہ تھا اس لئے پہاڑ کی زندگی سے اچھی طرح واقف تھا۔ ایک رات وہ اپنے خیمے سے چپکے سے نکلا اور دشمنوں کے قلعے کی طرف بڑھا۔ یہ قلعہ ایک پہاڑی پر تھا مگر وہ بہت اطمینان سے راستہ طے کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور قلعے کی چہار دیواری پھاند کر اندر گھس گیا۔ اس وقت اس کی زندگی اور موت کا سوال تھا مگر وہ بہت بہادر اور نڈر سپاہی تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر ایک نگاہ الی اور دیکھا کہ سب سپاہی خراٹے لے رہے ہیں اور ان کے بیچوں بیچ بارود کا ڈھیر پڑا ہوا ہے۔ علاوہ یں ہر ایک سپاہی کے پاس بندوق اور تلوار بھی ہے۔ اس کے بعد وہ پھاند کر واپس آیا اور اس نے پنے اعلیٰ فوجی افسر سے ماجرا کہہ سنایا اور درخواست کی کہ کوئی ایسی چیز اسے دی جائے جس سے آگ

لگ جائے۔ اس کا افسر بہت خوش ہوا اور ایک دیا سلائی کی ڈبیا جیب سے نکال کر دی۔ اپنے پاؤں پھر وہاں پہنچا اور سب سے اونچی والی دیوار پر بیٹھتے ہوئے دیا سلائی سلگانے لگا۔ مگر شاید نمی کی وجہ سے پہلے نہ جلی لیکن اس نے پھر کوشش کی۔ اس بار اس نے قلعے کی دیوار کے سوکھے پتھر سے رگڑا۔ رگڑتے ہی آگ پیدا ہوگئی دراصل شروع میں جب نئی نئی دیا سلائی ایجاد ہوئی تھی تو اس وقت اس میں اس طرح کا مسالہ استعمال ہوتا تھا کہ ذرا سی رگڑ سے بھی جل جاتی تھی۔ جیسے ہی دیا سلائی جلی اس نے فوراً بارود کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ بارود کے پاس پہونچتا تھا کہ اس میں آگ لگ گئی۔ اس سے بندوقیں یا بارود ہی نہیں جلی بلکہ قریب قریب سب سپاہی جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔

وہ وہاں سے پھر لوٹ کر اپنے خیمے میں آیا اور اپنے افسر کو اس واقعے سے مطلع کیا۔ اس کی بہادری اور دلیری کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور بہت سا انعام و اکرام دیا۔

بقیہ "دہلی سے پیرس" صفحہ ۱۶ سے آگے

گردن کے اشارے سے ہاں کہی۔ نام پوچھا تو بتایا "ستہ العرب" اس کے بعد نہ معلوم کیا کہنے لگا۔ بس 'ع' اور 'ق' کی آوازیں سمجھ میں آتی تھیں۔ وہیں ایک دکان بھی تھی۔ جس میں مقامی اور امریکن مال بکتا تھا۔ اسی دوکان پر ہندوستانی سکہ بھی لیا جاتا تھا۔ افسوس ہے کہ میری جیب میں کوئی ہندستانی سکہ نہیں تھا۔ ورنہ یہاں کام آتا۔ اڈے پر جتنے عرب ملازم نظر آئے وہ شکل وصورت سے بالکل ہندستانی معلوم ہوتے تھے۔ لباس، کوٹ پتلون۔ مگر بہت ہی گھٹیا صرف دو آدمی اپنے قومی لباس میں نظر آئے۔ دو آدمی اور دکھائی دئے۔ یہ شکل وصورت سے بالکل انگریز لگتے تھے۔ لیکن عربی بول رہے تھے نہ معلوم عرب تھے یا یہودی۔

ایک گھنٹے بعد ہم بصرہ سے بیروت کے لئے روانہ ہوگئے۔

(باقی آئندہ)

محمد رمضان ہلدوری

بونوں کا دیس

براعظم افریقہ کے بیچ میں کانگو نام کا ایک دریا مشرق سے مغرب کی جانب بہتا ہے۔ جس زمین
ر یہ دریا بہتا ہے اس کا بہت سا حصہ استوائی علاقے میں واقع ہے۔ اسی باعث یہاں سال بھر سخت گرمی
تی ہے اور سہ پہر کے وقت روزمرہ سارے سال بارش ہوتی ہے۔ نمی اور حرارت کی زیادتی کی وجہ سے
جا بہت ہی گھنے ہیں ایسے گھنے کہ سورج کی کرنیں ان سے ہو کر زمین تک نہیں پہنچ پاتیں۔ اس لئے
کہ دھوپ حاصل کرنے کی کوشش میں پیڑ اونچے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جن پر مختلف قسم کی بیلیں جال
طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ زمین پر اندھیرا رہتا ہے جہاں چھوٹی چھوٹی ندیاں اور دلدل ہیں۔ پیڑوں کی پتیاں
شاخیں ٹوٹ ٹوٹ کر ان میں گرتی اور سڑتی رہتی ہیں۔

جنگلوں میں بیسوں قسم کی چڑیاں پائی جاتی ہیں۔ جنگل چونکہ بہت گنجان ہیں اس لئے شیر، چیتا
بڑے جانوروں کی بہت کمی ہے۔ البتہ پیڑوں پر رہنے والے جانور ان جنگلوں میں کثرت سے ملتے
۔ ایسے جانوروں میں بندر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ بڑے جانوروں میں صرف ہاتھی پایا جاتا ہے۔
۔ اس میں کافی طاقت ہوتی ہے اس لئے یہ پیڑوں کو توڑ کر جنگل میں اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔ آگے

کے لئے ان جنگلوں میں راستے بنانا بہت مشکل ہے ایک مرتبہ اگر پیڑوں کو کاٹ کر راستے بنا بھی دئے جاتے ہیں تو چند روز بعد ہی اور تیزی سے اُگ آتے ہیں اور وہ راستے پھر بند ہی ہو جاتے ہیں

یہ جنگل خطرناک جانوروں بھرے پڑے ہیں۔ بڑے بڑے سانپ پیڑوں کے تنوں اور شاخوں میں لپٹے رہتے ہیں۔ کھنکھجورے، بچھو اور چھوٹے چھوٹے سانپ جیسے زہریلے جانوروں کی تو کوئی انتہا ہی نہیں۔ مکھی، مچھر، اور مختلف قسم کے ضرر رساں جراثیم اور کیڑے مکوڑے ایسی گرم مرطوب آب و ہوا کے علاقے میں بہت پیدا ہوتے ہیں۔

ایسے جنگلوں میں آدمی تو کیا جنگلی جانور بھی راستہ بھول جاتے ہیں۔ ان جنگلوں میں ایک بہت ہی چھوٹے قد والی ایک قوم رہتی ہے جن کو ہم بونے کہہ سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو انگریزی میں "پگمی" کہتے ہیں۔ ان کے قد ۴ فیٹ سے ساڑھے چار فیٹ تک ہوتے ہے۔ گرمی کی زیادتی کی وجہ سے ان کا رنگ کالا ہوتا ہے۔ بال گھنگھریالے ہوتے ہیں اور ہونٹ موٹے ہوتے ہیں جو آگے کو نکلے ہوتے ہیں۔ ان کے جسم اور چہرے سے جنگلی پن ظاہر ہوتا ہے۔

یہ بونے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں بنا کر رہتے ہیں جو لکڑی اور پیڑوں کی پتیوں سے بنی ہوتی ہیں۔ ان کا دروازہ بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اپنے گھروں میں لیٹ کر اندر جاتے اور باہر آتے ہیں ان کے گھروں میں مٹی کے برتن، کھانا، ہتھیار، اور پھل خاص کر کیلے رکھے ہوئے ملتے ہیں۔

بونے کیلے کے بہت شوقین ہوتے ہیں ایسے شوقین کہ ایک بونا ایک مرتبہ میں ساٹھ کیلے تک کھا جاتا ہے۔ یہ لوگ کیلوں کی تلاش میں جنگلوں کے کنارے کسی گاؤں کے باغ میں پہونچ جاتے ہیں اور کیلے توڑ کر ان کی جگہ گوشت باندھ دیتے ہیں گویا اس طرح سے کیلوں کی قیمت ادا کر دی جاتی ہے۔ جس زمانے میں پھل نہیں ملتے تو چوہے اور مینڈک پکڑ کر کھاتے ہیں۔ پانی سے انھیں سخت نفرت ہے۔ نہانا تو درکنار ہاتھ پاؤں بھی نہیں دھوتے۔ ہاتھی کا شکار کرنے میں یہ لوگ بہت چالاک ہوتے ہیں۔ اس کو مار کر گوشت کھا لیتے ہیں اور ہڈی دانت وغیرہ یورپ کی گوری قوموں کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں۔

تیر چلانے میں انھیں کمال حاصل ہے۔

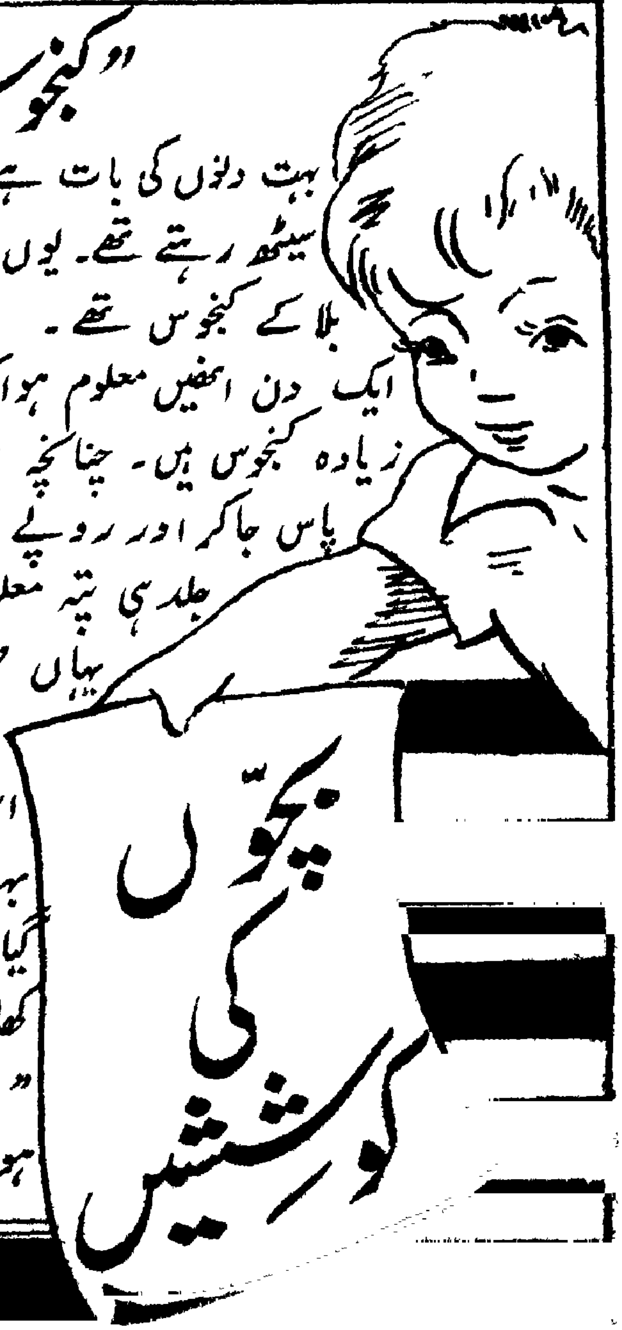
لوگ ایک مرتبہ میں چار تیر اتنی تیزی کے ساتھ چھوڑتے ہیں کہ پہلا تیر نشانے پر پہونچنے نہیں پاتا کہ آخری تیر ان کی چٹکی سے نکل چکتا ہے یہ لوگ شکار کھیلتے وقت پہلے تیر مار کر جانور کی آنکھ پھوڑ دیتے ہیں اور پھر ان کو مار کر گرا دیتے ہیں۔

عرب کے بدوؤں کی طرح یہ لوگ بھی ایک جگہ جم کر نہیں رہتے اور مختلف قبیلوں میں بٹتے رہتے ہیں۔ ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا ہے اور قبیلے کا ہر شخص اس کے حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے اتنی دور ہوتا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کا علم بھی نہیں ہوتا ایک قبیلے والے دوسرے قبیلے میں شادی نہیں کرتے۔ بونے دنیا کے دوسرے انسانوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ ذرا سی آہٹ بھی سن لیتے تو دور بھاگتے ہیں۔ ان کو گوشت اور کیلے دے کر مانوس کرایا جاتا ہے۔

ہاتھ کی انگلیوں سے یہ لوگ گنتی بھی ہیں۔ ہر عدد پر ایک انگلی اٹھا دیتے ہیں اس سے زبان میں گیت بھی گاتے ہیں۔ ان کی عمر بہت کم ہوتی ہے چالیس سال کا آدمی بہت بوڑھا خیال کیا جاتا ہے۔ بونے کپڑے کا استعمال نہیں جانتے۔ یا تو ننگے رہتے ہیں یا بہت کیا تو پیڑوں کے بڑے بڑے پتوں کو جھالر سی بنا کر کمر پر باندھ لیتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ بونوں کے قدم قدم پر خطرات ہیں۔ انہیں مشکلات و تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ اپنی آزادی کی زندگی کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتے اور خانہ بدوش کی زندگی ہی میں مگن رہتے ہیں۔

"کنجوس کا اُستاد"



بہت دنوں کی بات ہے۔ کسی شہر میں "کروڑی مل" نام کے ایک سیٹھ رہتے تھے۔ یوں تو ان کے پاس بہت روپیہ تھا۔ مگر یہ بلا کے کنجوس تھے۔

ایک دن انھیں معلوم ہوا کہ دہلی کے ایک سیٹھ جی ان سے بھی زیادہ کنجوس ہیں۔ چنانچہ انھوں نے سوچا کیوں نہ ہم ان کے پاس جاکر اور روپے بچانے کی ترکیبیں سیکھیں۔ پھر کیا تھا۔ جلد ہی پتہ معلوم کرکے دہلی آگئے۔ اور کنجوس کے یہاں مہمان بن کر پہنچے۔ جن کا نام "دمڑی لال" تھا۔ انھوں نے ہنستے ہوئے ان کا استقبال کیا۔ شام ہوئی تو کروڑی مل کو بہت بھوک لگی۔ آخر ان سے نہ رہا گیا۔ دمڑی لال سے بولے "بھئی کچھ کھانے کا انتظام تو کرو۔"

"ضرور ضرور!" سیٹھ جی توند سہلاتے ہوئے بولے "میں تو اسی لئے آپ کے

پاس آیا تھا۔ چلئے میں بازار میں آپ کو وہ روٹیاں کھلاؤں گا۔ جو راجے مہاراجے بھی نہ کھاتے ہوں گے۔"

یہ سن کر کروڑی مل کی ساری خوشیاں ہرن ہوگئیں۔ انھوں نے دل میں سوچا کہ "وہ بیکار یہاں آیا۔ اس سے زیادہ تو میں ہی پیسے بچا سکتا ہوں۔ کاش! میں یہاں نہ آتا۔ گاڑی کے پیسے ہی بچ جاتے۔ میں نے تو سوچا تھا کہ چلو گاڑی کا کرایہ جائے تو جائے پیسے تو زیادہ سے زیادہ بچا سکونگا۔ لیکن یہاں تو ایسے کھانے کھائے جاتے ہیں جو راجے مہاراجے بھی نہ کھاتے ہوں گے۔" آخر رونی صورت بنا کر وہ اس کے ساتھ ہولئے۔ ایک ہوٹل میں پہنچ کر دمڑی لال نے ہوٹل والے سے پوچھا "بھائی آپ کے پاس روٹیاں تازی ہیں یا باسی؟"

"اجی جناب! کھا کر تو دیکھئے۔ ہمارے یہاں کی روٹی، مکھن کی طرح ملائم اور مزے دار ہیں۔" ہوٹل والے نے اپنی ٹوٹی عینک صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔ دمڑی لال اپنے مہمان کی طرف مخاطب ہوئے جو سر جھکائے نہ جانے کیا سوچ رہے تھے۔

"دیکھئے کروڑی مل جی! یہ جناب کہتے ہیں کہ ہماری روٹی مکھن کی طرح ملائم اور مزیدار ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ مکھن تو روٹی سے اچھا ہی ہے۔ اس لئے کیوں نہ ہم مکھن ہی کھائیں۔" اور یہ کہہ کر وہ مکھن کی دوکان کی طرف دیکھنے لگے۔

"چلئے" دمڑی لال آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولے۔

"چلئے" کروڑی مل نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ اور یہ دونوں مکھن والے کی دوکان پر پہنچے۔ جاتے ہی دمڑی لال نے دوکاندار سے کہا۔

"کیوں جی؟ آپ کے پاس اچھا سا مکھن ہوگا؟"

"اجی وہ مکھن کھلاؤنگا۔ وہ مکھن کھلاؤں گا کہ آپ زندگی بھر یاد رکھیں گے۔ میرا مکھن بالکل زیتون کے

تیل کی طرح چکنا ہے۔

یہ سنتے ہی دمڑی لال کروڑی مل کی طرف مڑے "تب تو میرے خیال میں زیتون کا تیل ہی خریدنا چاہیئے۔" اور یہ کہتے ہوئے دونوں زیتون کے تیل کی دکان پر گئے۔ جاتے ہی دکاندار سے بولے "کیا آپ کے پاس خالص زیتون کا تیل ہے؟"

دکاندار نے رعب سے کہا۔

"اجی وہ تیل دوں گا کہ آپ دیکھتے ہی خوش ہو جائیں گے۔ بالکل پانی کی طرح چمکتا ہے میرا تیل۔"

دمڑی لال کروڑی مل سے بولے۔

"سیٹھ جی! تب تو پھر گھر ہی چلیئے۔ میں پانی سے آپ کی اچھی طرح خاطر کروں گا۔"

یہ کہہ کر دونوں گھر کی طرف مڑے اور گھر پہنچ کر جی بھر (یعنی پیٹ بھر) پانی پی لیا۔ رات کو سوتے وقت سیٹھ جی دل میں بولے "پرماتما کا شکر ہے کہ میرا یہاں آنا بیکار نہیں ہوا اور پہلے ہی دن ایک ترکیب سیکھ لی یعنی یہ معلوم ہو گیا کہ روپے پانی پی کر بھی بچائے جا سکتے ہیں۔"

صمد جمشید پوری

چار چور

ایک دن چار چور ایک بڑھیا کے گھر میں چوری کرنے گئے۔ پر وہ گھر میں نہ جا سکے۔ جب وہ تدبیر کر کے ہار چکے۔ تب ان میں سے ایک نے بڑھیا کی بھینس کو کھول دیا۔ بھینس کے چلنے کی آواز سُن کر بُڑھیا جب باہر نکلی۔ اسی وقت چوروں نے اُسے پکڑ کر ایک درخت سے باندھ دیا۔ بڑھیا کو باندھنے کے بعد چوروں نے اپنے سارے ہتھیار درخت کے نیچے رکھ دئے۔ اور چراغ جلا کر کافی سامان اٹھا کر لے گئے۔ لیکن چلتے وقت جلدی میں اپنے ہتھیار بھول گئے۔ صبح پولیس کو اطلاع دی گئی۔ اور پولیس نے دو تین روز میں ان چوروں کا پتہ لگا لیا

اور ان کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا۔ پولیس کے پاس کوئی گواہ نہیں تھا۔ مجسٹریٹ نے بہت سوچ وچار سے کام لیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اُن میں سے کسی نے اپنا قصور نہ مانا۔

آخر میں مجسٹریٹ کی سمجھ میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے فیصلہ سنا دیا اور کہا تم لوگ بے قصور ہو۔ جاؤ میں نے تم کو چھوڑ دیا۔ اور جب وہ کچہری کے باہر جانے لگے تو مجسٹریٹ نے پھر ان کو پکار کر کہا "جو فیصلہ ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب تم اپنے ہتھیار کیوں نہیں لے جاتے۔" مجسٹریٹ کی یہ بات سُن کر وہ بہت خوش ہوئے اور لوٹ کر اپنے ہتھیار لے جانے لگے تو مجسٹریٹ نے انھیں روک لیا۔ اور چوروں سے کہا "جب یہ ہتھیار تمہارے ہیں تو اور کون چور ہو سکتا ہے۔" یہ کہہ کر مجسٹریٹ نے اُن چوروں کو کڑی سزا دی۔

(محمد عثمان شریف ہانگل)

"وجہ"

میرے ایک قلمی دوست اختر حسین آگرے کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھے۔ ہم سے کئی سال سے خط و کتابت ہو رہی تھی۔ لیکن کسی نے بھی ایک دوسرے کی صورت نہ دیکھی تھی۔

ایک مرتبہ اختر حسین نے مجھے دعوت دی اور کئی خوشامدی خط لکھے۔ چنانچہ میں اُن کے یہاں پہنچا۔ گھر میں سے ایک موٹا تازہ آدمی نکلا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ یہی اختر حسین ہوں گے۔ انھوں نے آتے ہی مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اختر حسین نے میری خوب خاطر تواضع کی۔

ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا کہ آپ موٹاپے کا علاج کیوں نہیں کرواتے۔

"بہت علاج کئے مگر کچھ کم ہی نہیں ہوتا۔" اختر حسین نے کہا۔

"لیکن آپ موٹے کیسے ہوئے؟"

اختر حسین نے کہا کہ میرے موٹے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ میرے والد

بہت امیر آدمی تھے۔ گاؤں میں پانی کا قحط پڑا۔ گاؤں کے سب کنوئیں سوکھ گئے۔ لیکن ہمارے والد کا کنواں نہ سوکھا اب لوگوں نے اس کنوئیں میں سے پانی بھرنا شروع کر دیا سینکڑوں آدمی روزانہ پانی بھرتے۔ جب میرے والد نے اتنے آدمیوں کو پانی بھرتے دیکھا تو انھیں فکر ہوئی کہ کہیں کنواں نہ سوکھ جائے۔ انھوں نے ہر گھرانے کو ایک دن میں صرف میرے وزن کے برابر پانی دینا شروع کر دیا۔ مگر گرمی کے وقتوں میں اتنا پانی کسی کے لئے بھی کافی نہ تھا۔ ان لوگوں نے میرا وزن بڑھنے کے لئے دعا مانگی۔ خدا نے ان کی دعا قبول کرلی۔ اور ہم موٹے ہو گئے۔

(عابد حسین ایوتمحل)

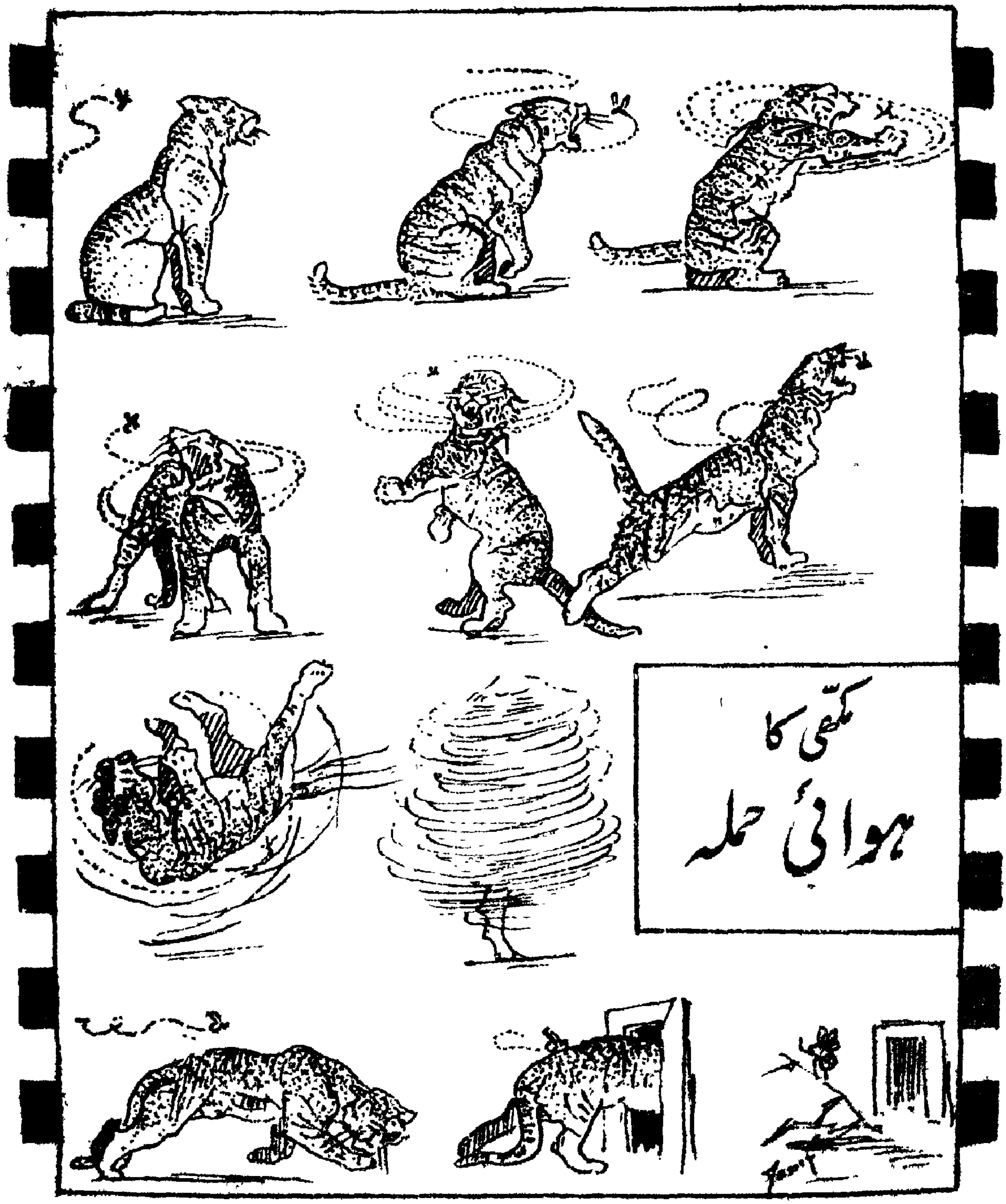
تین مصوّر

ایک مرتبہ تین مصوروں کی تصویروں کا مقابلہ ہوا۔ ایک مصور نے پھولوں کا بار اس خوش نمائی سے بنایا کہ شہد کی مکھی آئی اور یہ سمجھ کر تصویر پہ بیٹھ گئی کہ سچ مچ کے پھول ہیں۔

دوسرے مصور نے پھلوں کی تصویر بنائی۔ یہ پھل سب کے سب ٹوکری میں سجے ہوئے تھے۔ مصور نے ایسی تصویر بنائی کہ سچ مچ کے پھلوں کی ٹوکری معلوم ہوتی تھی۔ اُدھر سے ایک بیل آرہا تھا۔ اس نے جو یہ پھل کی ٹوکری دیکھی تو سچے پھل سمجھ کر اس کی طرف جھپٹا۔

تیسرے مصور نے ایک پردہ بنایا جو صاحب ان تصویروں کے جج بنائے گئے تھے انھوں نے تیسرے مصور کی تصویر دیکھنے کے لئے پردہ اٹھایا تو وہ یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ گیا کہ وہ پردہ نہیں تھا بلکہ دیوار تھی۔ وہ تصویر سب سے اچھی مانی گئی۔ اس لئے کہ اس نے ایک آدمی کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔

(جمیل اشرف نعمانی)
ثانوی سوم


مکھی کا
ہوائی حملہ

غوث انصاری



آپ نے پچھلے پرچوں میں پڑھا کہ غوث انصاری صاحب کس طرح پانی کے جہاز سے لورپول پہنچے۔ اب انھوں نے لورپول سے لندن تک کا ریل کا مختصر سفرنامہ بھیجا۔ ہمیں امید ہے کہ جناب غوث انصاری ہمیں آئندہ انگلستان کا آنکھوں دیکھا حال لکھیں گے۔ "ادارہ"

۴ ستمبر کو تقریباً ۳ بجے ہمارا جہاز لورپول کے ساحل سے جا لگا۔ اس وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور چاروں طرف ہلکا ہلکا اندھیرا تھا مگر اس کے باوجود شہر کی خوشنما عمارتیں ہمیں صاف نظر آرہی تھیں۔ تم نے شاید اپنی جغرافیہ کی کتاب میں اس شہر کا تذکرہ پڑھا ہو۔ یہاں جہاز بنانے کے بڑے بڑے کارخانے ہیں اور جہاز رانی کی صنعت کا بہت بڑا مرکز ہے۔ ویسے ہم لوگوں کو شہر گھومنے کا بالکل وقت نہیں مل سکا مگر جہاز کے عرشے پر ہی سے ہم نے تھوڑی بہت سیر کرلی۔ دیکھنے میں مکانات بہت خوبصورت لگ رہے

تھے۔ پہلی چیز تو یہ کہ کوئی مکان بھی دو منزل سے زیادہ اونچا نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ یہ اتنے ترتیب سے بنے ہوئے تھے کہ کوئی مکان بھی ادھر سے اُدھر قطار کے باہر نہیں تھا۔

جہاز رکتے ہی پاسپورٹ وغیرہ جانچنے کے لئے تمام افسران جہاز پر آگئے اور اُن کی کارروائی میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا۔ ہم لوگوں کو لندن تک کا ریل کا ٹکٹ بھی جہاز پر ہی مل گیا۔ کوئی ساڑھے چار بجے کے قریب ہم نے انگلستان کی سرزمین پر قدم رکھا، جہاں پتہ نہیں کب تک رہنا پڑے، کسٹم وغیرہ کی جانچ میں ایک گھنٹا صرف کرنے کے بعد ہم لوگوں نے ٹرین کا رُخ کیا۔ ہماری ٹرین کسٹم شیڈ سے لگی ہوئی تیار کھڑی تھی۔ یہ ٹرین مخصوص ہمارے جہاز کے مسافروں کے لئے تھی جس میں صرف ایک فرسٹ کلاس کا درجہ تھا اور باقی تمام تیسرے درجے تھے۔ پلیٹ فارم پر بالکل سناٹا تھا۔ صرف ہم ہی لوگ تھے۔ یہاں پر ہم اپنے اُن دوستوں سے رخصت ہوئے جو لندن نہیں جا رہے تھے۔

ٹھیک چھ بجے گاڑی نے سیٹی دی اور آہستہ آہستہ رینگنا شروع کیا۔ اس گاڑی میں ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں آنے جانے کا دروازہ تھا اور اس طرح سے گاڑی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آ جا سکتے تھے۔ تیسرے درجے میں بڑی آرام دہ سیٹیں تھیں۔ یوں سمجھو کہ کوئی ڈھائی فٹ لمبان کی سیٹ جس پر عمدہ قسم کے گدّے لگے ہوئے تھے ایک ایک آدمی کے بیٹھنے کے لئے مخصوص تھی۔ یہ سیٹیں دو دو آمنے سامنے تھیں جن کے بیچ میں ایک ایک میز بچھی ہوئی تھی۔

ہماری گاڑی لورپول سے نکل کر پہاڑی علاقے کو پار کر رہی تھی اور ہلکے ہلکے اندھیرے کے باوجود ہم

خوشنما مناظر کو دیکھ سکتے تھے۔ ہر طرف ہریالی تھی اور جہاں جہاں پر آبادی ملتی تھی وہاں مکانات چھوٹے چھوٹے خوبصورت اور باقاعدہ بنے ہوئے دکھائی پڑتے تھے۔ ویسے گاڑی بہت تیز رفتار سے جا رہی تھی اور نگاہ کسی ایک منظر پر نہیں جم پاتی تھی۔ مگر اس کے باوجود پہاڑی نالے اور چشمے اوپر سے اترتے ہوئے دکھائی دے جاتے تھے۔

گاڑی کے ریسٹوران کار میں ہم لوگوں نے رات کا کھانا کھایا اور لندن پہنچنے کا انتظار کرنے لگے۔ اب چونکہ کافی اندھیرا ہو چکا تھا اور باہر کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس لئے ہر ایک تھکا تھکا سا اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔

رات کو تقریباً ساڑھے دس بجے ہم لندن کے علاقے میں داخل ہوگئے۔ دونوں طرف خوب بجلی کی روشنی تھی اور ہم میں سے ہر ایک اترنے کی تیاری کر رہا تھا۔ ٹھیک گیارہ بجے گاڑی لندن کے ایوسٹن EUSTON اسٹیشن پر جا لگی۔ پلیٹ فارم پر پہلے ہی سے بہت سے لوگ اکٹھا تھے۔ ہر ایک کسی نہ کسی کو لینے آیا تھا۔ اور یہاں پر ہمارا چوبیس روز کا سفر ختم ہوگیا۔ اب ہم کوشش کریں گے کہ یہاں کی قابل دید چیزوں کے بارے میں آئندہ کبھی پھر لکھیں۔ اب اجازت دو۔



لطیفے

باپ: "بیٹا! دیکھو تمہاری پڑھائی میں ہمارا کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔"

لڑکا: "ابا جان! اسی لئے تو میں تھوڑا پڑھتا ہوں۔ تاکہ آپ کا روپیہ زیادہ خرچ نہ ہو۔"



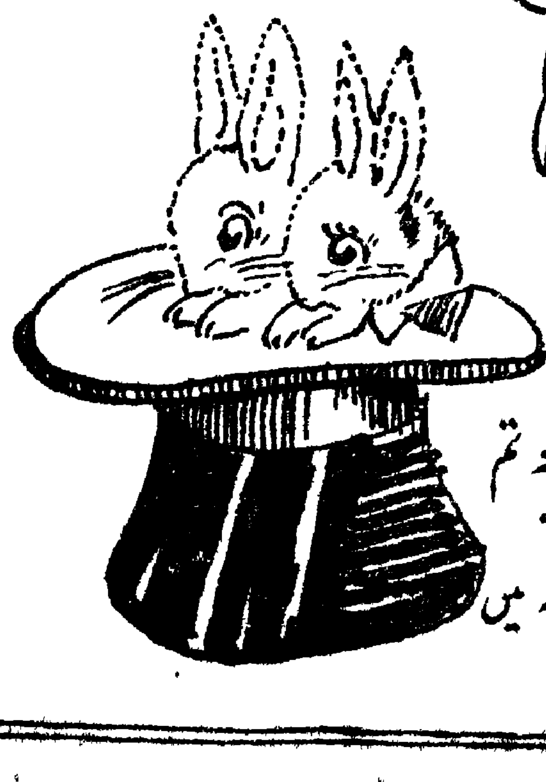
ماسٹر۔ بتاؤ کندن! کتّے کے کتنے کان ہوتے ہیں؟

کندن۔ دو۔

ماسٹر۔ اور کتنی آنکھیں؟

کندن۔ ماسٹر صاحب کیا آپ نے کتّا نہیں دیکھا۔

گوردیال سنگھ بھاٹیہ



بیوی: "کیوں جی جب میں گانا گاتی ہوں تو تم باہر جاکر کیوں بیٹھ جاتے ہو؟"

شوہر: تاکہ پڑوسیوں کو شک نہ ہو کہ میں تم کو مار رہا ہوں۔

لڑکا۔ امّی، کیا روشنائی بہت مہنگی آتی ہے۔
ماں۔ نہیں تو۔
لڑکا۔ پھر آپ ساری پر سیاہی گر جانے سے کیوں ناراض ہوتی ہیں۔
—— جسپال سنگھ بجاٹیا۔ جگسلائی

مریض۔ (ڈاکٹر سے) ڈاکٹر صاحب آپ نے میرے اوپر بڑا احسان کیا۔ میری جان بچا دی۔
ڈاکٹر۔ نہیں بھائی، اس میں میرا کیا احسان، سب بھگوان ہی کی کرپا ہے۔ اسی کا احسان مانو۔
مریض۔ یہ آپ نے اچھا بتا دیا۔ میں بھگوان کو فیس دے لوں گا۔

اُستاد۔ (شاگرد سے) "تم بہت شریر ہو، کل اپنے باپ کو بلا کر لانا۔ تمھاری حرکتیں ان کو بتاؤں گا۔"
شاگرد۔ "پھر تو مجھے پانچ روپے دیجئے میں بلا لاؤں گا۔"
اُستاد۔ "کیوں؟"
شاگرد۔ "اس لئے کہ میرا باپ ڈاکٹر ہے بغیر فیس لئے کسی کے گھر نہیں جاتا۔
—— ڈی، ایل، سنگھ ٹاٹانگر

ایک شخص۔ (اپنی ماں سے) اماں، مجھے رات کو باہر جانے سے ڈر لگتا ہے۔
ماں۔ بیٹا اب تو تم داڑھی مونچھوں والے ہو، اب بھی ڈرتے ہو۔
آدمی۔ داڑھی مونچھ کوئی مشین ہے جو ڈر نہ لگے۔

مجسٹریٹ۔ (ملزم سے) تمہارا کوئی گواہ ہے۔
ملزم۔ میرا خدا کے سوا کوئی گواہ نہیں۔
مجسٹریٹ۔ اچھا اسی کو بلاؤ۔
ملزم۔ جناب اگر آپ اس کو بلا سکیں تو میں ہی نہیں، ساری دنیا آپ کی ممنون ہو گی۔
—— اندر پال سنگھ۔ جگسلائی

صحیح حل　　فیس داخلہ ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں اور پانچ حلوں کی فیس ۴ر　　صحیح حل

دائیں سے بائیں　　　　۱۔ علم

۱۔ عادات　　　　۲۔ جیل

پیامی معمّہ نمبر ۱۹ کا شاندار نتیجہ

۴۔ سرور　　　　۳۔ تعلیم

۵۔ دوا　صحیح حل کوئی موصول نہیں ہوا۔ لہذا پہلا انعام مبلغ بارہ روپے ایک غلطی والے　۸۔ آگ

۶۔ احکام　آٹھ اشخاص پر بحساب ۱۸ر فی کس تقسیم کر دیا گیا

۷۔ اکبر　۱۔ جبندر سنگھ۔ جمشید پور۔ ۲۔ شریقہ بیگم۔ جودھ پور۔ ۳۔ عبدالرحمٰن۔ رڑکی۔ ۴۔ ایم۔ اے۔ رضا کرسٹی ۵۔ محمد اکبر۔ کان پور۔ ۶۔ محمد انور۔ اجنٹہ۔ ۷۔ عبدالسلام۔ جودھ پور۔ ۸۔ محمود عالم انصاری۔ پرتاب گنج۔

دوسرا انعام مبلغ نو روپے دو غلطی والے اٹھارہ اشخاص پر بحساب ۸ر فی کس تقسیم کیا گیا

۱۔ رضیہ بیگم۔ ایلچ پور۔ ۲۔ مامونہ بیگم۔ جودھ پور۔ ۳۔ بھیا سید آفتاب حسن۔ سہارن پور۔ ۴۔ بدرالحسن۔ جامعہ نگر ۵۔ محی الدین بابا۔ سنگشور۔ ۶۔ مانیٹر جماعت پنجم۔ رتنا گری۔ ۷۔ ایس۔ ایم۔ انظار احمد۔ دھوا۔ ۸۔ عبدالرحمٰن محمد عثمان تعلقہ بدالی۔ ۹۔ حافظ رشید احمد۔ سانحہ۔ ۱۰۔ ظہیرالدین۔ جامعہ نگر۔ ۱۱۔ عبدالقادر۔ جہ بکوڑی ۱۲۔ اقبال النساء کھام گاؤں۔ ۱۳۔ جیپال سنگھ بھاٹیہ۔ جگسلائی۔ ۱۴۔ ضیاءالحسن اناؤ۔ ۱۵۔ محمد سلیمان بیگ۔ جامعہ نگر۔ ۱۶۔ حافظ محمد عبداللہ ہلدور۔ ۱۷۔ اقبال حسین۔ ایوت محل۔ ۱۸۔ تہذیب جہاں بیگم۔ سکھر (پاکستان)

پیامی معمّہ نمبر ۲۰ کا صحیح حل

دائیں سے بائیں　　　　اوپر سے نیچے

۱۔ سچ ۲۔ رنگ ۳۔ جتانے۔ ۸۔ شدت۔ ۹۔ راہ ✱ ✱ ۴۔ ابتدا۔ ۵۔ نادان۔ ۶۔ ذوق۔ ۷۔ جان۔

نوٹ:۔ پیامی معموں سے دلچسپی لینے والے حضرات مندرجہ ذیل پانچ باتوں کا خیال ضرور رکھیں۔

۱۔ ٹکٹ کسی کاغذ پر ہرگز نہ چپکائیں۔　　۲۔ پتہ پر معمہ نمبر ضرور لکھیں۔

۳۔ حل بھیجنے کے لئے آخری تاریخ کا انتظار نہ کریں

۴۔ بغیر فیس والے حل شریک مقابلہ نہیں کئے جائیں گے

ضروری اطلاع	پیامی معمہ نمبر ۲ میں انعام پانے والوں کے نام اپریل کے شمارہ میں دئے جائیں گے

۵۔ معمّے کے بارے میں ہر قسم کی شکایت ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک ضرور آجانی چاہیئے

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔

۳۵ روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۲۳ روپے ★ دوسرا انعام ایک غلطی پر ۱۲ روپے ★

داخلہ کی آخری تاریخ ۲۵ مارچ ۵۲ء ★

پیامی معمہ نمبر ۲۱

[redacted]	۶ ب	۵	۴ م	۳ ا	۲ ح	۱ پ
۷	ا			د	ا	چ
		ی	ا	ب	د	
ا		[redacted]	[redacted]			س
ی		و	۹ ر		ی	۸ ں
			ت	ل		۱۰
			ت		و	۱۱ د

دائیں سے بائیں

۱۔ بچوں کا پیارا ماہنامہ ..... تعلیم۔

۸۔ بغیر تحقیق کیے کسی کو ... سمجھ لینا عقل مندی نہیں۔ (نیک۔ پنچ)

۹۔ انسان محنت سے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ (روزی۔ روٹی)

۱۰۔ اس سے کبھی بنا بنایا کام بھی بگڑ جاتا ہے۔ (عجلت۔ غفلت)

۱۱۔ اگر وقت پر کام نہ آئے تو اس سے فائدہ؟ (دوست۔ دولت)

اوپر سے نیچے

۱۔ پیامی معمہ نمبر ۲۵ کا انعام پچاس روپے ہوگا۔

۲۔ ہر وقت خدا کو .. کرو (یاد)

۳۔ بڑوں کا ..... کرنا چاہیے۔ (ادب)

۴ ..... کو وطن بہت یاد آتا ہے۔ (مسافر۔ مہاجر)

۵۔ اس کی ہر جگہ عزت ہوتی ہے۔ (وزیر۔ صدیق)

۶۔ ..... کا سلیقہ ہر ایک کو متاثر کرتا ہے (باغ۔ بات)

۷۔ دنیا میں ..... ہو تو بگڑے کام بھی بن جاتے ہیں (صفائی۔ سچائی)

کوپن پیامی معمہ نمبر ۲۱

نام ....

پتہ ....

کوپن پیامی معمہ نمبر ۲۱

نام ....

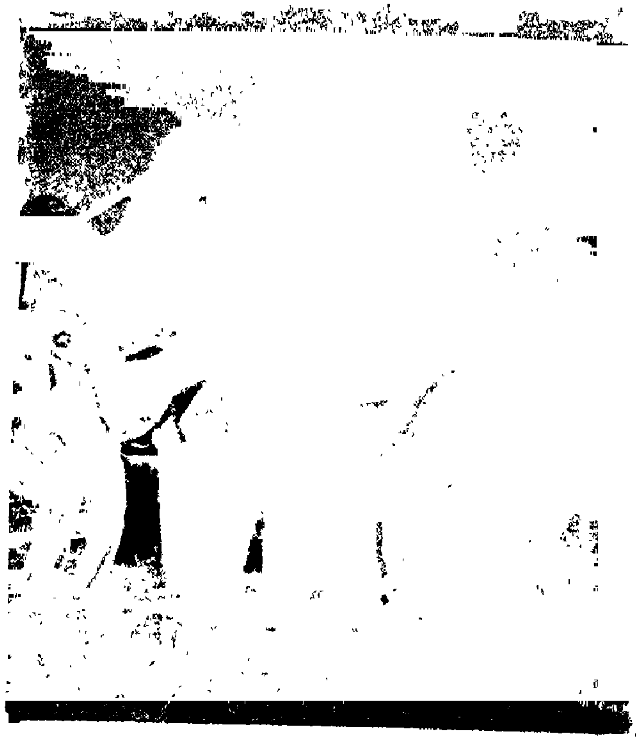
پتہ ....

حل اور فیس بھیجنے کا پتہ:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی

پرنٹر پبلشر حامد علی خاں

مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی



ارے بھائی سنبھل کر



مگر اب آسمان چھونے کا ارادہ ہے کیا؟

Regd. No. D. 96.
MARCH 1953.





پیام تعلیم
دہلی
ادارہ
حامد علی خاں
اطہر پرویز



مرزا غالب

اندر کے صفحات میں رشید عثمانی صاحب کا مضمون ''مرزا غالب'' پڑھئے



پیدائش	شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی	وفات
۳۱ دسمبر ۱۹۰۱ء		۲ اپریل ۱۹۵۳ء

شفیق صاحب کی یاد میں

۲۰؍اپریل ۱۹۵۳ء کی شام جامعہ کی برادری کے لئے شامِ غم بن کر آئی۔ اس شام جامعہ کا وہ آب دار موتی ہم سے چھن گیا جس کی قدر و قیمت سب پہچانتے تھے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

شفیق صاحب تقریباً دو مہینے سے بیمار تھے اور ولنگڈن ہسپتال میں علاج ہو رہا تھا۔ ابتداء میں تو یہ خیال نہ تھا کہ وہ اچھے نہ ہوسکیں گے لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے اُن کی بیماری خطرناک ہوتی گئی۔ ہندوستان کے بہترین ڈاکٹروں کا مشورہ حاصل تھا لیکن خدا کو منظور نہ تھا، صحت نہ ہوئی۔

شفیق صاحب جامعہ کے بڑے ہردلعزیز اُستاد تھے۔ بچوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ جس سے ملتے ہنس کر بات کرتے۔ جہاں پہنچ جاتے زندگی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی۔ چھوٹے بڑے سب اُنھیں گھیر لیتے۔ مزے مزے کی باتیں کرکے خود خوش ہوتے اور دوسروں کو خوش کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی زندگی کا مقصد ہی ہنسنا اور بولنا ہے جامعہ میں وہ طالب علم بھی رہے اور اُستاد بھی یہاں رہ کر اُنھوں نے بہت بڑے بڑے کام کئے اور سینکڑوں آدمیوں سے کام لئے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنے ساتھیوں کا دل دکھایا ہو۔ اپنی عزّت بڑھانا اور دوسروں کو ذلیل کرنا تو اُن کے نزدیک ایک بڑا گناہ تھا

شفیق صاحب ۳۱ ردسمبر ۱۹۰۱ء کو بڑاگاؤں بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول تک بارہ بنکی میں پڑھا۔ پھر علی گڈھ کالج میں داخل ہوئے کچھ دن بعد مہاتما گاندھی نے ملک میں آزادی کی تحریک شروع کی تو شفیق صاحب بھی اس تحریک میں شامل ہوگئے۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی نے علی گڈھ میں جامعہ کی بنیاد رکھی علی گڈھ کالج کے بہت سے طالب علم اپنا کالج چھوڑ کر جامعہ آگئے۔ ان ہی میں شفیق صاحب بھی تھے۔ یہ اب سے کوئی ۳۲ سال پہلے کی یعنی

۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ اُس زمانے میں جامعہ میں ایسی پڑھائی نہیں ہوتی تھی جیسی اب ہوتی ہے۔ نہ چھوٹے بچوں کی پڑھائی کا انتظام تھا۔ ایف اے، بی اے کے طالب علموں کو ایسی باتیں بتائی جاتی تھیں جنھیں سیکھ کر وہ اچھی اچھی تقریریں کرسکیں۔ پھر ملک میں جائیں اور لوگوں کو اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لئے اُبھاریں۔

شفیق صاحب بہت اچھی تقریر کرنا جانتے تھے۔ اُنھوں نے بھی جامعہ کے اور طالب علموں کی طرح ملک کا دورہ کیا اور لوگوں سے کہا کہ اپنے ملک کو آزاد کرانے میں مہاتما گاندھی کی مدد کرو۔ اُس زمانے میں ہندوستان پر انگریز حکومت کرتے تھے۔ انگریزی سرکار نے اُنھیں گرفتار کرکے جیل خانے بھیج دیا۔ جب ایک سال کے بعد رہا ہوئے تو پھر جامعہ آئے۔ اب جامعہ میں باقاعدہ تعلیم شروع ہوگئی تھی۔ اچھے اچھے پروفیسر رکھے گئے تھے۔ شفیق صاحب نے بھی دوبارہ پڑھائی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور ۱۹۲۳ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ بی اے کے بعد جامعہ ہی میں کام شروع کر دیا۔ اس وقت جامعہ علی گڈھ سے دہلی لائی جاچکی تھی۔ اُستاد بھی کم رہ گئے تھے اور طالب علم بھی گنتی کے تھے۔ روپیہ بھی نہ تھا۔ نہ یہ اُمید تھی کہ جامعہ آیندہ قائم رہ سکے گی۔ شفیق صاحب اور اُن کے ساتھی یہ عہد کرچکے تھے کہ جامعہ کو بند نہ ہونے دیں گے۔ عجب زمانہ تھا۔ چند جوشیلے نوجوان ملک کی بھلائی کی خاطر ہر طرح کی تکلیفیں اُٹھاتے اور ایک اچھے مستقبل کے خواب دیکھتے۔ ان کو سہارا دینے والے بہت کم تھے اور ان کی ہنسی اُڑانے والے بہت زیادہ۔ شفیق صاحب مذاق اُڑانے والوں کے ساتھ ایسی باتیں کرتے کہ وہ خود شرمندہ ہو جاتے۔ دراصل اُس زمانے میں جامعہ کے روح رواں شفیق صاحب ہی تھے۔

ایک سال اسی طرح گزر گیا۔ پھر ذاکر صاحب، مجیب صاحب اور عابد صاحب جرمنی سے تعلیم پاکر آئے اور جامعہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔

جامعہ علی گڈھ سے دہلی آئی تو اس کا سب سامان تتر بتر تھا۔ شفیق صاحب نے کتب خانے کی ترتیب اپنے ذمے لی لیکن دراصل اُن کا خاص کام یہ رہا کہ جامعہ والوں میں مایوسی نہ پیدا ہونے دیں۔ دوسری طرف ذاکر صاحب نے جامعہ میں پڑھائی کا بہت اچھا انتظام شروع کیا۔ اور

بچوں کی تعلیم پر سب سے زیادہ توجہ دی۔

۱۹۳۰ء میں مہاتما جی نے آزادی کی تحریک پھر شروع کی تو شفیق صاحب جامعہ سے چھٹی لے کر پھر مہاتما جی کے ساتھ آزادی کی لڑائی میں شریک ہوگئے۔ سرکار نے اُنھیں دوبارہ گرفتار کیا اور جیل بھیج دیا۔ دس برس جامعہ میں رہنے کے بعد شفیق صاحب اور اُن کے ساتھی یہ سمجھ چکے تھے کہ اب جامعہ ہی ہم سب کا گھر ہے چنانچہ جیل سے رہا ہونے کے بعد شفیق صاحب سیدھے جامعہ آئے۔

اِس زمانے میں جامعہ کی مالی حالت اور بھی خراب ہو چکی تھی۔ لوگوں کو کئی کئی مہینے تنخواہ نہ ملتی تھی۔ اب شفیق صاحب نے حلقۂ ہمدردانِ جامعہ قائم کرکے جامعہ کے لئے روپیہ جمع کرنے کا کام شروع کیا۔ وہ لوگوں کو سب سے زیادہ یہ بتاتے تھے کہ جامعہ کتنے اچھے اچھے کام کر رہی ہے۔ وہی لوگ جو پہلے اپنی نادانی کی وجہ سے اُن کی مخالفت کرتے بعد کو خود شفیق صاحب کی اچھائیوں سے اثر لے کر جامعہ کی مستقل مدد کا وعدہ کرتے۔

شفیق صاحب نے ملک کے کونے کونے کا دورہ کیا اور لاکھوں آدمیوں کے دلوں میں جامعہ کی محبت پیدا کی۔ جہاں جاتے لوگ دل ہی دل میں مان لیتے کہ اگر جامعہ کے لوگ ایسے سچے اور اچھے ہیں تو جامعہ کو قائم رکھنا ہمارا فرض ہے۔ حلقۂ ہمدردانِ جامعہ مضبوطی سے قائم ہوگیا تو شفیق صاحب اس سے الگ ہو گئے۔

اب انھوں نے بے پڑھے لکھے بالغوں کی تعلیم کا کام شروع کیا۔ اُنھیں برسوں ملک کا دورہ کرکے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ جب تک ملک سے جہالت دور نہ ہوگی ملک کی ترقی نہ ہو سکے گی۔ شفیق صاحب نے تعلیم کا کام پھیلانے والے اس نئے ادارے کا نام "ادارۂ تعلیم و ترقی" رکھا۔ اِس ادارے نے عام لوگوں کی تعلیم اور ترقی کے لئے بہت سے مرکز قائم کئے اور کئی سو آسان آسان کتابیں چھاپیں۔ شفیق صاحب کے اس کام سے ملک بھر میں جامعہ کی عزت اور بڑھ گئی۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا۔ لیکن اس زمانے میں لوگوں میں کچھ ایسے لڑائی جھگڑے تھے کہ آزادی خطرے میں پڑتی ہوئی نظر آئی۔ شفیق صاحب نے اپنا کام اور بھی مستعدی اور پختہ عقیدے سے آگے بڑھایا۔ روزانہ اپنے سب مرکزوں

کا پیدل گشت کرتے اور کسی خطرے کو خاطر میں نہ لاتے۔

۱۹۵۱ء میں وہ تعلیم بالغان ہی کے کام کے سلسلے میں ایک سال کے لئے انڈونیشیا گئے۔ ابھی وہ انڈونیشیا میں تھے کہ ملک میں نئے انتخابات ہوئے۔ کانگریس نے شفیق صاحب کو دہلی کے ایک حلقے سے اپنا نمائندہ نامزد کیا۔ جب اور نمائندے اپنی کامیابی کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے تھے، شفیق صاحب انڈونیشیا میں اپنے میں لگے ہوئے تھے۔ کیوں نہ ہو اُن کے ساتھی جو موجود تھے۔ اُنھیں اپنے آرام سے زیادہ شفیق صاحب کی کامیابی کا خیال تھا۔

انتخاب میں کامیابی کے بعد شفیق صاحب کو اپنے تعلیمی تجربے اور ملنسار طبیعت کے سبب دہلی کے صوبے کا وزیر تعلیم بنایا گیا۔ وزیر بن کر انھوں نے اور بھی اچھے اچھے کام کئے۔ دوسروں سے ملتے اس طرح کہ لوگ آپ ہی آپ اُن کے گرویدہ ہو جاتے۔ مخالف بھی اُن کی عزت کرتے۔ مخالف اخبار اور لوگوں کی تو برائیاں کرتے تھے لیکن اِن کو دکھ پہنچانا ٹھیک نہ سمجھتے تھے۔ دیکھو یہ کتنی بڑی بات ہے۔

ابھی وزیر بنے ایک سال ہی ہوا تھا کہ اللہ میاں نے اُنھیں اپنے پاس بلا لیا۔ بیماری میں سینکڑوں آدمی اُن کا مزاج پوچھنے اسپتال جاتے اور صحت کے لئے دعا کرتے۔ انتقال ہوا تو ہر شخص صدمے سے نڈھال ہو گیا۔ جنازے کے ساتھ جو تھا اُسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خود اُس کا کوئی قریبی عزیز ہمیشہ کے لئے جدا ہوا ہے۔

جامعہ شفیق صاحب کا گھر تھی۔ اس لئے اُن کی آخری آرام گاہ بھی جامعہ نگر قرار پائی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ اُن کی اچھائیوں سے کچھ سیکھیں اور ملک میں جامعہ کا نام اور روشن کریں۔



پیام تعلیم

اپریل ۵۳ء

ادارہ

حامد علی خاں بی ، اے (جامعہ)

اطہر پرویز ایم ، اے (علیگ)



فہرست



بچوں سے باتیں

اس بار کھلی ہوا کا مدرسہ بہت کامیاب رہا اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ ابتدائی کی طرح اس بار ثانوی اسکول نے بھی کھلی ہوا کا مدرسہ کیا۔

مدرسہ ابتدائی نے یہ مدرسہ حوض خاص پر کیا جو قطب کے قریب ہونے کے علاوہ نئی دہلی سے بھی زیادہ دور نہیں ہے۔ چنانچہ لڑکوں نے تاریخی مقامات کے ساتھ ساتھ ہوائی اڈا، مغل گارڈن، گوالیار پاٹری وغیرہ وغیرہ کی سیر بھی کی۔ مدرسہ ثانوی کے لڑکوں نے ہمایوں کے مقبرے کے پاس اپنا کیمپ کیا۔

ہم نے مدرسہ ابتدائی کے کھلی ہوا کے مدرسے پر نجمہ سلطان صاحبہ سے ایک مضمون خاص طور پر لکھوایا تھا۔ ہماری درخواست پر نجمہ صاحبہ نے مضمون تو لکھ دیا مگر یہ اتنا بڑا ہوگیا تھا کہ ہم اس بار اپنی کوشش کے باوجود نہ چھاپ سکے۔ مضمون دلچسپ اتنا ہے کہ اس کو مختصر کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کو ایک ہی پرچے میں پورے کا پورا

چھاپا جائے۔ بعض ساتھیوں کی رائے ہے کہ اس کو دو قسطوں میں کرکے چھاپیں۔ ہم اس کا فیصلہ پیامیوں پر رکھتے ہیں۔ ہمیں اپنی رائے لکھئے کہ مضمون ایک پرچے میں دیا جائے، یا دو قسطوں میں۔ ہمارے پاس اس کھلی ہوا کے مدرسے کی بڑی اچھی اچھی تصویریں ہیں۔ ان تصویروں کی وجہ سے آپ یہ مضمون اور بھی دلچسپی سے پڑھیں گے۔ ہمیں آپ کے خطوط کا انتظار رہے گا۔

"مرزا غالب" پر جناب رشید نعمانی نے بڑا مزیدار اور معلوماتی مضمون لکھا ہے جو اس پرچے میں چھپ رہا ہے۔ ہمیں تو یہ مضمون پسند آیا۔ مگر بعض ساتھیوں کا خیال ہے کہ پیامی اس سے زیادہ فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے۔ اگر مضمون پڑھنے کے بعد پیامی ہمیں اس سلسلے میں اپنی رائے لکھیں اور یہ بتائیں کہ انھوں نے اس مضمون کو اچھی طرح پڑھا اور سمجھ لیا تو ہمیں آئندہ اس طرح کے دوسرے مضمون شائع کرنے میں مدد ملے گی۔

آپ چاہیں تو اور دوسرے مضامین کے بارے میں بھی اپنی رائے لکھئے۔ اس طرح ہم پیام تعلیم کو آپ کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور دلچسپ بنا سکیں گے۔

مُشتاق بھائی

دہلی سے پیرس

سہ پہر کو تین بجے ہم بیروت پہنچے۔ بیروت بحر روم کے ساحل پر آباد ہے۔ اس کا ایک حصّہ ڈھلان پر واقع ہے۔ ڈھلوان زمین تقریباً بیچ شہر سے شروع ہوکر ساحل کا منہ چومتی ہے۔ لبِ ساحل تک عمارتیں کھڑی ہیں۔ بہت بڑا شہر ہے اور بہت ہی شاندار۔ چوڑی اور صاف سڑکیں، اونچی عمارتیں، ہوائی جہاز کا اڈا بہت بڑا ہے۔ اڈّے کے تمام افسر شکل و صورت سے بالکل انگریز معلوم ہوتے ہیں۔ بولی عربی۔ ان کی ایک اک حرکت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزاد قوم کے لوگ ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کے برتاؤ، بات چیت، غرض ہر حرکت میں شان تھی۔ میں یہاں صرف ایک رات ٹھہرا۔ اس لئے لوگوں کی معاشی زندگی کا کچھ اندازا نہیں کر سکا۔ پھر زبان کی دقت ایسی کہ کچھ نہ پوچھئے۔ بہر حال ٹیکسی ڈرائیور جو قمیض پہنے ہوئے تھا وہ پانچ روپے گز سے کم کی نہ ہوگی۔ یہاں موٹریں داہنی طرف سے چلاتے ہیں اور بے انتہا تیز۔ ہماری ٹیکسی ۱۲۰ میل فی

گھنٹے کی رفتار سے جا رہی تھی۔ ادھر سے اتنی ہی تیزی سے دوسری کار آتی نظر پڑی۔ دونوں کاریں بیچ سڑک میں تھیں۔ جب ہمارا ڈرائیور نزدیک پہنچا تو وہ داہنی طرف کو کاٹنے لگا۔ مجھے چونکہ ابھی تک اس کا اندازہ نہیں ہوا تھا کہ یہاں داہنی طرف سے چلتے ہیں۔ اسی لئے میرے منھ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ اب ٹکر ہوئی۔ اور دونوں کاریں پاش پاش ہو جائیں گی۔ لیکن خیر—

جس ہوٹل میں مجھے ٹھہرایا تھا۔ وہ بہت ہی شاندار تھا۔ بیرے عموماً نوعمر لڑکے تھے۔ میرے کمرے کا بیرہ ذرا ذرا انگریزی بولتا تھا۔ میں نے چائے منگوائی۔ سوچا اس کو بھی پلاؤں اور کچھ الفاظ کے ذریعے اور کچھ اشاروں کے ذریعے یہاں کے مسلمانوں کا حال پوچھوں۔ اس نے اپنا نام علی بتایا۔ میں نے پوچھا "مسلم" تو جواب ملا۔ "نو، کرسچین" مجھے تعجب ہوا کہ علی اور کرسچین! — ۴ کیپسٹن سگرٹ، دو پیالی چائے، ایک ماچس اور ایک معمولی پنسل کی قیمت ۴ شلنگ یعنی کوئی چار روپے ہوئی۔ ہمارے یہاں زیادہ سے زیادہ دو روپیہ کی ہوگی۔ لیکن یہہ علاقہ چونکہ رئیسوں کا تھا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ یہاں قیمتیں بہت زیادہ ہوں۔

عورتوں کو برقعے میں دیکھا۔ لیکن عجب بات یہ تھی کہ نوجوان عورتوں کے منھ عموماً کھلے ہوئے تھے۔ ہاں بوڑھی عورتیں ایک دوپٹہ منھ پر ڈالے ہوئے تھیں۔ ترکی ٹوپیاں بہت کم نظر آئیں۔ اس طرح عربی لباس میں تو کہیں کہیں لوگ نظر آئے۔ صبح میں ٹہلنے نکلا۔ مسجدیں بہت کم نظر آئیں۔ راستے میں ایک اچھی خاصی مسجد ملی بہت ہی صاف ستھری، ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ ایک کونے میں، مسجد کے اندر ہی پھول اُگے تھے اور جا بجا پھول سجا دئے گئے تھے۔ اس سے ملی ہوئی

ایک عمارت تھی۔ اس پر عربی میں لکھا تھا "صلاح الدین ایوبی کا مدرسہ" لیکن عمارت سے غربت ٹپکتی تھی۔

آخر میں آپ کو اپنی ایک حماقت بھی سنا دوں۔ غسل خانہ اتنا شاندار تھا کہ اس میں بار بار جانے کو جی چاہتا تھا۔ ادھر ادھر جو سوئچ یا بٹن لگے تھے۔ سب کا مقصد سمجھ میں آیا۔ ایک چھوٹے سے بٹن کا مقصد جو عین ٹب کے اوپر ذرا سا دیوار سے باہر نکلا ہوا تھا۔ بالکل سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے طے کیا کہ اس کو دبا کر دیکھنا چاہیئے کہ کیا ہوتا ہے۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ ہوئی، پھر ہمت کی اور بٹن دبا دیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور ہوٹل کی ایک ملازمہ نے اندر گردن ڈال کر کہا "YES SIR" ــــ سخت شرمندگی ہوئی۔

بیروت سے روم

آگے جانے کے لئے جو جہاز ملا وہ بہت ہی بڑا اور آرام دہ تھا۔ یہ دو منزلہ جہاز تھا۔ اوپر کی منزل میں ۴۴ سیٹیں تھیں۔ آواز نہ ہونے کے برابر تھی۔ ذرا بھی جنبش نہیں کرتا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم بحر روم کے اوپر تھے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی نیچے بحر روم کا نیلا پانی پھیلا دکھائی دیتا تھا۔ اب ہم جزیرہ سائی پرس CYPRUS کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ یہ جزیرہ بالکل پہاڑی ہے۔ انہیں پہاڑیوں میں سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑکیں اور باریک نلی کی طرح دریا نظر آتے تھے۔ آبادی بس کہیں کہیں نظر آتی تھی۔ اب جزیرہ رہوڈس RHODES کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ یہ وہی جزیرہ ہے جہاں کی مرغیاں مشہور ہیں۔ افسوس ہے کہ اتنی بلندی سے کوئی مرغی نظر نہ آئی۔ یہ جزیرہ چھوٹا سا ہے۔ اور سائی پرس کی طرح بالکل پہاڑی۔ یہ ترکی کی سرزمین کو چھوتا ہے۔ جہاز نے اعلان کیا کہ آپ کو بائیں طرف ترکی کے

ں پر ایک سو فٹ اونچا مجسمہ نظر
گا۔ یہ دوسری صدی عیسوی میں
تھا اور یہاں آگے موسم خراب
" یہ سن کر جی میں ہول سما گیا۔
کوشش کی مگر مجسمہ نظر نہ آیا۔
جہاز نے رنگ دکھانا شروع کیا
کھٹ سے اوپر، کبھی کھٹ سے
ڈر لگتا تھا کہ کہیں تے نہ ہو
ے۔ ولے بخیر گزشت۔

اب ہم اٹلی کے اوپر سے گزر رہے
۔ نیچے آبادی ہی آبادی۔ سڑکیں
باغات۔ یہ وہی انگور کے باغات
جو ساری دنیا میں اپنی عمدہ شراب
لئے مشہور ہیں۔ اب ہم روم کی
میں داخل ہو چکے ہیں۔ باہر دھوپ
تیز ہے۔ گو جہاز کے اندر خنکی ہے۔

م سے پیرس

۲۰ر کو ۴ بجے ہم روم پہنچے
اڈا معمولی تھا۔ ہوائی اڈے
عام طور پر مسافر ہوتے ہیں اس
لوگوں کی بھیڑ سے پتہ لگانا مشکل
تھا کہ اٹلی کے باشندے کیسے ہوتے
ہیں۔ لیکن کچھ دیر میں وہاں کے اصل
باشندے آئے۔ لباس سے غربت
ٹپکتی تھی۔ عبرت ہوتی تھی کہ یہ مسولینی
کی قوم کے لوگ ہیں۔ دکھنی اٹلی والوں
کے پاس کھانے کو بھی مشکل سے جڑتا
تھا (یہ بات پیرس میں اٹلی کی ایک
استانی نے مجھے بتائی) اڈے پر
بہت سی دکانیں تھیں۔ چیزیں گراں
تھیں۔ میں نے کارڈ سائز کی دو تصویریں
خریدیں۔ ہر ایک کی قیمت ڈیڑھ روپیہ
جہاز میں کچھ خرابی آگئی تھی۔ اس لئے
وہ ایک گھنٹے بعد روانہ ہوا۔ اب
ہم کارسیکا کے اوپر سے گزر رہے
تھے۔ یہ وہی جزیرہ ہے جہاں نپولین
کو قید کیا گیا تھا۔ چھوٹا سا جزیرہ،
بالکل پہاڑی۔ پہاڑیوں پر سڑکیں
یوں معلوم ہوتی تھیں جیسے کسی نے
سفید رسی ٹیڑھی میڑھی پھیلادی ہو
اب ہم نیس NICE سے آگے بڑھ
چکے ہیں۔ تھوڑی دیر میں پیرس آنے

والا ہے۔ اب بادل گھنے ہوتے جا رہے ہیں۔ بعض جگہ بادل اتنے گھنے تھے کہ جہاز اُن کے اندر چھپ جاتا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دور پر بادل کے پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دھنی ہوئی روئی کے پہاڑ بنا کر کھڑے کر دئے گئے ہوں۔ بادلوں کا سلسلہ لامتناہی تھا۔ جہاز ۱۸ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ گو جہاز کے اندر خنکی تھی لیکن سورج میں خاصی تیزی تھی۔ غالباً بلندی کی وجہ سے ایسا ہو۔ کیونکہ ہمیں جو کاغذ کی گھڑی دی گئی تھی اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ پیرس میں اس وقت شام ہوچکی ہے۔ یعنی پونے سات بجے تھے (دلی میں رات کے پونے گیارہ بجے ہوں گے) یہ گھڑی دلچسپ چیز ہے۔ اس لئے کہ اس سے بیک وقت دنیا کے سارے ملکوں کا ٹائم معلوم کیا جا سکتا ہے۔

۹ بجے رات کو ہم پیرس کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ جہاز سے باہر نکلتے ہی میرے دانت بجنے لگے۔ غضب کی سردی تھی۔ اور میرے پاس صرف ایک کوٹ تھا۔ اڈے پر تقریباً آدھا گھنٹا لگا۔ اس کے بعد پیرس شہر کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں بارش شروع ہوگئی۔ اب سردی کا کچھ نہ پوچھئے۔ آزادی سے دانت بھی نہ بجا سکتا تھا کیونکہ اور لوگ لبادوں میں لپٹے ہوئے خوش گپیوں میں مشغول تھے۔

پان امریکن کے دفتر میں پہنچ کر میں نے اپنے سارے چک فرانسیسی سکوں میں بدل لئے ۳۵۰ پونڈ یعنی کوئی ۵۰۰ روپے کے ۳۲ ہزار فرانک (فرانسیسی روپیہ) ملے۔ یہ میں نے بہت بڑی غلطی کی جس کا نتیجہ اب تک بھگت رہا ہوں لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ فرانسیسی سکہ مٹی کے مول ہے۔ میں نے ہیں نے ہوٹل کا پتہ دیا۔ ۳۰۰ فرانک لگے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پان امریکن کے دفتر سے ہوٹل صرف ۵ منٹ کے فاصلے پر تھا۔

ہوٹل پہنچا تو اصل دقت شروع ہوئی۔ یہاں جو حضرت بیٹھے تھے وہ صرف فرانسیسی جانتے تھے۔ میں نے اپنا نام بتایا اور کہا کہ یونسکو نے میرے لئے ایک کمرہ آپ کے ہوٹل میں ریزرو کرایا ہے۔ مگر وہ کچھ نہ سمجھے۔ نہ معلوم یا کیا اپنی زبان میں کہتے رہے۔ میں صرف موسیو (یعنی جناب) سمجھا۔ بہت دیر بعد میں سمجھا کہ وہ بار بار میرا نام پوچھتے ہیں۔ میں بار بار کہتا ہوں۔ "مشتاق احمد۔ مشتاق" لیکن ان کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ رجسٹر بار بار اُلٹتے ہیں لیکن میرا نام نہیں ملتا۔ اب میں عجیب مصیبت میں تھا۔ ۹ بجے رات کو کہاں جاؤں۔ سڑکیں بالکل سنسان پڑی تھیں۔ آخر قسمت نے مدد کی۔ میں نے رجسٹر کی طرف اشارا کیا۔ اور ان حضرت سے کہا کہ احمد دیکھو۔ یہ لیجئے میرا نام مل گیا۔ میں "مشتاق احمد" نہیں تھا بلکہ "احمد۔ مشتاق" تھا۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ کمرا مل گیا۔ اچھا خاصا آرام دہ کمرہ تھا۔ ضروری اور غیر ضروری چیزیں غرض سبھی چیزیں موجود تھیں۔ میں نے ان سے کہا کافی لاؤ، بارے سمجھ گئے کیونکہ فرانسیسی میں کافی کو 'کیفے' کہتے ہیں۔ کافی آئی تو بالکل کالی کوئلہ اور دودھ ندارد۔ اب میں بار بار کہتا ہوں کہ دودھ لاؤ مگر وہی بات تھی کہ اپنا کہا آپ سمجھیں یا خدا سمجھے۔ یوں ہی پی، کڑوی زہر——

بقیہ "نیکی اور سچائی" صفحہ ۱۴ سے آگے

موجود ہیں۔ آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے قول کے سچے ہیں۔ اب میرا فرض تھا کہ اسے معاف کرتا اس لئے کہ ابھی ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو معاف کر سکتے ہیں۔ میں اس آدمی کو معاف کرتا ہوں جس نے غصے سے بھڑک کر ایک آدمی کی جان لی۔ میں مرنے والے کے گھر کے لوگوں کو اپنی جیب سے ہرجانہ دینے کے لئے تیار ہوں۔"



نجمہ سُلطان

سُرخ پھول

یہ کہانی کسی بادشاہ کی نہیں ایک بہادر لڑکے کی ہے۔ بادشاہوں کی کہانیاں تو آپ نے بہت پڑھی ہوں گی اور اپنی دادی اور اپنی باجی سے سُنی بھی ہوں گی۔ مگر آج ایک بہادر کی کہانی سنئے جو ایک چرواہا تھا۔

یہ اس زمانے کی کہانی ہے جب دنیا آج کی سی نہ تھی۔ لوگ غاروں اور درختوں پر یا جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ آج کل کی طرح مکان تو تھے نہیں۔ اسی زمانے میں ایک پہاڑی تھی جس کا نام "لینا" تھا۔ اس پہاڑ کی چوٹیاں بہت اونچی تھیں۔ اتنی اونچی کہ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ چوٹیاں آسمان سے جا ملی ہیں۔ بڑے بوڑھے کہتے تھے کہ یہ چوٹیاں آسمان کے دیوتاؤں کے محل کی بنیادیں ہیں۔

لینا کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا اور اس کی ایک وادی میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ گاؤں میں کوئی بیس پچیس گھر ہوں گے۔ چھوٹے چھوٹے

صاف ستھرے۔ اس گاؤں کے رہنے والے بڑے محنتی تھے۔ وہ دن بھر بکریاں چرایا کرتے، شکار کرتے اور دوسرے جانوروں کی دیکھ بھال کرتے اور جب رات ہو جاتی اور چاروں طرف اندھیرا پھیل جاتا تو کبھی کبھی اپنے گھروں میں جانوروں کی چربی سے چراغ جلاتے۔ تب تو ایسا معلوم ہوتا جیسے بہت سے تارے آسمان سے اس گہری اور اندھیری وادی میں اُتر آئے ہوں۔

ہر روز رات کو گاؤں کے بیچوں بیچ الاؤ جلایا جاتا اور سب گاؤں والے وہاں جمع ہو جاتے پھر بہادروں کی کہانیاں کہتے۔ اچھی اچھی باتیں کرتے گاؤں کا مکھیا سب لوگوں کو بتاتا کہ اچھے کام کرنے سے دیوتا خوش ہوتے ہیں۔ جو بھی شخص بہادری میں سب سے پہلا انعام پاتا وہ سردار چُنا جاتا۔

گاؤں کا سردار کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ جو بات کہتا تھا ہمیشہ اُسے پورا کرتا تھا اور اگر اپنے وعدے سے پھرتا تو سب گاؤں والے اس کو مار ڈالتے کیونکہ جھوٹے فریبی اور وعدہ خلاف سردار کی وجہ سے ان کے دیوتا جو ناراض ہو جاتے ہیں اور پھر ان کی خوشی مٹ جاتی۔

ان ہی گاؤں والوں میں ایک بچہ رہتا تھا۔ اس کا نام لیوَن تھا۔ یہ بہت نیک اور سیدھا بچہ تھا۔ اس کا باپ مرچکا تھا۔ اور یہ اپنی ماں کے ساتھ ایک غار میں رہتا تھا۔ لیون سب گاؤں کے بڑے لوگوں کی عزت کرتا تھا۔ غریبوں اور اپاہجوں کی مدد کرتا تھا۔ اُن کے لئے لکڑیاں چُن کر لاتا ان کے لئے شکار مار کر لاتا۔ اور اسی طرح کے بہت سے کام کرتا تھا۔ لیکن شریر لڑکے اس کا مذاق اُڑایا کرتے وہ خاموشی سے اپنا کام کیا کرتا اور خوش رہتا۔

سردی میں جب کبھی اس کا گاؤں برف سے ڈھک جاتا اور میلوں تک

ہی برف ہوتی تو وہ گاؤں والوں کے ساتھ بہت بہت دور پانی لینے جایا کرتا اور بوڑھوں کو دیا کرتا۔ اس سے گاؤں والے بہت خوش ہوتے۔

ایک دفعہ بہت سخت سردی پڑی لینا کی پہاڑی اور اس کے چاروں طرف اس قدر برف پڑی کہ تمام چشمے سوکھ گئے۔ لیون اور دوسرے لوگ دور دور پانی کی تلاش میں جاتے مگر ناکام لوٹ آتے۔

تمام تمام رات خوفناک قسم کے طوفان آتے اور برف گرتی کبھی کبھی تو ہفتوں سورج نہیں نکلتا اور غریب چرواہے اپنے جھونپڑوں اور غاروں میں بیٹھے رہتے۔

گاؤں میں قحط پڑ گیا تھا۔ جو کچھ کھانے کا سامان انھوں نے جمع کیا تھا سب ختم ہو چکا تھا۔

گاؤں والوں کا خیال تھا کہ ان سے دیوتا ناراض ہو گئے ہیں۔ جو لینا پہاڑی کی اونچی چوٹیوں پر رہتے ہیں۔ اور اب اس کا علاج یہ ہے کہ گاؤں کا کوئی بھی جوان یا لڑکا اپنی قربانی دے۔

بوڑھے سردار کے مکان میں بیچ ہوئی لکڑیوں کا الاؤ لگا ہوا تھا۔ گاؤں کے سب لوگ اس کے چاروں طرف بیٹھے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ اگر کسی نے قربانی نہیں دی تو یہ ان کی آخری رات ہے۔ مگر قربانی دے تو کون؟ اور وہ بھی اتنی بڑی۔

سب خاموش تھے۔ کبھی کبھی بوڑھا سردار امید بھری نظروں سے جوانوں اور لڑکوں کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ ساری رات اسی طرح گزر گئی۔ صبح ہونے والی تھی۔ سردار نے لرزتے ہوئے کہا "قربانی صبح ہونے سے پہلے دینی چاہیئے"

باہر بہت زور دار برف باری ہو رہی تھی بڑا خوفناک طوفان تھا۔ ایسا طوفان ان لوگوں کی زندگی میں پہلی بار آیا تھا۔

ایک دم ایک کونے سے کچھ آواز آئی۔ سردار نے پلٹ کر دیکھا لیون کھڑا تھا۔ "میں اس قربانی کے لئے تیار ہوں"۔ سب حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ یہ کمزور معصوم لڑکا اتنی بڑی قربانی دے گا۔

بوڑھی عورتوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سب نے اس کی ماں کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بالکل چپ تھی۔

بوڑھے سردار نے لیون کو گلے سے لگایا۔ "سب کچھ جلد ہونا چاہئیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح ہو جائے"۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ لیون اپنی ماں کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے کمزور ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر کہا "بہادر ایسے ہی ہوتے ہیں"۔ لیون رخصت ہو رہا تھا۔ سارے گاؤں والے حیرت زدہ نظروں سے اس کو الوداع کہہ رہے تھے۔ لیون نے پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر ایک دفعہ اپنے گاؤں کی طرف دیکھا وہ بڑھتا گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ سب گاؤں والے سردار کے مکان میں راکھ کے ڈھیر کے چاروں طرف بیٹھے تھے۔

صبح ہو رہی تھی۔ بادل چھٹ گئے تھے اور بہت دن بعد سورج نکل رہا تھا اور برف پگھل رہی تھی۔ چشمے بہنے لگے۔ سردار نے بلند آواز سے قربانی کے قبول ہونے کی خوشخبری سنائی۔ گاؤں والے باہر آگئے۔ پہاڑی کے دامن میں سرخ سرخ پھول کھل رہے تھے۔ جیسے کسی کے خون کے قطرے ہوں۔ لیون کی قربانی قبول ہو چکی تھی۔

اور آج بھی اس پہاڑی کے دامن میں سرخ پھول کھلتے ہیں جو آج بھی اتنے ہی مقدس ہیں۔



بھئی ذرا سی جگہ ، صرف ایک آدمی کی!۔

مرزا غالب

رشید نعمانی

یہ بات قریب قریب مان لی گئی ہے کہ غالب ہندوستان کے اگر سب سے بڑے شاعر نہیں تو اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر ضرور تھے۔

مرزا غالب کی شہرت اور ان کے کلام کی قدر خود ان کی زندگی ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ وہ پرانے زمانے کے ان خوش قسمت شاعروں میں تھے جن کا دیوان خود ان کی زندگی میں چھپ گیا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک وہی دیوان نہ جانے کتنی بار اور کس کس روپ میں چھپ چکا ہے۔ ایک طرف تو طرح طرح کے حسین اور نفیس قسم کے چھپے ہوئے نسخے ہیں۔ تو دوسری طرف کلام کی کئی کئی شرحیں۔ ملک کے ایک مشہور مصوّر (آرٹسٹ) نے غالب کے دیوان کے بہت سے شعروں کو تصویروں کے ذریعے بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مولانا حالی اور دوسرے بزرگوں کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں، ان کے تمام خط، ان کے لطیفے، ان کی زندگی کے مختلف حالات پر اور ان کی شاعری کے بہت سے نکتے اُجاگر کرنے کے لئے ان گنت کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور آج بھی لکھنے والے ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہتے ہیں ——

آیئے اب انھیں غالب کی زندگی کے تھوڑے حالات آپ کو بھی سُنا دیے جائیں۔

غالب کا اصلی نام مرزا اسد اللہ خاں تھا۔ پہلے یہ اسدؔ تخلص کیا کرتے تھے، ایک بار کہیں کسی شخص کا یہ شعر سُن لیا ۔

اسدؔ تم نے بنائی یہ غزل خوب
ارے او شیر رحمت ہے خدا کی

اسی وقت سے اس تخلص سے نفرت ہوگئی اور غالبؔ لکھنے لگے ۔ مرزا نوشہ اس زمانے کے رواج کے مطابق ان کا لقب تھا ، نجم الدولہ، دبیرالملک اور نظام جنگ دہلی کے درباروں سے خطاب ملے تھے۔

ہاں تو بتانا یہ ہے کہ مرزا اب سے کوئی ایک سو چھپن برس پہلے (۱۷۹۷ء میں) آگرے میں پیدا ہوئے۔ شاہ عالم کے زمانے میں ترکستان سے ان کے دادا ہندوستان آئے تھے۔ ان کے والد مرزا عبداللہ بیگ شروع میں اودھ کے نوابوں کے یہاں رہے، پھر حیدرآباد کی ریاست میں ۔ اور آخر میں راجا الور کے یہاں ، اور یہیں ایک لڑائی میں مارے گئے۔ باپ دادا سب ترک سپاہی تھے۔ غالب کو اپنے خاندان اور باپ دادا کے پیشے پر بڑا ناز تھا۔ کہتے تھے ۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

باپ کی موت کے وقت مرزا کی عمر پانچ برس کی تھی۔ چار سال تک چچا کے پاس رہ سکے تھے کہ وہ بھی چل بسے۔ نہ باپ نہ چچا اور نہ کوئی ایسا بزرگ جو سر پر ہاتھ رکھتا اس زمانے میں ایک منجھے ہوئے اُستاد تھے شیخ معظم اور مشہور ہندوستانی شاعر نظیر اکبرآبادی۔ انھیں دونوں سے مرزا نے جو کچھ لکھنا پڑھنا تھا لکھ پڑھ لیا۔ چودہ سال کی عمر میں ان کو ایک پارسی مل گیا جو فارسی زبان کا عالم تھا اس سے دو برس تک فارسی پڑھی اور اس زبان میں اتنی مہارت اور لیاقت پیدا کرلی کہ شعر کہنے لگے اور معرکے کے شعر۔ تیرہ سال کے سن میں دہلی میں شادی ہوئی، شادی کے بعد آگرہ چھوڑ دہلی ہی میں آ بسے۔ یہاں شعر شاعری کا چرچا زوروں پر تھا۔ جی کھول کر ان

صحبتوں میں شریک ہونے لگے۔ شوق بڑھے ہوئے اور حوصلے اونچے، اس مقابلے میں آمدنی تھوڑی۔ کئی ایک ریاستوں اور سرکاروں سے ان کو وظیفہ ملا کرتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وظیفے ملنا بند ہو گئے۔ اس کے لئے ان کو نہ جانے کتنی لکھا پڑھی اور دوڑ دھوپ کرنا پڑی مگر نتیجہ اکثر ان کی امیدوں کے خلاف ہی نکلا۔ جس فراغت اور اطمینان سے زندگی گزارنا چاہتے تھے وہ ان کو آخر دم تک نصیب نہ ہوئی۔ شروع سے آخر تک فکروں اور پیسوں کی تنگی نے ان کا ہاتھ نہ چھوڑا لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنی جو وضع اختیار کر لی تھی اس کو آخر تک سنبھالے رہے۔ زندگی کی ساری پریشانیاں انھوں نے ہنس کھیل کر گوارا کر لیں۔ اپنی مصیبتوں کے ذکر سے انھوں نے اپنی شاعری کو بڑی حد تک آزاد رکھا۔ جو شخص بچپن سے بڑھاپے تک برابر مجبور اور پریشان رہا ہو اس کی تو ساری شاعری میں بجز دکھ درد، اور دنیا سے تیاگ کی تعلیم کے علاوہ اور کچھ ہونا ہی نہ چاہیئے تھا مگر غالب کے یہاں اس طرح کی چیزیں بہت کم ملیں گی۔ اگر کہیں زمانے کی شکایت ہے تو بڑے لطف کے ساتھ، پریشانیوں کا تذکرہ ہے تو بڑے اچھوتے انداز ہیں۔ شکوہ اور شکایت بھی کی تو اک خاص طریقے سے۔ تقدیر کو کوسنے سے زیادہ بہتر غالب نے یہ سمجھا کہ تقدیر بنانے والے پر طنز کیا جائے ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اسی زندہ دلی اور خوش مذاقی کی وجہ سے غالب کی آج تک عزت کی جاتی ہے۔ ان کے شعروں میں زندگی ہے اور زندہ رہنے کی خواہش۔ سوگ، تیاگ، نوحہ اور مرثیہ جس سے ان کو سابقہ پڑتا رہتا تھا اگر انھیں سب باتوں سے وہ اپنے دیوان کو بھر دیتے تو آج ان کی وہ قدر نہ ہوتی۔

خوش مذاق اور زندہ دل ہونے کے ساتھ وہ خود دار اور غیرت مند بھی بلا کے تھے، بڑی سی بڑی تکلیف جھیل لیتے مگر آن بان کو ٹھیس نہ لگنے دیتے۔ ایک مشہور واقعہ ہے کہ دلی کالج میں ایک استاد کی جگہ خالی ہوئی۔ اس کے

یہ بھی اپنے گھر سے امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے چلے کالج کا پرنسپل ان کی پالکی کے پاس پیشوائی کے لئے نہ آیا۔ تو آپ نے قدم زمین پر اتارنا گوارا نہ کیا۔ اور اُلٹے پاؤں گھر لوٹ آئے۔

زندگی میں جن مالی پریشانیوں یا دوسری فکروں سے ان کو واسطہ پڑا ان کا ذکر شعروں میں تو کم مگر خطوں میں ذرا زیادہ اور صاف صاف آگیا ہے۔ شاعری میں تو مرزا غالب کا بڑا درجہ ہے ہی۔ اس کے علاوہ خط لکھنے کا جو نرالا اور دل موہ لینے والا انداز انھوں نے نکالا ہے۔ وہ بھی اپنی آپ مثال ہے۔ نہ تو غالبؔ سے پہلے کسی نے اس انداز کے خط لکھے اور نہ ان کے بعد اس کا چربہ اُتار سکا۔ ان کے خط کیا ہوتے ہیں گویا بڑا دل چسپ آدمی سامنے بیٹھا میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہو۔ لمبے چوڑے القاب آداب کہیں ڈھونڈھے سے ان کے یہاں نہ ملیں گے، رسمی، غیر دل چسپ اور غیر ضروری باتوں ہی سے ایک جملہ بھی ان کے کسی خط میں نظر نہ آئے گا۔ ایک خط شروع کرتے ہیں۔ "میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔" ایک صاحب کو ان کے باپ کی موت پر لکھتے ہیں "یوسف مرزا کیوں کر تجھے لکھوں کہ تیرا باپ مرگیا۔ اور اگر لکھوں بھی تو آگے کیا لکھوں...... ہائے ایک کا کلیجا کٹ گیا ہے اور لوگ اسے کہتے ہیں تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا؟ .... پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے۔ بے سروپا کس کو کہتے ہیں؟ تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو" ظرافت کی ایک مثال "دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو۔ اور مزہ یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا تو کہو گے میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔ لطف اس میں ہے کہ میں بھی سچا اور تم بھی سچے۔" اردوئے معلی اور عود ہندی۔ ان دو کتابوں میں غالب کے خطوط جمع کر دئے گئے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میدان میں بھی مرزا کیسے کیسے موتی بکھیر گئے ہیں۔

خوش مذاقی ان کی گھٹی میں پڑی تھی، مزاح پیدا کرنے کے لئے ان کو سوچنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ بات میں بات پیدا کر دینا ان کی عادت سی بن گئی تھی ــــ ایک بار کسی نے پوچھا" بھلا یہ تو بتائیے مرزا صاحب! رتھ مذکر ہے یا مونث" فرمایا" عورت بیٹھی ہو تو مونث اور اگر رتھ میں مرد بیٹھ جائے تو مذکر ــــ"

مولانا حالی مرحوم لکھتے ہیں " جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا "مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟" عرض کیا" پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا"

غدر کے بعد مرزا کی آمدنی اور بھی کم رہ گئی تھی۔ ان کے باوجود غریبوں اور محتاجوں کو جو کچھ ہو سکتا تھا دے دیا کرتے تھے ان کے مکان کے آگے اندھے، لولے لنگڑے، اپاہج مرد اور عورتیں ہر وقت پڑی رہتی تھیں۔ اور کوئی سوال کرنے والا کبھی ان کے سامنے سے خالی ہاتھ نہ واپس جاتا ــــ ان کی فیاضی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے کہ ایک بار ان کو گورنر کی طرف سے کوئی انعام ملا۔ جو چپراسی اور جمعدار انعام لے کر آئے تھے ان کو نقد روپے دینے دلانے کی خاطر وہ انعام انھوں نے چپکے سے بازار میں فروخت کرا دیا۔ اور ان سے جو رقم ملی وہ سب کی سب انھیں لوگوں کو دے کر رخصت کر دیا۔

ہمدردی کا جذبہ ان کے دل میں کس حد تک موجود تھا۔ دوسروں کے درد دکھ سے وہ خود کس قدر جلد دکھی ہو جاتے تھے اس کا اندازہ ان کے ایک خط کے ایک ٹکڑے سے لگایا جا سکتا ہے ــــ

"جس شہر میں ہوں اس میں کوئی بھوکا ننگا نظر نہ آئے .... وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں"

تعصب یا تنگ نظری ان کے پاس سے بھی نہیں گزری تھی۔ ہر خیال اور ہر مذہب کے لوگ ان کے دوست تھے، ان کا رکھ رکھاؤ سب کے ساتھ یکساں تھا ان کے اندر جو کمیاں تھیں ان کو ظاہر کرنے

ہیں وہ تکلف نہ محسوس کرتے تھے۔ جو کمزوریاں تھیں ان کو بھی چھپانے کی انھوں نے کبھی کوشش نہیں کی۔

مرزا کی باقاعدہ تعلیم کی مدت بہت تھوڑی سی ہے۔ مگر ان کو دماغ اور نظر ایسی ملی تھی جو باتیں لوگ مدتوں کی محنت اور طرح طرح کی کوششوں کے بعد حاصل کرتے تھے وہ ایک معمولی مطالعے اور تھوڑی سی سوجھ بوجھ سے وہاں تک پہنچ لیتے۔ بقول مولانا حالی مرحوم ــ" ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا۔ ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے۔ مگر جو لطف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔"

مرزا غالب کے سلسلے میں یہ بات بھی عجیب دلچسپ معلوم ہوگی کہ ہم لوگ تو ان کو اردو کے ایک بہت بڑے شاعر کی حیثیت سے جانتے اور سامنے لاتے ہیں مگر وہ خود اپنے آپ کو فارسی زبان کا شاعر پہلے اور اردو کا بعد کو سمجھتے تھے۔ اور انھوں نے اپنی تحریروں اور شعروں میں بار بار اس پر زور دیا ہے کہ مجھے شاعر کی حیثیت سے دیکھنا ہے تو میرا فارسی کلام دیکھو۔ بہرحال ہم تو اتنا ضرور کہیں گے کہ اردو میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ڈھنگ نرالا ہے۔

بہت سی پرانی اور غیر دلچسپ باتوں کو انھوں نے نئی طرح سے اور دلچسپ بنا کر پیش کیا ہے، شروع زمانے کی بہت سی غزلیں مشکل ہیں اور ان میں فارسی کا رنگ اور فارسی کے الفاظ اور ٹکڑے زیادہ نظر آتے ہیں۔ مگر جیسے جیسے ان کے کلام کی شہرت ہوتی گئی ان کے کہنے کا انداز بھی بدلتا اور آسان ہوتا گیا۔ غالب کے یہاں یہ بھی ایک اچھی بات ہے کہ ان کی غزلیں بہت لمبی لمبی نہیں۔ اور نہ بھاری بھرکم دیوان، ۲۲۸ غزلوں کے علاوہ انھوں نے دو چار قطعے، چند قصیدے اور تھوڑی سی رباعیاں بھی لکھی ہیں۔

چند غزلوں کو چھوڑ کر باقی غزلوں میں بہت سے شعر ایسے مل جاتے ہیں جن کو ایک کم پڑھا لکھا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے اور

لطف اٹھا سکتا ہے۔

غالب کے سوچنے کا ڈھنگ چاہے نرالا ہو یا نہ ہو مگر ان کے شعر کہنے کا انداز ضرور انوکھا ہے۔ بعض وقت وہ ایک بہت عام بات اتنے خاص طریقے سے بیان کر گئے ہیں ان کو پڑھنے کے بعد منہ سے تعریف نکل ہی جاتی ہے۔

غالب کے شاگردوں میں بھی بڑے بڑے لوگ تھے۔ مولانا حالی، میر مہدی مجروح، منشی ہرگوپال تفتہ، نواب صاحب رام پور، بہادر شاہ ظفر۔ استاد کی طرح ان شاگردوں نے بھی زبان کے خزانے بیچ دماغ اور قلم کی دولت سے مالامال کئے ہیں۔

شاعر ہو یا ادیب یاد اسی کی باقی رہتی ہے جو اپنے پیچھے کچھ ایسی چیزیں چھوڑ جائے جس سے بعد کے لوگ بھی پورا پورا لطف لے سکیں اور اس زمانے کے بارے میں کچھ جان سکیں، کچھ سمجھ سکیں۔ غالب کے یہاں ایسی بہت سی چیزیں ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خالی لکیر کے فقیر تھے۔ ان میں آن بھی تھی اور امنگ بھی۔

ان کے دل میں اس کی بڑی آرزو تھی کہ اچھے دن پھر آئیں اور سب کے لئے آئیں اس سلسلے میں ان سے جو ہوا وہ کیا جو نہ کر سکے اس سے ان کو دکھ ہوا۔

تہتّر سال تک جئے۔ اور نوجوانی سے لے کر آخر دم تک، ذات، زبان اور قلم سے کوئی نہ کوئی فائدے، لطف یا کام کی بات نکلتی ہی رہی۔ اور ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

دہلی میں نظام الدین اولیا کی درگاہ کے پاس ان کی خواہش یا وصیت کے مطابق ان کو دفن کر دیا گیا۔ ویران سی قبر ہے اور ٹوٹی پھوٹی چار دیواری۔

کہتے ہیں کہ زندہ قوموں کے لوگ اور آزاد ملک کے رہنے والے اپنے بزرگوں کی آخری یادگاریں بھی شان دار اور خوش نما قسم کی بنواتے ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ آزاد ہندستان کے بھی کچھ لوگ غالب کی قبر کے بارے میں ایسی ہی باتیں سوچ رہے ہیں۔

غالب کے چند اشعار

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سنو گر بُرا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند — کس کی حاجت روا کرے کوئی

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں — روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں
دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں — بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

عشق نے غالب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

لطیفے

بیٹا۔ ابا جان! اگر میں آپ کا فائدہ کراؤں تو آپ خوش ہوں گے۔

باپ۔ ہاں بیٹا۔

بیٹا۔ آپ نے مجھے امتحان میں پاس ہونے پر گھڑی خرید دینے کو کہا تھا۔ اب نہ خریدئیے گا۔

باپ۔ ایسا کیوں؟

بیٹا۔ اس لئے کہ میں امتحان میں فیل ہوگیا۔

ایک آدمی۔ میں دنیا کا سفر کر چکا ہوں۔ جانتے ہو؟

دوسرا آدمی۔ تب تو آپ دنیا کے جغرافیہ سے بخوبی واقف ہوگئے ہوں گے۔

پہلا آدمی۔ بے شک! جغرافیہ ایک بہت بڑا شہر ہے۔ مگر مجھے چند ہی دن وہاں رہنے کا موقع ملا۔ اس لئے اچھی طرح سیر نہ کر سکا۔

دکاندار۔ (دوسرے سے) کیا اشتہار دینے سے کوئی نتیجہ نکلتا ہے؟

دوسرا۔ یقیناً! پرسوں ہی میں نے چوکیدار کے لئے اشتہار دیا اور کل ہی ہمارے گھر چوری ہوگئی۔

ایک بہرا آدمی بازار سے بیگن لینے گیا۔ واپسی پر ایک دوست ملا اس بہرے سے پوچھنے لگا۔ بھائی صاحب! آپ خیریت سے تو ہیں؟

بہرا۔ بیگن لایا ہوں۔

دوست۔ بال بچے تو راضی ہیں؟

بہرا۔ بھرتا کر کے کھاؤں گا۔

جسپال سنگھ بھاٹیا

استاد۔ نقشے میں سمندر دکھاؤ۔

شاگرد۔ اگر نقشے میں سمندر ہوتا تو نقشہ ڈوب جاتا۔

محمد یحییٰ کھام گاؤں (برار)

اُستاد۔ ڈاک خانہ کہاں ہے ؟
شاگرد۔ بینک کے سامنے۔
اُستاد۔ بینک کہاں ہے ؟
شاگرد۔ ڈاک خانے کے سامنے
اُستاد۔ دونوں کہاں ہیں ؟
شاگرد۔ آمنے سامنے۔

عبدالقادر علی کاپڑی کونڈیوا

موکل۔ (اپنے وکیل سے) میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس چوری کے مقدمے میں چھڑایا۔ اب میں کبھی نہ کبھی آپ کے یہاں ضرور حاضر ہوں گا۔
وکیل۔ مگر بھائی دن ہی میں آنا۔

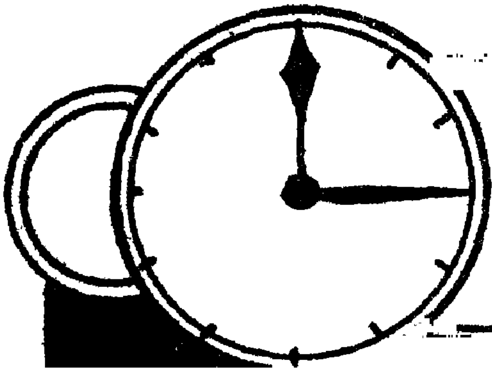
ڈاکٹر۔ (مریض سے جو اپریشن کی میز پر لیٹا ہوا تھا) بھئی آپ کا اپریشن جو میں کرنے جا رہا ہوں۔ یہ بہت مشکل ہے۔ اس میں پانچ میں چار مریض ضرور مر جاتے ہیں۔ اس لئے پیشتر اس کے کہ میں آپریشن کروں یہ بتائیے کہ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں۔
مریض۔ یہ بتائیے کہ میرا جوتا کہاں ہے ؟

افسر۔ (اپنے ماتحت کے سلام نہ کرنے پر) کیوں جی تم جانتے ہو، میں کون ہوں ؟
ماتحت۔ (اپنے دوسرے دوستوں کو آواز دیتے ہوئے) ارے بھائی ذرا صاحب کا حال سنو۔ آج یہ اپنا نام بھی بھول گئے۔ غالباً دماغ پر کوئی خاص اثر ہے۔

ایک دفعہ ایک امیر نے اپنے کوچبان سے کہا کہ جن ناموں کے پیچھے بان آتا ہے وہ بہت شریر ہوتے ہیں۔
ملازم۔ مثلاً ؟
امیر۔ جیسے دربان۔ گاڑی بان۔ شتربان اور کوچبان وغیرہ۔
ملازم۔ (ادب سے) جی مہربان۔

محمد خاں کھام گاؤں (برار)

نور النبی عباسی



گھڑی کی کہانی

آج کل سائنس کا زمانہ ہے۔ آپ گھر بیٹھے لندن، پیرس، ماسکو اور دوسرے دور دور کے لوگوں سے باتیں کر سکتے ہیں۔ ہزاروں میل کا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کر سکتے ہیں۔ آپ نے کبھی سوچا کہ انسان نے ایسی ایجادیں کیوں کیں۔ دراصل وقت کی بچت کی کوشش میں یہ ایجادیں ہوئیں۔ ورنہ پہلے تو زرا زرا سے کاموں کے لئے مہینے کیا، برس گزر جاتے تھے۔ اسی لئے انسان نے اپنا کام وقت کو سامنے رکھ کر کرنا سیکھا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آج کی طرح پہلے بھی گھڑیاں تھیں۔ گھڑی تو بہت بعد کی ایجاد ہے۔ لیکن انسان نے وقت معلوم کرنے کے لئے اور بھی طریقے معلوم کرلئے۔ آخر ضرورت ایجاد کی ماں جو ہے۔ جب انسان کو کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ اس کو ایجاد کرنے کی لوہ میں لگ جاتا ہے۔

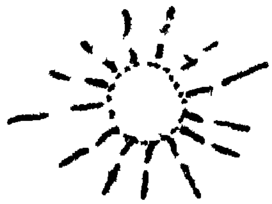


سب سے پرانی اور
زندہ گھڑی تو ہمارا
"مرغ" ہے۔ جو صبح
سویرے "بانگ" دے
کر اعلان
کرتا ہے کہ اٹھو
صبح ہوگئی۔ لیکن وہ بھی صحیح وقت
کہاں بتا سکتا ہے۔ اس لئے اس کا
سہارا لینا مشکل ہوگیا۔

پرانے زمانے میں "آگسٹین" نامی
ایک فقیر گزرے ہیں۔ وہ ایک بڑے
گرجا گھر میں رہتے تھے۔ ان کا کام
مقررہ وقت پر عبادت
کے لئے گھنٹا بجانا تھا
وہ صبح ہوتے ہی اپنے
بھجنوں کی ایک کتاب
پڑھنے بیٹھ جاتے تھے اور ایک خاص
صفحے پر آکر رک جاتے تھے اور وہی
اُن کی گھڑی کا کام دیتی تھی۔

لیکن پرانے زمانے کی سب سے
اچھی گھڑی تو ایک اور ہے جو آج
بھی اسی طرح وقت دے رہی ہے۔
یہ ہے آکاش گھڑی۔ لوگ ایک کھمبا
گاڑ دیتے تھے اور اس کے سائے کی
کی مدد سے وقت معلوم کیا کرتے
تھے۔

ہندستانی سادھوؤں نے ایک
اور طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ
جب یاترا کے لئے جاتے تو اپنے







ساتھ ایک چھڑی لے جاتے اور اس کی مدد سے وقت دیکھتے۔

لیکن یہ سب تو جبھی ممکن ہے جب سورج برابر دکھائی دے۔ اگر کہیں ابر آجائے تو آکاش گھڑی بھی بے کار ہو جاتی ہے۔ اب انسان نے آکاش پر سے نظر ہٹائی تو اُسے زمین پر پانی نظر آیا۔ اس نے سوچا کہ یہ تو اپنے قبضے میں ہوسکتا ہے۔ بس پھر کیا تھا چند دنوں کے اندر اندر "جل گھڑی" ایجاد ہوگئی۔ اب لوگ تین گھڑوں کو اوپر نیچے رکھ دیتے تھے اور اوپر کے دو گھڑوں میں چھید کر دیتے تھے، جس میں سے پانی بوند بوند کرکے نیچے آتا تھا اور تیسرے گھڑے میں اکٹھا ہو جاتا تھا۔ جب تیسرا گھڑا بھر جاتا تو وہ اُسے ایک گھنٹا کہتے تھے۔ یہ جل گھڑی بابل والوں کی ایجاد ہے۔ لیکن مصر والوں نے "دودھ گھڑی" بنائی۔ مصر میں ایک ٹاپو کے کنارے 'اوسیرس' دیوتا کا مندر ہے۔ جہاں ۳۶۰ پجاری تھے۔ ہر روز ایک پجاری ایک گھڑا دودھ سے بھر دیتا تھا اور وہ گھڑا دن رات میں خالی ہو جاتا۔ اس طرح سال بھر کے لئے ۳۶۰ گھڑے اور ۳۶۰ پجاری ہوتے تھے۔

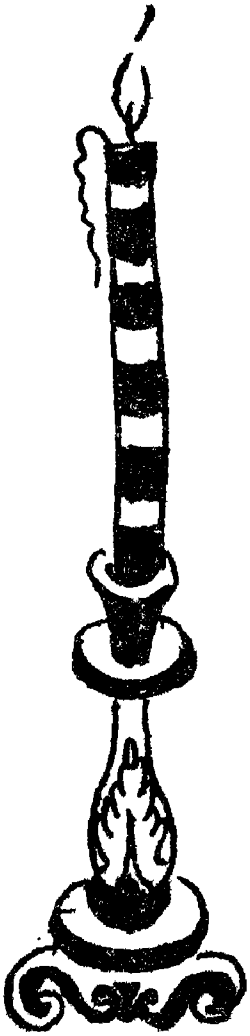
لیکن پانی اور دودھ کی گھڑی میں ایک اور دقت تھی۔ اس کا اندازہ اس کہانی سے ہو سکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار دو دوست مارکوس اور جولیس پر قتل کا مقدمہ چلا۔ اس زمانے میں جل گھڑی ہوتی تھی اور ملزم کو اپنی صفائی میں اس وقت تک بولنے کی اجازت ہوتی تھی جب تک کہ گھڑا نہ بھر جائے۔ چنانچہ جب مارکوس کے مخالف نے اپنی بات ختم کی تو جج نے مارکوس کو بولنے کی اجازت دی۔ مارکوس



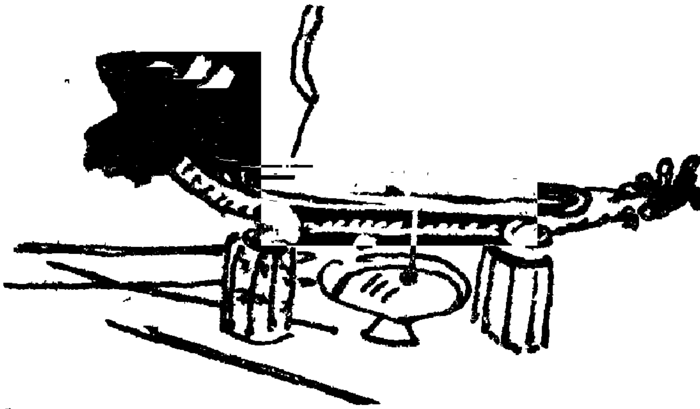
بچارا کیا بولتا۔ اس کی تو جان پر آبنی تھی۔ اور اس کا بچانے والا جولیس وہاں نہیں پہنچ سکا تھا۔ مارکوس نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا اور ادھر ادھر کی باتیں کیں تاکہ کسی طرح وقت گزر جائے اور جولیس وہاں پہنچ جائے۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ کہانی کھینچتا چلا گیا اور وقت دوگنا ختم ہو گیا لیکن گھڑا بھرنے میں ابھی دیر تھی۔ مخالف نے شکایت کی تو معلوم ہوا کہ برتن میں کسی نے کنکر پھینک دی تھی جس کی وجہ سے پانی دیر میں رِس رِس کر نکل رہا تھا اتنے میں اس کا دوست جولیس وہاں پہنچ گیا اور مارکوس کی جان بچ گئی۔

اور سنئے



چینیوں نے تو اور بھی کمال کیا۔ ایسے صاحب رات کو وقت معلوم کرنے کے لئے انھوں نے دئے اور موم بتی کی گھڑیاں بنالیں۔ موم بتی میں بارہ لکیریں کھینچ دیں اور جیسے ہی ایک حصّہ جلا، سمجھ لیا کہ ایک گھنٹا بیت گیا۔ یہی نہیں دیے کے تیل سے بھی وقت ناپا جانے لگا۔ اور اس وقت یہ پوچھنے پر کہ کیا بجا ہے۔ جواب ملتا کہ دو بتّی یا دو دیے۔ کیونکہ وہ رات کو تین بتیوں میں تقسیم کر دیتے تھے، اور اس کے مطابق وقت جانا جاتا تھا۔ چینی لوگوں نے تو آگ گھڑی

بھی ایسی بنائی جو "الارم" کا کام دیتی
تھی اور اس سے گھنٹے بجتے تھے۔ وہ
ایک ناؤ سی بنا لیتے اور اس پر ایک
سلاخ رکھ دیتے جو لکڑی کے برادے
کا بنا ہوتا
اس میں دو
گیندیں فاصلے
پر لٹکا کر
برادے
کی سلاخ
میں آگ لگا دیتے۔ جب آگ گیند
کے تاگے پر پہنچتی تو وہ گیند گر جاتی
نیچے ایک برتن رکھا رہتا جس میں
خوب زور سے آواز ہوتی۔ اس طرح
اس کے کافی دیر کے بعد دوسری
گیند بھی گرتی۔



پھر آخر انسان نے دھیرے دھیرے
یہ مشینوں کی گھڑیاں بنانی سیکھیں
فرانس، جرمنی اور سوئزرلینڈ کے
لوگ اس کام میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں۔
لندن کے گھنٹا گھر کا ذکر تو
آپ نے سنا ہوگا۔ ذرا اس کی لمبائی
چوڑائی و اونچائی کا حال سنئے —
میناروں کے چاروں طرف چار گھڑیاں
ہیں، جو گولائی میں ۲۳ فٹ ہیں۔
منٹ کی
سوئیاں ۱۲
فٹ لمبی ہیں
اور سال بھر
میں قریب
سو میل چلتی
ہیں۔ ان میں ہر ایک ہندسہ دو فٹ
اونچا لکھا ہے۔ پنڈولم ۱۳ فٹ لمبا
ہے اور اس کے نیچے کے گولے کا
وزن تین آدمیوں کے برابر ہے۔
بھلا بتائیے کہاں تو موم بتی اور
کہاں یہ راکشش! اور مقابلہ کیجیے
کہ اب تو انگوٹھی اور بُندوں میں
بھی گھڑی ہوتی ہے!

ایسی بھی گھڑیاں بنی ہیں جن میں
باقاعدہ پنڈولم کی آواز سنگیت کی
سی نکلتی ہے اور جب وہ بجتی ہیں

تو معلوم ہوتا ہے کہ پیانو بج رہا ہے سائنس کی ترقی کی بدولت ہی ہم آج اس منزل پر پہنچے ہیں کہ وقت کا ایک منٹ بھی ہمارے لئے اہم ہے اور ہم اس کا استعمال کر لیتے ہیں۔

گھڑی کی پرانی غیر سائنسی اور نامناسب وقت بتلانے والی مشین سے لے کر آج تک جو ترقی گھڑیوں کی بناوٹ میں ہوئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ اب تو ایسی گھڑیاں دیکھنے میں آتی ہیں جن میں سکینڈ، منٹ، گھنٹوں کے علاوہ دن، تاریخ، مہینا وغیرہ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

وقت کو جاننے اور انسان کو اس کی اہمیت کا احساس دلانے میں گھڑیوں نے بڑی مدد کی ہے اور ہمیں خاص طور پر ان لوگوں کی تعریف کرنی چاہیئے جنھوں نے گھڑیاں بنائیں اور انھیں نیا روپ دیا۔ ان میں پیٹر ہیلن، گلیلیو، ڈروز قابل ذکر ہیں جنھوں نے گھڑیوں کے ساتھ ساتھ دوسری چیزیں بھی بنائیں۔ ہیریس اور بھیوری جنھوں نے جہازی گھڑیوں کی ایجاد کی۔



سیٹھ جی! مجھے بچاؤ اس بدمعاش سے!!

بھیّا ہربرٹا نے پکنک منائی

عبدالحلیم ندوی

پکِ نک! آہا کیا پیارا نام ہے، بس سنتے ہی جی مچل گیا۔ کہ چلو، کہیں باہر، اس مدرسے سے اس گھر سے دور، کسی ویران سی جگہ میں، کہیں دریا کے کنارے، اور مزے سے کھائیں، پئیں، گائیں، دھما چوکڑی کریں اور خوشی منائیں۔ جی ہاں پک نک، آپ نے بھی منائی ہے اور ہم نے بھی، پر ہمارے بھیّا ہربرٹا نے تو کمال ہی کر دیا، پک نک منائی، اور خوب جی کھول کر۔ اور جانتے ہیں آپ کتنی دور کی؟ دو تین میل گھر سے باہر نہیں، بلکہ پورے پورے ساڑھے تین سو میل کی!۔ اور وہ ایک ہی دن میں پک نک نہیں ختم ہوگئی بلکہ پورے تین سال کے بعد اور وہ بھی کیسے، پیدل، اور صرف اکیلے! آپ کہتے ہوں گے کہ یہ حضرت ہربرٹا ہیں کون صاحب جنھوں نے اتنی لمبی چوڑی پک نک منائی۔ تو لیجئے پہلے آپ سے ملا دوں۔

"بھیّا ہربرٹا کا رنگ کالا، جسم بے ڈول بالکل گینڈے جیسا، کان چھوٹے ناک بھدی چپٹی جیسی چوہے کی بل، منہ بہت ہی بڑا، جیسے غار، پاؤں

موٹے، جیسے ہاتھی کے، دانت لمبے اور تیز جیسے برچھے، گردن موٹی جیسا نیم کا درخت، سر نہونے کے برابر ——

اور........ اور ان سب چیزوں کے ساتھ ایک ننھی منی چھوٹی سی —— دم۔ اے لیجئے آپ تو گھبرانے لگے۔ جی ہاں بالکل سچ مچ کی دم۔ آپ گھبرائیے نہیں ذرا ٹھہرئیے پوری بات سنئے۔ آپ بھی انھیں جانتے ہیں، پہچانتے ہیں، اور شاید دیکھا بھی ہو۔ جی تو محلّے ٹولے کے لوگ آپ کو "بھیا ہربرٹا" کہتے تھے۔ اور ہم اور آپ انھیں "دریائی گھوڑا" کے نام سے جانتے ہیں۔ آپ کا اصلی وطن زلولو لینڈ ہے، یہ علاقہ افریقہ میں سمندر کے کنارے واقع ہے۔ جی ہاں تو اس "دریائی گھوڑے" یعنی ہمارے "بھیا ہربرٹا" کو بھی ایک دن پکنک کی سوجھی۔ اور سوجھی بھی تو کتنے غضب کی۔ چنانچہ آپ ۱۹۲۸ء میں اپنے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ اکیلے اور تنہا، اور اپنی بھدّی چپٹی ناک جنوب کی طرف کرکے، بولے چل مری تھو تھن۔ ٹمک ٹم۔ رُک نہیں سکتے اب تو ہم۔ اور چل پڑے۔ جب تک جنگلی علاقہ رہا آپ کو نہ کسی نے دیکھا اور نہ سمجھا، چنانچہ آپ بے تکلف چلتے رہے پر ایک جگہ یہ جنگل ختم ہوگیا اور آپ اب میدان میں کھڑے تھے، اب تو بہت گھبرائے، پر پک تک کی جو سوجھی تھی۔ چنانچہ پھر آپ نے اپنی تھوتھنی اِدھر اُدھر گھمائی، اور بولے چل میرے تھوتھن ٹمک ٹم۔ رُک نہیں سکتے اب تو ہم۔

اب جو جنوب کی طرف اور آگے بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی چیز دور، دو پیروں پر چل رہی ہے، سرپر ٹوکری ایسی کوئی چیز بھی رکھے ہے، بھیا ہربرٹا سمجھے کہ کوئی جانور ہے۔ چلو ساتھی ملا ایک سے دو بھلے۔ یہ ایک جنگلی آدمی تھا، جو کہیں جا رہا تھا، اس



نے آج سے پہلے کبھی "دریائی گھوڑا"
نہ دیکھا تھا۔ اُس نے جو دور سے
اسے آتے ہوئے دیکھا تو ٹھہر گیا کہ
دیکھیں یہ ہے کیا جانور؟ اب بھیا
ہربرٹا جو قریب آئے اور ایک
دھاڑ مار کر سلام کیا تو جنگلی
آدمی کی جان نکل گئی،
اور وہ سر پر پاؤں
رکھ کر بھاگا اور پاس کے
دیہات میں جاکر دَم
لیا۔ اور گاؤں والوں
سے بتایا کہ کوئی عجیب سا
جانور جنوب کی طرف آرہا ہے
گاؤں والوں نے بھی آج تک
کبھی دریائی گھوڑا نہ دیکھا تھا۔
سب کو بڑا اچنبھا ہوا کہ یہ کیا
جانور ہے، چنانچہ یہ خبر سارے
علاقے میں پہنچ گئی، اب کیا تھا اخبار والے
دوڑ پڑے اور دوسرے ہی دن ساری
دنیا میں یہ خبر پھیل گئی کہ ایک دریائی گھوڑا
زولو لینڈ سے جنوب کی طرف بڑھ رہا ہے

بھیا ہربرٹا کو اپنی یک نک کی
سوجھی تھی چنانچہ وہ مستقل آگے
بڑھتے رہے، جب بھوک لگتی
تو کسی گنے کے کھیت میں پل
پڑتے۔ اور اطمینان سے
پیٹ بھر کر گنے کھاتے۔
اگر کوئی کھیت والا انھیں بھگانے آتا تو
ایسی گھڑکی دکھاتے کہ بیچارہ الٹے پاؤں
بھاگ جاتا، پھر تو لوگوں نے یہ سوچا کہ
چلو چھوڑ دو کاہے ستاؤ۔ دیکھو تو سہی

یہ جاتا کہاں ہے، چنانچہ ہر برٹا بھیا کھیت چرتے، روندتے، کودتے پھاندتے، چلتے رہے، آج تک کسی جانور نے بھی اتنا لمبا سفر نہ کیا تھا، اس لئے لوگ اس سے کچھ نہ بولتے، نہ کوئی شکاری انھیں مارتا اور نہ کوئی انھیں بھگاتا بلکہ اب تو اخبار والے بھیا ہر برٹا کے پیچھے پیچھے چل دے کہ دیکھیں یہ کہاں تک جاتے ہیں۔ بھیا ہر برٹا چلے جا رہے تھے، خوشی خوشی مگن ۔ آخر چھ مہینے کے بعد شہر ڈربن میں پہنچے۔ رات کا وقت تھا، ڈربن شہر بجلی کے قمقموں سے جگ مگا رہا تھا۔ بھیا ہر برٹا نے بجلی کے قمقمے کاہے کو دیکھے تھے، یہاں جو پہنچے تو یہ انھیں بہت بھلے لگے۔ تھوڑی دیر تک دیکھتے رہے پھر ان کی کھوپڑی میں یہ بات آئی کہ ہو نہ ہو یہ سینکڑوں آنکھیں ہیں جو انھیں دیکھ رہی ہیں اور بھیا کو یہ بات پسند نہ تھی چنانچہ انھوں نے سوچا کہ یہاں سے کھسکو۔ یہ سوچ کر وہ ایک طرف کو چل دئے۔ آگے جو بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک چہار دیواری ہے [illegible] اس میں بھی آنکھیں جگ مگا رہی ہیں، یہ اصل میں ایک پولیس اسٹیشن تھا۔ بھیا غلطی سے ادھر پھنس گئے تھے، چنانچہ انھوں نے جب لال لال پگڑیاں ادھر اُدھر بھاگتی دیکھیں تو خود بھی سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔ اب جاکر ایک دواخانے سے ٹکرائے، ادھر اُدھر نظر جو ڈالی تو کیا دیکھتے ہیں کہ الماریوں میں رنگ برنگ کی شیشیاں رکھی ہیں، لال، پیلی نیلی، ہری سبھی رنگ کی۔ جی تو ان کا چاہا کہ تھوڑی دیر اور دیکھیں پر اتنے میں لوگ آگئے اور لوگوں سے بھیا ہر برٹا نہ معلوم کیوں گھبراتے تھے، چنانچہ وہاں سے بھاگے۔ اور یہ جا وہ جا غائب۔

یہاں سے بھیا ہر برٹا جو غائب ہوئے تو اب کچھ پتہ نہیں کہ کہاں گئے۔ دن بیتے، مہینے بنے، مہینے بیتے سال بنے اور کئی سال گزر گئے، اور بھیا ہر برٹا کا کچھ پتہ نہیں کہ کہاں گئے۔ نہ کہیں کسی نے دیکھا اور نہ کسی نے ان کے متعلق سنا۔

آخر ۱۹۳۱ء میں ایک رات ایک مال گاڑی کے ڈرائیور نے پٹری پر ایک بڑی بھاری کالی سی چیز پڑی دیکھی۔ یہ تھے بھیا ہر برٹا

کے وطن سے پورے تین سو میل دور تھی۔
ہاں تو جب یہ ڈرائیور نے ایسی عجیب سی چیز دیکھی تو اس نے گاڑی کی چال دھیمی کر دی، اور بالکل پاس آکر روک لی۔ دیکھتا کیا ہے کہ بھیّا ہربرٹا بڑے مزے سے پٹری پر اپنا سر رکھے خراٹے لے رہے ہیں۔ ڈرائیور نے سوچا اب کیا کرے، مارنا چاہتا نہیں تھا کہ بھیا ہربرٹا نے اپنے اتنے لمبے سفر کی وجہ سے دنیا میں بڑا نام پیدا کر لیا تھا، اور ساری دنیا چاہتی تھی کہ دیکھیں یہ جاتے کہاں تک ہیں۔ چنانچہ اس نے بڑے زور کی سیٹی دی کہ ہربرٹا بھیّا اٹھ جائیں، پر بھیّا کے کان پر جوں تک نہ رینگی، اور پڑے خراٹے لیتے رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اب ڈرائیور نے دوسری سیٹی دی، اب کی بھیّا ہربرٹا نے بڑے اطمینان سے دوسری کروٹ لی اور پھر اتنا غفیل۔
حال گاڑی کو بہر حال جانا تھا، پر جائے کیسے۔ اگر ریل چلتی ہے تو بھیّا ہربرٹا مر جاتے ہیں، بڑی مصیبت تھی۔ آخر ڈرائیور کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے اپنی ریل پیچھے کی اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھائی، اور جب قریب آگیا تو گائے بھینس کو سامنے سے ہٹانے کے آلے سے "بھیّا ہربرٹا" کو زور سے دھکا دیا (امریکہ وغیرہ میں ہر انجن کے سامنے ایک چھاج کی سی چیز لگا دیتے ہیں کہ اگر کوئی گائے بھینس انجن کے سامنے آجائے تو اسے دھکیل کر پٹری سے الگ کر دے) جب بھیّا ہربرٹا کے دھکا لگا تو آپ کھڑ بھڑا کے اٹھے دیکھتے کیا ہیں کہ کوئی چیز ان کی پیٹھ کے اندر گھسی جا رہی ہے اور انھیں دھکیل رہی ہے چنانچہ آپ کو بہت غصہ آیا کہ خواہ مخواہ سوتے سوتے پریشان کیا، لگے اس سے لڑنے، پر انجن تو انجن ہی ہے، اس نے ایک دفعہ جو زور سے دھکا دیا تو بھیا ہربرٹا چاروں خانے چت دور پٹری سے پڑے تھے۔ اور گاڑی سیٹی دیتی، دھوئیں اڑاتی، یہ جا وہ جا، ہوا ہو گئی، پہلے تو بھیا ہربرٹا چیخے کہ کہاں جاتا ہے ٹھہر، تجھے ابھی بتاتا ہوں۔ پر آپ جانیں ریل گاڑی کو بھلا کون چھو سکتا ہے۔ تھوڑی دیر تک دوڑے آخر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے
اب بھیا ہربرٹا کو نیند کہاں۔ سوچا چلو اب آگے بڑھیں، چنانچہ چل پڑے

تھوتھن تھک تم۔ رک نہیں سکتے اب تو ہم"
کہا اور چل پڑے ـــ چلتے رہے، وہی اپنی تھوتھنی کی سیدھ میں۔ جنوب کی طرف، آخر ایک رات کو ایک دریا کے کنارے پہنچے، چودھویں کا چاند چمک رہا تھا، سامنے ہی دریا بہہ رہا تھا، بھیا ہربرٹا کو یہ سماں بڑا بھایا۔ سوچا کہ آؤ نہا لو۔ پاک صاف ہو لو۔ پھر آگے چلیں۔ ادھر دور کہیں تین شکاری پڑے تھے، کہ رات کو جنگلی جانور پانی پینے آئیں گے تو شکار کریں گے۔ انھوں نے جو بھیا ہربرٹا کو دیکھا تو منہ میں پانی بھر آیا بولے آہا کیا عمدہ شکار ہوگا۔ انھیں کیا خبر تھی کہ بھیا ہربرٹا کی اتنی مان دان ہے کہ ان کا مارنا جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ اتنی دیر میں بھیا ہربرٹا دریا میں اتر گئے۔ اور لگے چھپک چھپک اشنان کرنے۔ اب شکاریوں نے ایک ساتھ اپنی رائفلیں اٹھائیں اور ... ایک .... دو .... تین ـــ
ٹھائیں ... ٹھائیں ... ٹھائیں .... اور سارے جنگل میں جیسے [illegible] کا دھماکا ہوا۔ دوڑے تو کیا دیکھتے ہیں کہ بھیا ہربرٹا خون میں نہائے ڈھیر ہیں۔ سارا پانی خون سے لال ہوگیا ہے۔ شکاری مارے خوشی کے ناچنے کودنے لگے۔

صبح ہوئی اور بھیا ہربرٹا کے مرنے کی خبر بجلی کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئی۔ جس نے سنا بہت افسوس کیا اور ان شکاریوں کو بہت برا بھلا کہا۔ حکومت نے بھی ان شکاریوں کو پکڑا، اور مقدمہ چلایا۔ جب یہ ثابت ہوا کہ یہ بھیا ہربرٹا کو پہچانتے نہ تھے تو انھیں صرف جرمانہ کر کے چھوڑ دیا گیا۔ اور اس طرح بھیا ہربرٹا کی پک نک بغیر ان کے ختم کئے پورے تین سال بعد اور ساڑھے تین سو میل کی دوری پر ختم ہوگئی۔ خدا جانے اگر "بھیا ہربرٹا" مارے نہ جاتے تو کہاں تک چلتے رہتے، کیا خبر ان کی پک نک کبھی ختم بھی ہوتی۔ بھیا ہربرٹا کے مرنے سے دوسرے جانوروں کو بہت فائدہ ہوگیا۔ کیونکہ حکومت نے جنگلی جانوروں کی حفاظت کے قانون بنا دئے۔ اچھا صاحب اب چونکہ بھیا ہربرٹا بھی چلے گئے اس لئے اب ہم بھی چلے۔ چل مرے تھوتھن تھک تم۔ کہاں کے بھیا کہاں کے ہم۔

اطہر پرویز

نیکی اور سچائی

ایک آدمی اپنے باغیچے کی چہار دیواری پر بیٹھا ہوا تھا۔ ادھر سے ایک سانڈنی سوار اپنے اونٹ پر گزر رہا تھا۔ اونٹ کی گردن لمبی ہوتی ہے اس نے گردن اٹھا کر ایک پیڑ سے پھل توڑ کر کھانے شروع کر دیے۔ باغ کے مالک کو بڑا غصہ آیا اور اس نے جو پتھر اٹھا کر مارا تو اتفاق سے اونٹ کے ایسی چوٹ لگی کہ وہ وہیں گر کر مر گیا۔ سانڈنی سوار نے جب یہ دیکھا کہ اس کا اونٹ مر گیا تو اس نے بھی ایک پتھر اٹھا کر اس آدمی کو مار دیا۔ اتفاق دیکھیے کہ اس آدمی کے بھی ایسی چوٹ لگی کہ وہ بھی مر گیا۔ یہ دیکھ کر سانڈنی سوار کے ہوش جاتے رہے۔ اب تو وہ سب سامان چھوڑ کر وہاں سے بھاگا۔ لیکن یہ بات کہیں چھپنے کی تھی۔ ذرا سی دیر میں سارے میں یہ خبر پھیل گئی۔ سانڈنی سوار گرفتار کر لیا گیا اور مقدمہ خلیفہ کی عدالت میں پیش ہوا

بالآخر خلیفہ نے یہ فیصلہ کیا کہ سانڈنی سوار کو بھی موت کی سزا دی جائے۔

اب سانڈنی سوار کو یقین ہو گیا کہ وہ بچ نہیں سکتا۔ یہ خیال آتے ہی اس نے گھر بار کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اس کو نہ جانے کیا بات یاد آئی کہ اس نے خلیفہ سے درخواست کی :-

"حضور، مجھے تین دن کے لئے اجازت دیجئے کہ میں اپنے گھر ہو آؤں، پھر آپ مجھے میرے کئے کی سزا دیجئے گا۔"

خلیفہ سمجھ گیا کہ یہ بدمعاش آدمی ہے، بھاگنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا کہ "تم جا سکتے ہو۔ مگر ایک شرط پر کہ کوئی آدمی تمہاری ضمانت لے، اور اگر تم نہ آؤ تو تمہاری جگہ مرنے کے لئے بھی تیار ہو جائے۔"

یہ سن کر سانڈنی سوار نا امید ہو گیا۔ اور اس نے دربار میں سب کی طرف دیکھا۔ لیکن سب ہی اس کے لئے اجنبی تھے۔ اس کی ضمانت لیتا تو کون؟ جلاد نے اس کے ہاتھ باندھنے شروع کر دئے۔ نا امید ہو کر سانڈنی سوار چلایا۔

"کیا یہاں کوئی انسان نہیں ہے؟ کیا یہاں کوئی شریف آدمی نہیں ہے؟"

بھیڑ میں سے طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں کسی نے کہا "کیا تم نے اس آدمی کو بھی ایک لمحے کا وقت دیا تھا جس کی تم نے جان لی؟" کسی نے کہا "مارو اس کو، بکتا ہے۔"

لیکن لوگوں کی حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ ایک آدمی خلیفہ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ مگر یہ تو ابوذر تھے جو سچے مسلمان ہونے کی وجہ سے تمام میں مشہور تھے انھوں نے آگے بڑھ کر کہا :-

"حضور! میں اس آدمی کی ضمانت دینے کے لئے تیار ہوں۔"

خلیفہ نے کہا "ابوذر حماقت مت کرو

کیا تم نہیں سوچتے کہ اگر یہ آدمی واپس نہ آیا تو پھر تم کو اس کی جگہ جان دینی ہوگی۔"

ابوذر نے کہا "جی حضور! میں خوب سمجھتا ہوں۔ لیکن میں پھر بھی تیار ہوں۔"

سانڈنی سوار کو رہا کر دیا؛ جو ذراسی دیر میں نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ابوذر کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔

تین دن گزر گئے، آخر شام کا وقت قریب آگیا لیکن سانڈنی سوار واپس نہ آیا۔

خلیفہ کو خود بہت افسوس تھا کہ اب ابوذر کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا مگر قانون کے ہاتوں وہ بھی مجبور تھے۔ چنانچہ مجبوراً ابوذر کو جلاد کے سامنے لایا گیا۔ لیکن جیسے ہی جلاد نے مارنے کے لئے تلوار اٹھائی دور سے ایک آواز سنائی دی۔ سب لوگوں نے مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ریت کے غبار میں ایک شخص گھوڑے پر تیزی سے چلا آرہا ہے۔ خلیفہ نے جلاد کو ٹھہرنے کا حکم دے دیا۔ جب سوار قریب آیا تو لوگوں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ وہ سانڈنی سوار ہی تھا۔ سانڈنی سوار نے اترتے ہی کہا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ میں ٹھیک وقت پر آگیا۔"

مگر خلیفہ نے حیرت سے کہا کہ۔ "سانڈنی سوار تم جب بھاگ ہی گئے تھے تو کیوں چلے آئے؟ اگر تم گھر پر رک جاتے تو تمہاری جان بچ جاتی۔"

مگر سانڈنی سوار نے دوزانو ہوکر خلیفہ سے کہا:- "حضور! میں یہ ثبوت دینے کے لئے آیا کہ اگر دنیا میں شریف انسان موجود ہے تو ایک سچا آدمی بھی ہے جو اپنے قول سے نہیں پھرتا۔"

خلیفہ نے پوچھا "مگر پھر تم گئے کیوں تھے؟"

"حضور! میں گیا تو اس لئے تھا کہ مجھے یاد آگیا تھا کہ گھر میں میری

ضرورت ہے۔ کچھ دن ہوئے ایک بیوہ میرے یہاں آئی اور اپنے کچھ زیور میرے یہاں امانت کے طور پر رکھ گئی تھی۔ چونکہ مجھے تجارت کے سلسلے میں باہر جانا تھا۔ اس لئے میں نے اُسے ایک ایسی جگہ چھپا دیا جس کا میرے علاوہ اور کسی کو پتہ نہ تھا۔ جب کہ میں ابھی اپنے سفر ہی میں تھا تو یہ مصیبت آگئی۔ اگر آپ نے مجھے تین دن کی چھٹی نہ دی ہوتی تو میں اپنے دل پر ایک بڑا بوجھ لے کر مرتا۔ اور وہ بڑھیا میرے بے قصور بال بچوں کو کوستی۔ اب میں نے جاکر بڑھیا کی امانت اُسے لوٹا دی ہے اور گھربار کا سارا انتظام ٹھیک کر آیا ہوں۔ اب میں امن و سکون سے مرنے کے لئے تیار ہوں۔"

یہ کہانی سن کر خلیفہ نے ابوذر سے کہا "کیا آپ اس آدمی کو جانتے ہیں؟"

ابوذر نے کہا " [illegible] نے اس کو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔"

"تب پھر آپ نے اپنی جان اس اجنبی کے لئے کیوں خطرے میں ڈالی؟"

ابوذر نے کہا "حضور! میں نے یہ ضمانت اس لئے لی کہ سانڈنی سوار کو معلوم ہو جائے کہ اب بھی ایک آدمی ایسا موجود ہے جو شریف بھی ہے اور اپنی شرافت کا کوئی انعام بھی طلب نہیں کرتا۔"

خلیفہ سر جھکا کر کچھ سوچنے لگا۔ اتنے میں جلاد نے ابوذر کو اٹھا دیا اور اس کی جگہ پر سانڈنی سوار آکر بیٹھ گیا۔ لیکن جیسے ہی جلاد نے اس کو مارنے کے لئے تلوار اٹھائی، خلیفہ نے سر اٹھا کر کہا۔

"میں نے سانڈنی سوار کی جان بخشی کی۔"

درباریوں میں سے ایک بوڑھا آدمی نے [illegible]

بچّوں کی کوششیں



بچّوں کی گواہی

ایک گاؤں میں ایک پنڈت جی اپنی بیوی کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے تیرتھ کرنے کی نیت سے بڑی محنت کرکے تین سَو روپے کمائے۔ اس میں سے دو سَو روپے سفر خرچ کے لئے لے لئے اور باقی ایک سو روپے ایک لُٹیا میں ڈال کر اُس کا منہ بند کرکے انھوں نے ایک بنئے کو امانت کے طور پر دے دئے۔ پھر وہ تیرتھ کرنے چلے گئے۔

لیکن ان کے جانے کے بعد بنئے کی نیت بگڑ گئی اس نے لُٹیا میں سے روپے نکال لئے اور کنکر پتھر اس میں بھر دئے۔ بنئے کو ایسا بُرا کام کرتے دیکھ کر اس کی بیوی نے اُسے بہت سمجھایا کہ ایسا کام نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے ہماری بھلائی نہ ہوگی۔ لیکن بنئے نے اُس کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا۔ تھوڑے دنوں میں پنڈت جی تیرتھ کرکے لوٹ آئے۔ آتے ہی انھوں نے بنئے سے اپنی لُٹیا واپس لے لی۔ لیکن جب اس کا منہ کھول کر دیکھا تو ان کو روپیوں کی جگہ کنکر پتھر دکھائی دئے۔ روتے دھوتے اُنھوں نے جاکر گاؤں کے منصف سے فریاد کی۔

منصف نے بنئے کو بلایا۔ لیکن دونوں کی باتیں سننے کے بعد اس نے سوچا کہ کیسے فیصلہ کیا جائے۔ بنیا بھی قسم کھا کر کہہ رہا تھا کہ اُس نے لُٹیا جوں کی توں واپس کر دی۔ بہت دیر کے بعد منصف نے ایک تدبیر سوچی۔ تب اس نے پنڈت اور بنئے کو اپنی بیویوں کے ساتھ دوسرے دن آنے کے لئے کہہ دیا۔

دوسرے دن پنڈت اور بنیا اپنی بیویوں کے ساتھ منصف کے گھر آئے۔ تب منصف نے چار بڑی بڑی ڈھکنے لگی ہوئی ٹوکریوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "تم چاروں ایک ایک ٹوکری اٹھا کر گاؤں کے باہر برگد کے درخت کے پاس لے چلو۔ میں تھوڑی دیر میں آکر تمہارے جھگڑے کا فیصلہ کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے دونوں کو الگ الگ راستوں سے روانہ کر دیا۔ تھوڑی ہی دور چلنے کے بعد بنئے کی بیوی نے بنئے سے کہا: "بیچارے غریب برہمن کو دُکھا کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ اس گناہ کا پھل ہمیں کبھی نہ کبھی سہنا پڑے گا۔"

بنئے نے کہا "اری بیوقوف! تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو جا، پھر سب روپے ہمارے ہو جائیں گے۔"

اُدھر برہمن کی بیوی کہہ رہی تھی — "روپے تو چلے گئے اور بیکار یہ ٹوکریاں ڈھونا پڑا۔"

برہمن نے جواب دیا "نہ جانے یہ کس گناہ کا پھل ہے۔"

اسی طرح وہ چاروں تھوڑی دیر میں برگد کے درخت کے پاس آپہنچے اور اپنے اپنے سر سے ٹوکریاں اُتار دیں — اتنے میں منصف نے آکر ان چاروں ٹوکریوں کے ڈھکنے کھول دئے۔ فوراً ان میں سے منصف کے چاروں لڑکے باہر نکل آئے۔ انھوں نے ٹوکریوں میں بیٹھے بیٹھے جو باتیں سنی تھیں وہ صاف صاف دہرائیں۔

فوراً منصف کو سچی کہانی معلوم ہو گئی۔ اُس نے پنڈت جی کو ان کا روپیہ واپس دلا دیا۔ اور بنئے نے دھوکہ بازی کی سزا پائی۔

سید غفار۔ عمر ۱۱ سال، ایلور

ایک تھا سپاہی

یہ سپاہی پرانے زمانے کا تھا، اس کے پاس برچھا تھا، تلوار تھی، توڑے دار بندوق تھی۔ یہ بندوق بڑی دیر میں چلتی تھی اور جو کوئی اسے چلاتا تھا چلاتے وقت اسے بڑی زور کا دھکا لگتا تھا۔

نہ جانے یہ سپاہی کتنے دن سے فوج میں نوکر تھا۔ سپاہی کے سر پر بڑے بڑے بال تھے۔ جن میں روز کے روز تیل ڈال کر مانگ نکالا کرتا تھا۔

دن نکلا۔ سپاہی بستر سے اُٹھا پہلے منہ دھویا پھر آئینہ سامنے رکھا۔ آئینے کے پیچھے آڑ لگائی۔ پھر کنگھے سے مانگ نکالی اور ہاتوں سے خوب جمائی۔ اور دونوں آنکھوں میں سرمہ لگایا۔

پرانے زمانے کے سپاہی بھی خوب ہوتے تھے۔ لڑائی لڑنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ مفت کی تنخواہ پاتے، اور مزا اڑاتے

ایک دفعہ خبر پھیلی کہ ایک بڑی فوج نے چڑھائی کی ہے۔ فوج کا ہر سپاہی تیار رہے۔" سپاہیوں نے لڑائی کا نام کبھی سنا نہیں تھا، فوج کی چڑھائی سن کر گھبرا گئے۔ کسی نے بیماری کا بہانا کیا اور چھٹی لے کر گھر چلا گیا۔ کوئی راتوں رات فوج سے بھاگ گیا اور دوسرے شہر میں جاکر کسی امیر کی نوکری کر لی۔ کسی نے کہا جان ہے تو جہان ہے سارے کنبے میں بس ہمارا دم ہے۔ ہم مر گئے تو کنبے والے کہاں سے کھائیں گے۔ سپاہیوں کے گھوڑے بھی مریل تھے۔ گھاس دانہ ملتا نہ تھا۔ صبح شام تھان پر کھڑے رہتے دانہ ملتا تو سائیس چرا کر بیچ کھاتے۔

آپ یہ سن کر ہنسیں گے کہ اگر کوئی ان گھوڑوں میں سے کسی گھوڑے پر سوار ہوکر اپنی بارات لے جائے تو دلہن کے گھر تک پہنچتے پہنچتے جوان سے بوڑھا ہو جائے۔ اور برات دلہن کے گھر پر پہنچے تو بیچاری دلہن کے گھر والے روتے پیٹتے ہوں کہ دلہن جوان سے بوڑھی ہوئی۔ پھر بیچارہ

ہوئی اور مرگئی ـــــ

ہاں تو ہمارے سپاہی جن کی یہ کہانی ہے لڑائی کی خبر سن کر بڑے سٹ پٹائے مگر سوچے ، بچپن سے سرکاری نمک کھایا ہے ۔ نہ کبھی لڑے نہ کہیں گھر سے قدم باہر نکالا اور تنخواہ پاتے رہے ۔ جان جائے یا رہے لڑیں گے ضرور ۔ یہ سوچ کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور جدھر سے فوج آرہی تھی اُدھر چلے ۔

گھوڑا ٹُخ ٹُخ کرتا چیونٹی کی چال چلا جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک بڑی فوج آتی دکھائی دی جن کے سپاہی گھوڑوں پر تنے بیٹھے تھے اور گھوڑے ہوا کی طرح اُڑے چلے آرہے تھے ۔ دشمن کے سپاہی نے انھیں اور ان کے گھوڑے کو دیکھا تو جھپٹ کر آیا ۔

دشمن کے سپاہی کے تیور دیکھ کر ہمارے سپاہی صاحب بہت گھبرائے اور جب کوئی بات سمجھ میں نہ آئی تو گھوڑے کو بغل میں داب کر سرپٹ بھاگ کھڑے ہوئے ۔

محمود رشید عمر ۱۳ سال

نجومی کا راز

راج نگر میں ایک بہت مشہور نجومی تھا اس نے لوگوں کو جھوٹی سچی باتیں بتا کر بہت زیادہ دولت جمع کر لی تھی ایک دفعہ یہ نجومی کسی گاؤں کو جا رہا تھا ۔ چلتے چلتے رات ہوگئی ۔ رات بسر کرنے کے لئے راستے کے ایک گاؤں میں ایک کسان کے مکان میں ٹھہر گیا ۔ کسان تھا بہت شریف آدمی ، فوراً اس کو بٹھایا اور کھانا لینے کے لئے مکان چلا گیا ۔ اس کمرے میں کسان کا ایک شیرخوار بچہ سو رہا تھا ۔ نجومی بہت چالاک تھا فوراً ایک کاغذ اور پنسل لے کر بیٹھ گیا اور لگا بچے کی قسمت دیکھنے ۔ اتنے میں کسان روٹی لے کر آگیا اور نجومی کو کچھ لکھتے ہوئے دیکھ کر بولا ۔ ” آپ کیا لکھ رہے ہیں ؟ “

نجومی نے کہا ” بھائی تمہارے اس لڑکے کی قسمت جو سو رہا ہے ، بہت ہی اچھی ہے ۔ میں نے علم نجوم سے معلوم کر لیا ہے کہ یہ لڑکا بہت بہادر اور جوان مرد بنے گا ۔

بڑی بڑی لڑائیوں میں جوہر دکھلائے گا۔ اور دولت مند تو اتنا ہوگا کہ دنیا میں اس کا کوئی مقابل نہ ہوگا اور بھائی سخاوت کا تو کیا کہنا یقین جانو حاتم طائی کو بھی مات کر دے گا۔

ابھی نجومی کی بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ کسان بولا "بھائی صاحب معاف فرمائیے۔ یہ بچہ لڑکا نہیں ہے۔ بلکہ میری اکلوتی لڑکی ہے۔"

بس پھر کیا تھا نجومی کی آنکھیں نیچے جھک گئیں۔

نسیم جہاں خراسانی عمر ۸ سال
بہار شریف (پٹنہ)

تین ٹھگ

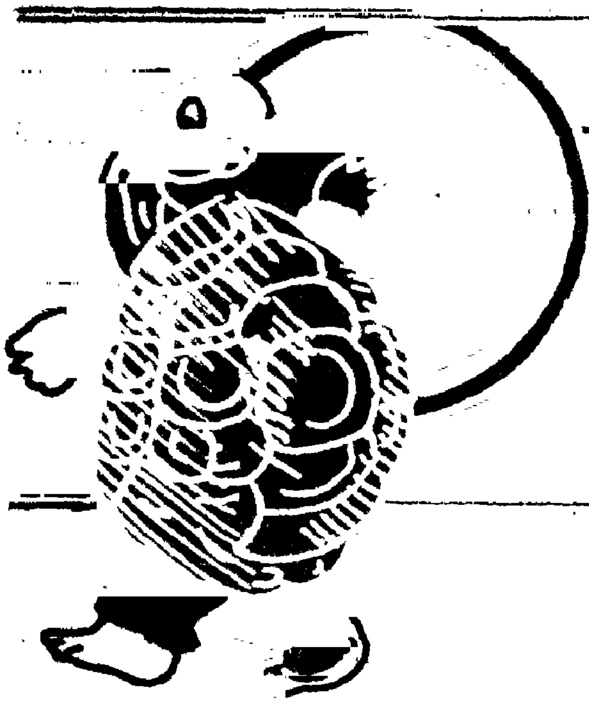
ایک دفعہ تین ٹھگ جمع ہوئے۔ انھیں بھوک ستا رہی تھی۔ نہ وہاں کوئی مکان تھا نہ کوئی آدمی۔ وہاں سے ہوٹل قریب ہی تھا۔ تینوں وہاں گئے اور خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا مگر تینوں کی جیبیں خالی تھیں۔ جب ہوٹل کا آدمی پیسے لینے کے لئے بل لایا تو تینوں جھگڑنے لگے۔ ایک کہتا تھا "پیسے میں دوں گا" تو دوسرا کہتا تھا "نہیں نہیں میں پیسے دوں گا۔" آخر تینوں نے یہ طے کیا "اس ہوٹل کے آدمی کی آنکھ پر پٹی باندھ دی جائے وہ ہم تینوں میں سے جس کو چھوئے گا اسی کو پیسے دینے ہوں گے۔" ایسا ہی کیا گیا۔ اس بیوقوف نے اپنا ہاتھ ایک کرسی پر رکھا تو خالی پایا۔ جب آنکھ کی پٹی کھولی تو کیا دیکھتا ہے کہ کمرہ خالی پڑا ہے۔

خالد ریاض عمر ۹ سال
گوجرانوالہ

بقیہ: بیٹے کا فرض صفحہ ۵۲ سے آگے

نہیں کر سکتے تو پھر میری چیز کی کیا حفاظت کروگے۔ میں ایسے آدمی کو ہرگز روپیہ قرض نہیں دے سکتا۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ تم اپنی راہ لو۔ میں بیوقوف نہیں ہوں۔"

وہ آدمی شرمندہ ہوکر چلا گیا۔



باتونی کچھوا

سلیم احمد

برسوں کی بات ہے کہ کسی تالاب میں ایک کچھوا رہتا تھا۔ اس کے دو دوست تھے اور دونوں دوست بطخیں تھیں۔ ان تینوں میں بڑی گہری دوستی تھی تینوں ہر روز تالاب کے کنارے آکر صبح سے شام تک مزے مزے کی باتیں کرتے۔ کچھوا بڑا باتونی تھا۔ اس لئے بطخیں اس سے خوب کہانیاں سنتیں۔

ایک بار برسات کا موسم یوں ہی نکل گیا۔ بالکل بارش نہیں ہوئی تھوڑے ہی دنوں میں تالاب سوکھنے لگا۔ اب تو بطخوں کو فکر ہوئی۔ اس لئے کہ اب وہ بغیر پانی کے کہاں رہ سکتی تھیں۔ انھوں نے سوچا کہ کسی اور تالاب کا رُخ کرنا چاہیئے۔ مگر ان کو اس کا غم تھا کہ اس طرح ان کا دوست کچھوا ان سے چھوٹ جائے گا۔ اور بچارا کچھوا یہاں اکیلا رہ جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی انھوں نے کچھوے سے کہا۔۔۔

"دوست! اب تو یہ تالاب سوکھ گیا ہے۔ ہم اس سوچ میں ہیں کہ یہ تالاب چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ مگر تم یہاں اکیلے کیسے رہو گے؟ اور تمہارے بغیر ہمارا جی بھی کیسے لگے گا؟"

یہ سن کر کچھوے نے کہا" سچ تو ہے بھائیو، اب تو پانی کے ختم ہونے سے یہاں میری گزر ہونی بھی مشکل ہے اور تمہارے بغیر تو میں یہاں ذرا سی دیر بھی نہیں رہ سکتا۔ کوئی ایسی ترکیب کرو کہ میں بھی تمہارے ساتھ چل سکوں۔

"مگر تم کیسے اُڑ سکو گے، پانی کا کیا بھروسا کہ پاس ہی ملے۔ اب نہ جانے کتنی دور پر دوسرا تالاب ہو۔ ایسی صورت میں تمھارا جانا تو مشکل ہی ہے"۔ بطخوں نے کہا۔

مگر کچھوے کا یہ سن کر اور بھی بُرا حال ہوگیا۔ اُس نے ضد کرتے ہوئے کہا" چاہے کچھ ہو، تم مجھے کسی نہ کسی ترکیب سے اپنے ساتھ لے چلو"

آخر سوچتے سوچتے بطخوں کی سمجھ میں ایک ترکیب آگئی۔ انھوں نے کہا۔ "ایک صورت ہے، اگر تم ہماری بات مان جاؤ تو ہم تم کو بھی اپنے ساتھ لے چل سکتے ہیں۔ ہم ایک پتلی سی مضبوط لکڑی کو دونوں سروں سے پکڑ کر اُڑیں گے۔ تم بیچ میں لکڑی کو اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑ کر لٹک جانا۔ راستے میں کیسی ہی ضرورت پڑے مگر تم چپ رہنا نہ اپنا منھ کھولنا نہ بات کرنا۔ اگر تم نے ہماری بات پر عمل نہ کیا اور راستے میں بول پڑے تو فوراً نیچے گر کر مر جاؤ گے۔

کچھوا یہ سن کر بہت خوش ہوا کہ چلو دوستوں کے ساتھ چلنے کی ایک صورت تو نکل آئی۔ چنانچہ اس نے بطخوں سے راستے بھر چپ رہنے کا وعدہ کیا۔

بطخوں نے ایک پتلی اور مضبوط لکڑی تلاش کی اور اس کے دونوں

سروں کو انھوں نے اپنی چونچ سے پکڑ لیا۔ کچھوے نے بھی بیچ سے اس لکڑی کو اچھی طرح سے پکڑ لیا۔ اب بطخیں اس کو لے کر اڑیں۔

جب وہ پیڑوں سے اوپر پہنچ گئے تو کچھوا بہت خوش ہوا۔ اس لئے کہ اُس کو زندگی میں پہلی بار اتنے اوپر جانے کا موقع ملا تھا۔ اس کے جی میں تو آیا کہ خوب چلا کر اپنے دوستوں سے کہے "بھئی مزا آگیا۔ ہم تو اتنے اوپر آگئے"۔ مگر پھر اسے بطخوں کی بات یاد آگئی۔ اور وہ چپ ہو گیا۔ جب وہ گاؤں کے کھیتوں پر سے گزرا تو کھیتوں پر کام کرنے والے کسان اس عجیب و غریب منظر کو دیکھ کر چلّانے لگے۔ "ارے بھائی لوگو دوڑو، دیکھو تو یہ کیا اڑا جا رہا ہے"۔

کچھوے کو گاؤں والوں کی یہ بات بہت بری لگی۔ اور اس کے جی میں آیا کہ فوراً کہہ دے" جاؤ اپنا کام کرو، اگر ہم اڑے جا رہے ہیں تو تم سے مطلب"۔ مگر پھر اس کو اپنے دوستوں کی نصیحت یاد آگئی، اور وہ چپ ہو گیا۔

کچھ دور اور اُڑنے کے بعد ایک اور بستی نظر آئی۔ بستی کے لڑکوں نے جو یہ دیکھا تو خوشی کے مارے چلّانے لگے "واہ وا۔ یہ پرندے کچھوے کو لئے جا رہے ہیں"۔

کچھوے کو لڑکوں کی یہ بات بہت بُری لگی۔ اور اس بار وہ بطخوں کی نصیحت کو بالکل ہی بھول گیا اور بولا "بھائی یہ کیا شور مچا رکھا ہے"۔ منہ کھولنا تھا کہ لکڑی دانتوں سے چھوٹ گئی اور کچھوا دھڑ سے نیچے آ رہا۔

احمد حسین

بنیے کا قرض



ایک بنیا سود پر لوگوں کو روپیہ قرض دیا کرتا تھا۔ لیکن لوگوں سے ضمانت کے طور پر کوئی نہ کوئی زیور ضرور لے لیا کرتا تھا۔ اور اگر کوئی آدمی وقت پر روپیہ نہ ادا کرتا تو پھر بنیا اس کا زیور ضبط کر لیتا تھا۔

ایک دن بنیے کے پاس ایک غریب کسان آیا۔ بنیے نے پوچھا۔ "تم کو کیا چاہیئے؟"
کسان نے جواب دیا۔ "بھیّا مجھے ایک ہزار روپے کی سخت ضرورت ہے۔ تم مجھے دے دو، میں اسی فصل میں تم کو یہ روپیہ ادا کردوں گا۔"

"مگر تم ایک ہزار روپیہ لے کر کیا کروگے؟" بنیے کا یہ دستور تھا کہ وہ لوگوں سے یہ ضرور پوچھ لیا کرتا تھا۔

"میں اپنی لڑکی کی شادی کروں گا" کسان نے جواب دیا۔

یہ بات بنیے کے سمجھ میں آگئی۔ اس لئے کہ وہ بھی بال بچوں والا آدمی تھا۔ بغیر روپیے کے شادی کس طرح ہو سکتی تھی۔ بنیے نے زرا گھور کر کسان کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ آدمی ضرورت مند ہونے کے ساتھ ساتھ ایمان دار بھی ہے۔

لر اس نے کسان سے کہا۔

"بھیا ایک ہزار روپیہ تو میں دے دوں مگر اس کی ضمانت میں تم مجھے کیا دو گے ؟"

کسان ضمانت کا نام سن کر حیران رہ گیا ۔ اس لئے کہ وہ آدمی ایمان دار تھا ۔ وہ لوگوں پر بھروسہ کرتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ لوگ اس پر بھی بھروسہ کریں گے ۔ مگر بنئے کی زبان سے ضمانت کا نام سن کر وہ گھبرا گیا اور بنئے سے بولا ۔

"سیٹھ جی میں غریب آدمی ہوں ۔ بھلا میرے پاس ضمانت دینے کے لئے کیا رکھا ہے جو میں تم کو دوں ؟"

یہ سننا تھا کہ بنئے نے صاف جواب دے دیا ۔" اگر تمہارے پاس ضمانت کے لئے کچھ نہیں ہے تو پھر میں تم کو ایک دھیلا بھی نہیں دے سکتا ۔"

بچارا کسان یہ جواب سن کر پریشان ہو گیا ۔ اس کے سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے آخر سوچتے سوچتے اس کے سمجھ میں ایک بات آ گئی ۔ اس نے اپنے سر سے ایک سفید بال توڑا اور اسے بنئے کے حوالے کرتے ہوئے بولا ۔

" سیٹھ جی ! یہ ہے میری ضمانت ۔"

بنئے نے بال اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ اور اُسے غور سے دیکھتا رہا پھر بولا ۔

" اس سے کام نہیں چلے گا ۔"

"کیوں ؟" کسان نے پوچھا ۔

" اس لئے کہ یہ بال ٹیڑھا ہے ۔"

"ٹیڑھا ہے یا سیدھا ۔ لیکن یہ میرے سر کا بال ہے ۔ بس یہی ہے میری ضمانت ۔"

یہ سن کر بنئے نے وہ بال اپنی تجوری میں احتیاط سے رکھ لیا ۔ اور بلا کچھ اور کہے ، ایک ہزار روپے کسان کے حوالے کر دئے ۔

دو ایک روز میں سارے گاؤں میں اس بات کا چرچا ہو گیا ۔ بچے بچے کی زبان پر یہ بات تھی کہ بنئے نے ایک بال کی ضمانت پر ایک ہزار روپیہ ایک کسان کو قرض دے دیا ۔ بعض لوگوں نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب بنیا بوڑھا

ہوگیا ہے۔ اس لئے اُس نے ایسی غلطی کی۔
اسی گاؤں میں ایک چالاک آدمی رہتا تھا۔ اس کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو اس نے سوچا کہ کیوں نہ میں بھی بنئے کی بے وقوفی سے فائدہ اٹھاؤں۔ چنانچہ وہ بنئے کے پاس پہنچا۔
بنئے نے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"کیوں جی تم کو کیا چاہیئے؟"
اس آدمی نے جواب دیا۔
"سیٹھ جی مجھے ایک ہزار روپے کی سخت ضرورت ہے۔ میری لڑکی کی شادی ہے۔ مجھے ایک ہزار روپیہ دے دیجئے میں بہت جلد لوٹا دوں گا۔"
"تمہارے پاس ضمانت کے لئے کوئی چیز ہے؟" بنئے نے اپنی عادت کے مطابق اس سے پوچھا۔
اس آدمی نے فوراً اپنے سر سے ایک بال توڑا اور بنئے کے ہات میں دیتے ہوئے کہا۔" اسے اپنی تجوری میں رکھ لیجئے۔ یہی میری ضمانت ہے۔ میرے پاس اور کوئی چیز نہیں ہے۔"

" اس سے کام نہیں چلے گا۔" یہ کہہ کر بنئے نے وہ بال پھینک دیا۔
"کیوں! اس میں کیا بات ہے۔ سیٹھ جی؟"
بنئے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
"یہ بال ٹیڑھا ہے۔"
اس آدمی نے ایک اور بال توڑ کر بنئے کے حوالے کیا۔ بنئے نے اُسے بھی اسی طرح ٹیڑھا کہہ کر پھینک دیا۔ اس طرح اس آدمی نے اپنے سر کے پچاسوں بال دے ڈالے اور بنئے نے ہر دفعہ ٹیڑھا کہہ کہہ کر ہر بال کو پھینک دیا۔ آخر بنئے نے عاجز آکر کہا۔" بھائی! اب یہ سلسلہ ختم کرو۔ تمہارے سر میں ایک بال بھی تو سیدھا نہیں ہے۔
مگر اس آدمی نے فوراً جواب دیا۔
" سیٹھ جی ذرا ٹھہریئے، میں آپ کو ابھی ذرا سی دیر میں سیدھا بال نکال کر دیتا ہوں۔"
بنئے نے کہا۔" بھیا! میں نے اتنی دیر میں یہ دیکھ لیا کہ جب تم اپنی چیز کی حفاظت

بقیہ صفحہ ۴۶ پر دیکھئے

صحیح حل — فیس داخلہ ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں اور پانچ حلوں کی فیس ۴؍ — صحیح حل

۱۔ گھی ۲۔ ۳۔ ابتدا
۲۔ رنگ ۵۔ نادان
۳۔ جتانے ۷۔ ذوق

پیامی معمہ نمبر ۲۲ کا شاندار نتیجہ!

۸۔ شدت
۹۔ دام

بالکل صحیح حل بھیج کر مبلغ بیس روپے پہلا انعام جناب خورشید داد خاں ولد ملک ولی داد خاں صاحب حاطر رحیم اللہ۔ گل نیلیاں۔ ایٹر نے حاصل کیا۔

انھیں انعام پانے کی اطلاع بذریعہ خط دے دی گئی

ایک غلطی والے ۲۷ حل موصول ہوئے چنانچہ مبلغ دس روپے کا انعام بحساب لاٹری کس تقسیم کر دیا گیا۔

(۱) خلیق احمد خاں۔ بہرائچ (۲) سید یوسف اختر زکی۔ بلیا (۳) حضرت جان۔ لکشمیشور۔ (۴) حافظ محمد احمد۔ نئی دہلی (۵) شمیم فاطمہ فاروقی۔ بھوپال (۶) حلیمہ بی۔ راویر (۷) فاطمہ بی۔ امراوتی۔ (۸) اجیالی بانو۔ علی گڑھ (۹) صفیہ خاتون۔ سراج گڑھ (۱۰) اسماعیل عمر۔ واجبول (۱۱) شبو میاں۔ لکھنؤ۔ مس خورشید۔ غازی پور۔ ۱۳ تسلیم احمد۔ بلدانہ ۱۴ رام نرائن۔ سیتاپور ۱۵ کشور جہاں۔ حیدرآباد ۱۶ محمد صبیح السلام۔ لاہور (۱۷) افتخار علی۔ شیوپور (۱۸) مس نسیم زہرہ چتور (۱۹) مامونہ بیگم۔ جودھ پور (۲۰) ایم۔ آر۔ احمد۔ ساگر (۲۱) سیدہ قمر فاطمہ بیگم۔ ضلع فتحپور (۲۲) مشتاق احمد۔ ایرنیونہ۔ (۲۳) محمد فاروق احمد۔ اوناؤ (۲۴) کملا دیوی۔ پونچھ (کشمیر) (۲۵) محمد عبدالسلام۔ حیدرآباد (۲۶) بیگم۔ گوڑا باڑ۔ (۲۷) فیروز احمد۔ بمبئی۔

صحیح حل پیامی معمہ نمبر ۲۱

دائیں سے بائیں۔ (۸) پنج (۹) روزی (۱۰) عجیب (۱۱) دوست

اوپر سے نیچے (۱) پچاس (۲) یاد (۳) ادب (۴) مسافر (۵) صدیق (۶) بات

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں

۴۰ روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ ایک آنہ کے ٹکٹ کی صورت میں

داخلہ کی آخری تاریخ ۲۵ اپریل ۵۳ء

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۲۵ روپے

دوسرا انعام ایک غلطی پر ۱۵ روپے

پیامی معمہ نمبر ۲۲

			۲م	ا		۱پ
	ا	۵ں			۳ع	چ
ج	ا	۶	ک	ۂ		
ت		ع	۷	ح		س
	ی		۸ب			
				ت		

دائیں سے بائیں

۱- بچوں کا پیارا ماہنامہ ... تعلیم۔

۴- یہ انسانی زندگی کے لئے بہت خطرناک ہے (تاگ۔ نار)

۶- پہلے زمانے میں اکثر لوگ اس کو حاصل کرنے کے لئے اپنے باپ بھائی تک کو قتل کر دیتے تھے (راج۔ تاج)

۷- بعض آدمیوں کیلئے تو دولت بھی ... ہوتی ہے۔ (نعمت۔ لعنت)

۸- ... بات کبھی منہ سے نہیں نکالنی چاہیئے۔ (بڑی۔ بری)

اوپر سے نیچے۔

۱- پیامی معمہ نمبر ۲۵ کا انعام پچاس روپے ہوگا۔

۲- بعض لوگ ایسے ہیں جنھیں ہر کام ... نظر آتا ہے (ممکن۔ مشکل)

۳- اس کے بغیر ترقی کرنا ناممکن ہے۔ (علم۔ عمل)

۵- ... سے بچنا ہی آج کل کے نوجوانوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ (زحمت۔ محنت)

نوٹ:- بھیجنے کا پتہ:- اڈیٹر پیامی معمات ۲۲۔ جامعہ نگر دہلی

کوپن پیامی معمہ نمبر ۲۲

نام - - - - - - - - - - - -

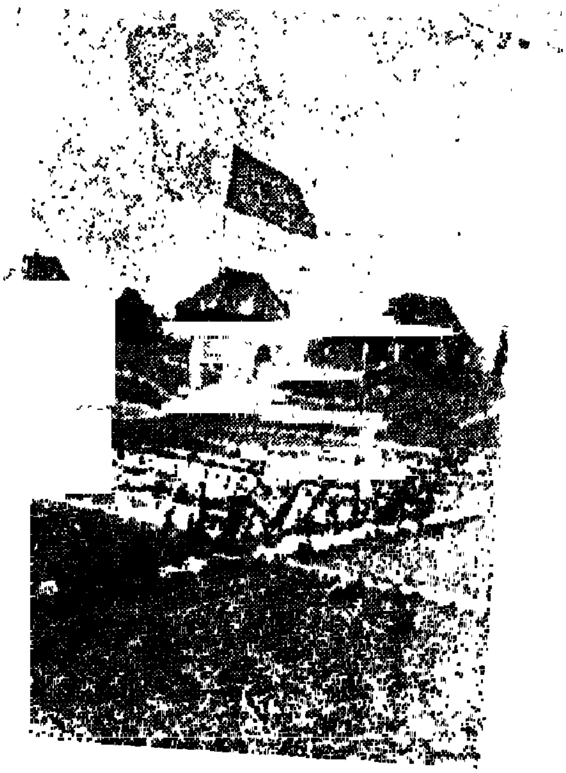
پتہ - - - - - - - - - - - -

کوپن پیامی معمہ نمبر ۲۲

نام - - - - - - - - - - - -

پتہ - - - - - - - - - - - -


پیام تعلیم









کھلی ہوا کے مدرسے کے چند مناظر

12 MAY 1953

پیام تعلیم
مئی ۵۳ء



فہرست

ادارہ
حامد علی خاں
بی، اے، (جامعہ)
اطہر پرویز
ایم۔ اے (علیگ)

سالانہ چندہ
چار روپے
فی پرچہ
چھ آنے



بچوں سے باتیں

نئی دہلی کی ریلوے نمائش کا ذکر تو آپ نے اخباروں میں پڑھا ہی ہوگا۔ نمائش آپ نے بہت دیکھی ہوں گی۔ لیکن یہ اپنی قسم کی پہلی نمائش ہے، جو ہمارے ملک میں ہو رہی ہے۔ یہ نمائش پہلے ۳ر مئی کو ختم ہونے والی تھی، لیکن امتحانات کی وجہ سے بہت سے طالب علم اس کو نہیں دیکھ سکے۔ اس لئے حکومت نے اسے ۱۷ر مئی تک کے لئے بڑھا دیا ہے۔ پیامِ تعلیم کے اس پرچے میں اس نمائش کا حال چھپ رہا ہے۔ اُمید ہے کہ آپ دلچسپی سے پڑھیں گے۔

پیامیوں کا امتحان غالباً اب ختم ہوگیا ہوگا۔ اور اب آپ گرمیوں کی چھٹیاں گزار رہے ہوں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ان چھٹیوں کا حال لکھیں۔ اس زمانے میں آپ کے جو مشغلے ہوں، اس کی کہانی لکھ کر ہمیں بھیجیے۔

کچھ پیامی ایسے بھی ہوں گے جو اس چھٹی میں باہر کی سیر کا پروگرام بنائیں گے۔ اگر

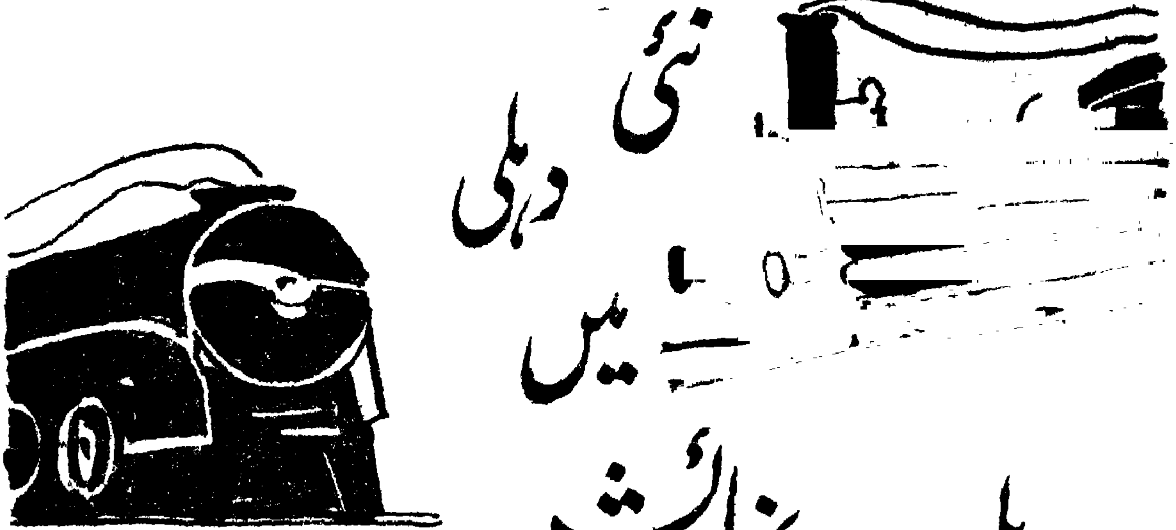
آپ سیر کے لئے جائیں تو اپنے سفر میں پیام تعلیم کو نہ بھولئے گا۔ جہاں بھی جائیں وہاں کا حال لکھ کر ہمیں بھیجئے۔ ہم اُسے "پیام تعلیم" میں شائع کریں گے۔ تاکہ آپ کی تفریح میں اور لوگ بھی شامل ہو سکیں۔

"بچوں کی کوششیں" کے طور پر پیامی جو کہانیاں چھپنے کے لئے بھیجتے ہیں، وہ اکثر بڑی لمبی لمبی ہوتی ہیں اگر آپ اس بات کا خیال رکھیں کہ کہانی مختصر ہو تو اچھا ہے۔ اس طرح ان کے چھاپنے میں ہمیں آسانی ہوگی، اور آپ کو یہ فائدہ ہوگا کہ آپ کی کہانی جلد شائع ہو سکے گی۔ امید ہے کہ آئندہ کہانیاں لکھتے وقت اس کا ضرور خیال رکھیں گے۔

نجمہ سلطان صاحبہ کے مضمون 'کھلی ہوا کے مدرسے' کے بارے میں ہم نے پچھلے مہینے پیامیوں کی رائے معلوم کی تھی۔ سب نے یہی لکھا کہ مضمون ایک مرتبہ ہی چھاپا جائے۔ چنانچہ ہم آپ سب کی خواہش کے مطابق یہ مضمون شائع کر رہے ہیں۔ مضمون کی دلچسپی کا اندازہ آپ پڑھ کر خود ہی لگا لیں گے۔

اس مضمون کی اشاعت کے سلسلے میں ہم مدرسہ ابتدائی کے نگراں جناب آل رسول صاحب کے شکر گزار ہیں، جنھوں نے ہمیں مفید مشورے دئے اور ہمارے لئے تصویریں اکٹھا کیں جو اس پرچے میں چھپ رہی ہیں۔

کیا آپ کو اپنی خریداری کی مدّت یاد ہے؟ اگر نہیں تو چٹ پھاڑنے سے پہلے اُسے ضرور دیکھ لیجئے۔



نئی دہلی میں ریلوے نمائش

ریلوے نمائش کا ذکر آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ یہ اپنی قسم کی پہلی نمائش ہے جو ہمارے دیس میں ہو رہی ہے۔ دراصل ہندستان میں ریلوں کو چلتے ہوئے سو سال ہوگئے۔ ۱۶ر اپریل ۱۸۵۳ء کو ہندستان میں پہلی بار ریل گاڑی بوری بندر (بمبئی) سے چلی اور تقریباً ۲۲ میل کے فاصلے پر "تھانہ" پہنچی۔ یہ نمائش اسی لئے ہو رہی ہے کہ ہم اندازہ لگا سکیں کہ اس سو سال کے عرصے میں ہماری ریلوں نے کتنی ترقی کی۔ ہماری ریلیں کیسی تھیں اور اب کیا ہوگئیں۔

یہ نمائش دہلی سے متھرا جانے والی سڑک کے راستے پر پرانے قلعے کے بالکل پاس ایک بڑے میدان میں ہو رہی ہے۔ میدان بھی کوئی چھوٹا موٹا نہیں، تیس ایکڑ کا تکونا میدان ہے۔ باہر سے دیکھئے تو وہ پھاٹک نظر آرہا ہے، سادہ لیکن بہت ہی خوب صورت۔ پھاٹک کے قریب بیل گاڑی، تانگہ، موٹر اور انجن کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ جن کو ایک نظر دیکھ کر ہم سمجھ جاتے ہیں کہ انسان نے ذرائع آمد و رفت کے

معاملے میں کتنی ترقی کی ہے۔

پھاٹک کے اندر داخل ہوتے ہی بڑا سا میدان ہے جہاں ہر طرف پھولوں کی خوشنما کیاریاں ہیں اور سبزہ ایسا نرم نرم ہے کہ دیکھ کر بے ساختہ بیٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ میدان میں ذرا آپ آگے بڑھئے تو آپ کو ریلوں کی اصل نمائش گاہ دکھائی دے گی۔ جیسے دیکھئے اُدھر ہی بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ تو پھر آئیے ہم آپ بھی اندر چلیں۔ ارے بھائی یہ تو عجیب و غریب جگہ ہے۔ ہماری ہندستانی ریلیں جس طرح چھ حصّوں میں بٹی ہوئی ہیں اُسی طرح یہاں بھی ان کے لئے الگ الگ جگہ مقرر کی گئی ہے۔ ہر علاقے کی ریلوے اپنے اپنے حصّوں کی نمائش کر رہی ہے۔

کہیں نقشے ہیں، کہیں تصویریں ہیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ ننھی منّی گاڑیاں بھی چل رہی ہیں۔ وا بھائی واہ — یہ لو رُک گئی چلتے چلتے، جیسے بیچ مچ کی تو ہے، کہ سگنل نہ گرنے کی وجہ سے رُک گئی۔ جب سگنل نہ گرے تو آگے جانے میں خطرہ ہی تو ہوتا ہے۔ آپ نے گاڑی میں سفر کرتے ہوئے دیکھا ہوگا کہ گاڑی اسٹیشن کے قریب پہنچ کر اکثر رُک جاتی ہے۔ دراصل وہ سگنل گرنے کا انتظار کرتی ہے جب سگنل گر جاتا ہے تو گاڑی آگے بڑھتی ہے۔ لیجئے اب سگنل ہوگیا اور ہماری یہ ننھی سی گاڑی چل پڑی۔ کہیں پہاڑ دکھائی دے رہے ہیں۔ کہیں پُل ہیں، جن پر سے یہ ننھی منّی گاڑیاں گزر رہی ہیں۔ یہ پُل ہی نہیں بعض اسٹیشنوں کے نمونے (ماڈل) ہیں۔ کہیں باوڑا اسٹیشن ہے تو کہیں پٹنہ، دادر، بڑودا۔ وغیرہ۔

اب آگے بڑھتے جائیے۔ یہ نمائش کتنی دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ وہ دیکھئے چترنجن فیکٹری کی نمائش گاہ بھی نظر آرہی ہے۔ آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ اب ہمارے دیس میں انجن بھی بننے لگے ہیں۔ اس کارخانے کا ایک انجن یہاں بھی آیا ہے۔ یہ ایشیا کا سب سے بڑا انجن بنانے والا کارخانہ ہے۔

ہر اسٹال پر جو یہ آدمی کھڑے ہیں۔ ان سے آپ کو آپ کے سوالوں کے جواب بھی مل سکتے ہیں۔

کونے میں نظر ڈالئے۔ وہیلر کی کتابوں اور اخباروں کا اسٹال ہے۔ یہ اسٹال

دیکھ کر آپکو کوئی ریلوے اسٹیشن یاد آجائے گا بالکل ویسا ہی اسٹال ہے جیسا اسٹیشنوں پر ہوتا ہے۔

اگر آپ ریل میں سیر کرنا چاہیں تو سیر بھی کیجئے، لیکن یہاں بھیڑ بہت ہے۔ ٹکٹ لینے کےلئے کتنی لمبی قطار بنی ہوئی ہے۔ نمائش میں آئے ہیں تو پھر ریل کا مزا بھی لے لیں۔

اب آپ ریل کی سیر کر چکے۔ یہ سامنے انجن اور گاڑیاں نظر آرہی ہیں۔ یہ ڈبہ دیکھئے جو سامنے پٹری پر کھڑا ہے۔ اسی میں گاندھی جی کی راکھ دہلی سے الہ آباد گئی تھی۔ اس کے اندر سب کچھ ویسے ہی رکھا ہے۔ اندر ایک میز ہے اور چاروں طرف قومی جھنڈے۔

اس کے قریب جو دوسرا ڈبہ ہے۔ کسی زمانے میں انگلستان کے پرنس آف ویلز، (جو اب ڈیوک آف ونڈسر ہیں) ہندستان آئے تھے۔ انھوں نے اسی ڈبے میں بیٹھ کر اس وقت سارے ہندستان کی سیر کی تھی۔

اب ایک پرانا انجن دیکھئے۔ یہ انجن اب سے ۹۸ سال پہلے بنا تھا اور چالیس سال تک کام دیتا رہا۔ لیکن یہ دوسرا عمر میں تو اس سے کم ہے مگر کام اب بھی دے رہا ہے۔ یہ ایک سَن کے کارخانے میں کام کرتا ہے اور سَن سے لدی ہوئی گاڑیاں اِدھر سے اُدھر لے جاتا ہے۔ ۷۵ برس کی عمر ہے مگر جوں کا توں ہے۔

لیکن انجنوں میں سب سے زیادہ دلچسپ تو ایک اور انجن ہے۔ وہ دیکھئے جہاں سامنے خوب بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ یہ انجن گوالیار کے راجہ صاحب نے اپنے لڑکے کے لئے خریدا تھا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کوئلے کی جگہ صندل جلایا جاتا ہے، اور چنبیلی کا تیل جو ہم آپ اپنے سر میں لگاتے ہیں، وہ اس کے کَل پرزوں میں دیا جاتا ہے۔ مگر یہ تو پرانے راجاؤں کی باتیں ہیں۔

اب انجن تو آپ نے دیکھ لئے۔ آئیے آپ کو ایک نئے ڈھنگ کا ڈبہ دکھائیں۔ کتنی گرمی ہو رہی ہے۔ یہ دلی کی گرمی بھی خوب ہے کہ مئی کے آنے سے پہلے ہی چوٹی سے ایڑی تک پسینہ بہنے لگا۔ لیکن اس ڈبے کے اندر قدم رکھئے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دہلی سے کشمیر آگئے۔ ساری تھکن دور ہوگئی۔ بھئی یہ ائرکنڈیشن سیلون ہے۔ بڑے

بقیہ صفحہ ۳۲ پر دیکھئے۔

چار آنے

سیّد منیر الحسن



یہ اٹلی کی ایک مشہور کہانی ہے ــــ اور ملک اٹلی جیسا کہ آپ جانتے ہیں یورپ میں بحر روم کے خطے میں واقع ہے۔ یہ بہت سی باتوں میں ہمارے ہندوستان سے ملتا جلتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اٹلی اور ہندوستان دونوں جزیرہ نما ہیں اور دونوں اپنے اپنے برّاعظموں کے جنوبی حصّوں کے بیچ میں واقع ہیں۔ دونوں کے شمال میں پہاڑوں کے سلسلے ہیں جو سنگین فصیل کا کام کرتے ہیں۔ یعنی کوہ ہمالیہ ہندوستان میں اور ایلپس اٹلی میں۔ اسی طرح دونوں ملکوں کے جنوب میں جزیرے ہیں یعنی لنکا ہندوستان میں اور سسلی اٹلی میں۔ اور ایک لطف کی بات یہ ہے کہ دونوں کے مشرقی ساحلوں پر بہت کم بندرگاہ ہیں۔

چنانچہ دوسری جنگ عظیم میں جب اٹلی اور جرمنی ہار گئے تو ان ملکوں کے سپاہیوں کو فوراً ہی "جنگی قیدی" کی حیثیت سے کیمپوں میں بند کر دیا گیا۔ یہ کیمپ بالکل جیل کی طرح ہے۔ اتحادیوں کی طرف سے ہندوستان میں کوئی تین چار ہزار اطالوی قیدی ریاست بھوپال میں بھی ایک خاص کیمپ میں رکھے گئے جو "بیراگڈھ" کہلاتا ہے۔ انھیں قیدیوں میں سے

ایک قیدی روم کا رہنے والا تھا۔ اس نے مجھے یہ کہانی سُنائی۔ آپ بھی یہ کہانی سُنئے۔

بہت دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن ایک کسان اپنا کھیت جوت رہا تھا۔ اُسی وقت ایک بادشاہ اُس راستے سے گزرا۔ بادشاہ نے جب کسان کو اس طرح ہل چلاتے ہوئے دیکھا تو اس نے کسان سے پوچھا:۔ "تم ایک دن میں کتنا کما لیتے ہو؟" کسان نے جواب دیا ـــــ "میں صرف چار آنے کما پاتا ہوں" راجہ نے پوچھا:۔ "تم ان کا کیا کرتے ہو؟"

کسان نے جواب دیا ـــــ "کہ ایک آنے سے میں کھانا کھاتا ہوں، دوسرا آنہ اُدھار دے دیتا ہوں، تیسرا آنہ قرض کی ادائگی میں دیتا ہوں اور چوتھا آنہ کنوئیں میں پھینک دیتا ہوں" بادشاہ اس پہیلی جیسی بات کا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھ سکا۔ اس لئے اس نے کسان سے ذرا صاف صاف اور تفصیل سے بیان کرنے کے لئے کہا۔ کسان نے جواب میں یوں کہنا شروع کیا ـــــ

جناب پہلے آنے سے میں اپنا اور اپنی بیوی کا خرچ اُٹھاتا ہوں، دوسرا آنے میں اپنے بچوں کو کھلا پلا دیتا ہوں تاکہ وہ میرے بڑھاپے میں جب کہ میں کسی کام کے کرنے کے قابل نہیں رہوں گا، بوڑھا اور کمزور ہو جاؤں گا اُس وقت نہ صرف یہ کہ وہ میری مدد کریں گے بلکہ میری خبرگیری کر کے مجھے اس کا بدلہ دیں گے۔ اس طرح وہ مجھے میرا دیا ہوا قرض چکا دیں گے۔ تیسرا آنہ میں اپنے والدین کو کھلاتا پلاتا ہوں اور اس طرح میں اپنے والدین کا وہ قرض ادا کرتا ہوں جو کہ انھوں نے بچپن میں مجھے دیا تھا۔ چوتھا آنہ خیرات کر دیتا ہوں یعنی اچھے کاموں میں خرچ کر دیتا ہوں۔ جس کا معاوضہ یا انعام اس دنیا میں کسی قیمت پر نہیں چاہتا۔"

بادشاہ کسان کی یہ بات سُن کر بہت خوش اور متاثر ہوا اور اُس نے کسان سے کہا کہ جب تک تم میرا چہرہ سو بار نہ دیکھ لینا اُس وقت تک کسی کو ان سوالات کے جواب نہ بتانا۔ اس کا وعدہ کرو۔ کسان نے اس بات کا وعدہ کیا کہ وہ کسی کو بھی اس کا مطلب نہیں بتلائے گا۔ اس بات چیت اور گفتگو کے بعد

کسان پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ اور بادشاہ اپنے محل کی طرف چل دیا۔

دوسرے دن جب دربار ہوا اور حسب معمول تمام امیر، وزیر دربار میں جمع ہوگئے اُس وقت بادشاہ بھی دربار میں آئے۔ سب نے کھڑے ہوکر بادشاہ کو جھک کر سلام کیا۔ جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو اس وقت بادشاہ نے فوراً ہی وزیروں سے مخاطب ہوکر کہا کہ آج آپ کو ایک مسئلہ حل کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ "ہمارے ملک میں ایک کسان رہتا ہے جو چار آنے روز کماتا ہے۔ پہلا وہ کھاتا ہے، دوسرا اُدھار دیتا ہے، تیسرا قرض میں ادا کرتا ہے اور چوتھا کنوئیں میں ڈال دیتا ہے۔ اب آپ یہ بتائیے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے اور ایسا کرنے سے اس کا مقصد کیا ہے؟"

بادشاہ کی یہ باتیں سُن کر وزیر اور درباری بڑے پریشان ہوئے۔ اس سوال کو حل کرنے میں ان سب نے بہت سر مارا اور بہت زیادہ دماغ سوزی کی، مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ اب تو یہ لوگ اور بھی پریشان ہوئے آخر ان وزیروں میں سے ایک وزیر نے جو بڑا ہوشیار تھا تین دن کی مہلت مانگی۔ بادشاہ نے نہایت خوشی کے ساتھ اس بات کی اجازت دے دی۔

اب اُس وزیر نے یہ پتہ لگانا شروع کیا کہ آخر بادشاہ کو یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی اور وہ کسان کہاں ہے، اُس کا نام کیا ہے؟ بڑی دوڑ دھوپ اور محنت و کوشش کے بعد پتہ چلا کہ کل بادشاہ کی ملاقات اچانک ایک کسان سے ہوئی تھی اور بادشاہ کے پوچھنے پر یہ سوال اور اس کا جواب کسان نے بادشاہ سلامت کو بتلایا تھا۔ وزیر فوراً ہی آناً فاناً اُس کسان کے گھر پہنچا اور اُسے سارے دربار کا حال یہاں تک سُنا دیا کہ وزیروں سے بھی تمہارے اُس سوال کا جواب نہ بن پڑا۔

وزیر کی یہ بات سُن کر کسان نے کہا کہ "اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" وزیر نے جواب دیا کہ "میں تمہارے پاس اس سوال کا جواب معلوم کرنے آیا ہوں۔" کسان نے نہایت اطمینان سے کہا کہ "میں نے بادشاہ سلامت سے وعدہ کرلیا ہے کہ جب

تک میں بادشاہ سلامت کا چہرہ سو بار نہیں دیکھ لوں گا کسی اور اجنبی شخص کو اس کا جواب نہیں بتاؤں گا۔ مجھے اپنے وعدے کا پاس ہے اور میں اس سے نہیں پھر سکتا۔"
کسان کی یہ بات سن کر وزیر بہت چکرایا اور سوچ میں پڑ گیا۔

آخر ایک ترکیب اُس کی سمجھ میں آگئی وہ یہ کہ وزیر نے اپنی جیب سے اشرفیوں کی ایک تھیلی نکالی اور کسان کو دیتے ہوئے کہا کہ ان اشرفیوں پر بادشاہ کے چہرے کی مُہر بنی ہوئی ہے تم ان سب کو دیکھ کر اپنی قسم پوری کر لو۔ کسان وزیر کی اس بات سے مطمئن ہو گیا اور اُس نے وزیر کو نہایت تفصیل سے ان سوالات کے جواب بتا دئے۔

وزیر خوش خوش دوسرے روز بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔ اور بھرے دربار میں ان سوالات کے جواب دئے جو بادشاہ نے کئے تھے تمام وزیر اور درباری وزیر کی ہوشیاری کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور خوش بھی بہت ہوئے لیکن بادشاہ نے وزیر کی بات سُننے کے بعد کہا کہ "معلوم ایسا ہوتا ہے تم نے اُس کسان سے سارے جواب معلوم کر لئے ہیں"

بادشاہ کے حکم کی دیر تھی۔ کسان فوراً بلوایا گیا۔ اور اس سے پوچھا کہ تم نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ کسان نے جواب دیا کہ "حضور میں نے جواب تبلانے سے پہلے آپ کا چہرہ سو بار دیکھ لیا تھا۔" کسان کی یہ بات سُن کر بادشاہ کو سخت تعجب ہوا۔ چنانچہ بادشاہ نے بڑے اچنبھے کے انداز میں کہا کہ "وہ کیسے؟"

اُس وقت کسان نے اپنی جیب سے اشرفیوں کی ایک تھیلی نکالی اور انھیں گن کر بتایا کہ میں نے اس طرح ان اشرفیوں پر آپ کے بنے ہوئے چہرے کو سو بار دیکھ لیا تھا۔" کسان کی اس عقلمندی پر بادشاہ اتنا زیادہ خوش ہوا کہ اس نے کسان کو سونے کی سو اشرفیاں اور زیادہ انعام میں دیں۔

دفتر سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں۔

کیا کمایا کیا کھایا

غوث انصاری

جب آپ کو کوئی دعا دیتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ "ہزاروں برس کی عمر ہو، خوب پھولو پھلو، لاکھوں کماؤ" اور آپ خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ پھر سوچنے لگتے ہیں کہ ہم ڈاکٹر بنیں گے یا وکیل بنیں گے یا ماسٹر بنیں گے یا تاجر بنیں گے اور اس کے لئے آپ خود جی لگا کر پڑھتے ہیں۔ اچھے اچھے نمبروں سے پاس ہوتے ہیں۔ غرض کہ آپ میں سے کوئی بچہ بھی ایسا نہ ہوگا جو بڑا ہوکر کچھ نہ کچھ بننے کا خواب نہ دیکھتا ہو۔ مگر ایسا بھی زمانہ تھا جب بچے یہ سب باتیں نہیں سوچا کرتے تھے۔ وہاں تو بس یہ تھا کہ جو کام آبا کرتے تھے، وہی ان بچوں کو بھی کرنا پڑتا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ دنیا نے دھیرے دھیرے ترقّی کی ہے۔

آج سے ہزاروں برس پہلے کی بات ہے جب آدمی جنگلی جانوروں کی طرح جنگلوں میں رہا کرتا تھا، تب نہ رہنے کو گھر تھا، نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔ کبھی تو درخت کے اوپر چڑھ کر سو رہا، کبھی پہاڑوں کے غاروں میں رات بسر کرلی۔ کپڑے کی جگہ درختوں کے پتّوں سے کام لیتا تھا، کھانے کیلئے مچھلیوں اور جانوروں کا شکار کرتا تھا، اور شکار کا گوشت ایسے ہی

کچا چبا کر پیٹ بھر لیا کرتا تھا۔ اس زمانے میں بندوق ایجاد نہیں ہوئی تھی، اس لئے وہ پتھروں کو نوکیلا کر کے عجیب و غریب ڈھنگ کے اوزار بنا لیتا تھا، جن کو اب اگر آپ دیکھیں تو ہنسی آجائے۔ اُس زمانے کی سب سے اچھی بات یہ تھی کہ تمام آدمی اپنی اپنی جگہ پر آزاد تھے، نہ کوئی کسی کا مالک تھا اور نہ کوئی نوکر یا غلام۔ پھر سب ہی آدمی مل جُل کر بانٹ کر کھاتے تھے۔ ان لوگوں میں یہ بات نہیں تھی کہ یہ چیز میری ہے اور وہ چیز میری ہے۔ بلکہ جو چیز بھی تھی وہ سب ہی کی تھی۔ کوئی بھی آدمی کسی آدمی پر بے جا سختی نہیں کر سکتا تھا اور اگر کوئی ایسا کرتا تھا تو اس کو سب مل کر سزا دیتے تھے۔

دھیرے دھیرے ایسا ہوا کہ آدمیوں نے جانوروں کے شکار کے ساتھ ساتھ دودھ دینے والے جانوروں کو پالنا بھی شروع کر دیا اور جب شکار نہیں ملتا تھا تو پالے ہوئے جانوروں کو مار مار کر کھاتا تھا۔ جس آدمی کے پاس سب سے زیادہ جانور ہوتے تھے وہ سب سے امیر آدمی سمجھا جاتا تھا۔ بس اس زمانے سے میرے اور تیرے کی بات بھی شروع ہوئی۔ اور پہلے والا میل ملاپ بھی ختم ہو گیا۔ امیر، غریب کا فرق شروع ہو گیا۔ اُس زمانے میں لوگ روپے پیسے تو جانتے نہیں تھے اور نہ ہی روپیہ دے کر جانور خریدتے تھے بلکہ ہوتا یہ تھا کہ جو سب سے طاقت ور ہوتا تھا، وہ بہت سے جانوروں کو پکڑ کر اپنے قبضے میں کر لیتا تھا اور جب بہت سے جانور ایک ہی آدمی کے قبضے میں ہوں تو وہ سب کی رکھوالی تو کر نہیں سکتا، اس لئے وہ دس پانچ کمزور آدمیوں کو پکڑ کر زبردستی اپنا غلام بنا لیتا تھا اور ان سے اپنے جانوروں کی رکھوالی کراتا تھا۔ ان بے چارے غلاموں پر وہ طرح طرح کی سختی کرتا تھا اور بیس بیس گھنٹے کام لیتا تھا ــــ اس زمانے میں آدمی ایک جگہ جم کر نہیں رہتا تھا کہ بلکہ دو مہینے ایک جگہ رہا تو دو مہینے دوسری جگہ ــ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب جانور کسی ایک جگہ کا چارہ چر کر چٹ کر جاتے تھے اور کچھ گھاس پھوس

باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ تب آدمی جانوروں کو لے کر دوسری جگہ جا کر رہنے لگتا تھا جہاں گھاس وغیرہ ہو اور اس طرح سے آدمی خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس طرح مارے مارے پھرنے میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض جگہوں پر رات بسر کرنے کے لئے کوئی چیز نہ ہوتی تھی، تب آدمی نے یہ ترکیب سوچی کہ جھونپڑیوں کی طرح کے مکان بنانے شروع کر دئے، تاکہ بارش اور سردی سے بچ سکے۔ یہ جھونپڑیاں کچھ اس قسم کی ہوتی تھیں کہ آسانی سے ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ لے جائی جا سکیں۔ اسی زمانے میں آدمی نے آگ کا جلانا بھی معلوم کر لیا تھا۔ آگ سے آدمی دو کام لیتا تھا۔ ایک تو سردی سے بچنے کا اور دوسرے گوشت کو بھون کر کھانے کا۔ کچے گوشت کی بہ نسبت بھنا ہوا گوشت زیادہ مزا دیتا تھا۔

اس طرح کی گھومنے پھرنے والی زندگی آدمی نے کئی ہزار سال تک بسر کی۔ اس درمیان میں بعض دفعہ ایسا بھی موقع آیا کہ کھانے کے لئے کوئی چیز نہ ہونے پر گھاس وغیرہ سے پیٹ بھرا۔ اسی گھاس پھوس میں گیہوں کے دانے بھی اُسے ملے۔ آدمی کو یہ گیہوں کے دانے بہت مزے کے معلوم ہوئے۔ چونکہ اس وقت تک اُسے صرف اتنا معلوم تھا کہ زمین سے جو اُگتا ہے وہ خود اُگتا ہے۔ اس لئے وہ جوتنا بونا نہیں جانتا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اُسے اندازہ ہوا کہ اگر کوئی بیج زمین کھود کر بو دیا جائے تو اس کا پودا اُگ آتا ہے چنانچہ آدمی نے گیہوں بونا شروع کر دیا۔ اور اس طرح کھانے کا سامان زمین سے اُگانے لگا۔ اس کھیتی باڑی کے لئے ضروری تھا کہ آدمی جم کر ایک جگہ رہے۔ ورنہ پھر کھیتی باڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس ایک جگہ جم کر رہنے سے گاؤں بننا شروع ہو گئے۔ اور لوگوں نے کچے مکان بنا کر ان میں مستقل رہنا شروع کر دیا۔ یہاں بھی ایسا ہوا کہ جو طاقتور آدمی تھے وہ زمین کے مالک بن بیٹھے اور کمزور آدمیوں سے محنت مزدوری کا کام لیتے تھے۔ اس محنت کے بدلے ان کو تھوڑا بہت گیہوں ملتا تھا۔

جب گاؤں آباد ہو گئے اور بہت بہت

سے آدمی ایک جگہ جم کر رہنے لگے تو اور بھی بہت سے کام دھندے ہونے لگے۔ مثلاً کپڑا بننا، لکڑی کا سامان بنانا، مٹی کے برتن بنانا وغیرہ ـــــ اس زمانے تک لوگ تھوڑے بہت مہذب بھی ہوگئے تھے اور رہنے سہنے کا طریقہ بھی بدل گیا تھا۔ یہی دیکھئے کہ کپڑے پہننے شروع کر دئے تھے، برتنوں میں کھانا پکانے لگے تھے، لوہے کے ہتھیار استعمال کرنے لگے تھے۔ آپس میں لین دین شروع ہوگیا تھا یعنی اگر جولاہے کو گیہوں کی ضرورت ہوتی وہ کسان کے پاس جاتا اور اس سے گیہوں لے کر کپڑا اسے دے دیتا۔ اسی طرح گاؤں کا سارا کاروبار چلتا۔ اب بھی دیہاتوں میں تھوڑا بہت یہ طریقہ باقی ہے۔ البتہ شہروں میں یہ طریقہ بالکل نہیں ملے گا۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد غلاموں پر سختیاں کم ہونی شروع ہوئیں پھر آہستہ آہستہ غلام بنانے کا دستور ختم ہوگیا آخر میں صرف یہ رہ گیا کہ زمیندار کی زمین پر کسان کھیتی باڑی کرتا اور سال کے آخر میں یا فصل پر اپنے حصے میں سے آدھا یا چوتھائی زمیندار کو دینا پڑتا۔ اور یہ طریقہ ہمارے ملک کے دیہاتوں میں تو آج تک باقی ہے کہ زمیندار (بہت بڑے زمیندار راجہ مہاراجہ کہلاتے ہیں) اپنے محل میں مزے کرتا ہے اور کسان محنت مزدوری کرکے جو کچھ پیدا کرتا ہے وہ اس میں سے حصہ بٹاتا ہے۔ ویسے شہروں میں تو آپ دیکھتے ہی ہوں گے کہ ان راجہ مہاراجہ کے کتنے عالیشان محل ہیں۔

لیجئے شہروں کا تذکرہ آگیا۔ اب آپ پوچھیں گے کہ شہر کیوں اور کیسے بنے؟ یہ بات بھی بتانی ہی پڑے گی، شہر والے جو ٹھہرے! بھئی کم از کم ہمیں تو اپنا شہر بہت پسند ہے۔ آئیے پھر یہ بھی بتاتے چلیں۔ جب دیہاتوں میں چھوٹے موٹے دھندے شروع ہوئے تو گاؤں کے درمیان لین دین شروع ہوا۔ مثلاً ایک گاؤں میں ضرورت بھر کا کپڑا نہیں تیار ہو پاتا تو دوسرے گاؤں سے کپڑا لیا جاتا اور اس کے بدلے میں وہ چیز دی جاتی جس کی انھیں ضرورت ہوتی۔ اس طرح سے تجارت شروع ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ تجارت بڑھی، اور ایک ملک اور دوسرے ملک کے درمیان تجارت ہونے لگی چونکہ اس زمانے میں ریل گاڑی تو تھی نہیں اس لئے سامان کشتیوں اور چھوٹے جہازوں کے ذریعے

دریاؤں کے راستے سمندر تک جاتا اور وہاں سے جہازوں پر دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا۔ جن جن جگہوں پر آسانی کے ساتھ دریاؤں کے راستے سامان جا سکتا تھا وہاں پر لوگ جا جاکر آباد ہونے لگے۔ اور جیسے جیسے تجارت ترقی کرتی گئی ویسے ویسے وہ جگہیں زیادہ سے زیادہ آباد ہوتی گئیں۔ بڑے بڑے بیوپاری تو مستقل ان ہی جگہوں پر رہنے لگے۔ پختہ سڑکیں بن گئیں۔ امیر لوگوں نے اپنے اچھے اچھے مکان بنوائے اور راجہ مہاراجہ بھی غریبوں کی بستی سے ذرا ہٹ کر رہنا پسند کرتے تھے اس لئے انھوں نے بھی اپنے محل ایسی ہی جگہوں پر بنوائے۔ اس بات کا اندازہ یوں بھی آسانی سے ہو سکتا ہے کہ جتنے بڑے بڑے شہر ہیں وہ سب دریاؤں اور سمندر کے کنارے آباد ہیں۔

اب دیکھئے! ہوتے ہوتے یہ کہانی ہماری آج کل کی زندگی سے کتنی قریب ہو گئی ہے۔ یہ تو ابھی صرف دو برس پہلے کی بات ہے کہ سائنس نے ترقی کرنی شروع کر دی۔ مشینیں ایجاد ہونے لگیں جو کام پہلے ہاتھ سے کئے جاتے تھے وہ مشینوں کے ذریعے ہونے لگے۔ طرح طرح کی مشینیں بن گئیں۔ مثلاً پہلے جولاہے ہاتھ سے کپڑا بنتے تھے۔ مگر اب کارخانوں میں کپڑا تیار ہوتا ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جس کام کو دس آدمی مل کر چار دن میں کر سکتے تھے وہی کام اب دو آدمی مشین کے ذریعے سے چار گھنٹوں میں کر لیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مشین سے بنی ہوئی چیزیں زیادہ مضبوط اور زیادہ خوبصورت ہوتی ہیں۔ آپ کسی بھی بازار میں نکل جائیے تو دیکھیں گے کپڑے، جوتوں اور روز مرہ کے استعمال کی چیزیں سیکڑوں قسم کی دوکانوں میں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ سب مشین ہی کی بدولت تو ہے۔ ان مشینوں کے رواج سے بڑے بڑے سیٹھ بنے۔ ویسے آپ گننے بیٹھئے تو آپ شہر کے سیٹھوں کو انگلیوں پر گن سکتے ہیں مگر ان کے کارخانوں میں جو مزدور کام کرتے ہیں وہ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں ملیں گے۔

مشینوں کے رواج سے شہروں نے بھی خوب ترقی کی۔ تمام کارخانے شہروں ہی میں قائم ہوئے کیونکہ یہاں ہر قسم کی آسانیاں تھیں، مثلاً سامان لانے لے جانے کے لئے پکی سڑکیں، ریل گاڑی اور بجلی پیدا کرنے کا انتظام ساتھ ہی ساتھ

مزدور بھی شہر میں زیادہ تعداد میں ملتے ہیں۔ دیہاتوں میں یہ سب آسانیاں ممکن نہیں تھیں اور نہ ہی اتنے بہت سے مزدور مل سکتے تھے۔ شہروں میں کارخانے کے قائم ہو جانے سے دیہاتوں میں سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ بہت سے دیہاتی لوگ روزی کی تلاش میں دیہات چھوڑ چھوڑ کر شہر آنے لگے۔ دوسری تبدیلی وہاں یہ ہوئی کہ شہر کے کارخانوں کی بنی ہوئی چیزیں وہاں جاجاکر بکنے لگیں۔ جو چھوٹے موٹے دھندے وہاں ہوتے تھے وہ ختم ہونے لگے اور صرف وہی لوگ وہاں باقی رہ گئے جو کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ روپیہ پیسہ کا رواج وہاں بھی شروع ہو گیا۔ جہاں پہلے گیہوں کے بدلے چاول، کپڑے کے بدلے جوتا ملتا تھا وہاں اب شہروں کی طرح ہر چیز روپیہ سے خریدی جاتی اور روپیوں میں بیچی جاتی ہے۔

تو یہ کہانی اپنی ہزاروں برس سے لے کر اب تک کی ہے اس پوری کہانی سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ آج کل جیسے آپ کو گھر بیٹھے آرام سے کھانا مل جاتا ہے، کپڑا مل جاتا ہے اور ضرورت کی تمام چیزیں مل جاتی ہیں اس طرح کا آرام پہلے نہیں تھا۔ مگر ترقی کرتے کرتے آج ہم کتنے آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ ترقی یہیں آکر ختم نہیں ہوئی بلکہ روز بروز نئی نئی چیزیں ایجاد ہوتی جارہی ہیں۔

بقیہ گھاس کے میدان کا پہرے دار صفحہ ۲۹ سے آگے۔

ہوئی کہ انھوں نے میدان میں ایک سنتری کو مقرر کر دیا کہ اُس پھول کو لوگوں کے پاؤں سے کچلنے سے بچائے۔

سنتری مقرر کرنے کے بعد یہ بات بھلا دی گئی اور کچھ دنوں بعد جب وہاں پھول کا نام و نشان بھی نہ رہا تو بھی سنتری کی ڈیوٹی لگتی رہی۔ یہاں تک کہ ایک زمانہ گزر گیا اور آج کسی کو یہ بھی یاد نہیں کہ اس پہرے دار کے وہاں کھڑے ہونے کا کیا سبب ہے۔

زار یہ سُن کر بہت خوش ہوا۔ اس کی اور بسمارک کی الجھن ختم ہوئی۔ بڑھیا انعام پاکر خوش خوش واپس گئی۔ یہ واقعہ روس میں بہت مشہور ہے۔ اور اب بھی جب کسی بات کا پتہ نہیں چلتا تو لوگ کہتے ہیں "یہ تو گھاس کے میدان کا پہرے دار والی بات ہے"۔


(۱)
بابوجی! کیا ٹائم ہے؟
(۲)
کیا بج گیا بابوجی؟
(۳)
کیوں صاحب کیا وقت ہوگا؟
(۴)
بابوجی! ذرا ٹیم تو بتانا؟
آپ کو معلوم ہے کہ اب کیا بجا ہے۔
ذرا گھڑی دیکھیے۔



یانوچو کی عقلمندی

ایک قدیم چینی کہانی

کئی ہزار سال پہلے کی بات ہے کہ جب چین میں چھوٹے چھوٹے بہت سے ملک تھے۔ ان ملکوں میں 'چھی' اور 'چھو' نام کے دو ملک تھے۔ ایک دن "چھی" ملک کے بادشاہ نے "چھو" میں اپنا سفیر بھیجنا چاہا۔ 'چھو' کا بادشاہ بہت ظالم تھا۔ اس کے پڑوسی اسی لئے اس سے ڈرتے بھی تھے۔ چنانچہ 'چھی' دیس کے بادشاہ نے سوچا کہ وہاں کوئی ہوشیار سفیر بھیجا جائے۔ اُس نے اس کام کے لئے ہزاروں آدمیوں میں سے ایک آدمی کو چنا۔ اُس کا نام 'یانوچو' تھا۔

یانوچو بہت چھوٹے قد کا ناٹا سا آدمی تھا۔ مگر جتنا ہی اس کا قد چھوٹا تھا، اتنا ہی اس کا دماغ بڑا تھا۔ اب یانوچو کو ملک 'چھو' میں بھیجنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ یہ خبر 'چھو' کے بادشاہ کو بھی معلوم ہو گئی کہ اس کے ملک میں 'چھی' سے ایک ناٹے قد کا آدمی سفیر ہو کر آرہا ہے۔ وہ اپنی شرارت سے کب چوکنے والا تھا۔ اس نے دارالسلطنت کے بڑے دروازے کے پاس ہی ایک چھوٹا سا دروازہ بنوایا۔ جب یانوچو وہاں پہنچا تو بڑا دروازہ بند کر دیا

گیا اور چھوٹا دروازہ کھول دیا گیا۔ ایک آدمی نے بڑھ کر کہا "حضور! آپ بہت ناٹے ہیں، اس لئے آپ اس کتے کے دروازے سے ہو کر اندر آسکتے ہیں۔"

یانوچڑ آدمی تھا حاضر جواب، اس بے عزتی سے گھبرایا نہیں، اُس نے فوراً کہا "اگر میں آدمیوں کے ملک میں آتا تو آدمیوں کے دروازے سے گھُستا، مگر چونکہ کتوں کے ملک میں آیا ہوں، اس لئے کتوں کے دروازے سے ہی گھسنا پڑے گا۔ کیا 'چھو' کتوں کا ملک ہے؟"

یہ سُن کر وہ سب لوگ بہت شرمندہ ہوئے اور انھوں نے صدر دروازہ کھول دیا پھر یانوچڑ کو اسی میں سے لے گئے۔

جب یانوچڑ بادشاہ کے پاس پہنچا تو بادشاہ نے اس سے پوچھا "تم بڑے چھوٹے سے آدمی ہو۔ کیا تمہارے ملک میں سب لوگ تمہاری ہی طرح چھوٹے ہوتے ہیں؟"

یانوچڑ نے فوراً جواب دیا "ہمارے ملک میں یہ قاعدہ ہے کہ بڑے لوگوں کو بڑے ملکوں میں بھیجا جاتا ہے اور چھوٹوں کو چھوٹے ملکوں میں۔ میں بہت چھوٹا ہوں اس لئے مجھ کو یہاں بھیج دیا گیا۔

یہ جواب سن کر بادشاہ لاجواب ہو گیا۔

ذرا سی دیر میں ایک آدمی ایک قیدی کو پکڑ کر اُن کے سامنے سے جانے لگا تو بادشاہ نے پوچھا "اس قیدی نے کیا قصور کیا ہے اور یہ کس ملک کا رہنے والا ہے؟"

اس آدمی نے جواب دیا "اس نے دوسروں کی چیزیں چوری کی ہیں اور 'چی' کا رہنے والا ہے۔"

راجا نے یانوچڑ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ہمارے ملک میں تمہارے یہاں کے بہت سے آدمی رہتے ہیں اور عام طور پر چوری کرتے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے؟ کیا تمہارے ملک میں چوری کرنی سکھائی جاتی ہے۔ جو یہ لوگ دوسری جگہ جاکر بھی چوری کرتے ہیں۔"

یانوچڑ نے جواب دیا "جب سنگترہ جنوبی چین میں پیدا ہوتا ہے تو وہ بہت میٹھا ہوتا ہے لیکن جب وہی سنگترہ شمالی چین میں بو دیا جاتا ہے تو کھٹا ہو جاتا ہے

بقیہ صفحہ ۲۶ پر دیکھیے

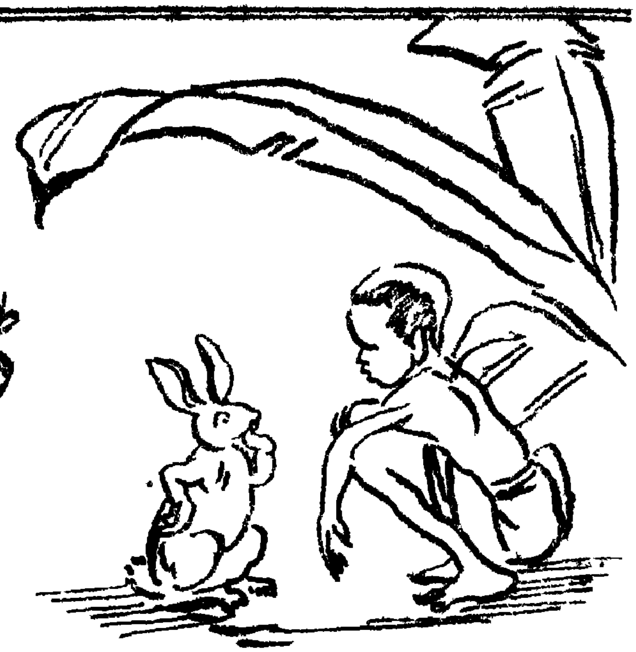
خدا کے نام خط

محمد آفاق

لندن میں ایک غریب اور یتیم بچہ تھا۔ وہ ایک مدرسے میں پڑھا کرتا تھا۔ ایک بار اس کو فیس کے لئے دس شلنگ کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ اُس نے اللہ میاں کے نام ایک خط لکھا جس میں اپنی پریشانی کا حال لکھا اور اللہ میاں سے دس شلنگ بھیجنے کی درخواست کی۔

پھر لڑکے نے وہ خط ڈاک میں ڈال دیا۔ ڈاکیے کی نظر اس پتے پر پڑی تو وہ حیرت میں پڑ گیا۔ اس نے کھول کر پڑھا تو ڈاکئے کو اس غریب لڑکے سے ہمدردی پیدا ہوئی۔ ڈاکیئے کے پاس آٹھ شلنگ تھے۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ میں اس غریب لڑکے کی مدد کر دوں۔ بس اس نے یہ آٹھ شلنگ اس کو بھیج دئے۔ لیکن پتے پر اپنا نام لکھنے کے بجائے اس نے اللہ میاں کا ہی نام لکھا۔ لیکن اس کو قریب کے ایک پادری کے معرفت کر دیا۔ جب یہ آٹھ شلنگ لڑکے کے پاس پہنچے تو وہ بہت خوش ہوا۔ چنانچہ اس نے اللہ میاں کے نام ایک اور خط لکھا جس میں اُن کا بہت بہت شکریہ ادا کیا، مگر ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اب آئندہ وہ اس پادری کے ذریعے نہ بھیجیں۔ اس لئے کہ اس نے دو شلنگ کاٹ لئے۔

اسماعیل سعد



ڈرپوک لڑکا

یوگنڈا کی ایک قدیم کہانی

کسی زمانے میں افریقہ کے ایک گاؤں میں ایک کمہار اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ ان کے ایک لڑکا تھا جس کا نام کُمبا تھا۔ کُمبا عجیب لڑکا تھا۔ جتنا بڑا ہوتا جاتا اتنا ہی انوکھا ہوتا جاتا تھا۔ اس کے ماں باپ اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔

کُمبا کے ساتھ ایک دقت تو یہ تھی کہ جتنی اس کی عمر تھی وہ اس سے چھوٹا دکھائی دیتا تھا اسی لئے جب بھی وہ گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا تو ہمیشہ اُن سے پیچھے رہ جاتا۔ اکثر وہ کھیلوں میں ہار جاتا اور اس کے ساتھی اُسے چھیڑنے لگتے۔ کُمبا کو یہ بات بالکل پسند نہ تھی۔ اُس نے جب یہ دیکھا کہ لڑکے اسے چھیڑنے سے باز نہیں آتے تو وہ ان لڑکوں سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو وہ اپنے ساتھیوں سے ڈرنے لگا، دوسرے اس کو اپنے اکیلے پن کا خیال بھی ہر وقت ستاتا رہتا۔۔۔۔۔ وہ چاہتا تھا کہ دوسروں کی طرح بن جائے لیکن بےچارا کوئی کام ہی ایسا نہ کر پاتا جس سے دوسرے لڑکے اس کی طرف دھیان دیتے۔ یہاں تک کہ آخر میں تو یہ حالت ہوگئی کہ اسے کوئی بھی کام کرتے ڈر لگتا کہ کہیں کوئی اس کے بےڈھنگے پن پر ہنس نہ دے۔ اب تو اس نے مٹی کے پیالے

اور برتن بھی بنانے چھوڑ دئے۔ کُبا کو یہ خیال لگا رہتا کہ کہیں اس کے بنائے ہوئے برتنوں کو دیکھ کر اس کا باپ بھی نہ ہنس پڑے کہ کیسے بھونڈے برتن بنے ہیں۔

اب تو اس کا کام یہ تھا کہ دن بھر کھیتوں اور جنگلوں میں مارا مارا پھرتا۔ ہر وقت اسی خیال میں رہتا کہ وہ بھی ایک دن دوسروں کی طرح عقلمند اور بڑا بن جائے گا۔ گاؤں کے لوگ اسے دیکھ کر منہ پھیر لیتے اور کہتے "کُبا بالکل بدھو ہے، اس کا دماغ بالکل بیکار ہے" پاس پڑوس کی عورتیں اس کی ماں کو تسکین دیتیں "کوئی رنج کی بات نہیں، کسی دن تمہارے ایک اور لڑکا ہوگا جو عام لڑکوں کی طرح ہوگا" مگر کُبا کی ماں کہتی۔ "میں کوئی دوسرا لڑکا نہیں چاہتی۔ بس میرا یہی لڑکا عقلمند اور اچھا بن جائے۔"

گاؤں کے لوگ اسی طرح اس کے باپ کے پاس بھی آتے اور اس کی ہمت بڑھاتے "صبر کرو، تھوڑے دن بعد تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہارا لڑکا بدھو ہے۔ یا ہوشیار اور تیز ہے۔"

ایک بار جب کُبا رات کو اپنے بستر پر لیٹا تھا تو اس نے اپنے ماں باپ کو اپنے ہی بارے میں باتیں کرتے سنا۔ اسے ان کی باتیں سُن کر بڑا دکھ ہوا۔ اس وقت اسے پتہ چلا کہ اس کی وجہ سے کتنا پریشان تھے۔ وہ واقعی سمجھنے لگے تھے کہ کُبا کہیں اسی طرح ہمیشہ بے وقوف نہ رہے۔ لیکن پھر بھی کُبا اپنے آپ کو بدھو سمجھنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا۔

ایک شام وہ اداس جنگل میں دور تک نکل گیا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ وہ ایک ٹیلے کے پاس کھڑا ڈوبتے سورج کی لالی دیکھنے لگا۔ پھر کُبا وہیں بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ منہ پہ رکھ کر رونے لگا۔

اسے روتے دیکھ کر جنگل سے ایک شیر چپکے سے نکلا۔ اس نے کُبا کو دیکھا اور پھر اس کے پاس آگیا۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں بہت ہی اداس ہوں" کُبا نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ میں عقلمند اور

بڑا بن جاؤں۔ مگر مجھے یہ بھی تو نہیں معلوم کہ میں سمجھ دار ہوں یا بے وقوف۔"

"بس صرف یہی سوچ رہے ہو؟" شیر نے پوچھا

"ہاں، میں تو دن رات اسی سوچ میں ڈوبا رہتا ہوں" کُبا نے جواب دیا۔

"تب تو تم واقعی بدھو ہو" شیر نے کہا "عقلمند آدمی تو یہ سوچتے ہیں کہ وہ دوسروں کے لئے کیا کر سکتے ہیں" پھر شیر پیچھے مڑا اور جنگل کو لوٹ گیا۔

تھوڑی دیر میں ٹیلے پر ایک بارہ سنگھا چھلانگیں مارتا ہوا آیا اور کُبا کو دیکھ کر بولا "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں بہت اُداس ہوں" کُبا نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ میں عقلمند اور بڑا بن جاؤں مگر مجھے یہ نہیں معلوم کہ میں واقعی سمجھ دار ہوں یا بے وقوف۔"

"تم کیا کھاتے ہو؟" بارہ سنگھے نے اس کی پتلی پتلی ٹانگوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میری ماں دن میں دو مرتبہ کھانا پکاتی ہے اور میں وہی کھاتا ہوں" کُبا نے جواب دیا۔

"تم کبھی اپنی ماں کا شکریہ بھی ادا کرتے ہو؟"

"نہیں! شکریہ تو ادا نہیں کرتا۔"

"تب تو تم سچ مچ بے وقوف ہو۔ عقلمند آدمی ہر اُس آدمی کا شکریہ ادا کرتا ہے جو اس سے کوئی اچھائی کرتا ہے۔" یہ کہہ کر بارہ سنگھا چھلانگیں لگاتا ہوا غائب ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں ایک چیتا آیا اور کُبا کو گھور کر دیکھنے لگا "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اُس نے پوچھا۔

میں بہت اُداس ہوں" کُبا نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ عقلمند اور بڑا بن جاؤں۔ لیکن میں یہ بھی نہیں جانتا کہ میں واقعی سمجھدار ہوں یا بے وقوف۔"

"کیا تمہیں گاؤں کے دوسرے لڑکے پسند کرتے ہیں؟" چیتے نے پوچھا۔

"نہیں! وہ مجھے پسند نہیں کرتے۔ لیکن مجھے اس کی کب پرواہ ہے! میں بھلا

ان کو پسند نہیں کرتا ہے۔

"تب تو تم بدھو ہو،" تمھیں یہ تک نہیں معلوم کہ لڑکوں کو آپس میں دوستی رکھنا چاہئیے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہئیے۔" پھر چیتا بھی جنگل کو لوٹ گیا۔

تھوڑی دیر میں ایک ہاتھی جھومتا ہوا آیا اور کُبا کو دیکھ کر بولا "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں بہت اُداس ہوں۔" کُبا نے کہا۔" میں عقل مند اور بڑا بننا چاہتا ہوں مگر مجھے نہیں معلوم کہ میں سمجھ دار ہوں یا بے وقوف۔"

"تم کیا کام کرتے ہو؟" ہاتھی نے پوچھا۔

"میں تو کچھ بھی نہیں کرتا۔" کُبا نے کہا۔

"بس پھر تو تم بدھو ہو،" ہاتھی نے کہا" ہر عقل مند آدمی کام کرتا ہے۔" اور پھر ہاتھی جھومتا ہوا ٹیلے کے دوسری طرف چلا گیا۔

کُبا کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ وہ رونے ہی والا تھا۔ اتنے میں اس نے اپنے قریب ہی ایک باریک آواز سُنی۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" ایک بھورے خرگوش نے اس سے پوچھا۔

"اوہ! میں بہت اُداس ہوں۔ میں عقلمند اور بڑا بننا چاہتا ہوں لیکن جنگل کے سب جانور کہتے ہیں کہ تم بدھو ہو۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔

تھوڑی دیر تک تو خرگوش کچھ نہ بولا۔ پھر وہ کُبا کے بہت ہی قریب آ گیا اور بولا۔ "کن جانوروں نے تمھیں بدھو کہا ہے؟"

"واہ، شیر نے کہا کہ میں بدھو ہوں اس لئے کہ میں ہر وقت اپنے ہی متعلق سوچا کرتا ہوں، بارہ سنگھے نے کہا کہ میں بدھو ہوں اس لئے کہ میں کھانے کے بعد اپنی ماں کا شکریہ نہیں ادا کرتا ہوں۔ چیتے نے کہا کہ میں بدھو ہوں اس لئے کہ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلتا۔ اور ہاتھی نے بھی کہا کہ میں بدھو ہوں اس لئے کہ میں کوئی کام نہیں کرتا۔"

ننھے خرگوش نے اپنا سر ہلایا، جانوروں

نے تمہیں ٹھیک بات بتائی ہے۔ عقلمند آدمی واقعی ہمیشہ اپنے متعلق نہیں سوچتے۔ جب ان کے ساتھ کوئی بھلائی کرتا ہے تو اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ عقل مند لڑکے دوسروں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور عقل مند آدمی کبھی بے کار نہیں رہتے بلکہ کوئی نہ کوئی کام کرتے ہیں۔"

اس کے بعد دیر تک کُمبا اور خرگوش دونوں چپ بیٹھے رہے۔ دھیرے دھیرے بات ہونے لگی۔ تب ننھے خرگوش نے کُمبا سے کہا کہ رات کو اسی کے بل کے پاس سوئے۔ کُمبا نے ننھے خرگوش کی دعوت قبول کر لی اور رات بھر جنگل ہی میں رہا۔

اگلے دن کُمبا نے سوچا کہ وہ ابھی تک بے وقوف تھا لیکن آیندہ وہ کسی قیمت پر بے وقوف نہیں رہے گا۔

صبح سویرے وہ گھر واپس آیا۔ جب اس نے گھر کے دروازے پر ماں کو دیکھا تو مسکرانے لگا اور اپنی ماں کو سلام کیا۔ جب اس کی ماں کھیت میں کھدائی کرنے گئی تو وہ بھی ساتھ ہو لیا اور اس کی مدد کرنے لگا۔ جب اس نے گاؤں کے لڑکوں کو ایک دوسرے کا پیچھا کرتے دیکھا تو وہ بھی ان کے ساتھ دوڑنے لگا۔ لیکن اب اگر وہ دوڑتے دوڑتے گر بھی جاتا تو ہمت نہ ہارتا بلکہ پھر دوڑنے لگتا اور ان کو پکڑ لیتا۔

شام کو جب اس کا باپ برتن بنا رہا تھا تو بھی وہ اس کے پاس آ بیٹھا اور بولا "میں بھی برتن بناؤں گا۔" وہ جانتا تھا کہ اس کا پہلا پیالا ٹھیک نہ بنے گا لیکن اب اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ کوشش تو ضرور کرے گا۔

پھر جوں جوں دن گزرتے گئے، اس کا ڈر دور ہونے لگا اور اب تو وہ سوالات بھی پوچھنے لگا۔ وہ اپنے باپ سے پوچھتا کہ برتنوں پر پھول اور بیلیں بنانے کے لئے رنگ کیسے بنائیں۔ اور جب وہ اس کو بتا دیتا تو خود بھی اسے بنانے کی کوشش کرتا۔ اسی کے لئے بعض اوقات کُمبا کو اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں میں بھی جانا پڑتا جہاں وہ دونوں رنگ بنانے کے لئے پھول اور پتے اکٹھے کرتے۔ اس لئے کہ کُمبا کا باپ انہی پھول اور پتوں کو اُبال کر رنگ تیار کرتا تھا

اسی طرح دن ، ہفتے اور سال گزر گئے کُمّبا اب جوان ہو گیا تھا ۔ وہ ہمیشہ محنت کرتا رہتا اور کبھی ہمّت نہ ہارتا ۔ یہاں تک کہ وہ برتن بنانے کے فن میں بہت مشہور ہو گیا لوگ دور دور سے اس کے برتن خریدنے آتے تھے ۔ اس کے برتن واقعی بڑے خوبصورت اور نفیس ہوتے

اور اب نہ صرف یہ کہ کُمّبا کے برتنوں کی ہی تعریف کی جاتی بلکہ بڑی بات تو یہ تھی کہ اس کے پڑوسی اس سے محبت بھی کرنے لگے تھے ۔ اب وہ اسے بدھو نہ کہتے بلکہ عقلمند اور سمجھ دار سمجھ کر اس کی عزّت کرتے ۔

بقیہ "ریلوے نمائش" صفحہ ۶ سے آگے

بڑے لوگ ریل میں ایسے ہی ڈبّوں میں سفر کرتے ہیں ۔

اب اگر آپ تھک گئے ہوں تو کچھ کھا پی لیجئے یا جھولا جھول لیجئے ۔ نمائش تو اتنی بڑی ہے ، ایک دن میں کون اس کی سیر کر سکتا ہے ۔

بقیہ "یانوچو کی عقل مندی" صفحہ ۱۹ سے آگے

اسی طرح ہمارے لوگ ہمارے ملک میں تو بہت اچھے ہوتے ہیں لیکن جب وہ یہاں آتے ہیں تو بُروں کے ساتھ بُرے ہو جاتے ہیں ۔

چھوکے بادشاہ کو یانوچو کی عقلمندی پر بڑا تعجب ہوا اور اس کے بعد پھر اُس نے چھوکے آدمیوں کو کبھی نہیں ستایا اور دونوں ملک امن چین سے رہنے لگے ۔

گیاس کے میدان کا پہرے دار

محمد طیب

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب روس میں زار کی حکومت تھی جس کا خاتمہ ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد ہوا اور وہاں مزدوروں کا راج قائم ہوا۔ اُس زمانے میں روس اور بلجیم ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے۔ اس روز روز کے جھگڑے سے تنگ آکر بلجیم کے بادشاہ نے اپنے لڑکے پرنس بسمارک کو زار کے پاس صلح کی بات چیت کے لئے پیٹرس برگ بھیجا۔ پرنس بسمارک بڑا ذہین، پڑھا لکھا اور لائق شہزادہ تھا۔ اس نے تمام یورپ میں شہرت حاصل کرلی تھی۔ پیٹرس برگ میں اسے ایک عالیشان مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔ چونکہ شام ہوچکی تھی اس لئے اس کی زار سے ملاقات اگلے دن ہی ہوسکتی تھی۔

دوسرے روز عادت کے مطابق وہ بہت سویرے اُٹھا۔ جب وہ اپنے کمرے سے باہر آکر محل کے سامنے باغ میں ٹہلنے کے لئے چلا تو اُسے ہر موڑ پر ایک سنتری نظر آیا جو اُسے دیکھ کر باقاعدہ سلامی دیتا۔ جگہ جگہ سنتریوں کی اس سلامی نے اُس کو پریشان کردیا۔ وہ تو سوچنا چاہتا تھا کہ زار اس سے کیا بات کرے گا۔ مگر یہ پہرے دار اسے کچھ

سوچنے نہ دیتے۔ اس لئے وہ محل سے کچھ فاصلے پر ایک بڑے میدان کی طرف بڑھا تاکہ ان سنتریوں سے اُسے نجات ملے۔ مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے اس سنسان گھاس کے میدان کے بیچ میں بھی ایک سنتری کو پہرہ دیتے ہوئے دیکھا۔ شہزادے نے سنتری کے نزدیک جاکر پوچھا "تم یہاں کھڑے ہوئے کیا کر رہے ہو؟" اُس نے جواب دیا۔ "میں کچھ نہیں جانتا یہ برگیڈیر صاحب کا حکم ہے۔"

بسمارک ہر بات کو سمجھنے کا عادی تھا اور جب تک کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آتی وہ اور کچھ سوچ ہی نہ سکتا تھا۔ سنتری کا اس اکیلے گھاس کے میدان میں پہرہ دینا اس کے کسی طرح بھی سمجھ میں نہ آیا۔ اور اس کے دماغ میں یہ بات گھومتی رہی۔

جب وہ زار سے ملا تو آداب شاہی بجا لانے کے بعد سب سے پہلی بات اُس نے زار سے یہ پوچھی "گھاس کے میدان میں سنتری کیوں پہرہ دیتا ہے؟"

زار کو بڑی حیرت تھی کہ یہ کون سی اہم بات ہے جو بسمارک جیسا عقلمند شہزادہ پوچھ رہا ہے۔ اُسے شہزادے کی ذہانت میں بھی شک ہونے لگا۔ زار نے اُسے ٹالنا چاہا مگر جب شہزادہ نہ مانا تو بادشاہ نے کہا "میں یہ بات برگیڈیر سے پوچھتا ہوں۔" بادشاہ کے حکم سے برگیڈیر بلایا گیا۔ اُس نے بتایا کہ پہرے داروں کو کسی جگہ مقرر کرنے کا کام کرنیل کا ہے۔ اب کرنیل صاحب بلائے گئے۔ جب ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے بتلایا کہ اُن سے پہلے والے کرنیل نے سنتریوں کے پہرے کا جو نقشہ بنایا تھا اس میں انھوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی ہے اور وہ خود اس کی وجہ نہیں بتا سکتے۔

ہوتے ہوتے فیلڈ مارشلوں اور وزیر جنگ کی نوبت آئی لیکن کوئی بھی اس کی وجہ نہ بتا سکا۔ وزیر جنگ نے کچھ مہلت مانگی تاکہ وہ پرانے سرکاری کاغذوں سے کچھ پتہ چلائے اس لئے بادشاہ نے بھی اس مسئلہ کو شام کے لئے ملتوی کر دیا۔

دفتر میں ایک تہلکہ سا مچا ہوا تھا سکریٹری اور کلرک سبھی فائلوں کی چھان بین کر رہے

تھے کہ شاید کہیں اس بات کا سراغ لگے لیکن یہ سب کوششیں بے کار ثابت ہوئیں اور وزیر جنگ نے ڈرتے ڈرتے بادشاہ سے اپنی ناکامی کا اظہار کیا۔

اس بات سے بادشاہ بڑی تشویش اور الجھن میں پڑ گیا اس نے پورے ملک میں اعلان کروا دیا کہ جو شخص اس گھاس کے پھیرے دار کے کھڑے ہونے کا سبب بتلائے گا۔ بادشاہ اُسے ایک ہزار روپیہ انعام دے گا۔

بادشاہ کے محل کے ایک علیحدہ کمرے میں ایک بہت سن رسیدہ بڑھیا رہتی تھی جو اس زارہ کی دادی کی آیہ رہ چکی تھی اس کا کام اب صرف چرخہ کاتنا تھا۔ محل کی ایک نوکرانی اسے کھانے کے لئے کچھ دے آتی۔ جب اعلان کرنے والا اس کے کمرے کے پاس سے گزرا اور اس نے ڈھنڈورا پیٹا تو بڑھیا نے نوکرانی سے پوچھا "یں یہ کیا کہتا ہے؟" نوکرانی نے بڑھیا کو سب کچھ بتلا دیا۔ بڑھیا فوراً سمجھ گئی اور بولی "ارے وہ میدان تو تیر اندازی والا میدان ہے چل تو مجھے لے چل اور میں اس کی وجہ بتلا دوں گی۔ میں سمجھتی ہوں کہ ایک ہزار روپئے تیرے جہیز کے لئے کافی ہوں گے۔"

بڑھیا بادشاہ کے سامنے لائی گئی اس نے کہا کہ آپ کی دادی صاحبہ کے زمانے میں اس میدان میں تیر اندازی کی مشق ہوتی تھی۔ چونکہ آپ کی دادی صاحبہ، ملکہ زارینہ کو خود تیر اندازی کا بڑا شوق تھا اس لئے وہ خود یہاں مشق کرنے آتیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے تیر اندازی کا مقابلہ کیا اس میں بہت سی عورتیں شریک تھیں۔ تیر چلانے کے بعد جب سب عورتیں، جنمیں زارینہ بھی شامل تھیں اپنے اپنے تیر اکٹھا کرنے جا رہی تھیں کہ زارینہ بیچ میدان میں ایک جگہ ٹھہر گئیں ان کے پاؤں کے پاس ایک بنفشہ کا پھول کھلا ہوا تھا۔ اس پھول کو دیکھ کر سب ساتھ کی عورتیں بول اٹھیں کہ یہ ایک نیک شگون ہے۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد ملکہ کے یہاں ایک شہزادہ پیدا ہوا اور وہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ اس خبر سے آپ کے دادا صاحب کو اتنی خوشی

بقیہ صفحہ ۱۲ پر دیکھئے۔

لطیفہ

چوری کے الزام میں ایک ملزم پکڑا گیا۔ عدالت میں کافی دیر تک اس پر بحث ہوتی رہی۔ لیکن پولیس کوئی ثبوت نہ دے سکی کہ ملزم نے سچ مچ گھڑی چرائی۔ آخر مجسٹریٹ نے فیصلہ دے دیا کہ ملزم بے قصور ہے اس لئے اسے رہا کر دیا جائے۔

چونکہ ملزم بالکل جاہل تھا اس لئے وہ ذرا بھی اس ساری کارروائی کو نہ سمجھ سکا۔ چنانچہ اس نے بڑی معصومیت کے ساتھ مجسٹریٹ سے پوچھا۔

"سرکار! تو کیا میں گھڑی واپس کر دوں۔ یا آپ مجھے ایسے ہی چھوڑ دیں گے۔

باپ۔ کیوں بیٹا تمہارے ماسٹر صاحب تم سے خوش ہیں؟

بیٹا۔ جی ہاں ابا مجھ سے بہت خوش ہیں۔

باپ۔ کیا انھوں نے کبھی تمہاری تعریف کی؟

بیٹا۔ جی ہاں، کل ہمارے ماسٹر صاحب کہہ رہے تھے۔ اگر سب لڑکے تمہارے جیسے ہو جائیں تو میں آج ہی اسکول بند کر دوں۔

ایک چھوٹا لڑکا ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہا تھا۔

"یا اللہ میاں، ہمارے امّاں اور ابا اچھے رہیں، وہ ہمیں پیار کرتے ہیں۔ ہماری بہن منی اور بھیا چیتو کا بھی خیال رکھنا وہ ہمارے ساتھ کھیلتے ہیں۔ ہماری چچی اور ممانی کا بھی خیال رکھنا وہ مجھے مٹھائی کھلاتی ہیں اور سب سے زیادہ اللہ میاں تم اپنا خیال رکھنا ورنہ ہم سب کا کیا ہوگا!"

ماسٹر۔ (لڑکے سے) بتاؤ صلاح الدین چینی کہاں سے آتی ہے؟

لڑکا۔ "چین سے"

محمد جمشید پوری

مجسٹریٹ۔ (ایک ملزم سے) تم اور تمہارے ساتھی پر یہ الزام ہے کہ تم دونوں بیچ سڑک پر ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے جب تم کو پولیس نے پکڑا۔

ملزم۔ جی یہ بیان غلط ہے۔ سپاہی تو اس وقت پہنچا جب ہم لوگ ایک دوسرے کو چھوڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

لڑکا۔ ابّا جان آپ کے چھ سات بال سفید ہو گئے۔

باپ۔ ہاں بیٹا جب کسی کا لڑکا شرارت کرتا ہے تو ہر شرارت پر اس کا ایک بال سفید ہو جاتا ہے۔

لڑکا۔ تو پھر دادا کے لڑکوں نے بہت شرارت کی ہوگی اس لئے کہ اُن کے تو بہت سے بال سفید ہیں۔

لڑکا۔ ماں مجھے اندھیری رات میں باہر جانے سے ڈر لگتا ہے۔

ماں۔ اب بھی ڈرتے ہو۔ اب تو تمہارے داڑھی نکل آئی۔ کوئی تم بچے تو ہو نہیں۔

لڑکا۔ تو داڑھی کوئی مشین گن ہے جو ڈر نہ لگے۔

اندرپال سنگھ بھاٹیا
جگسلائی

جج۔ (ملزم سے) بھئی تمہیں شرم نہیں آتی جو تم ہر روز عدالت آتے ہو؟

ملزم۔ لیکن جناب شرم تو آپ کو آنی چاہیئے۔ میرا تو ناغہ بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن آپ تو روز آتے ہیں۔

ایک سیٹھ جی اتنے موٹے تھے کہ مشکل سے چل پھر سکتے تھے۔ اُن کی توند گھڑے کی سی تھی ایک دن اُن کی بیوی نے کہا کہ تم عجائب خانہ کیوں نہیں چلتے ہو۔

سیٹھ جی توند سہلاتے ہوئے بولے۔ "اس لئے کہ کہیں لوگ مجھے پکڑ کر عجائب خانہ میں نہ رکھ لیں۔

——— صمد جمشید پوری



میز سے کاغذ اُٹھانا

محمد اقبال احمد

آپ سوچیں گے کہ مقناطیس سے کاغذ کیسے اُٹھایا جا سکتا ہے۔ مقناطیس تو صرف لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ لیکن اگر آپ لوہا اُٹھائیں تو کون سی حیرت کی بات ہوگی۔ مزا تو جب ہے کہ آپ مقناطیس سے کاغذ اُٹھائیں۔

آئیے ہم آپ کو مقناطیس سے کاغذ اٹھانے کا طریقہ بتائیں، اس کی مدد سے آپ اپنے دوستوں کو حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔

سب سے پہلے آپ اپنے دوستوں سے کہئے کہ وہ مقناطیس سے کاغذ کو اٹھائیں۔ ظاہر ہے کہ آپ کے دوست یہ دیکھ کر حیرت میں پڑ جائیں گے اور ان کو یقین نہ آئے گا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جب وہ کہیں کہ "مقناطیس سے لوہا تو اُٹھ سکتا ہے لیکن کاغذ نہیں، آپ خود اٹھا کر دکھائیے"۔

اب آپ چھو منتر کہہ کر اپنی جادوگری کا ثبوت دیجئے۔ طریقہ ہم بتائے دیتے ہیں۔ چپکے سے کاغذ کے نیچے ایک سوئی اس طرح رکھ دیجئے کہ کسی کو سوئی کا پتہ بھی نہ چل سکے۔ اب آپ دو تین منٹ اس جادو پر تقریر کیجئے اور لوگوں کا دھیان اپنی طرف کر لیجئے اور پھر مقناطیس کو پھونک کر چھو منتر کے ساتھ کاغذ پر رکھ دیجئے۔ اب جب آپ مقناطیس اٹھائیں گے تو کاغذ اپنے آپ اُٹھ آئے گا۔ آپ کے دوست حیرت سے آپ کا منہ تکتے رہ جائیں گے۔ اس کا بھید یہ ہے کہ مقناطیس نے کاغذ کے نیچے کی سوئی کو کھینچ لیا ہے چونکہ اس کے بیچ میں کاغذ ہے اس لئے سوئی کے ساتھ کاغذ بھی مقناطیس سے چپک گیا ہے۔ البتہ کاغذ کو زیادہ اونچا نہ اٹھائیے ورنہ سوئی نظر آجائے گی اور سارا بھید کھل جائے گا۔

نجمہ سلطان

کھلی ہوا کا مدرسہ



پچھلے سال بھی آپ مدرسہ ابتدائی کے کھلی ہوا کے مدرسے کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ لیکن اس سال کے کھلی ہوا کے مدرسے میں پچھلے سال سے کچھ فرق تھا۔ اس سال کھلی ہوا کے مدرسے کے لئے ایسی جگہ سوچی گئی تھی جو بچوں کے لئے زیادہ سے زیادہ تعلیمی مواد دے سکے۔ بچے اس جگہ جاکر خیموں میں رہیں تو ضرور لیکن خیمے کی زندگی اور آرائش پر مناسب توجہ دیتے ہوئے زیادہ وقت قرب و جوار کی چیزوں اور عمارتوں کے مطالعہ میں صرف کریں۔ اس مقصد کے لئے ایک مشہور تاریخی جگہ حوض خاص چنی گئی تھی۔ اس لئے کہ اس جگہ سے ۳ میل کے اندر اندر بہت سی چیزیں تھیں۔ جن سے طلبا تعلیمی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ ایک طرف مہرولی جہاں قطب کی لاٹ ہے۔ اور دوسری طرف چراغ دہلی، تیسری طرف مختلف دیہات اور کھیت اور چوتھی طرف گوالیار پاٹری ورکس، صفدر جنگ، ہوائی اڈا وغیرہ وغیرہ ان سب کو دیکھنے کے لئے پہلے سے پروگرام بنا لیا تھا کہ کونسی جماعت کس سمت میں، کس دن جائے گی۔

ہم طالب علموں اور اُستادوں کو مبارکباد دیتے ہیں کہ سب نے مل کر کھلی ہوا کے مدرسہ کو کامیاب کیا اور اس سے پورا تعلیمی فائدہ حاصل کیا

ادارہ

بہت سوچ بچار کے بعد طے ہوا کہ کھلی ہوا کا مدرسہ حوض خاص پر ہوگا۔ ۹ر مارچ کو اُستاد جاکر خیمے لگا دیں گے اور ۱۰ر کو یہاں سے روانگی ہوگی۔ اب ۱۰ر مارچ کے انتظار میں دن ہیں کہ کاٹے نہیں کٹتے۔ خدا خدا کرکے ۹ر تاریخ آئی۔ ادھر اُستاد خیمے لگانے گئے، اُدھر لڑکوں نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ بستر تک باندھ لئے۔ کیا ہوا رات کو صرف دری ہی بچھا کر سو جائیں گے۔ لیجئے شام تک پورا سامان ٹھیک ہوگیا۔ اتنا کام کرنے کے باوجود بچّوں کے چہرے کھلے پڑتے تھے۔

ابھی مغرب کی اذان ہو ہی رہی تھی کہ ایک لڑکے نے آکر کہا کہ "باجی کھلی ہوا کا مدرسہ نہیں ہوگا۔ وہاں گھوڑ دوڑ ہوگی" دیکھتے ہی دیکھتے سب بے جان سے ہوکر بیٹھ گئے "اب کیا ہوگا۔ اب کیا ہوگا" لڑکے ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ عجیب کیفیت تھی۔ بہت سے بچوں کا تو کھانا کھانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے سمجھایا گیا کہ کچھ نہ کچھ ہوگا ہی۔

رات کو اُستادوں کا جلسہ ہوا سب نے مل کر طے کیا کہ وہاں سے ہٹ کر دوسری جگہ خیمے لگائے جائیں اور بجائے دس کے گیارہ کو چلیں۔ اب ذرا جان میں جان آئی۔

مگر ابھی سکون سے بستر پر لیٹے ہی تھے کہ زور دار گڑگڑاہٹ ہوئی اور معلوم ہوا کہ موسم کا مزاج بگڑ رہا ہے۔ مگر بچے بھی مدرسہ ابتدائی کے تھے۔ جو پچھلے سال کے طوفان کا مقابلہ کرچکے تھے۔ ان کے لئے اب کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ ایسے "مزاج" کا کون خیال کرتا، کسی نے بھی پرواہ نہیں کی اور جب موسم نے دیکھا کہ اس کی گیدڑ بھبکی کو کسی نے بھی اہمیت نہیں دی تو وہ کھسیا کر چپ ہو رہا۔

خیر صاحب گیارہ کی صبح سے روانگی شروع ہوئی۔ پہنچتے پہنچتے بارہ بج گئے۔ عجیب جگہ تھی۔ ہر قدم پر ایک کانٹا سواگت کرتا تھا بچّوں نے بھی پھاوڑہ کھرپے لے کر ان میزبانوں کی خوب خاطر کی اور شام تک ساری زمین برابر اور صاف کر دی۔

میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔
آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ حوض خاص کیا جگہ ہے؟ کیسا حوض ہے؟ لیجئے سنئے جناب۔ علاؤ الدین خلجی کو تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ انھوں نے اب سے کوئی چھ یا سات سو برس پہلے ایک لمبا حوض یا چھوٹا سا تالاب بنوایا تھا۔ اس کے چاروں طرف دو منزلہ عمارت بنوائی تھی۔ مگر حوض پورا نہیں ہوسکا اور پھر فیروز شاہ تغلق نے اس عمارت میں ایک مدرسہ بنوا دیا۔ یہاں فیروز شاہ کا مقبرہ بھی ہے اور آج کل حوض میں کھیتی ہوتی ہے۔
اب ہمارا پروگرام سنئے یہ پچھلے سال سے ذرا مختلف تھا۔ کیونکہ اس دفعہ تو ہم اپنی تاریخ کے درمیان تھے۔ کون ہوگا جو اتنے قریب رہ کر ماضی کو دیکھنا نہ پسند کرے گا۔ پھر یہاں سے قریب کچھ حال کی عمارتیں بھی تھیں۔ لہٰذا طے ہوا کہ ہر روز ایک درجہ کہیں باہر جائے گا۔ مثلاً مغل گارڈن۔ قطب مینار ہوائی اڈا۔ لودھی بادشاہوں کے مقبرے چراغ دہلی۔ ہوا پانی کا دفتر۔ حوض خاص یا کوئی دوسرا گاؤں اور برتنوں کا کارخانہ وغیرہ۔
پروگرام ہر اُستاد کے پاس تھا کہ کس کو کس دن کہاں جانا ہے اور کب اس کی جماعت کو لاری مل سکتی ہے تاکہ وہ دور کی جگہیں مثلاً ہوائی اڈا یا مغل گارڈن دیکھ لیں۔
اب پہلا دن لیجئے۔ ہر درجے کے لڑکے صبح پانچ بجے اُٹھے نماز ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوکر سات بجے تک تیار ہوگئے آج اوّل دوم کے بچّوں کو مغل گارڈن جانا ہے اور سوم کے بچّے گاؤں کا مشاہدہ کریں گے۔
پہلے آپ گاؤں کا مشاہدہ کیجئے۔ یہ ۲۵ گھروں کا ایک گاؤں ہے۔ ایک مدرسہ بھی ہے۔ جس میں دو اُستانیاں اور ایک اُستاد ہیں۔ یہاں ہم نے رہٹ۔ گاؤں کے گھر۔ کٹّی کاٹنے کی مشین۔ کھیت وغیرہ سب دیکھے۔ گاؤں والے بچّوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے خوشی

خوشی اپنے گھر دکھائے۔ اپنا کام بتایا۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ یہاں کے نمبردار کے لڑکے جو ایم۔ اے پاس ہیں۔ سب کام کرتے ہیں۔ وہ روز صبح اُٹھ کر کٹی کاٹتے ہیں۔ دودھ دوہتے ہیں۔ ہم جس وقت ان سے ملے وہ کوئیں پر سے کپڑے دھو کر لا رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر بچے بڑے حیران ہو رہے تھے۔ ابھی ماسٹر صاحب بچوں سے کہہ ہی رہے تھے کہ "آپ لوگ دیکھئے" کہ ایک صاحب اپنی بھینسوں کو جنگل لیجاتے ہوئے ادھر سے گذرے معلوم ہوا کہ یہ میٹرک پاس ہیں۔ تعلیم کی تعریف ہی یہ ہے کہ انسان کسی کام میں نہ گھبرائے۔

اس کے بعد ہم سب چماروں کے گھر گئے۔ مجھے تو سب سے زیادہ ان ہی کے گھر پسند آئے۔ بہت صاف ستھرے اور ہوا دار غرض تین چار گھنٹے خوب گھومے۔ بچوں نے ضروری نوٹس لئے۔ اور بہت سی باتیں ہمیں بھی معلوم ہوئیں اگر تفصیل سے لکھیں تو نہ معلوم کتنے صفحے ہو جائیں۔

یہاں کا مشاہدہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے کرایا۔ سب سے پہلے وہ لوگوں کے مکانوں میں لے گئے جن کی زمین میں ہم نے خیمے لگائے تھے۔ اس کے بعد اور گھر دیکھے۔

یہاں کے مکانات عام طور پر کچے ہیں۔ صرف چوپال اور نمبردار کے گھر پکے تھے۔ یہاں تین نمبردار تھے۔ یہاں کل ۲۵ گھر ہیں۔ آبادی ۲۵۰ ہے۔ اسکول میں ۵۰ لڑکے اور لڑکیاں پڑھتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی کہ اتنی کم آبادی میں ۵۰ لڑکے لڑکیاں پڑھنے کے لئے آجاتے ہیں۔ اسکول میں ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں بھی دیکھیں جو بہت اچھی تھیں۔

ایک بات اور ہے یہ لوگ دودھ وغیرہ بیچتے ہیں۔ اپنی ضرورت کے مطابق۔ بدلا کر لیتے ہیں۔ مثلاً چمار اگر کسی کا کام کرے گا تو وہ بجائے پیسوں کے اس سے اناج لے لے گا۔ یہاں بھنگیوں کو بھی تنخواہ نہیں دی جاتی۔ صرف

تہواروں پر کچھ دے دیا جاتا ہے۔ ویسے ہر گھر سے روزانہ ایک روٹی دی جاتی ہے۔ مشاہدے کے دوران میں گاؤں والوں نے کہا کہ ہم یہاں بڑے میل محبت سے رہتے ہیں۔ سب سے محبت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہم کسی بے زبان جانور کو بھی ستانا پسند نہیں کرتے۔ لہٰذا آپ لوگ بھی یہاں چڑیوں وغیرہ کو غلیل سے نہ ستائیے گا، ورنہ ہم ناراض ہو جائیں گے۔ بچوں نے اسی وقت اپنی غلیلیں رکھ لیں۔ اور گاؤں والوں کے اس خلوص اور محبت سے سب بہت متاثر ہوئے۔ دیکھا آپ نے یہ گاؤں والے کتنے اچھے ہیں۔ وہ کسی کو ستانا بہت بُرا سمجھتے ہیں۔ ہمیں بھی ان سے یہی سبق لینا چاہیئے کہ بلا وجہ کسی کو نہ ستائیں۔ اور سب میل محبت سے رہیں۔

ہمیں تو گاؤں والوں کی یہ بات بہت ہی بھائی۔ اور کچھ شرمندہ بھی ہوئے کیونکہ یہ تو پرندوں کو بھی نہیں ستانے دیتے جو بے زبان ہیں۔ اور ہم اپنے یہاں کسی کو اپنے سے ذرا کمزور دیکھتے ہیں اسے پریشان کرنے کی تدبیریں کرنے لگتے ہیں۔ اور ستا کر ہی دم لیتے ہیں۔ کہنے کو وہ لوگ جاہل ہیں گنوار ہیں اور ہم لوگ مہذب ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ مگر صاف دلی اور نیکی تو بس ان میں ہی دیکھی۔ کہئیے کیا سنا آپ نے۔

یہاں سے سکندر لودھی کے زمانے کا ایک مقبرہ دیکھتے ہوئے واپس آئے۔ یہاں اوّل اور دوم کے بچوں سے ملاقات ہوئی جو مغل گارڈن دیکھ کر آرہے تھے۔ آئیے آپ بھی مغل گارڈن کی سیر کیجئے۔ مغل گارڈن نئی دہلی میں راشٹرپتی بھون کے پیچھے ہے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک گنبد نما دروازے کے بیچ میں آپ کو ایک فوّارہ نظر آئے گا۔ جو اونچا ہوتے ہوتے کبھی کبھی اوپر تک چلا جاتا ہے۔ کیونکہ اوپر سے گنبد ایک گول دائرے کی شکل میں کھلا ہوا ہے۔ اس پر گلاب کے پھولوں کا تختہ ہے۔ یہاں چاروں طرف لوگ کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے پڑتے ہیں۔ اب ذرا اوپر چلئے۔ جدھر دیکھئے بس پھول ہی پھول نظر

آئیں گے۔ چھوٹی چھوٹی نارنگیاں بھی آپ کے منہ میں گھڑوں پانی بھر دیں گی مگر توڑیئے گا نہیں۔ موٹے موٹے ڈنڈے لئے سپاہی گھوم رہے ہیں۔

تھوڑی دور چل کر ایک سرخ پتھر کی بارہ دری میں سے گذریئے جو مختلف قسم کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اس کے بعد ایک گول چار دیواری کے اندر داخل ہوں گے۔ اس دیواروں پر بھی سفید سرخ نارنجی اودے پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ان کے بعد طرح طرح کے پودے ہیں پھر ایک گول دائرے کی شکل میں راستہ ہے یہ جگہ بالکل گول ہے اور بیچ میں پانی کا حوض ہے۔ حوض اور راستے کے درمیان کا حصّہ پھولوں سے ڈھکا ہوا ہے۔

یہ جگہ ہمیں بہت پسند آئی۔ واپس آنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ مگر ایک بج گیا چلنا ہی چاہیئے یہاں سے جاکر غسل کریں گے اور کھائیں گے۔ پھر آرام کریں گے۔ ساڑھے تین سے ساڑھے چار تک پڑھائی ہوگی۔ پھر اخبار کا کام، خیموں کو بھی سجانا ہے اور پھر رات کو کیمپ فائر، مزے دار نقلوں کا خیال آکر ابھی سے دل اُچھلنے لگا۔ پھر رات کو پہرہ دیں گے اور جاگے پئیں گے۔ اس دفعہ پہرہ کا انتظام بھی مختلف ہے۔ بجائے گھومنے کے لڑکے اپنی اپنی مقرر کی ہوئی چوکیوں پر پہرہ دیں گے۔ کیونکہ ایک تو کیمپ کا رقبہ بڑا ہے، اور پھر جگہ ناہموار ہے۔

بھئی کیا بات ہے ۱۳ر کو کہیں جانے کا پروگرام نہیں ہے۔ لڑکے "راما منائیو" کی صدا لگا رہے ہیں اور کام کرتے جا رہے ہیں۔ بھئی آج جمعہ ہے آج کوئی بھی کہیں نہیں جائے گا۔ اور یہ جو "راما منائیو" کی صدا لگاتے ہیں آپ نہیں سمجھے۔ بات یہ کہ یہ قریب ہی رہٹ ہے۔ یہاں جب پانی اوپر آتا ہے تو وہ آدمی جو پانی کا ڈول نکالتا ہے "راما منائیو" کہتا ہے۔ بچوں کو یہ چیز بہت بھائی اب جدھر دیکھئے آپ کو یہی آواز سنائی دے گی۔

اس آواز میں ہے خوب زور، کیا زور دار کام ہو رہا ہے۔ قریب قریب

پتھر لگا کر کتنے اچھے راستے بنائے ہیں۔ کچھ لوگوں نے مطبخ یعنی باورچی خانے کی جگہ صاف کردی۔ سنا ہے کسی زمانے میں اس چہار دیواری میں جانور ذبح کئے جاتے تھے۔ اگر پہلے آکر آپ دیکھتے تو جھاڑیوں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آتا۔ مگر اب ایک طرف تندور ہے تو دوسری طرف خیمہ ہے ایک طرف بچوں کے رات کے کھانے کا انتظام ہے۔ دن کا کھانا تو حوض خاص میں سبزہ پر کسی گھنے درخت کے نیچے کھایا جاتا ہے۔

لیجئے جمعہ کا دن بھی ختم ہوا۔ پتہ ہی نہیں چلا۔ آج یہاں رہیں ہوگی سب بچے وہی دیکھیں گے۔ جو وقت بچے گا اس میں اپنے ماڈلس بنائیں گے اور خیموں کی سجاوٹ ہوگی۔ صرف چہارم کے بچے جیا سرائے گئے۔

ہم نے آپ کو حوض خاص کے گاؤں کی سیر کرائی تھی اب ذرا جیا سرائے کی بھی سیر کریں۔ یہ حوض خاص کے جنوب میں ۱½ فرلانگ پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ اسی کو سب جیا سرائے کہتے ہیں۔ آپ کو اس کی عمر بتائیں، یہ چار سو سال پرانا ہے۔

یہاں کی آبادی ۱۲۰ ہے۔ ایک خاص بات اور ہے یہاں کل ۱۷ مکان ہیں مگر سب کچے ہیں۔ کیونکہ یہاں دیمک بہت ہے اس لئے یہاں کچے مکان بنائے جاتے ہیں۔ یہاں ۲۵ بھینسیں اور ۹ گائیں ہیں۔ گاؤں والوں کے پاس کل ۳۰۰ بیگھہ زمین ہے۔ ایک بیگھہ ۳۰۲۵ مربع گز ہوتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے گذارے لائق اناج وغیرہ ہو جاتا ہے۔ ان کے یہاں دودھ بیچا نہیں جاتا بلکہ خود ان کے استعمال میں رہتا ہے۔ اب لگے ہاتھوں برتن بنانے کے کارخانے کو دیکھتے چلیں۔

یہ حوض خاص سے کافی قریب ہے۔ اس کا نام پاپولر پوٹری ورکس ہے۔ یہاں ہم بغیر کسی تعارفی خط کے گئے تھے۔ اور سوچ رہے تھے کہ دیکھئے کیا حشر ہوتا ہے مگر خلاف امید کارخانے کے مالک صاحب جو کہ سردار جی تھے۔ بہت اخلاق اور محبت سے پیش آئے اور دلچسپی سے اپنا

کارخانہ دکھایا۔

سنئے یہاں چینی کے برتن بنتے ہیں۔ برتن بنانے میں دو چیزیں کام آتی ہیں کھریا مٹی اور معمولی پہاڑی پتھر۔ پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے بڑے بڑے رولرس ROLLERS میں ڈال دئے جاتے ہیں۔ رولر بجلی سے گھوم رہے تھے۔ پتھروں کے ساتھ کچھ ایسی دوائیں بھی شامل کی جاتی ہیں جن سے پتھر پگھل کر پانی پانی ہو جاتا ہے۔

یہاں سے یہ پانی ایک حوض میں آتا ہے یہاں کھریا مٹی ملائی جاتی ہے۔ حوض میں سے یہ مادے کی شکل میں ایک اور مشین میں جاتا ہے۔ یہاں اس کا سب پانی الگ کر لیا جاتا ہے۔ اور مٹی گوندھے ہوئے سخت آٹے کی شکل میں نکل آتی ہے۔ اس مٹی کے موٹے موٹے ڈنڈے بنالئے جاتے ہیں۔ اب کاریگر مختلف سانچوں میں اسے بھر کر مختلف شکل کی پیالیاں کھلونے پلیٹیں وغیرہ بناتے ہیں۔ سانچے بھی ایک خاص قسم کی مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ برتن کچے ہوتے ہیں۔ اگر ان پر نقش و نگار بنانا ہو تو ایک خاص رنگ سے ان پر کاریگر بناتے ہیں۔ پھر ان برتنوں کو ایسی چیز میں بھگوتے ہیں کہ ان پر چمک آجائے۔

اب برتن بھٹی میں پکنے کے لئے جاتے ہیں۔ برتن پکانے کے لئے مٹی کی بنی ہوئی تھالیاں سی ہوتی ہیں۔ جن کو ساگر کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جرمنی کے ایک شخص ساگر نے یہ مٹی ایجاد کی تھی۔ ایک وقت میں سینکڑوں تھالیاں رکھی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد برتن تیار ہو جاتے ہیں جن پر ایک چمک دار تہہ ہوتی ہے۔

اتوار کے دن پھر وہی شاہدہ۔ کوئی قطب جا رہا ہے۔ کوئی چراغ دہلی کی لو لگائے ہوئے نوٹس کی کاپی سنبھالے کھڑا ہے۔ کوئی ہوائی اڈے جانے کے لئے پر تول رہا ہے۔

آج تو سوم کے بچوں کو لاری ملے گی اس لئے ہوائی اڈہ، صفدر جنگ، لودھی بادشاہوں کے مقبرے دیکھنے کا پروگرام ہے۔

نو ساڑھے نو تک سب ہوائی اڈے پہنچ گئے۔ پہلے ماسٹر صاحب اندر جاکر اجازتی کارڈ لائے۔ اب ہمیں کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ سب بچے لائن سے اندر گئے ایک باغ میں سے ہوتے ہوئے بادامی عمارت کے پاس پہنچے اس پر بڑا بڑا انگریزی میں "ونگڈن ایر اسٹیشن" لکھا ہوا تھا۔ یہاں ایک صاحب ہماری رہبری کرنے کے لئے آگئے۔ یہ عمارت اندر سے گول اور دو منزلہ ہے۔ یہاں اس کمپنی کا (جس کا کہ ہوائی جہاز آتا ہے) دفتر ہے۔ بیچ والے حصے میں مسافروں کے لئے صوفے بچھے ہیں۔ اس عمارت کے اوپر سرچ لائٹ لگی ہے۔ بچوں نے دیکھتے ہی کہا "باجی یہی وہ روشنی ہے جو ہم سب جامعہ سے روز رات کو گھومتی ہوئی دیکھتے ہیں"۔

اس کے بعد دوسرے دروازے سے ہم باہر کی طرف آئے۔ یہاں تھوڑی دور پر لکھا ہوا تھا کہ یہاں باہر نہیں جاسکتے۔ مگر ہمیں کیا ڈر ہمارے پاس تو اجازتی کارڈ تھا۔

ہم سب اب ہوائی جہاز کے ٹھہرنے کی جگہ پر جا رہے تھے۔ یہاں مختلف نمبر پڑے ہوئے تھے۔ ہمارے رہبر نے بتایا کہ جیسے ریلوں کے مختلف اسٹیشن ہوتے ہیں اسی طرح ہوائی جہاز کے اسٹیشن ہیں۔ زمین پر کے نمبروں کا مطلب ہے مختلف اسٹیشن۔ تھوڑی دور پر ہوائی جہاز کھڑا نظر آ رہا تھا۔ سب اس کے پاس گئے۔ یہاں پر جہازوں کے گھر تھے جہاں وہ مزے سے کھڑے تھے۔ یہاں آکر ہم سب ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی گاؤں میں موٹر آجائے اور لوگ حیرت سے اسے دیکھتے ہیں۔ اتنا بڑا جہاز ہمارے سامنے تھا۔ سب بچے اسے چھوکر دیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہاں اسٹاف میں سے بہت سے لوگ جمع ہوگئے جو بچوں سے بہت اخلاق اور محبت سے پیش آئے۔ اور بچوں کے سوالات کو بڑے غور سے سُنا اور اچھی طرح ان کا جواب دیا۔ چار چار ٹولیاں بناکر اندر بھی لے گئے۔ اور ایک ایک چیز سمجھائی۔

یہ جہاز ۲۱ آدمیوں کے لئے تھا۔ اس میں ایک غسل خانہ تھا۔ سامان رکھنے کی جگہ الگ تھی۔ چھوکر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جہاز بنانے میں جو چیزیں استعمال کی جاتی ہیں وہ

بہت ہلکی ہوتی ہیں۔ اور کھڑکیوں میں جو شیشے نما چیز لگی ہوتی ہے اس پر آگ اثر نہیں کرتی۔ جہاز کے اندر ایک ایسی گھڑی بھی دیکھی جو دن رات ہفتے مہینے گھنٹے منٹ سکنڈ سب بتاتی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا اس کی قیمت پانچ سو روپیہ ہے۔ بچوں نے کچھ سوال بھی کئے دو چار آپ بھی سُن لیجئے۔

ایک بچے نے پوچھا: اس کا وزن کتنا ہے؟ انھوں نے کہا کہ دو سو من سے بھی زاید ہے ابھی یہ سوال پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ دوسرا سوال ہوا۔ اس کی قیمت کیا ہے؟ اس پر سب ہنس پڑے۔

آپ بھی سنئے۔ آپ کے لئے جہاز کی قیمت ۶ لاکھ روپے ہے۔ اور اگر کوئی کمپنی خریدے تو ۴ لاکھ میں ملے گا۔

"کیا ہندوستان میں جہاز بنتے ہیں؟"

"جی ہاں! مگر وہ صرف دو آدمیوں کے لئے ہوتے ہیں۔"

"اچھا تو قسمیں کتنی ہوتی ہیں ان کی؟"

"تین قسمیں ہوتی ہیں۔ مسافروں کا جہاز۔ دوسرا بم پھینکنے والا۔ تیسرا لڑنے والا۔" ان باتوں کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ جہاز میں ڈاکٹری امداد کا سامان بھی ہوتا ہے۔ اگر کسی کی طبیعت خراب ہو جائے تو فوراً اس کو ڈاکٹری امداد دی جاتی ہے۔ جہاز میں پستول رکھنے کی بالکل اجازت نہیں ہوتی۔ صرف کام کرنے والوں کے پاس ایک ہوتا ہے۔ آگ بجھانے کے لئے بھی گیس کی بوتلیں ہوتی ہیں۔ وہ خود بخود پھٹ جاتی ہیں اور آگ بجھ جاتی ہے۔ اس جہاز میں ۶۰۰ گیلن پٹرول آتا ہے۔ یہ پٹرول ۱۲ گھنٹے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ عام طور پر جہاز ایک گھنٹے میں ۲½ سو میل اُڑتا ہے۔ جب جہاز ہوائی اڈے سے تقریباً ۵۰ میل دور ہوتا ہے اس وقت وہ وائرلیس سے اڈے پر اطلاع کرتا ہے۔ یہاں اسٹیشن والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ جہاز آ رہا ہے۔ ہوائی جہاز چلانے کے لئے سامنے دو پائلیٹ ہوتے ہیں۔ جن میں سینیر بیٹھا رہتا ہے اور جونیر چلاتا ہے۔

یہاں سے ہم سب صفدر جنگ کا مقبرہ دیکھنے گئے۔ یہ سرخ پتھر کی بہت بڑی عمارت ہے جو کچھ کچھ ہمایوں کے مقبرہ اور تاج محل سے

ملتی ہے۔ یہاں بچوں کا دل نہیں لگا۔ ان کے دماغوں میں تو جہاز ہی چکر لگا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں تو سر پہ منڈلاتے ہوئے اس جہاز کو دیکھ رہی تھیں جس کا وہ ابھی ذکر سن کر آئے تھے کہ بعض تجربے کرنے کے لئے ایک ایسا جہاز بھی ایجاد ہوا ہے جو بغیر انجن کے اُڑتا ہے۔ پہلے سہارے کے لئے کوئی جہاز رسّی باندھ کر اُڑا دیتا ہے پھر اوپر جاکر رسّی کاٹ دی جاتی ہے اور جہاز گول گول چکّر لگا کے اینچیوں کی طرح زمین پہ گر جاتا ہے۔

کہئے ہوا پانی کے دفتر کا حال بھی سنائیں۔ یہاں صرف ششم کے لڑکے گئے تھے: اچھا تو سنیئے۔

۱۶ر مارچ کو ہم لوگ ہوا پانی کے دفتر گئے۔ کئی دن سے ذکر تھا کہ ہوا پانی کا دفتر دیکھیں گے۔ ماسٹر صاحب نے سمجھایا بھی تھا کہ وہاں کیا ہوتا ہے مگر جب تک اپنی آنکھوں سے نہ دیکھیں۔ کیسے سمجھیں۔ خیر صاحب ہم اپنا تعارفی خط لے کر گئے۔ پہلے وہ دکھایا تب کہیں جاکر اجازت ملی۔ اس کے بعد ہم سب کو خاص طور پہ ہدایت دی گئی کہ ہم بہت خاموش رہیں۔ کیونکہ شور سے کام کرنے والوں کا حرج ہوگا۔ بس پھر کیا تھا ہم بھی دم سادھے رہے۔ سانس بھی آہستہ آہستہ لیتے تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں کسی کو ہم سے شکایت پیدا ہو جائے۔

زرا سنتے جائیے۔ آپ تو پوچھنے لگے کہ یہ ہے کیا جگہ۔ ہم پہلے سے کچھ بھی نہیں بتائیں گے۔ بس ہماری باتیں سنتے جائیے۔

ہاں تو ہم کیا کہہ رہے تھے۔ وہاں اندر گئے بالکل چپ چاپ۔ سب سے پہلے انھوں نے ہمیں ہواؤں کے نقشے دکھائے جس میں دکھایا گیا تھا کہ کون کونسی ہوائیں چلتی ہیں اور کس کس طرف جاتی ہیں۔ پھر انھوں نے ایک غبارہ دکھایا۔ جس میں مشین سے ہوا بھر کے نیچے ایک مشین باندھ کر چھوڑ دیا جاتا ہے اور دوربین سے دیکھتے رہتے ہیں۔ اس غبارے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی بات ہوا کا رُخ دوسری بات ہوا کی رفتار۔

اس کے بعد ہوا کے دباؤ کا آلہ دکھایا

اور پھر مان سون ہواؤں کا رُخ بتایا۔ یہی وہ دفتر ہے جہاں سے آندھی، بارش، طوفان دھند وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں اور ہوائی اڈے تک پہنچائی جاتی ہیں۔ یہاں ایک آلہ آسمان کا حال بھی بتاتا تھا۔ یہ دفتر سب سے پہلے ہندستان میں شملہ میں قائم ہوا۔ اس کے بعد ہندستان کی دوسری جگہوں پر قائم ہوا۔

سمجھے آپ کتنے کام کرتا ہے یہ دفتر سچ پوچھئے تو اس زمانے میں ہم موسم کا حال جانے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔ جیسے گزرے سال ہم سب موسم کا حال اخبار میں اسی دفتر کا بھیجا ہوا پڑھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے ارادے کی مضبوطی کو دیکھ کر ہوائیں رُک جائیں اور طوفان اپنا راستہ بدل دیں۔

یہاں سے سیدھے کیمپ پہنچے اور پھر وہی کام۔

۱۵ر مارچ کو چہارم کے بچے چراغ دہلی کا ارادہ کر رہے تھے۔ میں نے بھی سوچا کہ چلنا چاہیئے۔ زیادہ دور بھی نہیں بس تین میل ہوگا۔

آیئے پہلے آپ کو یہ بتا دوں کہ چراغ دہلی کیا ہے۔ یہاں ایک بزرگ پیر نصیر الدین کا مزار ہے جو چراغ دہلی کہلاتے تھے۔ اس لئے اس بستی کا نام چراغ دہلی پڑ گیا۔ ان ہی کے نام پر ہمارا پہلے دن کا WATCH WORDسہ 'چراغ' تھا۔

حوض خاص سے چلے ابھی تھوڑی دور گئے ہی تھے کہ راستے میں ایک مینار نظر آیا۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کا نام چور مینار ہے۔ اسے علاؤ الدین خلجی نے بنوایا تھا۔ اس پر منگول حملہ آور سرداروں کے سر کاٹ کر لٹکائے جاتے تھے۔

ابھی چور مینار کو دیکھ ہی رہے تھے

سہ فوجی چھاؤنیوں میں یہ طریقہ ہے کہ کوئی خفیہ لفظ مقرر کر لیتے ہیں۔ باہر سے آنے والا جب پہرہ دار کو یہ لفظ بتا دیتا ہے تو اُسے آگے بڑھنے دیا جاتا ہے ورنہ گرفتار کر لیتے ہیں۔

کہ ایک بڑی ستون والی عمارت نظر آئی۔ بھئی اسے بھی دیکھ ہی لیا جائے۔ دیکھنے کے لائق اتنی جگہیں ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا — کس کو دیکھیں اور کس کو چھوڑیں۔ خیر لاؤ اسے بھی دیکھتے ہی چلیں۔ دور سے اچھی لگ رہی ہے۔

ہم سب اُسے دیکھنے پہنچے۔ یہ ذرا اونچائی پر بنی ہوئی تھی۔ اس کے چاروں طرف بہت سے ستون والے برآمدے تھے کچھ قبریں بھی تھیں۔ یہ عمارت بہت ٹوٹی پھوٹی تھی مگر بڑی ترقی یافتہ۔ گرم اور ٹھنڈا کرنے کے لئے دوہرے دروازے تھے جن میں پانی لاکر کمرے کو ٹھنڈا یا گرم کیا جا سکتا ہے زمین دوز نالیاں تھیں۔ مگر اس کا نام کیا ہے ہم سب اپنے دل میں سوچ رہے تھے۔ کہیں نہ کہیں تختی ضرور لگی ہوگی۔ سب اوپر چڑھ گئے۔ تب کہیں جاکر معلوم ہوا کہ اس عمارت کا نام "وجے منڈل" ہے۔ اور محمد شاہ تغلق کے زمانے کی بنی ہوئی ہے۔ اندر کی طرف دو گہرے کوئیں سے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خزانے کے لئے تھے۔

یہاں سے واپس ہوکر تھوڑی دور پر سرخ گنبد دیکھا۔ یہ کسی بزرگ کا مقبرہ ہے جو سرخ پتھر کا بنا ہوا تھا۔

یہاں سے پھر سڑک پر ہولئے۔ راستے میں ایک بستی کے شروع میں ہمایوں کے زمانے کا ایک دالان دیکھا جس پر بڑا خوبصورت کام ہو رہا تھا۔ ان بیل بوٹوں میں رنگ برنگے نگینے جڑے ہوئے تھے۔ اسی کے پاس کسی کا مقبرہ تھا۔ جس کی چھت میں بھی بڑا اچھا کام تھا۔ اور نگینے جڑے تھے۔ ان عمارتوں کی حالت پہ بڑا افسوس ہوا۔ اب یہاں بھینسیں بندھتی ہیں۔

یہاں سے اب چراغ دہلی تھوڑی دور پر تو ہے ہی۔ ذرا سی دیر میں پہنچ گئے۔ مزار پر گئے۔ بڑی ٹھنڈی جگہ ہے۔ یہاں تھوڑی دیر بیٹھے، پانی پیا۔ اور بہلول لودھی کا مقبرہ دیکھتے ہوئے کچے راستے سے ہوتے ہوئے ۱۲ بجے تک حوض خاص پہنچے۔ یہاں آکر ایک تبدیلی دیکھی وہ یہ کہ راستوں اور کھیتوں کی حدوں پر قلعی ہوگئی تھی۔

انھیں دیکھ کر سوچا کہ آثار اچھے ہیں۔ آخری دن زور دار ہوگا۔ ابھی تو قطب جانا اور باقی ہے۔

منگل کے دن صبح سے قطب کی طرف چل پڑے کچے راستے سے بہت جلد پہنچ گئے۔ حالانکہ یہ بھی کوئی تین میل ہوگا۔

کچھ دیر سستانے کے بعد گھومنا شروع کیا۔ مسجد قوت الاسلام دیکھی۔ اس کے بیچ میں اشوک کی لاٹ ہے۔ اس پر جو عبارت کھدی ہے اس کا ترجمہ سیدھے ہاتھ کے دالان میں سفید پتھر پر کھدا ہوا ہے۔ مسجد کے پیچھے سیدھے ہاتھ کی طرف التمش کا مقبرہ دیکھا۔ یہاں کی سنگ تراشی دیکھ کر بچوں کو بہت حیرت ہوئی کہ ہاتھ سے اس قدر اچھا کام کیسے بن سکتا ہے۔

بائیں ہاتھ کی طرف علاؤالدین خلجی کا مقبرہ ہے جو بہت شکستہ ہو گیا ہے۔ وہاں سے علائی دروازے کی طرف آئے۔ بعض بچے جب قطب مینار کے نیچے سے نکلے تو انھوں نے اپنے سروں پر ہاتھ رکھ لئے۔ اور سوچنے لگے کہ کہیں قطب ان کے سروں پر نہ گر جائے۔ بعض پوچھتے کہ یہ مینار ٹیڑھا کیوں نظر آ رہا ہے۔ قطب کی پانچ منزلیں ہیں اور ہر منزل ایک نئی طرز کی ہے۔ اس کو قطب الدین ایبک نے شروع کروایا تھا اس کے بعد مختلف بادشاہوں نے بنوایا۔ سب بچے اس پر چڑھے تو انھوں نے بتایا کہ ۳۷۸ سیڑھیاں ہیں۔ سب سے اوپر لوہے کی جالی ہے۔ رات کو ایک سرخ بلب جلتا ہے۔ اندھیرے میں یہ بلب جلتا اور بجھتا بڑا اچھا لگتا ہے۔

یہاں علائی مینار دیکھنے گئے۔ یہ ادھورا مینار ہے اس کو علاؤالدین نے شروع کروایا تھا سنا ہے اگر یہ بن جاتا تو قطب سے بھی زیادہ شاندار ہوتا۔ مگر اب تو یہ مٹی کے ڈھیر کی شکل میں ہے۔ اس کے بعد کہیں جانے کی ہمت نہیں ہوئی بہت ارادہ کیا کہ مہرولی جائیں۔ وہاں سنا ہے بختیار کاکی کا مزار ہے۔ ہمارا دوسرے دن کا WATCH WORD کاکی تھا۔

مگر اب تو پیروں نے جواب دے دیا۔ اور پیٹ بھی کچھ مانگ رہا ہے لہٰذا چلنا چاہیے۔ چلتے چلاتے ½۱ بجے کے قریب کیمپ پہنچے۔ اب تو غسل کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ اس قدر بھوک لگی ہے۔ کیا کریں ادھر ریٹ پر "راما منا یوگی" آواز اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ کھانے کے بعد آرام کریں گے پھر ادھورے ماڈل پورے کرنے ہیں۔ کل تو مظاہرہ ہے بہت سے مہمان بھی آ رہے ہیں۔

لیجئے کام کرتے کرتے دن گزر گیا۔ مظاہرے کا

وقت بھی آگیا۔ پانچ بجے سے مہمان آئیں گے۔ آئیے آپ بھی سیر کیجئے۔ چلئے سامنے گیٹ ہے۔ جوہری تیپوں اور عباسی پھولوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ ان تیپوں اور پھولوں کو بچے بہت دور سے لائے تھے کیونکہ یہاں تو دور دور تک سوائے کانٹے دار جھاڑیوں کے کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ دروازے کے دونوں طرف زمین پر چونے سے بنے ہوئے ہلال نما چبوتروں پر بالک نگری اردو ہندی میں لکھا ہوا ہے۔

داخل ہوتے ہی بچوں کا اخبار نظر آئے گا۔

اب سیدھے ہاتھ کی طرف چلئے۔ یہ دو خیمے اوّل دوم کے بچوں کے ہیں۔ اس کیمپ کا نام چاند تارا کیمپ ہے۔ انھوں نے اپنی عمر کے مطابق ایک گاؤں کا گھر اور مٹی کے چند کھلونے بنائے ہیں۔ سامنے چھوٹے چھوٹے پتھروں سے چاند تارا لکھا ہے۔

اس کے بعد دوسرا کیمپ سوم کے بچوں کا ہے اس کا نام بہادر کیمپ ہے۔ انھوں نے اپنی دھوپ گھڑی مکمل کرلی ہے۔ قطب تارا اور کھٹولا بھی بنالیا ہے۔ کچھ مٹی کے جانور بھی ہیں۔ ایک خوبصورت جھونپڑی اور زمین پر کھیتیں بھی بنائی ہیں۔ ایک قطب مینار مٹی سے بنا ہوا ہے۔ ایک طرف جامعہ سے حوض خاص تک زمین پر نقشہ بنایا ہے۔ کیا کیا دیکھیں۔ اتنی بہت سی چیزیں ان ننھے ننھے بچوں نے بناکر رکھی ہیں۔ وہ دیکھئے جوتے رکھنے کا اسٹینڈ الگ ہے، لوٹے گلاس کا الگ ہے۔ میلے کپڑوں کا الگ اسٹینڈ ہے ایک بریکٹ بھی بنایا ہے اس پر سب سے اوپر آئینہ رکھا ہے۔ اس کے نیچے کنگھے اور تیل کی شیشی وغیرہ ہے۔ یہاں گاؤں کے مشاہیر کے فوٹو بھی نظر آئیں گے اور کچھ ضروری ہدایتیں بھی دیکھئے۔ ہم بھی سیکھ لیں۔ پانی کے گھڑے کے پاس لکھا ہوا ہے "گھڑا ڈھکتے جائیے" "جو چیز جہاں سے اٹھائیے وہیں رکھئے" وغیرہ۔ بھئی کمال کے بچے ہیں۔

اب آگے چلیں۔ یہ چہارم کا چراغ کیمپ ہے۔ یہاں ایک طرف کھیل کے میدان کا ماڈل ہے۔ دوسری طرف ایک خوبصورت سی ریلوے لائن ہے۔ گائڈ بچے نے بتایا کہ یہ ریلوے لائن حوض خاص سے جامعہ جاتے ہوئے راستے میں پڑتی ہے۔ کسی نے پوچھا "مگر ریل تو نظر نہیں آتی، کہاں ہے؟" ایک بچے نے جواب دیا کہ "ریل چلی گئی۔" اس کے بعد انھوں نے پانی صاف کرنے کے طریقے کو دکھایا تھا۔ ایک طرف ننھا سا رہٹ تھا اب دوسری طرف سیڑھیاں اتریئے، یہ بھی ان ہی بچوں نے آپ کی آسانی کے لئے بنائی ہیں نیچے چراغ کیمپ کا دوسرا حصّہ ہے کیونکہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ زمین ہموار نہیں ہے۔ یہاں قریب کے ایک گاؤں جیا سرائے کا ماڈل بنا ہوا ہے۔ دوسری طرف ہندستان کا نقشہ ہے

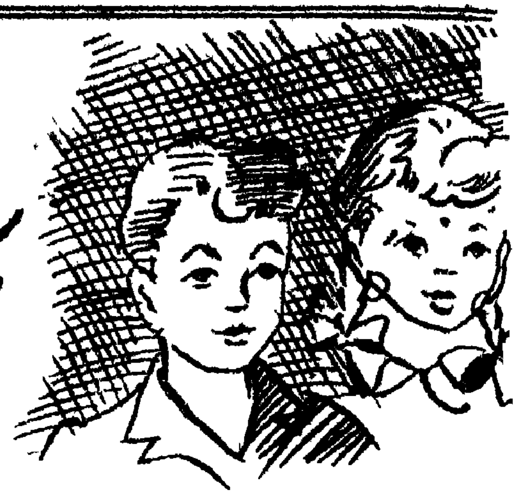
اور زرا یہ درخت دیکھیے۔ طرح طرح کے گھونسلے لٹکے ہوئے ہیں۔ یہ بچوں نے جمع کئے ہیں۔

یہ تعلیمی کا تعلق کیمپ ہے۔ شروع میں مٹی پر کھدا ہوا ہندستان کا نقشہ اور جامعہ کا موٹو گرام آپ کا خیر مقدم کرے گا۔ اب اندر آئیے ایک طرف قطب مینار مٹی سے بنا ہے اس کے پاس قطب تارا، بنات النعش اور شہاب ثاقب ذحل وغیرہ کو زمین پر دکھایا گیا ہے۔ یہاں بھی دھوپ گھڑی ہے۔ اس کے پاس سرخ گنبد ہے۔ پھر الٹے ہاتھ کی طرف جو زمین پر آپ نقشہ دیکھ رہے ہیں۔ یہ چاند کی مختلف شکلوں کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ سامنے والی چیز بہت حسین ہے زرا قریب سے دیکھیں۔ بچوں نے جو مقامات دیکھے تھے ان کا نقشہ بنایا تھا اور ان مقامات کو ماڈلس کی شکل میں ظاہر کیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف مٹی کے درخت جو ہرے رنگے ہوئے ہیں۔ ہرے درخت اور سرخ سڑک کی بجری عجب بہار دکھا رہی ہے۔ میرا تو دل چاہتا ہے یہیں بیٹھی رہوں۔ ہوائی اڈے میں جہاز کتنے ننھے ننھے سے بنائے ہیں۔ واہ بھئی جامعہ کے گنبد بھی تو ہیں۔ اور یہ ایک انگلی کے برابر قطب مینار بھی۔

اب ششم کے قطب کیمپ کو دیکھنے چلیں۔ سب سے پہلے آپ بانگ گھڑی کا ماڈل دیکھ لیجئے۔ آپ ایک نظر میں پورا کیمپ دیکھ سکتے ہیں۔ پھر حوض خاص کا ماڈل ہے۔ اس کے آگے ریس کورس کا ماڈل ہے جس نے کبھی ریس نہ دیکھی ہو وہ اس ماڈل میں گھوڑے دوڑتے ہوئے دیکھ لے۔ جی جناب سامنے گھوڑے بھی تو دوڑائے ہیں۔ پھر ہوائی اڈے کا ماڈل ہے۔ دائیں طرف دیکھئے میں آپ کو قطب کی بھی سیر کرا دوں۔ بچوں کو بھی خوب سوجھتی ہے۔ سرکنڈوں سے قطب مینار بنایا ہے۔ اور پوری عمارتیں مٹی کی ہیں۔ علائی مینار بھی سرکنڈوں سے بنا ہوا ہے۔ قطب تو اتنا اچھا لگ رہا ہے اگر قطب الدین دیکھ لیتا تو بجائے پتھر کا مینار بنوانے کے وہ سرکنڈوں سے ہی قطب بنواتا۔ اس کے بعد بچوں کی جمع کی ہوئی چیزیں دیکھئے اور موسم کی تبدیلی کا نقشہ دیکھتے ہوئے زرا اوپر کی طرف چلیں۔

یہ لڑکیوں کا غنچہ کیمپ ہے۔ سب سے پہلے آپ ایک پھولوں اور پتّوں سے ڈھکے ہوئے دروازے سے داخل ہوں گے۔ یہاں لڑکیوں نے اپنی فرصت کے وقت کام کیا ہے۔ کیونکہ روز تو وہ اپنے درجے کے ساتھ کام کرتی تھیں۔ یہاں بھی گاؤں کا گھر، کچھ کھلونے، رہٹ، انڈیا گیٹ، اور چھوٹا مینار نظر آئے گا۔

اب زرا کیمپ فائر دیکھ لیں شروع ہوگیا۔ آج تو مہمانوں کی سہولت کے لئے مغرب کے بعد ہی شروع کر دیا ہے۔ نقلیں تو بہت عمدہ ہیں۔ وقت کا پتہ بھی نہیں چلا۔ اور دس بج گئے۔ بھوک بھی لگنے لگی۔ کھانا کھائیں اور سوئیں کل تو روانگی ہے۔



بچوں کی کوششیں

مغرور رئیس

بہت عرصہ گزرا ہندوستان میں ایک رئیس رہتا تھا۔ جو نہایت مغرور تھا۔ ایک دفعہ اُس کے مکان پر ایک فقیر آیا۔ رئیس نے بہت بُرا بھلا کہا۔ اور کہا "چل دور ہو اب کے میرے گھر پر آیا تو تیری جان نکال دوں گا۔" جب محلے والوں کو اس بات کا پتہ چلا کہ اس نے فقیر کو بہت برا بھلا کہا ہے تو وہ رئیس سے بہت ناراض ہوئے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ رئیس کے گھر میں چور گھس گئے اس نے بہت شور وغل مچایا لیکن کوئی اس کی مدد کو نہ آیا۔ انھوں نے کہا کہ خود تو غریبوں کی کوئی مدد نہیں کرتا اور اُن کے ساتھ بُرا سلوک کرتا ہے۔ جب اپنے اوپر مصیبت پڑی تو ہماری مدد چاہتا ہے۔ اسے اب اپنے کئے کی سزا بھگتنی چاہئیے۔ ادھر محلے والے یہ باتیں کر رہے تھے کہ اُدھر چور تمام مال و دولت لے کر رئیس کو قتل کر گئے۔

شمس الحسن نقوی
طالب علم درجہ ششم

دکھیاری بڑھیا

شام کا وقت تھا سورج پہاڑیوں کے پیچھے سے اپنی لال لال صورت دکھا رہا تھا۔ لال پیلی شفق اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔ میں ٹہلنے کی غرض سے نہر کی جانب تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا جا رہا تھا۔ اتنے میں میرے بازو سے ایک بڑھیا سر پر لکڑیوں کا ایک بھاری گٹھا رکھے ہوئے گزری۔

نہ جانے کیوں مجھے اس پر ترس آگیا۔

میں نے اپنے من میں سوچا شاید کوئی مصیبت کی ماری ہے۔ یہ سوچ کر میرے ذہن میں ایک بات آئی کہ دیکھوں یہ کہاں رہتی ہے۔ یہ سوچ کر میں اس کی طرف چل پڑا۔ ابھی میں تھوڑی ہی دور چلا ہوں گا کہ اس نے اپنے سر کا بھاری گٹھا زمین پر پٹخ دیا۔ اب میں نے اس سے کہا "بڑی بی مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں" "ہاں ہاں کیا کچھ لکڑیوں کا بھاؤ تاؤ کروگے" اس نے بڑے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"نہیں کچھ اور" میں نے کہا۔

اتنے میں دو بچے کوئی ۷، ۸ برس کے اس کے پاس دوڑتے ہوئے آئے "اماں! جلد رو پکاؤ بھوک لگی ہے" یہ ان کی زبان سے نکل رہا تھا۔ "ہاں ہاں ابھی چلتی ہوں" بڑھیا نے کہا۔ اور پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔ "آؤ بیٹا یہاں اطمینان سے بیٹھو اور پھر کہو کیا کہتے ہو" اس نے جھونپڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ جھونپڑی کے اندر ایک کونے میں ایک چولھا بنا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ایک کھٹولا پڑا تھا جس کی رسی کثرت استعمال سے جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ چولھے کے پاس ایک پرانی مٹی کی ہانڈی، چند مٹی کی رکابیاں اور ایک توا پڑا تھا۔ اور ایک طرف کو ایک مٹی کا گھڑا تھا اور اس کے پاس ایک ٹین کا کنستر رکھا تھا۔

کھٹولے کی طرف اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس پر بیٹھو" میں چپ چاپ اس کے اوپر بیٹھ گیا اور میرے پاس ہی اس

کے دونوں لڑکے بیٹھ گئے۔ میں نے ان کو جو غور سے دیکھا تو اُن کے جسم پر صرف ایک پُرانا کُرتہ تھا۔ بُڑھیا باہر سے آکر اپنے کھانا پکانے کے دھندے میں مصروف ہوگئی اس کے بھی جسم پر ایک میلا اور پرانا کپڑوں کا جوڑا تھا۔ بڑھاپے اور پریشانیوں کی وجہ سے اس کے سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر پتہ نہیں کتنی شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے کہا۔ "کہو بیٹا کیا پوچھ رہے تھے؟" میں نے کہا "مجھے اپنی آپ بیتی سناؤ" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "آپ بیتی سن کر کیا کروگے۔ میری آپ بیتی بڑی ...... دکھ بھری ہے"
میں نے کہا "تم سناؤ تو"

"اچھا" اس نے کہا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ کتنے ہی بڑے بڑے آدمیوں کی آپ بیتی تو میں نے پڑھی اور سنی ہے لیکن آج دیکھوں ایک غریب دکھیاری بڑھیا کی آپ بیتی کیسی ہے؟

اس نے یوں کہنا شروع کیا کہ "آج سے پانچ برس پہلے کی بات ہے کہ ہم لاہور میں بڑے چین اور آرام سے رہتے تھے" اُس نے چولھے میں آگ لگاتے ہوئے کہا "ان بچوں کے باپ ایک کامیاب وکیل تھے ہماری کئی کوٹھیاں تھیں۔ میرے پاس بہت زیور تھا۔ بینک میں ہمارا بہت روپیہ تھا۔ غرض کہ ہم بڑے امیر تھے۔ لیکن بیٹا کیا بتاؤں قسمت میں بڑھاپا دکھ سے گزارنا لکھا تھا تو سکھ کہاں سے آتا۔ ۱۹۴۷ء میں ان کے باپ مارے گئے ہمارا سب کچھ مال لٹ گیا" اور یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے کئی آنسو نکل کر گر پڑے۔ اس نے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا "اور پھر ہم پناہ گزینوں کے ساتھ بڑی مصیبتوں سے یہاں تک پہنچے۔ یہاں ہمارا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ حکومت بھی اس وقت کچھ نہ کرپا رہی تھی۔ ایک وقت ایک ٹکڑا روٹی ملتی تھی اور تین وقت فاقہ۔ کبھی بس ایک مٹھی چنوں پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ رہنے کو کوئی مکان نہیں، کھلے میدان میں سب پڑے بلکتے رہتے۔

آخر لاکھوں مصیبتوں کے بعد اب جاکر یہ زندگی ملی ہے کم از کم دو وقت تو روکھی سوکھی مل جاتی ہے۔ یہ دو بچے ہیں ایک کی عمر ۲۰

سال کی ہوگی۔ ایف، اے پاس ہے مگر۔۔۔"
اور وہ پھر رونے لگی۔ اور اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا" وہ اب تک بالکل بیکار ہے کوئی نوکری نہیں ملتی ہے۔ وہ بھی لکڑیاں کاٹ کر لاتا ہے اور یوں ہم اپنا پیٹ پال رہے ہیں۔ نہ کچھ پہننے اوڑھنے کا ہے اور نہ رہنے سہنے کو ڈھنگ کا مکان ہے۔ یہ بھی جھونپڑا برسات میں ٹپکتا ہے۔ یہ ہے بیٹا میری آپ بیتی" اس نے ایک آہ سرد بھرتے ہوئے کہا۔

میں نہ جانے کیوں یہ باتیں سن سن کر بہت غمگین ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہندوستان آزاد ہے مگر ابھی اس کے باسی غریب ہیں، بھوکے ہیں، ننگے ہیں۔ لیکن اس کے ذمہ دار کون ہیں کون؟

اب میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ اس کے ذمہ دار ہم ہی ہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کی مدد کریں اور ان میں سے ہر بات کو دور کرنے کی کوشش کریں تو ہمارا ملک بہت جلد ترقی کرسکتا ہے

محمد سلمان بیگ۔ عمر ۱۲ سال۔

"لاپرواہی کا نتیجہ"

حمید ایک ذہین لیکن شوخ لڑکا تھا۔ صرف پڑھنے لکھنے ہی میں نہیں بلکہ کھیل کود میں بھی بہت اچھا تھا۔ اسکول کے امتحانوں میں ہمیشہ اوّل آتا تھا لیکن اس میں یہ بڑا عیب تھا کہ وہ سُست اور لاپرواہ تھا۔ ہر کام عین وقت پر کرتا تھا۔ جب سالانہ امتحان آتا تو سب لڑکے کئی مہینے پہلے سے امتحان کی تیاری کرتے اگر اس کے ساتھی اس سے پڑھنے کو کہتے تو ہنس کر جواب دیتا کہ ابھی تو بہت دن باقی ہیں۔ میں تو ابھی سے سر نہیں کھپاتا۔ دو تین دن جم کر بیٹھوں گا اور اپنی تیاری مکمل کر لوں گا۔ چنانچہ وہ امتحان سے تین چار دن پہلے ہی کتاب لے کر بیٹھتا اور رات دن ایک کرکے اپنا کام ختم کر لیتا۔ ایک دفعہ مدرسے میں انسپکٹر صاحب آنے والے تھے۔ ماسٹر صاحب نے سب لڑکوں سے کہا کہ ہندوستان کا ایک اچھا نقشہ بنائیں۔ جس کا نقشہ سب سے اچھا ہوگا اس کو ایک سنہرا تمغہ ملے گا سب لڑکے اسی روز سے نقشہ بنانے میں

مصروف ہوگئے۔ لیکن حمید ہر روز یہ سوچ کر کہ ابھی کیا جلدی ہے جس روز چاہوں گا بنا لوں گا۔ ٹالتا رہا۔ یہاں تک کہ انسپکٹر صاحب کے آنے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا۔ ماسٹر صاحب نے سب لڑکوں کے نقشے دیکھے جن میں سے بعض بہت اچھے تھے پھر بھی یہ خیال تھا کہ حمید کا نقشہ اور بھی اچھا ہوگا۔ جب حمید سے نقشے کے متعلق پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ نقشے میں تھوڑی سی کمی رہ گئی ہے اس لئے کل لاکر دوں گا۔

اسکول سے آکر حمید نقشہ بنانے کی کوشش کرنے لگا اور نقشہ تیار بھی ہوگیا لیکن اس درمیان میں ٹھوکر لگ جانے کی وجہ سے نقشے پر روشنائی گر گئی اور اس کی ساری محنت برباد ہوگئی۔ اب کیا ہوسکتا تھا اتنا بھی وقت نہ تھا کہ وہ دوسرا نقشہ تیار کرسکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حمید کی لاپرواہی کی وجہ سے سنہرا تمغہ دوسرے لڑکے کو مل گیا اور حمید منہ دیکھتا رہ گیا۔ اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس دن سے حمید نے اپنی سستی اور لاپرواہی کو بالکل چھوڑ دیا اور وہ ہمیشہ کے لئے ہوشیار اور چست و چالاک لڑکا ہوگیا۔

سید یوسف زکی عمر ۱۱ سال

کھلی ہوا کے مدرسے کے پہلے تین دن کا حال

۱۱ مارچ کو ہم لوگ حوض خاص پہنچے۔ پہنچتے ہی سب سے پہلے ہم لوگوں نے خیمے کھڑے کرنے شروع کر دئے۔ جب خیمے لگ گئے تو ہم لوگوں نے خیمے کی صفائی شروع کی۔ اس کے بعد اپنے اپنے سامان لانے شروع کئے۔ پھر بستر بچھائے، دوپہر کے وقت کھانا کھایا۔ پہلے دن تو خیمے کی صفائی میں لگے رہے — دوسرے دن صبح اٹھ کر منجن کیا۔ پھر ناشتہ کیا۔ آج ہم لوگوں کی قطب مینار جانے کی باری ہے ہم لوگوں نے لائن بنائی اس کے بعد ہم لوگ ماسٹر صاحب کے ساتھ قطب مینار کی طرف چلے۔ کھیتوں اور پہاڑیوں سے ہوتے، شکار کھیلتے کوئی ایک گھنٹے میں مہرولی پہنچے۔ سب سے پہلے ہم لوگوں نے ادھم خاں کا مقبرہ دیکھا۔ اس کو اکبر بادشاہ نے ۱۵۶۲ء میں بنوایا تھا اس کو بھول بھلیاں بھی کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے گندک کی باؤلی دیکھی۔ اس کو سلطان شمس الدین التمش نے ۱۲۱۰ء سے ۱۲۳۶ء

تک بنوائی تھی۔ اس کی لمبائی ۱۳۲ فٹ ہے اور اس کی چوڑائی ۲۵ فٹ ہے۔ اس میں ۱۰۵ سیڑھیاں ہیں۔ اوپر ۸۴ سیڑھیاں ہیں اور باقی کے اندر ۲۱ سیڑھیاں ہیں۔ اس کی پانچ منزلیں ہیں۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے علائی دروازہ دیکھا۔ اس دروازے کو سلطان علاؤ الدین خلجی نے ۱۳۱۱ء میں بنوایا تھا اس کے بعد ہم لوگوں نے قطب مینار دیکھا۔ اس کو قطب الدین ایبک نے ۱۲۰۰ء میں بنوایا تھا۔ اس میں ۳۷۹ سیڑھیاں ہیں۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے سلطان شمس الدین التمش کا مقبرہ دیکھا۔ ان کا انتقال ۱۲۳۵ء میں ہوا۔ یہ مقبرہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں بنوایا تھا۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے علائی مینار دیکھا۔ سلطان علاؤالدین خلجی نے اس مینار کو ۱۳۱۱ء میں بنوانا شروع کیا تھا مگر مکمل نہ ہو سکا تھا۔ دوپہر تک ہم لوگ دیکھتے رہے۔ اس کے بعد ہم لوگ پھر حوض خاص کی طرف روانہ ہوئے۔ تیسرے دن ہم لوگوں نے گاؤں کا مشاہدہ کیا۔ اس گاؤں کا نام بیا سرائے تھا۔ دوپہر تک ہم لوگوں نے اس گاؤں کو دیکھا۔ اس کے بعد پھر آگئے۔ کھانا کھایا۔ اپنے خیمے کی صفائی کی۔ شام کو چائے پی اور اپنے خیمے کو سجاتے رہے۔ رات کو کھانے کے بعد کیمپ فائر دیکھا۔

حبیب الرحمٰن
ابتدائی چہارم

بغیر فیس والے اور دیر میں آنے والے حل مقابلہ میں شریک نہیں کئے جائیں گے

پیامی معمہ نمبر ۲۱ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل معمہ نمبر ۲۱
دائیں سے بائیں
(۱) پیام (۸) ہیچ (۹) روٹی (۱۰) عجلت (۱۱) دوات

صحیح حل معمہ نمبر ۲۱
اوپر سے نیچے
(۱) پچاس (۲) یاد (۳) ادب (۴) مسافر (۵) صدیق (۶) بات (۷) سچائی

صحیح حل آٹھ موصول ہوئے۔ ۳۵ روپے کے بجائے ۳۶ روپے کی تقسیم۔ ●● پہلا انعام ۲۴ روپے آٹھ اشخاص پر بحساب ۳ روپے فی کس تقسیم کیا گیا۔

(۱) ماموینہ بیگم عثمانی۔ جودھپور (۲) لائق علی۔ دہلی۔ (۳) شاکرہ خاتون۔ دہلی۔ (۴) ممتاز احمد۔ ہسپورہ۔ (۵) محمد مسلم۔ کلکتہ۔ (۶) رفیع احمد۔ شاہدرہ (۷) صادق علی خاں۔ کانپور (۸) محمد خلیل انصاری۔ ہسپورہ

دوسرا انعام ایک غلطی پر ۲۴ اشخاص کو بحساب ۸ ر فی کس تقسیم کر دیا گیا۔

(۱) عشرت بانو۔ ہسپورہ۔ (۲) سیدہ قریشہ بیگم۔ جامعہ نگر (۳) مشتاق احمد۔ سیوگنج۔ (۴) اختر حسین۔ گیا (۵) ابوالبرکات راہی۔ نگھوپوم۔ (۶) شہاب الدین۔ ضلع گیا۔ (۷) حامد الٰہی۔ ٹانڈہ (۸) صفیہ خاتون۔ سوراج گڈھ (۹) تہذیب جہاں بیگم سکھر۔ (۱۰) فرزانہ سلطان۔ گیا (۱۱) شریقیہ بیگم۔ جودھپور (۱۲) امینہ بیگم۔ جودھپور (۱۳) تمیزہ بیگم۔ جودھپور (۱۴) محمد عبدالسلام۔ ضلع بیدر (۱۵) محمد بتول احمد۔ ضلع بیدر (۱۶) شمس فریدی گیسلائی (۱۷) محمد سراج الدین احمد۔ پٹنہ (۱۸) محمد داؤد انصاری۔ ردھرپور (۱۹) طاہرہ بانو۔ میسور سٹی (۲۰) سعیدہ سعد۔ جامعہ نگر (۲۱) فضل کریم بتیا۔ (۲۲) رشیدہ خاتون۔ پٹنہ (۲۳) اہر علی غلام۔ شیوپور۔ کلاں۔

صحیح حل پیامی معمہ نمبر ۲۲

دائیں سے بائیں

(۱) پیام (۴) نامہ (۶) راج (۷) لعنت (۸) بری۔

اوپر سے نیچے

(۱) پچاس۔ (۲) مشکل۔ (۳) عمل۔ (۵) محنت

*معمہ نمبر ۲۱ کا صحیح حل اپریل کے شمارہ میں غلط چھپ گیا تھا۔ ادارہ اپنی اس غلطی پر نادم ہے۔

ایڈیٹر پیامی معمہ

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔ ـ ـ

۵۴ روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ فی حل ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں اور پانچ حلوں کی فیس ۴ آنے۔

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۳۰ روپے دوسرا انعام ایک غلطی پر ۱۵ روپے

حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۵ر مئی ۵۳ء

پیامی معمہ نمبر ۲۳

ی	ن	ا	ث	س	ش	ا	پ
	ا	م	ر	ے	ا	م	چ
	ن			ے		ی	
	ا	ر			ل		س
	ل			ے			

دائیں سے بائیں

(۱) ـ ـ ـ بچے مکتبہ شاہد کراچی کو مبلغ چار روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر پیام تعلیم کے سالانہ خریدار بن سکتے ہیں

(۳) دوسروں کی زبانی اپنی کمزوریاں سن کر ـ ـ ـ جاتا اچھا نہیں۔ (شرما۔ گرما)

(۵) کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے ـ ـ ـ کو کبھی نہیں بھولتے۔ (دشمن۔ بچپن)

(۶) اپنی طاقت کے نشے میں دشمن کو ـ ـ ـ سمجھنا عقلمندی نہیں۔ (ڈگرا۔ ڈرا)

(۷) کسی مصیبت کی پرواہ کئے بغیر اپنا کام کرنے والا ـ ـ ـ یہی کہلائے گا۔ (عاقل۔ غافل)

اوپر سے نیچے

(۱) پیامی معمہ نمبر ۲۵ کا انعام پچاس روپے ہوگا۔

(۲) اسکا سہارا زیادہ تر دھوکا ہی ہوتا ہے (امید۔ امیر)

(۴) ـ ـ ـ آدمی دوسرے کے کہے کی پرواہ نہیں کرتے (کاس۔ کاہل)

(۵) ایسا پیڑ ہرگز مت ـ ـ ـ کہ جس کا پھل اچھا نہ ملے (بودو)

ٹوکن پیامی معمہ نمبر ۲۳

نام ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

پتہ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

ٹوکن پیامی معمہ نمبر ۲۴

نام ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

پتہ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

پرنٹر پبلشر حامد علی خاں		پتہ: پیامی معمہ ۲۳۔ ماہنامہ پیام تعلیم جامعہ نگر دہلی، مطبوعہ چکرورتی پریس۔ دہلی



بچے اپنے خیمے سجا رہے ہیں



بچے کھیل رہے ہیں

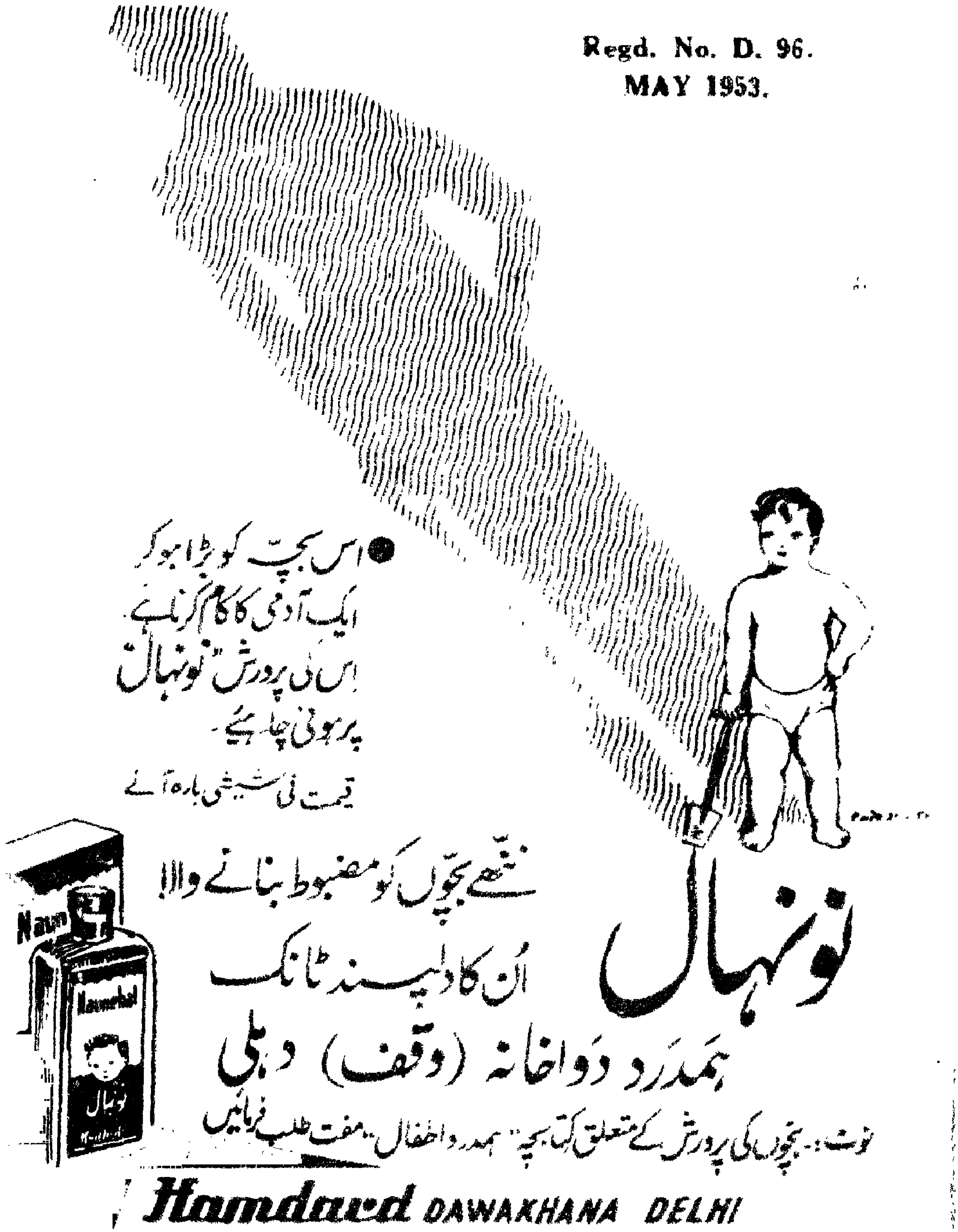


آخری دن کے مظاہرے کا ایک منظر



واپسی کی تیاریاں ہو رہی ہیں

Regd. No. D. 96.
MAY 1953.

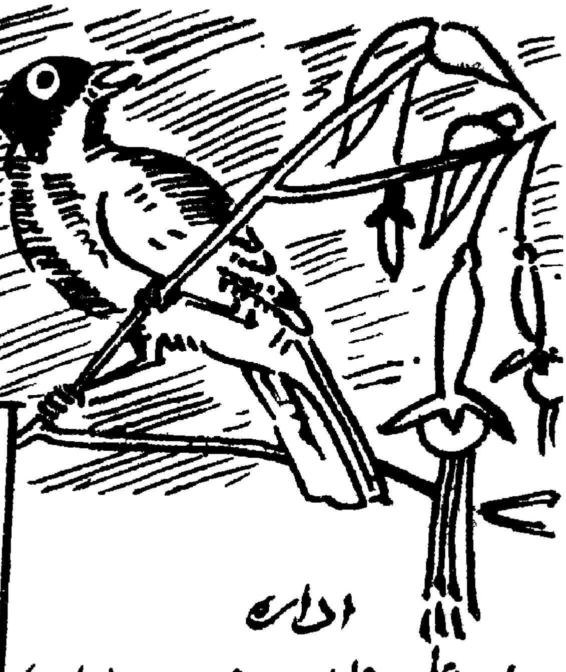



ادارہ
حامد علی خاں



پیام تعلیم

جون ۵۳ء



فہرست

ادارہ

حامد علی خاں بی۔ اے (جامعہ)

اطہر پرویز ایم۔ اے (علیگ)

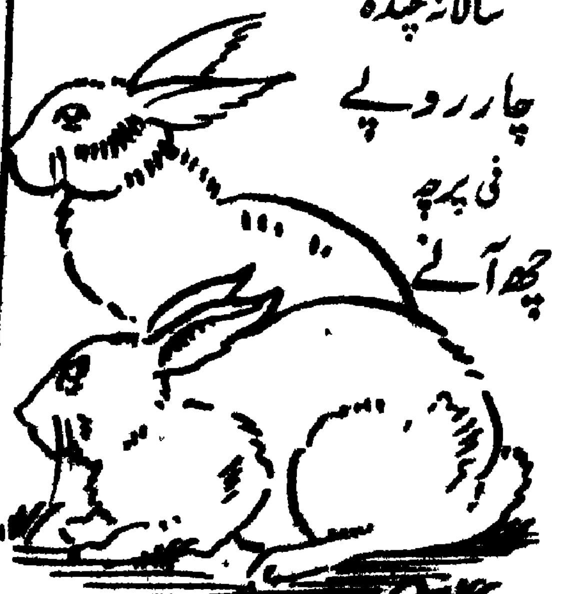
آرٹسٹ: گلیڈون میبی

سالانہ چندہ

چار روپے

فی پرچہ

چھ آنے



جامعہ ملیہ دہلی



بچوں سے باتیں

آئیے آپ کو ایک خوشخبری سنائیں ۔ ماؤنٹ ایورسٹ کا نام تو آپ نے سنا ہوگا۔ یہ ہمالیہ کی وہ مشہور چوٹی ہے جو دنیا کے تمام پہاڑوں سے اونچی ہے کتنے دن سے آدمی اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ کئی ناکامیاں ہوئیں مگر انسان نے ہمت نہ ہاری۔ اس بار انگلستان کے کرنل ہنٹ کی رہنمائی میں پھر کچھ لوگ ایورسٹ پر چڑھنے کے لئے روانہ ہوئے ۔ کرنل ہنٹ پہاڑ پر چڑھنے کے ہنر میں خوب ماہر ہیں۔ آخر ۳۰ مئی ۵۳ء کو یہ اپنے اس بڑے مقصد میں کامیاب ہوئے اور اس چوٹی کو سر کرکے رہے۔

ایورسٹ کی اونچائی سطح سمندر سے ۲۹۱۴۰ فٹ ہے۔

آج کل جامعہ میں ہر طرف سناٹا ہے اور کیوں نہ ہو ۔ رونق تو بچوں سے ہوتی ہے ۔ جب بچے ہی نہ ہوں تو رونق کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے ۔

بچے تو چھٹیاں گذارنے اپنے اپنے گھر چلے گئے ہیں۔ بس کچھ دفتر ہیں جو کھلے ہوئے ہیں۔ اس لبستی میں اکا دکا کوئی چلتا پھرتا نظر آجاتا ہے۔ مگر کام کب رکتا ہے۔ ان دنوں داخلوں کا زور ہے۔ اگر آپ یہاں داخلہ لینا چاہیں تو ابھی وقت ہے۔ آپ نے پچھلے دنوں پیام تعلیم کے ذریعے مدرسہ ابتدائی کے بچوں کی دلچسپیاں، ان کی تعلیمی و تفریحی سرگرمیوں کا حال پڑھا ہوگا۔ اگر آپ بھی اس مزیدار اور دلچسپ تعلیمی زندگی میں حصہ لینا چاہیں تو اپنے داخلے کی درخواست مدرسہ ابتدائی کو بھجوا دیجئے۔

آپ کو یہ دیکھ کر خوشی ہوگی کہ آپ کے پسندیدہ شاعر اور ادیب جناب حامد اللہ صاحب افسر نے خاص طور پر آپ کے لئے ایک مضمون لکھ کر بھیجا ہے اور یہی نہیں بلکہ انھوں نے ہم سے یہ بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ مستقل طور پر پیام تعلیم کے لئے کہانیاں اور مضامین لکھتے رہیں گے۔

آپ کی عرصے سے خواہش تھی کہ پیام تعلیم میں تصویروں والی کہانی بھی دی جائے۔ لیجئے اس طرح کی کہانی چھپ رہی ہے۔ دیکھیں اسے پڑھ کر آپ اپنی ہنسی کیسے ضبط کرتے ہیں۔

اس مہینے میں کوریا کی لڑائی شروع ہوئے تین سال ہو جائیں گے۔ آج کل کوریا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا حال تو آپ اخباروں میں پڑھتے ہوں گے۔ لیکن اس پرچے میں آپ کو کوریا کے پرانے باشندوں کا حال ملے گا۔ اُن کے شادی بیاہ کی دل چسپ رسمیں، ان کا رہن سہن، ان کے رسم و رواج ــــ یہ سب کچھ اتنا دلچسپ ہے کہ آپ بڑے شوق سے پڑھیں گے۔

حامد اللہ افسر

کلیوں کی چوری

بیلا ہے ان میں ، چنبیلی ہے ان میں   مہندی ہے چنپا ہے ، جوہی ہے ان میں
اور موتیا ہے ، اور ساونی ہے   یہ دیکھو شب کی رانی ہے ان میں
جیسے آتی ہو جھولی مالن بھرے
میں نے توڑ توڑ کلیاں دامن بھرے

۲

کل کُل کے آنکھیں ، تاروں نے دیکھا   اِک ساتھ اتنے ستاروں نے دیکھا
پودوں نے دیکھا ، پتّوں نے دیکھا   سارے چمن کے خاروں نے دیکھا
جیسے آتی ہو جھولی مالن بھرے
میں نے توڑ توڑ کلیاں دامن بھرے

۳

اور چاند نے بھی بدلی سے جھانکا   بدلا ہوا تھا نقشہ یہاں کا
شاخوں کے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا   سب لُٹ چکا تھا دھن گلستاں کا
جیسے آتی ہو جھولی مالن بھرے
میں نے توڑ توڑ کلیاں دامن بھرے



کتّے کی کہانی



اچھا تو بچو تم کتّے کو کرتب سکھا رہے ہو۔
جی ہاں — لیکن ہمارا کتّا بڑا ہوشیار ہے۔
وہ چیزیں ادھر سے اُدھر
لے جاتا ہے۔



ارے بھائی چیزیں ادھر سے اُدھر
لے جانا کوئی بڑی بات نہیں
ہے۔ ہر ایک کتّا ایسا کر سکتا ہے

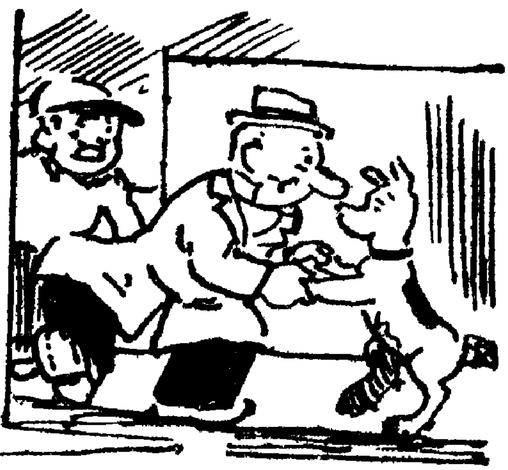


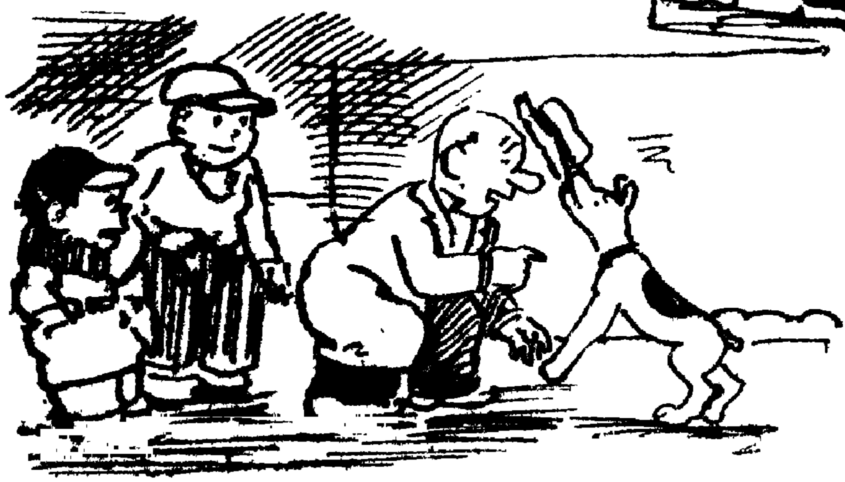
میرے پاس پہلے ایک کتّا پلا تھا۔ میں نے
اس کو خوب ناچنا سکھایا تھا۔



لاؤ اسے بھی ناچنا سکھادوں۔
ہاں پپی! ایک۔
دو۔
تین۔

دیکھو میرے قدم ایسے اٹھتے ہیں۔

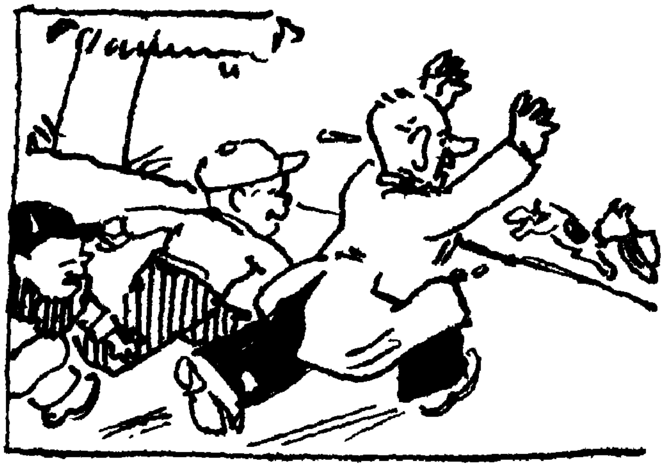




ہاں اب ناچ کے تو دکھاؤ ——
ارے رے



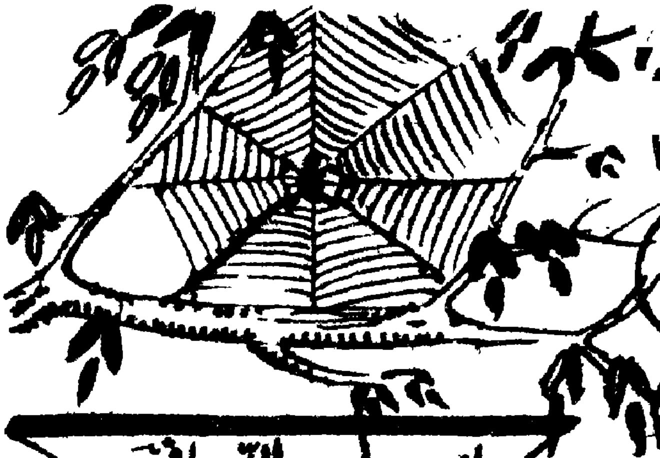
یہ کیا کیا ——
اِدھر لاؤ میرا ہیٹ ——
بیوقوف، گستاخ۔
جلدی لاؤ ——
نئی ہیٹ ہے خراب
ہو جائے گی۔



ارے اس کو بلانے سے
کوئی فائدہ نہیں ——
اب وہ واپس نہیں آئے گا۔
آپ خواہ مخواہ چلّا رہے ہیں۔



بچو! اب بتاؤ کیا کروں۔ میں
نے یہ ہیٹ چالیس روپے میں
خریدا تھا۔
لیکن غلطی تو آپ ہی کی ہے۔ آپ
نے اس کے کرتب کو کوئی
اہمیت نہیں دی۔



مکڑی کا جالا

از حامد اللہ افسر

میں باغیچے کے پاس بیٹھا ہوا سوچ ہی رہا تھا کہ "پیام تعلیم" کے لیے کس موضوع پر مضمون لکھوں کہ مکڑی کے جالے نے میری نظر اپنی طرف کھینچی، یہ جالا پھولوں کے ایک پودے سے دوسرے پودے تک پھیلا ہوا تھا، صبح کا وقت تھا اوس کے چھوٹے چھوٹے قطروں نے جالے کے تار میں چمکتے ہوئے موتی پرو دیے تھے، درخت کا ایک پتہ اوپر سے ٹوٹ کر گرا اور جالے میں اُلجھ گیا، مکڑی خدا جانے کہاں سے دوڑی ہوئی آئی، ایک تار سے دوسرے پر اور دوسرے سے تیسرے پر گئی اور ہوتے ہوتے اس پھنسے ہوئے پتے تک پہنچ گئی۔ اِدھر اُدھر سے جالے کو کاٹا اور پتے کو جالے سے نکال کر نیچے گرا دیا پھر جلدی جلدی تاروں کو جوڑا اور غائب ہو گئی۔

یہ حیرت ناک بہت سی ٹانگوں والا کیڑا اسی خاندان سے ہے جس میں بچھو وغیرہ شامل ہیں اور جسے ارکنید (Arachnid) کہتے ہیں، یہ دُنیا کا سب سے پہلا ہوا باز ہے، سب سے پہلا فضائی انجینیر ہے، سب سے پہلا معمار ہے، سب سے پہلا کاتنے اور بُننے والا ہے۔

مکڑی کے غدودوں سے ایک لیسدار مادہ نکلتا ہے، یہی مادہ ہوا کی مدد سے جالے کا تار بن جاتا

ہے۔ جو فولاد سے بھی زیادہ مضبوط ہوتا ہے، یعنی اگر فولاد کا اتنا ہی باریک تار کھینچا جائے، جتنا باریک مکڑی کا جالا ہوتا ہے مثلاً ایک انچ کا ۱/۱۰۰ تو وہ ہرگز اتنا مضبوط نہیں ہوگا، یہ تار بڑھتا ہے اور بڑھتا ہے، ہوا میں اُڑتا ہے اور سامنے کسی آگے کو نکلی ہوئی چیز پر چپک جاتا ہے اور پھر اس مضبوط رسّی کے اس قدرتی پل پر مکڑی ایک نئی دُنیا فتح کرنے کے لئے چل پڑتی ہے۔

یہ تو بڑی مکڑی کا ذکر تھا، مکڑی کے بچوں کا حال سنیے گا تو حیرت میں رہ جایئے گا وہ تو کمال ہی کر دیتے ہیں۔ مکڑی انڈے سیتی ہے اور جب بچے نکلتے ہیں تو ان کو اپنے ساتھ لئے لئے پھرتی ہے، اپنی کمر پر سوار کر لیتی ہے ہر طرح ان کی حفاظت کرتی ہے، ان کی دیکھ بھال کرتی ہے، مگر آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ مکڑی اپنے بچوں کو کچھ کھلاتی پلاتی نہیں اور نہ وہ خود کچھ کھاتے پیتے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا وہ کیونکر زندہ رہتے ہیں۔ صرف زندہ ہی نہیں رہتے بلکہ پلتے بڑھتے رہتے ہیں، اور کھیلتے کودتے رہتے ہیں، یہ ایک ایسا راز ہے جو آج تک کسی سے نہ کھل سکا۔

آخر ان کے بچپن کا زمانہ ختم ہوتا ہے اور ماں انھیں کمر سے اُتار کر آزاد چھوڑ دیتی ہے، اگر وہ اس کے پاس سے جانے میں ہچکچاتے ہیں تو وہ انھیں کھا جاتی ہے۔ اُس وقت وہ خود ہی اپنی ماں سے گھبرانے لگتے ہیں اور اس سے دور بھاگتے ہیں، جو کل تک ماں تھی وہی آج ان کی سب سے بڑی دُشمن ہوتی ہے، اب وہ کسی درخت یا دیوار یا جھاڑی پر چڑھ جاتے ہیں اور اپنا جالا تننا شروع کر دیتے ہیں، اس کے تار ان کے چھوٹے چھوٹے جسموں سے دور ہوا میں تیرتے ہیں، مکڑی کے بچے بغیر انجن کے ہوا باز، بغیر گیس کے زندہ غبارے، ان تاروں پر جھولتے ہیں اور خلا کو پار کر کے اس طرف سے اُس طرف پہنچتے ہیں۔

مکڑی اپنا سارا جالا تقریباً ایک گھنٹہ میں تان لیتی ہے، جالا بنانا شروع کرتے وقت وہ ایک بے ضرر سیلانی ہوتی ہے اور جب جالا تیار ہو جاتا ہے تو ایک ہوا میں لٹکی ہوئی ریاست کی۔ ایک گھڑی، ایک محفوظ قلعہ کی اور ایک جال کی مالک ہوتی ہے۔

جالا تاننے کا کام شروع کرنے کے لئے اس کو صرف کسی درخت یا پودے کی ایک شاخ کی ضرورت ہوتی ہے وہاں سے وہ جالے کا تار ہوا میں اُڑا دیتی ہے تاکہ دوسری طرف کسی دوسری شاخ یا دیوار

میں جا کر اس کا سرا چپک جائے یا پھر خود ہی اپنے تار پر اُتر آتی ہے اور اس کے سرے کو کسی چیز سے چپکا دیتی ہے، اس طرح اوپر اور نیچے کے تار قائم کر کے دائرے کی صورت میں جال سا بنا لیتی ہے، اسکے بعد وہ شعاعی خطوط بناتی ہے جو پہیئے کے ڈنڈوں کی طرح سب کے سب بیچ کے نقطے سے گزرتے ہیں۔ پھر دفعۃً جب وہ مرکز سے گزرتی ہے تو اس کو نئے تاروں کی مدد سے زیادہ مضبوط بناتی جاتی ہے یہ تار چپچپے اور لسدار نہیں ہوتے، مکڑی بار بار اپنے اس ڈھانچے کے ہر تار پر سے گزرتی ہے اور ہر جوڑ کو مضبوط بناتی جاتی ہے۔ ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں جوڑ ہوتے ہیں۔

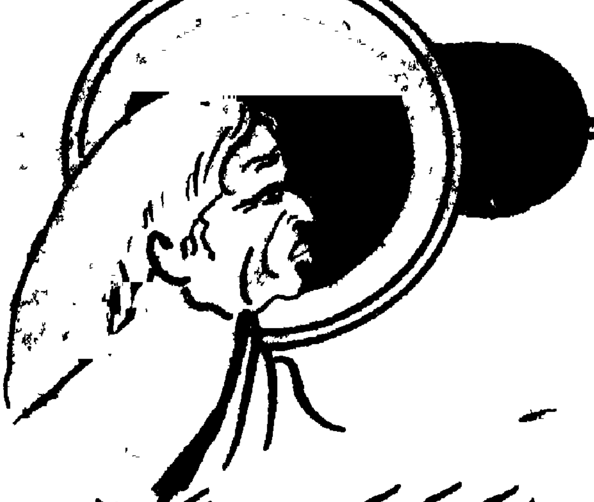
جالے کا وہ حصہ جو مکھیوں اور دوسرے کیڑوں کو پھنسانے کا کام کرتا ہے لسدار ہوتا ہے، اصل میں مکڑی کے پیٹ میں کم سے کم تین غدود ضرور ہوتے ہیں اور بعض مکڑیوں کے تو سات سات غدود ہوتے ہیں، اور ہر غدود سے مختلف قسم کا لعاب نکلتا ہے، جالے کا ایک حصہ ایسا ہوتا ہے جس کے تار چکنے اور صاف ہوتے ہیں، اور ایک حصہ چپچپا اور لسدار ہوتا ہے جو کیڑوں کو پھنسا لیتا ہے، اس لسدار حصے میں مکھیاں اور طرح طرح کے کیڑے آکر پھنس جاتے ہیں۔ مکڑی کی نظر بہت کمزور ہوتی ہے وہ اچھی طرح نہیں دیکھ سکتی، جیسے ہی کوئی کیڑا جالے میں پھنستا ہے تار میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور مکڑی فوراً دوڑ کر پہنچ جاتی ہے، اگر شکار، مکھی ہے تو وہ اسکی گردن میں اس زور سے کاٹتی ہے کہ بے چاری وہیں مر کر رہ جاتی ہے۔ یا تو اسی وقت اس کو چوس ڈالتی ہے یا اگر اس وقت بھوک نہ ہو تو اس کے چاروں طرف جالا تان دیتی ہے اور گویا اس کو کسی دوسرے وقت کھانے کے لئے ٹانگ دیتی ہے۔

لیکن اگر کوئی بھڑ یا اور کوئی اسی قسم کا ڈنک دار کیڑا جالے میں پھنس جاتا ہے تو وہ بہت احتیاط سے کام لیتی ہے کیونکہ بھڑ اُسے آسانی سے مار ڈالتی ہے، بھڑ کے پھنستے ہی وہ بہت دور کہیں آڑ میں پہنچ جاتی ہے اور موقع دیکھ کر آہستہ آہستہ پہلو بچاتی ہوئی، آگے بڑھتی ہے اور اسی طرح بڑھتے ہوئے، جالا تان تان کر اس کو پھنساتی رہتی ہے، اور ہوتے ہوتے اُس کے پر، اس کی ٹانگیں، اس کے سر اور اس کے ڈنک سب کو اپنے لعاب کے تاروں سے جکڑ لیتی ہے اور جب ہر طرح اطمینان ہو جاتا ہے تو اس کے پاس پہنچ کر اُسے اپنی خوراک بناتی ہے۔

مکڑی کے جالے کا تار ریشم کے تار سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ سُنتے ہیں کہ میڈا گاسکر (Madagascar) میں مکڑی کے لعاب سے بنے ہوئے تار سے کپڑا بُنتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں نے بہت سی مکڑیاں پال رکھی ہیں اُن سے تار حاصل کرکے دھاگا بناتے ہیں اور اس دھاگے سے کپڑا بُنتے ہیں۔

مکڑی زہریلی ضرور ہوتی ہے مگر اس کا زہر انسان کے لئے مہلک نہیں ہوتا، بعض لوگ مکڑی سے بہت ڈرتے ہیں۔ یوں ڈرنے کو تو آپ چاہے جس چیز سے ڈرنے لگیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ طرح طرح کی مہلک بیماریوں کے جراثیم آپ کی خوراک میں یا آپ کے زخموں پر جمع کرنے والی مکھی، مکڑی سے کہیں زیادہ خطرناک اور ڈرانے والی چیز ہے، خدا کا شکر کیجئے، کہ اس نے مکڑی کو آپ کا دوست بنا کر بھیجا ہے جو مکھیوں کو نیست و نابود کرتی رہتی ہے اور آپ کو بہت سی بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

سیّد منیر الحسن



نانی کی سالگرہ

چیکوسلواکیا کی ایک قدیم کہانی

کہتے ہیں کہ ایک گاؤں میں ایک چھوٹی سی لڑکی اپنی ماں کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ سب لوگ اُسے لال ٹوپی والی کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک دن لڑکی کی ماں نے خوش خبری سُنائی کہ آج تمھاری نانی کی سال گرہ ہے۔ یہ سُن کر لڑکی بہت خوش ہوئی اور اپنی ماں سے کہنے لگی "تو پھر اب کیا ہوگا؟" ماں نے جواب دیا —— "تم مٹھائی لے کر ان کو سال گرہ کی مبارکباد دینے جانا۔ میرا سلام کہنا اور انھیں پیار کرنا۔" پھر ماں نے لڑکی کو نہلایا دُھلایا، اُجلے اُجلے دُھلے ہوئے، صاف ستھرے کپڑے پہنائے اور ہاتھ میں مٹھائی کا ایک تھیلا دے دیا۔ جس کو لے کر وہ لڑکی اپنی نانی کے گھر چل دی۔

نانی کا گھر دور جنگل میں تھا۔ اس لڑکی کو اپنی نانی کے گھر اسی جنگل میں سے جانا تھا۔ چنانچہ جب وہ لڑکی اس جنگل میں پہونچی تو اُسے راستے میں ایک بھیڑیا ملا۔ اس نے لڑکی سے پوچھا کہاں جارہی ہو۔ لڑکی نے جواب دیا اپنی نانی کے یہاں سال گرہ کی مبارکباد دینے۔ اور یہ دیکھو ان کو دینے کے لیے مٹھائی بھی لیے جارہی ہوں۔ بھیڑیے نے مٹھائی کا جو نام سُنا تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ مگر کچھ کہا نہیں بلکہ چپ ہو رہا۔ مگر پھر تھوڑی دیر کے بعد بولا "اس جنگل سے ان کے لیے پھولوں کا

تم بھی تو لیتی جاؤ۔ صرف مٹھائی سے ہی کیا کام بنے گا۔ لڑکی کو بھیڑیے کی یہ تجویز پسند آئی۔ چنانچہ وہ اپنی نانی کے لئے پھول توڑنے لگی۔ ادھر بھیڑیے نے لڑکی کی آنکھ بچا نانی کی جھونپڑی کی راہ لی۔

جب بھیڑیا جھونپڑی کے دروازے پر پہنچا تو مہین سی آواز بنا کر بولا "نانی! نانی! آپ گھر میں ہیں ؟" نانی نے اندر سے جواب دیا "کون ہے؟" بھیڑیا بولا "میں ہوں لال ٹوپی والی" نانی نے کہا "میں بیمار ہوں اس لئے دروازہ نہیں کھول سکتی۔ تم دروازے کی رسّی کھینچ لو۔ اس طرح وہ کھل جائیگا" بھیڑیے نے ایسا ہی کیا اور دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ جھونپڑی میں گھسا اور لاچار بوڑھی نانی کو جھپٹّا مار کر کھا گیا۔ بعد میں اس کے کپڑے پہن کر خود چارپائی پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ لال ٹوپی والی لڑکی بھی وہاں آگئی اور جھونپڑی کے سامنے پہنچ کر نانی کو آواز دی۔ بھیڑیے نے بوڑھی نانی کی طرح آواز بنا کر کہا "میں بیمار ہوں اس وجہ سے میں خود دروازہ نہیں کھول سکتی۔ تم اس کی رسّی کھینچ لو یہ کھل جائیگا" لڑکی نے ایسا ہی کیا اور دروازہ کھل گیا۔

جھونپڑی کے اندر جب لڑکی پہنچی تو اس نے کہا "لیکن نانی آپ کی آنکھیں اتنی بڑی بڑی کیوں ہیں" بھیڑیے نے جواب دیا "زیادہ دیکھنے کیلئے" "اور یہ کا منہ اتنا چوڑا اور لمبا کیوں ہے" بھیڑیے نے کہا "تجھے کھانے کیلئے" اتنا کہکر بھیڑیا اس لال ٹوپی والی لڑکی پر جھپٹا اور اُسے کھا گیا۔ اب بھیڑیے کا پیٹ خوب بھر چکا تھا اور اُسے اب کچھ نیند بھی آنے لگی تھی چنانچہ وہ چارپائی پر پڑ کر سو گیا۔

کچھ دیر بعد جنگل کا رکھوالا اُس جگہ پر آیا اُس نے سوچا لال ٹوپی والی کی نانی بیمار ہے ذرا چل کر اُسے دیکھنا چاہیے کہ اب اُس کا کیا حال ہے اور کیسی طبیعت ہے جب جنگل کا رکھوالا جھونپڑی کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ جھونپڑی کے اندر جو آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ میاں بھیڑیے مزے میں خراٹے لے رہے ہیں اور گہری نیند کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ جنگل کا رکھوالا سب کچھ سمجھ گیا کہ اس مردود نے نانی کو کھا لیا ہے اور اب یہاں پڑا ہوا سو رہا ہے جنگل کے رکھوالے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً ہی اپنی کٹار سے بھیڑیے کی توند چیر دی۔ توند کا چیرنا تھا کہ بھیڑیے کے پیٹ سے پہلے لال ٹوپی والی نکلی اور پھر اسکی نانی یہ دیکھکر جنگل کے رکھوالے کو بڑا تعجب ہوا۔ مگر نانی اور لال ٹوپی والی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور اس طرح دوبارہ زندگی پانے پر بوڑھی نانی نے اپنی سال گرہ بڑی خوشی سے منائی۔

حبیب احمد

کوریا کے پُرانے رسم ورواج

کوریا کا ذکر تو آپ روزانہ اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ یہ وہ بدنصیب مُلک ہے جو تین سال سے جنگ اور مار دھاڑ کا شکار ہے۔ لیکن اس وقت ہم جنگ کی کہانی نہیں لکھ رہے ہیں بلکہ ان لوگوں کا حال جو اس دیس میں رہتے تھے۔ ان کے رہن سہن کے طریقے، ان کے رسم ورواج، جن کو پڑھ کر آپ بھی دنگ رہ جائینگے۔

کوریا ایشیا کے بالکل مشرقی حصے میں ہے۔ اگر آپ نقشہ دیکھیں تو مشرقی ایشیا میں ایک حصہ آپ کو جاپان کی طرف نکلتا ہوا دکھائی دے گا۔ بس یہی کوریا ہے۔

کوریا کا سب سے بڑا شہر سیول ہے۔ پُرانے زمانے میں منگول حملہ آوروں سے بچنے کے لئے یہاں شہر کے چاروں طرف ایک دیوار بنائی گئی تھی۔ اس شہر پناہ میں ۸ دروازے تھے جو شام کے وقت بند کر دیئے جاتے تھے۔ اس وقت ایک گھنٹا بجتا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ سب خیریت ہے۔ سیول کے ایک بڑے حصے میں بادشاہ کا محل تھا، جس کے اِرد گِرد امرار کے محلات تھے۔ باقی شہر میں چھوٹے چھوٹے مکانات۔ کوئی مکان بادشاہ کے مکان سے اونچا نہ ہوسکتا تھا اور نہ کوئی شخص دو منزلہ مکان بنا سکتا تھا۔

کوریا کے لوگ عام طور پر توہم پرست ہوتے تھے۔ چنانچہ جب کسی مکان میں آگ لگ جاتی تو

یہ لوگ اُسے کبھی نہ بجھاتے۔ محض اس لئے کہ یہ آگ بھوت پریت کی لگائی ہوئی ہے۔ لہٰذا جب آگ لگ جاتی تو بدروحوں کو خوش کرنے کے لئے خوب باجا بجایا جاتا تھا۔

جب کسی کے چیچک نکلتی تو یہ لوگ علاج نہ کرتے بلکہ کسی جادوگر کو بُلاتے جو اپنے جادو کے زور سے اس بدروح کو قابو میں لاتا۔ اس طرح مریض کے سامنے خوب باجا بجایا جاتا۔ دوا اس لئے استعمال نہ کرتے تھے کیونکہ اس سے اگر وہ بھوت ناراض ہوجاتا تو پھر یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں وہ غصہ میں اس آدمی کی جان نہ لے لے۔

جب امیروں میں سے کوئی باہر نکلتا تو وہ خچر پر سوار ہوتا۔ خچر کے دائیں بائیں دو آدمی امیر کو پکڑ کر چلتے۔ ایک آدمی کے ہاتھ میں چھتری ہوتی آگے آگے وہ لوگ جو راہگیروں کو ہٹاتے چلتے۔ اگر کوئی آدمی امیر کو سلام نہ کرتا تو اس کی خوب پٹائی ہوتی۔ جب کسی امیر کے یہاں کوئی لڑکا پیدا ہوتا تو وہ بادشاہ سے اجازت لے کر کسی سڑک یا کسی محلے میں ٹیکس لگا دیتا اور اس طرح اس کا لڑکا اس ٹیکس کی بدولت امیرانہ زندگی گذارتا۔

ملک میں بہت سے قبیلے تھے۔ اور یہ قبیلے داری زندگی آج تک ہے۔ ان قبیلوں میں یہ دستور تھا کہ جب کسی قبیلے کا کوئی سردار بے اولاد مر جاتا تو قبیلے کے دوسرے لوگوں کو یہ حق ہوتا کہ وہ سردار کی جگہ لینے کے لئے کسی شخص کو بھی اس کی اولاد بنا دیتے اور اس طرح وہ سردار ہو جاتا۔

آئیے اب آپ کو کوریا کے مکانوں کا کچھ حال سُنائیں۔ کوریا کے لوگ بڑے عجیب و غریب قسم کے انسان ہیں۔ یہ لوگ اپنے مکان اس طرح بناتے ہیں کہ دالان میں آگ کے لئے ایک بڑا چولھا ہوتا ہے اور چولھے سے بہت سی نالیاں نکالتے ہیں جو کمروں کے اندر سے گذرتی ہیں۔ چنانچہ جب آگ جلتی ہے تو سارا گھر اندر سے گرم ہو جاتا ہے۔ کوریا کے بعض شہروں اور گاؤں میں یہ طریقہ آج بھی رائج ہے۔

یہ تو خیر ان کے مکانوں کا حال تھا لیکن اگر یہ لوگ کپڑے پہنتے تھے تو عمر کا خاص طور پر لحاظ رکھتے تھے۔ مختلف عمر کے لوگ مختلف کپڑے پہنتے تھے۔ یہ لوگ رسم و رواج کی بڑی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ ان کے یہاں رسموں پر موٹی موٹی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ کوریا کی شادی کی رسمیں ہمارے یہاں کی رسموں سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ بیاہ شادی کا دن جادوگر کی مرضی سے طے ہوتا۔ ماں باپ کی مرضی کے

بغیر کوئی شادی نہ ہو سکتی۔ جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی تو اسے تین دن ایک الگ کمرے میں رکھا جاتا۔ اس کے بعد دولہا کو دولہن کے یہاں لے جاتے۔ دولہن کی آنکھ پر دن بھر کے لئے پٹی باندھ دی جاتی۔

شادی کے بعد دولہا دلہن کو ایک ہنس تحفے کے طور پر دیتا اور دلہن، دولہا کو ایک ہنس پیش کرتی جو ان کے گھر پر رہتا۔ اگر اس جوڑے میں سے کوئی بھی ہنس مر جاتا تو دوسرا ہنس زندگی بھر اکیلا رہتا۔

آئیے اب ہم آپ کو کوریا کے کچھ دلچسپ واقعات اور بتائیں۔ جب شروع شروع میں بجلی کی ٹرامیں چلیں تو لوگوں نے اس کی بڑی مخالفت کی اور اس سلسلے میں بعض بڑے دلچسپ واقعات ہوئے۔ ایک بار ایک لڑکا ٹرام سے دب کر مر گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ لوگ اتنے ناراض ہوئے کہ اگر بادشاہ بیچ میں نہ پڑ جاتے تو لوگ پٹریاں اکھاڑ کر پھینک دیتے۔

ایک بار ایک شخص نے بادشاہ سے اپیل کی کہ یہ ٹرامیں ان کو سونے نہیں دیتیں۔ جب گزرتی ہیں تو ڈرائیور ان کو روک کر ان کو جگا دیتا ہے۔ اس طرح ان کی نیند میں خلل پڑتا ہے۔

اس لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ جب اس طرح کوئی آدمی سوتا ہو تو اس وقت وہ ٹرام کھڑی رہے جب تک کہ وہ آدمی جاگ نہ جائے۔ مگر بیچارے کی یہ غرض منظور نہ ہو سکی۔

کوریا میں پہلے عورتیں پردہ کرتی تھیں مگر مغربی تہذیب کے آنے کے بعد وہاں پردے کا رواج کم ہو گیا۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں جاپانیوں کے خلاف آزادی کی تحریک میں عورتوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اور آج بھی کوریا کی عورتیں مردوں کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر لڑائی کی آگ بجھانے میں لگی ہوئی ہیں۔

اسمٰعیل سعد

نیکی کا پھل

ایک دن ایک آدمی سفر پر جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے بہت سے بچوں کو شور مچاتے دیکھا اس نے رک کر ان سے پوچھا "تم شور کیوں مچا رہے ہو؟" اُنھوں نے کہا "دیکھئے یہ ہمارے پاس چوہا ہے یہ کیسے رے میں کود پھاند رہا ہے" آدمی کو چوہے پر بڑا ترس آیا۔ اس لئے کہ وہ گھبرا گھبرا کر ادھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر بچے تھے کہ اُس کو کہیں جانے نہ دیتے تھے۔ اس نے سوچا۔ بے چارہ چوہا کتنا ڈر گیا ہے۔ چنانچہ اس نے بچوں سے کہا "دیکھو میں تمھیں پیسے دوں گا تم اس چوہے کو مجھے دے دو" بچوں نے خوشی خوشی چوہا اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے چوہے کو ایک میدان میں لے جا کر چھوڑ دیا۔

اب وہ پھر اپنے سفر پر چل پڑا۔ راستے میں اس نے کچھ اور لڑکوں کو دیکھا کہ جو ایک گدھے کو تنگ کر رہے تھے۔ اسے دو پیروں پر کھڑا کرواتے، یہاں تک کہ وہ بیچارہ گر پڑتا۔ اس آدمی کو گدھے پر بھی بڑا ترس آیا۔ اور اس نے پہلے کی طرح ان لڑکوں کو بھی کچھ پیسے دے کر گدھے کو اس مصیبت سے چھڑا دیا۔

اب وہ پھر اپنے راستے پر ہو لیا۔ مگر ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا ہوگا کہ اس کی نظر ایک ریچھ پر

پڑی۔ لوگ اسے نچارہے تھے۔ ریچھ بے چارہ بہت پریشان تھا مگر مرتا نہ تو کیا کرتا۔ کسی نہ کسی طرح ناچ رہا تھا۔ اس آدمی کو ریچھ پر بھی بہت رحم آیا۔ مگر اسکی جیب میں اب بچا ہی کیا تھا۔ پیسے تو پہلے ہی لڑکوں کو دے چکا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی انگوٹھی ان لوگوں کے حوالے کردی اور ریچھ کو اس مصیبت سے نجات دلوائی۔

لیکن اب وہ بالکل خالی ہاتھ تھا۔ جو کچھ تھا پہلے ہی ختم ہوگیا تھا۔ خیر وہ آگے چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ ایک آم کے باغ میں پہونچا۔ یہ باغ وہاں کے بادشاہ کا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ کیوں نہ کچھ آم توڑ کر کھاؤں۔ اس طرح کچھ دیر کے لئے بھوک ختم ہو ہی جائے گی۔ چنانچہ وہ باغ میں داخل ہوگیا اور وہاں اس نے کچھ آم توڑ کر کھانے شروع کردیئے۔ جب وہ کھا چکا تو باغ کے مالیوں کی نظر اس پر پڑگئی۔ وہ اسے پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے گئے۔ وہاں کا بادشاہ بڑا ظالم تھا۔ اس نے حکم دیا کہ "اس کو ایک بکس میں بند کرکے سمندر میں پھینک دو"۔ نوکروں نے ایک ڈبہ لیا۔ اس میں کچھ روٹی اور پانی رکھ کر اسے بند کردیا اور دور سمندر میں لے کر پھینک دیا۔

بکس لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ اسی لئے وہ پانی پر تیرتا رہا۔ آدمی نے بکس کے اوپر کھٹ کھٹ کی آواز سنی۔ ذرا سی دیر میں بکس میں ایک بڑا سوراخ ہوگیا۔ اس نے سوراخ سے جھانک کر دیکھا تو ننھا چوہا بکس پر بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد گدھا اور ریچھ آئے اور بکس کو کنارے پر لے گئے وہ اس بکس سے نکل آیا۔ اس نے دیکھا کہ ارے یہ تو وہی چوہا، گدھا اور ریچھ تھے جن کو اس نے پیسے اور انگوٹھی دے کر چھڑایا تھا۔



اس پر کیسی عجیب و غریب دھاریاں پڑی ہیں —

شاہد علی خاں

انگلستان کی ملکہ کی تاجپوشی



آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ انگلستان کی ملکہ الزبیتھ دوم کی تاجپوشی کی رسم ۲ر جون کو ادا کی جا رہی ہے۔ یہ جشن انگلستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لئے دنیا کے مختلف ملکوں کی حکومتوں کے نمائندے اس میں شرکت کے لئے گئے ہیں۔ ہمارے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو بھی اسی لئے لندن تشریف لے گئے ہیں۔ ابھی تک یہ اندازہ نہیں کیا جا سکا کہ اس میں کتنا روپیہ خرچ ہوگا تاہم اس سے پہلے کے جشن میں لاکھوں روپیہ پانی کی طرح بہایا گیا ہے۔ ابھی تک سب سے زیادہ رقم ملکہ وکٹوریہ کے لڑکے ایڈورڈ ہفتم کی تاجپوشی پر خرچ ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی تاجپوشی پر ۴۷ لاکھ روپیہ خرچ ہوا۔ لیکن ملکہ الزبیتھ کی تاجپوشی پر اس سے بھی زیادہ خرچ ہوگا۔

۲ر جون کو تاجپوشی کا جلوس بکنگھم محل سے نکل کر ویسٹ منسٹر ایبے جائے گا۔ جہاں تاجپوشی کی تمام رسمیں ادا کی جائیں گی۔

اس جشن میں شرکت کے لئے ملکہ کے لئے خاص طور پر پوشاک تیار کی گئی ہے جو اس وقت پہنی جائے گی۔ یوں تو یہ پوشاک خاص قسم کی بنی ہوتی ہے لیکن ملکہ الزبتھ نے اپنی مرضی سے اپنے لئے پوشاک تیار کرائی ہے۔ عورتوں کے استعمال کے لئے ایک پوشاک تھی جسے ملکہ وکٹوریہ نے پہنا تھا مگر اب وہ پرانے فیشن کی نظر آتی ہے۔ اس لئے ملکہ الزبتھ نے اپنی مرضی سے پوشاک تیار کرائی ہے۔ جس کو موتیوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ جشن ختم ہونے کے بعد یہ پوشاک لندن کے عجائب گھر میں رکھ دی جائے گی۔ جہاں پچھلے بادشاہوں کی پوشاکیں بھی رکھی ہیں جو انھوں نے اپنے تاجپوشی کے جشن میں پہنی تھیں۔

انگلستان کے بادشاہ تاجپوشی کے دن صرف چند منٹ کے لئے تاج پہنتے ہیں۔ اور اس کے بعد پھر اسے احتیاط سے ایک عمارت "لندن کے ٹاور" میں رکھ دیا جاتا ہے، جہاں تمام موتیوں اور جواہرات کی حفاظت کی جاتی ہے۔ برطانوی تاج کا وزن ڈھائی سیر ہے۔ ملکہ وکٹوریہ نے اس کے وزنی ہونے کی بناء پر اسے پہننے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ ان کے لئے خاص طور پر ایک تاج بنایا گیا تھا جس کا وزن ڈیڑھ سیر کا تھا۔ لیکن ملکہ الزبتھ دوم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اسی تاج کو پہنیں گی جس کو ان کے باپ دادا نے پہنا تھا۔ جس کا وزن ۲½ سیر ہے۔

یہ سونے کا تاج بڑے قیمتی پتھروں اور موتیوں سے آراستہ ہے۔ اسی میں کوہ نور بھی جڑا ہوا ہے جو دنیا کا سب سے خوبصورت اور قیمتی موتی ہے۔

تاج پوشی کی رسم ادا کرتے ہوئے کینٹربری کا بڑا پادری ملکہ کے سر پر بڑی آہستگی سے یہ تاج رکھے گا۔ اور

بقیہ صفحہ ۱۴۵ پر دیکھئے

آصفہ بیگم چشتی

چوری

ارشد اور صفیہ دونوں ایک ہی جماعت میں پڑھتے تھے۔ دونوں کے گھر بھی آمنے سامنے تھے۔ اس لئے ان میں خوب دوستی ہوگئی تھی۔ چھٹی ہوتی تو دن بھر دونوں باغ میں تتلیاں پکڑتے، سبزے پر دوڑتے پھرتے یا پھر آنکھ مچولی کھیلتے۔ وہ اسی طرح کھیلتے کودتے دن گذار رہے تھے کہ امتحان کے دن آگئے۔ اب وہ امتحان کے ڈر سے کھیل بھی نہ سکتے تھے جہاں ذرا دیر ہوتی کہ ارشد کے یہاں کا نوکر سلّو آپہنچتا "ارشی میاں صاحب بُلا رہے ہیں۔" یہ سُن کر ارشد کہتا "ہم آجائیں گے تم جاؤ" مگر سلّو بھلا کب ٹلنے والا تھا وہ آنکھیں مٹکا کر کہتا "نہیں جی ساتھ لانے کے لئے کہا ہے صاحب نے" "اچھا ہم نہیں جاتے" "اچھا تو کہتا ہوں صاحب سے جاکر" صفیہ بڑی سیدھی لڑکی تھی وہاں دونوں کا جھگڑا بڑھتا دیکھ کر ارشد کو سمجھانے کے انداز سے کہتی "اب کھیلیں گے، نہیں تو ابّا جی خفا ہوں گی۔" آخر ارشد کو جانا پڑتا۔

ارشد کے ابا جان یوں تو ارشد سے بہت محبت کرتے تھے مگر اپنے اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ اور ارشد بھی اُن سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ اسی اسکول میں استاد تھے جس میں

شد اور صفیہ پڑھتے تھے۔ وہ اس کے کلاس میں
رافیہ پڑھاتے تھے۔ ابّا جان کے گھنٹے میں وہ
ئی شرارت نہ کرتا اور کوئی کام ہو یا نہ ہو مگر
رافیہ کا کام وہ ضرور کر کے لاتا۔ حالانکہ مس ہیلن
ی سخت استانی تھیں مگر ان تک کے گھنٹے
ں بھی وہ شرارتوں سے باز نہیں آتا تھا۔

امتحان قریب تھے۔ صفیہ کی امّی نے دونوں
انعام دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس لئے وہ امتحان
ں اچھے نمبروں سے اور بھی پاس ہونا چاہتے تھے۔

ایک روز شام کو ارشد اور صفیہ کھیل رہے
تھے کہ صفیہ نے پوچھا "آج تمہارے ابّا جان کہیں
گئے ہیں؟"

ارشد نے کہا "ہاں ان کی دعوت ہے صفو
آج تم بھی نہ جانا ــــ ابّا جان کے دفتر میں چل کر
ذرا پرچے ڈھونڈیں گے شاید مل جائیں۔"

"کون سے پرچے" صفیہ چونک پڑی

"جغرافیہ کے"۔

"ہاں ہاں اور اگر مل گئے تو مزہ آجائیگا"
ارشد خوشی سے بولا۔

"مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ان کے کمرے
ں پرچے ہیں" صفیہ نے پوچھا۔

"اسکول میں مجھ سے روبی کہہ رہی تھی اور
وہ شام بھی کہتا تھا" ارشد نے کہا "ابّا جان تو
ہمیشہ ہی پرچے بناتے ہیں لیکن ہمیں معلوم
نہیں ہوتا تھا"

"تو پھر چلو کہیں ابّا جان نہ آجائیں" صفیہ
نے جلدی سے کہا۔

"ارے وہ نو بجے تک آئیں گے دعوت
میں گئے ہیں" ارشد نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور
وہ دونوں کھیل میں لگ گئے۔

جب خوب اندھیرا پھیل گیا تو ارشد
صفیہ کو ساتھ لے کر اندر پہونچا۔ انھیں دیکھ کر
ارشد کی امّاں نے کہا "آؤ ارشی کھانا کھالو اور
صفیہ کو بھی کھلالو پھر دونوں پڑھنا" صفیہ نے
ارشد کی طرف دیکھا۔ وہ بولا "آؤ جلدی سے
کھالیں" جلدی سے کھانا ختم کر کے دونوں ابّا
جان کے کمرے میں پہونچے اور کتابوں میں میز
پر ادھر ادھر ڈھونڈنے لگے۔ الماری میں ایک
صندوقچہ دیکھ کر ارشد نے کہا "شاید پرچے اسی میں
چھپے ہوں گے۔ اس کی کنجی دیکھو صفو" صفیہ نے
میز پر سے کنجی اٹھا کر کہا "یہ ہے"؟

"ہاں یہ ہی ہے آج جلدی میں ابّا جان

یہاں بھول گئے ہیں"

کنجی تو مل گئی مگر صندوقچہ کچھ عجیب قسم کا تھا اور ارشد نے اسے خود بھی پہلے کبھی نہ کھولا تھا۔ اس میں کئی قسم کی گھنڈیاں سی لگی ہوئی تھیں۔ کنجی لگا کر کسی کو دبانا اور کسی کو کھینچنا پڑتا تھا تب کہیں تالا کھلتا تھا اس نے پہلے خود کوشش کی اور پھر بولا "صفو تم چابی لگا کر گھماؤ میں گھنڈی کو دباتا ہوں۔ تھوڑی دیر کی محنت کے بعد تالا کھلا۔ ڈھکنا کھولا تو اس میں بہت سی اوپر نیچے درازیں تھیں۔ ان سب میں کاغذات رکھے تھے دونوں نے جلدی جلدی اُلٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا لیکن کسی کاغذ پر جغرافیہ کا ایک بھی سوال نظر نہ آیا۔ ارشد سوچ رہا تھا کہ کون سی جگہ اس سے زیادہ محفوظ ہوگی۔ جہاں ابا جان نے پرچے رکھے ہوں گے لسے یقین تھا کہ اسی میں ہوں گے۔ اِدھر اُدھر جو "چور درازیں" تھیں ان کا کھلنا بہت ہی مشکل نظر آ رہا تھا کیوں کہ اس کے کھلنے کے لیے نہ کوئی گھنڈی تھی اور نہ تالے کا کوئی نشان۔

"ارشد! درازیں بھی ان کے پرچے ... " صفیہ نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں مگر کھلیں گی کیسے" ارشد نے انھیں غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں روشنی کم ہے" صفیہ نے رائے دی "چلو اسے وہاں رکھ لیں میز پر"

یہ کہکر اس نے صندوقچہ اٹھالیا اور دفتر کی میز کی طرف بڑھی۔ ارشد نے جلدی سے میز پر رکھا ہوا لیمپ سوئچ دبا کر روشن کر دیا۔ اس کی تیز روشنی میں صفیہ کو کونے میں ایک چھوٹا سا کھٹکا چمکتا نظر آیا خوشی سے چلّا کر بولی "یہ تو دیکھو" اور یہ کہتے ہی جو سر اُٹھا کر دیکھا تو ارشد کے ابا جان کھڑے مسکرا رہے تھے! صفیہ پر جیسے بجلی گر پڑی۔

آبا جان نے دونوں کو پریشان دیکھا تو قریب آئے۔ وہ اس وقت غصہ میں بالکل نہیں تھے۔ انھوں نے میز پر سے بلاٹنگ کا تختہ ہٹایا ارشد اور صفیہ نے ڈرتے ڈرتے چوروں کی طرح دیکھا اس کے نیچے کئی کاغذات رکھے تھے اباجان انھیں اُٹھا کر بولے "جغرافیہ کے پرچے یہ ہیں دیکھو" ان کی آواز میں غصہ کے بجائے نرمی تھی "کیا تم انھیں کو ڈھونڈنے آئے تھے" وہ دونوں کیا بولتے ڈر کے مارے خون تک خشک ہو رہا تھا۔ اباجان نے قریب آ کر دونوں کے سر پر ہاتھ

پھر اور پیار سے کہنے لگے "میرے بچو! تم نے آج جو حرکت کی جانتے ہو یہ کتنی بُری بات ہے تم چُھپا کر پیسے یا کسی کی کوئی بھی چیز لینا بُرا سمجھتے ہو، اسے چوری کہتے ہو لیکن یہ بھی تو چوری ہے اور اتنا ہی بُرا کام ہے لوگ سُنیں تو کیا کہیں۔ صفیہ بیٹی تمھاری امی کو سُن کر بڑا دُکھ ہوگا — تم دونوں اتنے اچھے بچوں کو یہ بُرا خیال آیا ہی کیسے"

ارشد سر جھکائے کھڑا تھا اباجان کو مہربان دیکھ کر ڈر کی جگہ شرم نے لے لی تھی۔ وہ پچھتا رہا تھا۔ آہستہ سے روتی آواز میں بولا "ابا جان صفیہ کو میں نے ہی بُلایا تھا"

اباجان نے کہا "میں صفیہ کی شکایت نہیں کروں گا میں جانتا ہوں کہ یہ بڑی اچھی بیٹی ہے لیکن تم کو یہ بُرا خیال آیا ہی کیسے؟"

ارشد کی زبان پر روبی اور شیام کا نام آیا پھر اس نے سوچا کہ کہیں وہ بیچارے پٹ نہ جائیں کہ اتنے میں صفیہ بول اُٹھی۔ "ارشی کو اسکول ہی میں کسی نے بتایا تھا"

"کیوں ارشد،" اباجان نے پوچھا۔

"جی"

"مگر اس طرح تمھیں کسی کی بُری بات نہیں مان لینی چاہیے۔ اچھا اب ایسا کبھی نہ کرنا اور ان لوگوں کو بھی جنھوں نے تمھیں یہ بات بتائی تھی بتا دینا کہ یہ کام کتنا بُرا ہے" اباجان نے کہا "اپنی محنت سے امتحان پاس کرو اس بار میں تمھیں انعام دوں گا"

ارشد اور صفیہ نے ایک دوسرے کو دیکھا اب ان کا انعام دوگنا ہو گیا تھا اور پھر انھوں نے اباجان سے چوری نہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔

بقیہ "گانے والا کیڑا" صفحہ ۱۴ سے آگے

اس میں یہ کیڑا بھی شریک کیا گیا اور خوش قسمتی سے اس کا کیڑا سب کیڑوں سے بازی لے گیا۔ چنانچہ نک۔ کی کو کافی رقم انعام کے طور پر ملی۔ بڑھیا کے دن پھر پلٹے۔ وہ اب مالدار ہو چکی تھی۔ اس نے اسی شام کو اپنے سارے پڑوسیوں کو دعوت دی اس میں اس کا مالک۔ نکو۔ چھے۔ بھی شامل ہوا۔ ہر مہمان کی مچھلی، مٹھائیوں اور چاول سے خاطر تواضع کی گئی۔ پنجڑے کے کیڑے نے اپنا گانا سنایا۔ رات کو اور مزیدار بنا دیا۔ کیا کوئی نک۔ کی اور لوڑ۔ کو کی خوشی کا اندازہ کر سکتا ہے؟



آکاش کی سیر

وقار خلیل شاہ پوری

آئیے، آسمان کی سیر کریں، یہ دیکھیے ہمارے خیالی گھوڑے اُڑتے، آسمان سے باتیں کرتے۔ کہاں پہنچ گئے، جانتے ہیں یہ کون سی جگہ ہے؟ ارے بھئی یہ ہے سورج ـــــ سورج، اُف رے اللہ، یہ آگ کا گولہ، بھئی گرمی سے تو اپنا بُرا حال ہو رہا ہے۔ چلو اس سے تو چھٹکارا پائیں۔

ارے ٹھہرو بھئی، جلدی کاہے کی، سنو تو۔ اس میں سے ہر وقت گرمی اور روشنی نکلتی ہے۔ اس کی روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ بجلی کی روشنی تک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اگر ہم سورج کی تمام گرمی کو ایک جگہ اکھٹا کر لیں اور پھر دو میل لمبے برف کے گھیرے کا ایک کھمبا بنا کر زمین سے سورج تک کھڑا کر دیں تو سورج کی گرمی اُسے دیکھتے دیکھتے پانی پانی بنا دے گی۔ اور پھر یہ پانی آٹھ دس سکنڈ کے اندر بھاپ بن کر اُڑ جائے گا۔

آپ پوچھیں گے کہ پھر ہم لوگ اتنی گرمی میں کیونکر رہتے بستے ہیں؟

ہم تک اس کی پوری گرمی نہیں پہنچتی بلکہ اس کا بہت ہی کم حصہ پہنچتا ہے۔ سورج زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل کی دوری پر ہے۔ اگر ہم ایک ہوائی جہاز میں بیٹھ کر رات دن مسلسل اُڑتے چلے جائیں

تو ایک سو سات سال میں اس تک پہنچ سکیں گے۔
دیکھو نا! یہ ہم سے اتنی دور ہونے پر بھی ہمارے کام آتا ہے، پھر تو یہ بڑا ہی اچھا ہے۔ یہ باغوں میں پھل پکاتا ہے، اسی سے موسم بھی بدلتے ہیں۔ رات اور دن بھی تو اسی سے بنتے ہیں۔

ابھی تو ہمیں اور بھی سفر کرنا ہے ـــــ وہ دیکھئے ایک سیارہ اپنے محور پر کتنی تیزی سے گھوم رہا ہے اس کا نام عطارد ہے!

عطارد سورج کا قریبی عزیز ہے اور یہ تیس ہزار میل لمبا ہے۔ یہ بہت تیزی سے حرکت کرتا ہے اور اٹھاسی دن میں سورج کے چاروں طرف گھوم کر اپنا سفر پورا کر لیتا ہے۔

یہ تو زمین سے بھی تیز گھومتا ہے۔ اب چلئے بھئی بڑی سردی ہو رہی ہے یہاں۔

ہاں آگے چلئے ـــــ اب ہم زہرہ سے ملیں گے، بتلایئے یہ کتنی دور ہے۔ بس یہی سورج سے چھ کروڑ ستر لاکھ میل، زہرہ کا گھیرا سات ہزار چھ سو میل ہے، یا یوں سمجھ لو کہ یہ زمین کے برابر ہے۔ سب ستاروں میں یہ زیادہ چمکدار ہے جب ہی تو سب کو نظر آتا ہے۔

یہی وہ ستارہ ہے جسے صبح کا تارا کہتے ہیں۔ یہ کبھی تو صبح کو نظر آتا ہے اور کبھی شام کو، بات یہ ہے کہ جس دن یہ ستارہ، سورج ڈوبنے کے بعد پچھم میں دکھائی دیتا ہے تو دوسرے دن سورج نکلنے پر پورب میں چمکتا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے پچھم کی طرف چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

پھر تو اچھی خاصی آنکھ مچولی ہوتی ہے اسکی!

ہاں ـــــ اس کی وجہ یہ ہے کہ عطارد اور زہرہ سورج اور زمین کے درمیان رہتے ہیں اس لئے اُن کی صورتیں بدلتی رہتی ہیں۔ اسی سبب کبھی زہرہ گھٹ کر پتلی کمان کی طرح بن جاتا ہے اور کبھی بڑھتے بڑھتے پورے چاند کی طرح ہو جاتا ہے۔ یہ سورج کے چاروں طرف دو سو پچیس دن میں اپنا چکر پورا کر لیتا ہے اور اپنے محور پر تین دن میں گھوم لیتا ہے۔ یعنی کہ اس کا دن ہمارے تین دنوں کے برابر ہوتا ہے۔

اب دیکھئے وہ دور سے ہلکی ہلکی چمک، کتنا فاصلہ ہوگا زمین سے اس کا؟ یہ زمین سے چودہ کروڑ میل دور ہے اور اس کا نام ہے مریخ۔ یہ بھی سورج کے چاروں طرف گھومتا ہے اور آدھی رات گزرنے کے بعد یہ آسمان پر چمکتا ہے۔ یہ زمین سے چھوٹا ہے اور اس کا قطر چار ہزار دو سو میل ہے۔ مریخ اپنے

چاروں طرف چوبیس گھنٹوں میں ایک چکر پورا کرتا ہے۔ جب یہ سیارہ اسی طرح گھومتے گھومتے سورج کے بالکل قریب آجاتا ہے تو ہماری زمین سے بہت دور ہو جاتی ہے اور یہ ستارہ ہم سے تین کروڑ میل دور رہتا ہے۔ اِن دنوں اگر دوربین سے دیکھا جائے تو اس میں پانی کی نہریں دکھائی دیتی ہیں۔

بھئی اب تو ہم تھک گئے۔

چلئے ذرا چندا ماموں سے تو مل لیں۔ چندا ماموں دور کے ہیں ـــــ آیئے ذرا ان کو بھی دیکھیں۔

اِس کا قطر دو ہزار میل سے زیادہ ہے اور یہ ہماری زمین سے دو لاکھ چالیس ہزار میل دور ہے۔ اِس کی لمبائی کا حال یوں ٹھیک طور پر معلوم ہوگا کہ اگر ہم تمام دُنیا کی ریل پٹریوں کو ایک جگہ جمع کر دیں تو وہ قریب قریب چاند کی لمبائی کے برابر ہوگی۔ یا پھر اگر ہم ایک ہوائی جہاز میں بیٹھ کر زمین سے چاند کی طرف اُڑیں اور جہاز کی رفتار سو میل فی گھنٹہ ہو تو دن رات برابر اُڑتے رہنے پر ہم تین سال میں چاند تک پہنچ سکیں گے۔

چاند زمین کے چاروں طرف گھومتا ہے اور اس طرح جب یہ گھومتے گھومتے سورج اور زمین کے بیچ میں آجاتا ہے تو سورج کی طرف کا حصہ روشن ہو جاتا ہے اور وہ حصہ جو زمین کی طرف رہتا ہے نظر نہیں آتا۔ پھر کچھ دن بعد اُسکی صورت کمان کی سی نظر آتی ہے۔ اور جب چودہ تاریخ کو چاند سورج اور زمین کے بالکل سامنے آجاتا ہے تو اُس کے پورے گھیرے پر سورج کی روشنی پڑتی ہے اور چاند پورا چمکتا ہے۔

وہ دیکھئے چاند کی دُنیا ـــــ چلئے گھومیں اور دھومیں مچائیں۔ ذرا دیکھئے کتنے بڑے بڑے پہاڑ اور کتنے خطرناک غار اور نہریں نظر آرہی ہیں۔ آہاہا، یہ پہاڑ تو بڑے ہی اچھے ہیں۔ اور دیکھئے تو ان پہاڑوں پر سفید سفید روئی کے گالے، کس مزے سے اُڑ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پانی پر تیر رہے ہیں۔

اُف ـــــ دس بج رہے ہیں چلئے اب ہمیں اسکول چلنا ہے۔

اب ہمارے خیالی گھوڑے مدرسے کی طرف تیزی سے دوڑنے لگے۔ پھر کیا تھا۔ مدرسہ ـــــ کتابیں ـــــ اُستاد اور ہم فقط



شیربنو

محمد آفاق

ایک تھا امیر آدمی۔ وہ تجارت کیا کرتا تھا۔ اس نے اسی تجارت کی بدولت، لاکھوں روپیہ کمایا اور خوب مال دولت اکٹھا کیا۔ جب وہ بوڑھا ہوگیا تو اس نے اپنے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ "بیٹا! اب میرا سارا کام تم کو ہی سنبھالنا ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم بھی کچھ سیکھو۔ غیر ملکوں کی سیر و تفریح کرکے دنیا میں تجربے حاصل کرو تاکہ جلد ہی اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکو۔ انسان کو چاہیئے کہ کسی کے آگے ہات نہ پھیلائے۔ خود اپنی محنت سے مال دولت حاصل کرے۔"

لڑکے کو اپنے باپ کی رائے پسند آئی اور اس نے سوچا کہ گھر سے باہر نکل کر دنیا کو دیکھنا چاہیئے۔ اگلے دن وہ اپنے سفر پر نکل پڑا۔ ایک روز وہ کسی جنگل سے گذر رہا تھا۔ اس کی نظر ایک شیر پر پڑی جو بڑے مزے میں اپنے مارے ہوئے ہرن کا گوشت کھا رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں جب اس کا پیٹ بھر گیا تو وہ ہرن کا باقی گوشت چھوڑ کر ایک طرف کو چل دیا۔ تھوڑی ہی دور پر ایک

لومڑی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی دو ٹانگیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اُس نے بھی گھسٹنا شروع کیا۔ اور گھسٹتے گھسٹتے اس بچے کھچے ہرن کے گوشت کے پاس پہنچ گئی اور خوش ہوکر کھانے لگی۔

امیر آدمی کے لڑکے نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ سوچنے لگا۔ کہ اللہ میاں بھی کتنے اچھے ہیں جو وہ اپنی مخلوق کے لئے بیٹھے بٹھائے کھانا پہنچاتے ہیں۔ اب شکار تو کیا شیر نے اور لنگڑی اپاہج لومڑی کو مفت کا گوشت بیٹھے بٹھائے مل گیا۔ اب اگر انسان بھی محنت نہ کرے تو اس طرح اس کو بھی کھانا ملنا کیا مشکل ہے۔ خدا کو خود اپنے بندوں کی فکر ہے۔ اس لئے محض کھانے کے لئے سفر کی تکلیف اٹھانے سے کیا فائدہ۔ آخر اب لومڑی کی روزی اس کے پاس ہی پہنچ گئی۔

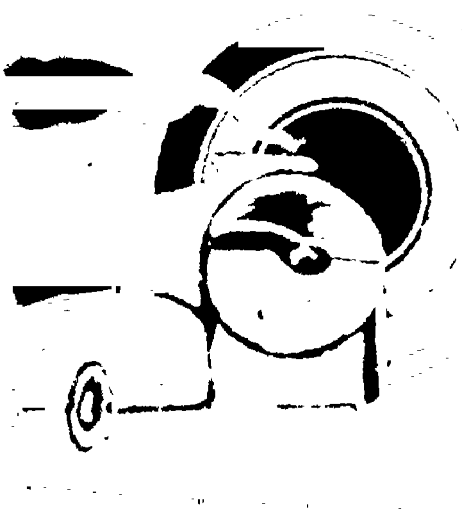
یہ خیال آتے ہی وہ اپنے گھر کی طرف واپس چل پڑا۔ گھر پہنچ کر امیر کے لڑکے نے اپنے باپ سے سارا حال کہہ سنایا۔ بوڑھا امیر یہ سُن کر بہت ہنسا اور بولا۔

”بیٹا! تم نے جو قصہ سنایا۔ یہ بالکل سچا ہے۔ مجھے اس کی سچائی میں ذرا بھی شک نہیں۔ البتہ ایک بات یہ ہے کہ تم اپاہج لومڑی کیوں بننا چاہتے ہو؟ میری تو خواہش ہے کہ تم بہادر شیر بنو جو خود اپنی غذا اکٹھا کرتا ہے۔ تم نے سنا ہے کہ شیر کبھی کسی دوسرے جانور کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ اسی لئے کہ اُسے اپنے قوت بازو پر بھروسہ ہے۔ تم کو چاہیئے کہ تم بھی شیر بنو، کماؤ کھاؤ اور جو کچھ بچے وہ بوڑھوں، بچوّں کو کھلاؤ۔“

یہ سُن کر لڑکا بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا ”ابا! آپ بے فکر رہیں۔ میں یقیناً شیر بنوں گا۔ اپاہج گیدڑ کی طرح دوسرے کی چیز نہیں کھاؤں گا!“

اس کے بعد پھر امیر کے لڑکے نے اپنے باپ کی تجارت میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد اس کا کاروبار بڑھ گیا۔

اطہر پرویز



ہندوستانی ریلوں کی کہانی

گھنے جنگلوں اور پہاڑوں کے رہنے والوں کے سوا کون ہوگا جس نے کبھی ریل نہ دیکھی ہو۔ ہمارے ملک میں ریلوں کو چلتے ہوئے سو سال ہوئے ہیں۔ لیکن اس سو سال کے عرصے میں یہ ریلیں آپ کو دیس کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچا سکتی ہیں۔ آپ جس شہر میں جائیں وہاں آپ کو ریلوے اسٹیشن ملے گا۔ ریل کی پٹریاں دکھائی دیں گی، جن کے لئے جنگلوں اور پہاڑوں کو کاٹ کر راستہ نکالا گیا ہے۔ سیکڑوں ندیوں اور نالوں پر پل بنائے گئے ہیں، جن پر سے ریلیں گذرتی ہیں۔

اب تو ہم ریلوں سے اتنی اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں کہ ہمیں یہ ریلیں نئی نہیں معلوم ہوتیں، مگر آپ سوچئے تو، کہ جب شروع شروع میں ریلیں چلی ہوں گی تو کتنا عجیب معلوم ہوتا ہوگا۔ ایک اک گاڑی میں ایک بستی آباد نظر آتی ہوگی۔ جو پہیوں پر گاؤں گاؤں گھومتی پھرتی ہے۔ کتنے لوگ اس کو دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتے ہوں گے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ جنگلی آدمی اور ہمارے دیہات کے رہنے والے جنھوں نے ریل کا نام بھی پہلے نہ سنا تھا وہ بھی اُسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ کوئی یہ سمجھا کہ یہ کوئی جن بھوت ہے، کسی نے کہا کہ یہ کوئی زلزلہ لانے والی مشین ہے۔ کہتے ہیں کہ جب شروع شروع میں ریلیں چلیں تو

جس گاؤں سے گزرتیں، لوگ اپنے اپنے گھروں سے ڈنڈے لے کر نکل پڑتے کہ کہیں یہ کالے کالے، دُھواں پھینکنے والے جن، ان کے گھروں پر اچانک حملہ نہ کر دیں۔

یہ تو خیر دیہاتوں کی باتیں تھیں، لیکن جب یہ گاڑیاں جنگلوں سے گزرتیں تو جنگلی جانور اس کو بھی کوئی خطرناک جانور سمجھ کر اس پر حملہ کرتے۔

اب سے سو سال پہلے، پہلی گاڑی ۱۶ اپریل ۱۸۵۳ء کو بمبئی میں چلی تھی۔ اس وقت صرف ۲۲ میل پر پٹری بچھائی گئی تھی۔ اب آپ کو یہ سُن کر حیرت ہو گی کہ سو سال میں ۳۴۱۲۰ میل لمبی ریلوے لائن دیس بھر میں پھیل چکی ہے۔

پہلے زمانے میں جو ریل کے ڈبے لکڑی کے بنتے تھے۔ اُن کے دروازے باہر کی طرف کھلا کرتے تھے۔ چھوٹی لائن پر جہاں کے ڈبے چھوٹے ہوتے ہیں آجکل بھی ایسے ہی ڈبے چلتے ہیں۔ پہلے زمانے میں ڈبوں میں بیٹھنے کے لئے بنچیں نہ تھیں اسی لئے لوگ فرش پر بیٹھتے تھے۔ مگر اب تو یہ ڈبے بہت اچھے ہو گئے ہیں۔

یہ تو خیر ڈبے کی بات ہے۔ اب انجنوں کا حال سُنئے۔ پہلے انجن بھی بہت زیادہ ترقی یافتہ نہ ہوتے تھے اس لئے کہ اُن میں بریک کا اچھا انتظام نہ تھا۔ چنانچہ جب کبھی کسی اسٹیشن پر گاڑی رُکتی اتنے زور کا جھٹکا لگتا کہ مسافروں کے ناک اور منہ کھڑکی سے لگتے اور بہت چوٹ آتی لیکن اب یہ حالت نہیں رہی۔ آجکل تو آپ کو یہ معلوم ہی نہ ہوگا کہ کب گاڑی رُکی اور کب چلی۔ آپ رات کو بڑے مزے میں سو جائیے صبح کو جب آنکھ کھلے گی تو آپ کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ راستے میں کہیں گاڑی رُکی بھی تھی یا نہیں۔

جہاں تک گاڑی میں روشنی کا سوال ہے شروع شروع میں تو انگلستان میں بھی گاڑیوں میں موم بتی اور تیل کی لالٹین جلائی جاتی تھیں۔ پھر ۱۸۷۰ء میں گیس کی روشنی کا استعمال شروع ہوا مگر ہمارے یہاں اس زمانے میں بھی لالٹین اور موم بتیاں استعمال ہوتی تھیں۔ لیکن بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی ہمارے یہاں بھی گیس کا استعمال ہونے لگا۔ اور پھر یہ گیس کی روشنی تقریباً بیس سال تک استعمال ہوتی رہی۔ اس کے بعد گیس کی جگہ بجلی نے لے لی۔ جس نے ریل کے ڈبوں کی شکل ہی بدل دی۔

آیئے اب ہم آپ کو ریل کے ڈبوں کے بارے

میں کچھ بتائیں۔ آپ پوچھیں گے کہ یہ ریل کے ڈبے بنتے کہاں ہیں؟ ریل کے ڈبے بنانے کے کارخانے ہمارے دیس میں شروع ہی میں قائم ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی کچھ ڈبے انگلستان سے بھی بن کر آجاتے تھے آجکل ہمارے یہاں ۱۲ ہزار سے بھی اوپر ڈبے ہیں جو استعمال میں آرہے ہیں۔

ایک کارخانہ پیرامبر (مدراس) میں بھی بن رہا ہے۔ جس میں ہر سال تقریباً ساڑھے تین سو نئے انجن بنیں گے۔ جب یہ کارخانہ چلنے لگے گا تو پھر ہمیں باہر سے ڈبے منگوانے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔

اس طرح ہماری ریلیں دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی چلی جا رہی ہیں۔ ریلوے کے محکمے میں تقریباً دس لاکھ آدمی کام کرتے ہیں اور ان کی ملی جلی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے جو ریلوں کا انتظام دن بدن بہتر ہوتا جا رہا ہے۔

ریلوں کے ذریعے ہمیں نہ صرف یہ فائدہ ہوا ہے کہ اب ہم جہاں چاہیں اطمینان سے جا سکتے ہیں۔ بلکہ اس کی بدولت ہماری تجارت کو بڑی مدد مل رہی ہے۔

ان کی بدولت حکومت کو ریلوے سے بڑا منافع ہوتا ہے۔ لیکن یہ منافع کسی ایک آدمی یا کسی کمپنی کو نہیں ملتا بلکہ ہمارے خزانے میں جمع ہوتا ہے۔ اس لئے اب یہ ریلیں سرکاری ملکیت میں ہیں اس کا منافع ملک کے بہتری کے کاموں میں استعمال ہوتا ہے۔

یہ ہے ہماری ریلوں کی کہانی۔ اگر ریلوے کی ترقی کی یہی رفتار رہی تو اگلے سو سال میں ہندوستانی ریلیں دنیا بھر میں اپنی مثال آپ ہوں گی۔

لطیفے

ماسٹر۔ (طالب علم سے) تمہاری عمر کیا ہے؟
طالب علم۔ گیارہ سال۔
ماسٹر۔ گیارہ سال نہیں ہوسکتی۔
طالب علم۔ جناب پچھلے سال میں پانچ برس کا تھا۔ اب چھ برس کا ہوں۔ اب آپ ہی بتا دیجئے کہ پانچ اور چھ کتنے ہوتے ہیں۔

محمد عبدالقادر قادری

ڈاکٹر۔ (کمپونڈر سے) آج ہیضے سے کتنے آدمی مرے۔
کمپونڈر۔ جناب دس آدمی۔
ڈاکٹر۔ مگر میں نے تو بارہ کو دوا دی تھی۔

ہوٹل والا۔ جناب اس کمرے کا کرایہ دس روپیہ ہے یہ زیادہ نہیں ہے۔ آپ یہاں سے دور دور کے مناظر دیکھ سکتے ہیں اور لطف اٹھا سکتے ہیں۔
مسافر۔ تب تو پھر مجھے کرایہ کم دینا ہوگا۔
ہوٹل والا۔ کیوں؟ کیا بات ہے؟
مسافر۔ اس لئے کہ میری بینائی کمزور ہے۔

حامد۔ کیوں احمد تم کو اسکول جانا پسند ہے؟
احمد۔ جی ہاں! جانا بھی اور آنا بھی۔ لیکن وہاں بیٹھنا پسند نہیں۔

اسامہ (بہاری)

شمیم۔ (رحیم سے) بتاؤ تم رات کو منہ کیوں نہیں دھوتے؟
رحیم۔ میں صبح کو منہ دھوؤں گا۔
شمیم۔ تم ابھی منہ دھولو تاکہ صبح نہ دھونا پڑے۔

سید امیر شاہ حیدرآبادی
جامعہ نگر، دہلی

اُستاد۔ گورنمنٹ کا اسم فاعل بتاؤ۔
شاگرد۔ گورنر۔

عبدالقادر علی کاپڑی
گونڈی پورہ

ایک صاحب ہوٹل گئے۔ اور بیٹھ کر آرڈر دینے لگے۔

"بیرا! کھانا لاؤ"

"یہ لیجئے" بیرے نے کھانا رکھتے ہوئے کہا "اور کیا لاؤں؟"

"پلاؤ لاؤ"، پلاؤ لانے کے بعد بیرے نے پھر پوچھا کہ "حضور اب کیا لاؤں؟"

ذرا سی دیر بعد صاحب نے کہا "زردہ لاؤ"

زردہ لانے کے بعد بیرے نے پھر پوچھا۔ "سرکار! اب کیا لاؤں؟"

"بل لاؤ"

بل لانے کے بعد بیرا خاموش کھڑا ہوگیا۔ صاحب نے اسے ایک مرتبہ غور سے دیکھا اور بولے۔

"جاؤ اب پولیس لاؤ۔ اس لئے کہ میرے پاس بل ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں۔

——— دلجیت سنگھ آزاد۔ ٹاٹا نگر

امجد۔ (خلیل سے) یار تم تو ہر وقت حساب ہی کرتے رہتے ہو۔

خلیل۔ تو پھر کیا کروں؟

امجد۔ تم سو جاؤ۔ امریکہ میں اس وقت سب لوگ سو رہے ہوں گے۔

——— سید امیر شاہ حیدرآبادی۔ جامعہ نگر دہلی

ماں۔ (بس میں) امجد تو چلا بیٹھتا ہے کہ نہیں۔ شرارت سے باز نہ آئے گا تو مار کھائے گا۔

امجد۔ مارو گی تو میں کنڈکٹر کو اپنی عمر بتادوں گا۔ پھر پورا کرایہ دینا پڑے گا۔

باپ۔ دیکھو بیٹا جب میں چھوٹا تھا تو میں نے کبھی چوری نہیں کی۔

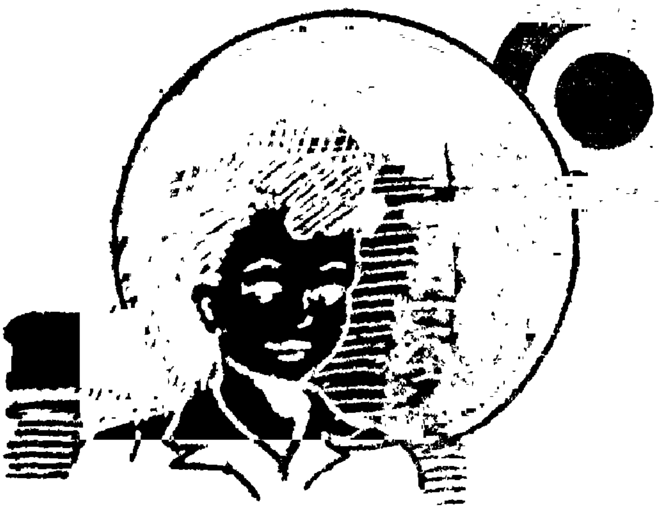
بیٹا۔ تو ابّا جان! چوری کرنا کب سے شروع کی۔

ایک بیوقوف۔ اگر دریا میں آگ لگ جائے تو مچھلیاں کدھر بھاگیں گی؟

دوسرا بیوقوف۔ درختوں پر۔

تیسرا بیوقوف۔ ارے! وہ کیا گائے بھینس ہیں جو درخت پر چڑھیں گی۔

عبدالقادر علی کاٹھگا
کونڈی پورہ



فرمانبردار لڑکا

ست پال جھانب

کسی زمانے میں ایک سمندری جہاز سفر پر جا رہا تھا۔ اس میں فوجی سپاہی تھے اور لڑائی کا سامان بھی لدا ہوا تھا۔ جہاز کے کپتان کا ایک لڑکا بھی اس کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ اس لڑکے کا نام "کیسا بیانکا" تھا۔ کیسا بیانکا سمندر کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ اچانک جہاز میں آگ لگ گئی۔ اور ذرا سی دیر میں جہاز دھوئیں سے بھر گیا۔ مسافر اپنی جان بچانے کے لئے اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے تھے۔ جہاز میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی ہوتی ہیں جو ایسی مصیبت کے وقت کام آتی ہیں۔ چنانچہ لوگ ان ہی کشتیوں میں کود کود کر بھاگ رہے تھے بےچارا کیسا بیانکا بھی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا کہ اچانک اس کا باپ وہیں آ گیا اور بولا "بیٹا یہاں کھڑے رہو، میں ابھی آتا ہوں" پھر وہ کسی ضروری کام سے نیچے چلا گیا۔ ذرا سی دیر میں آگ اتنی پھیل گئی کہ کپتان بھی اس میں جل گیا اور اوپر نہ آ سکا۔ کیسا بیانکا اپنے باپ کی بتائی ہوئی جگہ پر اسی طرح کھڑا رہا۔ مگر آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے اس کے قریب آ گئی۔ لوگ اپنی اپنی جان بچاتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ کسی نے اس لڑکے کی طرف کوئی دھیان بھی نہیں دیا۔ اس نے اپنے باپ کو پکارا۔ مگر

باپ جب مر ہی گیا تھا تو جواب کون دیتا۔ اب تو آگ اس کے قریب آ گئی تھی۔ کیسا بیانکا نے اور زور سے آواز دی۔

"ابا جان! کیا میں یہاں سے ہٹ جاؤں؟"

مگر اس کو کوئی جواب نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اتنی دیر میں اس کے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ اس کے کپڑے جلنے لگے۔ بال جھلس کر رہ گئے۔ کیسا بیانکا اپنے باپ کو برابر آواز دیئے جا رہا تھا "ابا جان مجھے بچاؤ"۔ اس کے کپڑوں کے ساتھ اس کا بدن بھی جلنے لگا۔

اور ذرا سی دیر میں کیسا بیانکا جل کر راکھ ہو گیا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹا۔

اعلان

پیامِ تعلیم میں چھپنے کے لئے جو مضامین بھیجیں اس کی نقل اپنے پاس ضرور رکھئے۔ ڈاک سے اکثر مضامین ضائع ہو جاتے ہیں۔

ادارہ

عام معلومات

دنیا کی صنعتیں اور پیشے

ہندوستان :- کپڑا بُننا، کوئلہ اور فولاد کانوں سے برآمد کرنا۔
پاکستان :- لاہوری نمک کانوں سے برآمد کرنا، شکر کے کارخانے۔ روئی اونٹنے کے کارخانے، رسن پیدا کرنا۔ روئی اُگانا۔
ایران :- قالین تیار کرنا اور تیل کے چشموں سے تیل برآمد کرنا۔
جاپان :- کھلونے تیار کرنا، کپڑا بُننا اور جہاز سازی۔
چین :- ریشم کا کام۔
روس :- پٹرول نکالنا اور کپڑا بُننا۔
انگلستان :- کپڑا تیار کرنا اور کانوں سے کوئلے کی کھدائی کرنا۔
[illegible] :- شیشے سے مختلف چیزیں تیار کرنا۔ کپڑا بُننا۔ شکر تیار کرنا۔
[illegible] :- شراب بنانا۔
[illegible] :- تمباکو اور روئی پیدا کرنا۔
سوئیزرلینڈ :- گھڑیاں تیار کرنا۔ زردوزی کا کام۔
امریکہ :- مشین سازی۔ سونا، کوئلہ اور لوہا کانوں سے برآمد کرنا۔
فن لینڈ :- لکڑی کا کام۔ کاغذ سازی اور کپڑا بُننا۔ جرمنی :- لوہے کا سامان تیار کرنا اور کپڑا بُننا۔



نسیم احمد

بے ایمان وزیر

کسی زمانے میں جنوبی ہندوستان میں ہری سنگھ نامی ایک راجا راج کرتا تھا۔ ہری سنگھ بڑا نیک اور رحمدل راجا تھا۔ اس کی رعایا اس سے بہت خوش تھی۔ اس کا وزیر، روپ سنگھ بھی ویسا ہی اچھا آدمی تھا۔ اسی لئے ہری سنگھ ہر کام میں اس کی رائے ضرور لیتے۔ اس طرح راج کاج کا کام بڑے مزے میں چل رہا تھا۔ رعایا اپنے راجا اور وزیر سے بہت محبت کرتی تھی۔

ایک بار روپ سنگھ تیرتھ کے لئے بنارس گئے اس لئے انھیں تین مہینے کی چھٹی لینی پڑی۔ راجا نے تین مہینے کے لئے سورج سنگھ نامی ایک شخص کو اپنا وزیر بنا لیا۔ سورج سنگھ بڑا بے ایمان آدمی تھا۔ جیسے ہی اس کو وزارت کا عہدہ ملا اس کا دماغ اور بھی خراب ہوگیا۔ بے ایمان تو وہ تھا ہی، اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خوب دولت اکٹھا کی جائے۔ چنانچہ [illegible]

سے لوٹ کھسوٹ شروع کر دی۔ یہاں تک کہ روپ سنگھ کے زمانے میں بہت سے مدرسوں اور اسپتالوں کی مدد کے لئے روپیہ دیا جاتا تھا۔ سورج سنگھ نے وزارت کا عہدہ سنبھالتے ہی سب سے پہلے ان کا روپیہ ہڑپ کر لیا اور گاؤں کے مکھیا اور چودھری کو رشوت دے کر ان سے جھوٹی جھوٹی رسیدیں لکھوا لیں۔ سب لوگ اس کو چپ چاپ دیکھتے رہے، لیکن کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ راجا سے وزیر کے خلاف کچھ کہے۔

ایک مرتبہ راجا کو یہ خیال آیا کہ اپنی ریاست کا دورہ کرنا چاہئیے۔ جاڑے کا زمانہ تھا۔ وہ دورہ کرتے ہوئے ایک جنگل میں پہنچے۔ راجا کو یہ جنگل بہت پسند آیا۔ انھوں نے سوچا کہ یہاں دو چار روز ٹھہرنا چاہئیے۔ وزیر نے بھی رائے دی کہ "سرکار! محل میں تو رہتے ہی ہیں ذرا جنگل کی خوب صورتی بھی دیکھ لیجئے۔"

چنانچہ راجا نے دو چار روز ٹھہرنے کا ارادہ کر لیا۔ رات کو جب راجا ہری سنگھ سونے کی تیاری کر رہے تھے تو ان کو گیدڑوں کے چلانے کی آواز سنائی دی۔ جنگل کے تمام گیدڑ ایک جگہ اکٹھا ہو کر "ہوا ہوا" چلا رہے تھے۔ راجا ہری سنگھ نے گیدڑوں کی آواز کب سنی تھی۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور بولے "سورج سنگھ! یہ کیا شور سنائی دے رہا ہے؟"

سورج سنگھ نے سوچا کہ راجا کو بیوقوف بنانے کا بہترین موقع ہے۔ اس نے جواب دیا "سرکار! یہاں سے کچھ دور پر ایک ظالم راجا راج کرتا ہے۔ یہ سب گیدڑ اس کی پرجا ہیں۔ اس بار فصل بھی خراب ہو گئی ہے اس لئے بیچارے بے حد پریشان ہیں۔ آج ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ آپ جیسا رحم دل راجا ان کے پڑوس میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس لئے وہ ادھر چلے آئے۔ اس وقت سردی کے مارے چیخ رہے ہیں۔"

راجا ہری سنگھ کو یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ وہ سمجھے کہ گیدڑ بھی کوئی آدمیوں

ں کی ذات ہے۔ اس لئے انھوں نے کہا کہ " بھائی سورج سنگھ! یہ لو پانچ ہزار روپیہ
ور ان سب کو کل کمبل لاکر بانٹ دو۔"
سورج سنگھ نے وہ روپیہ لے کر ہڑپ کر لیا۔ اگلے دن شام کو جب راجا ہری
سنگھ سونے کی تیاری کرنے لگے تو پھر گیدڑوں نے "ہوا ہوا" چلّانا شروع کر دیا۔ اب
تو راجا ہری سنگھ حیرت میں رہ گئے فوراً بولے " ارے بھائی سورج سنگھ! کیا ان
کو کمبل نہیں پہنچے جو یہ آج پھر چلّا رہے ہیں؟"



سورج سنگھ نے کہا " سرکار! کمبل تو پہنچ گئے اور اس کو پاکر گیدڑ بہت خوش
ہوئے، لیکن آج کہہ رہے ہیں کہ آپ کی بدولت بدن تو ڈھک گیا اور جاڑا نہیں لگ
رہا ہے لیکن کئی روز سے کھانے کو نہیں ملا۔" راجا صاحب نے کچھ سوچ کر کہا۔
" آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ بے چاروں کی فصل بھی تو ماری گئی ہے۔ اور ان کا راجا
ان کی مدد نہیں کرتا۔ اس لئے ان بھوکوں کو کھانا تو کھلانا ہی چاہیے۔ ابھی فوراً
ان کو پانچ ہزار کی تھیلی بھجوا دیجیے۔"

وزیر کو پانچ ہزار کی رقم مل گئی اور وہ جنگل میں گھوم گھام کر آ گئے۔

مگر گیدڑ برابر 'ہوا ہوا' چلاّ رہے تھے۔ راجا نے کہا "سورج سنگھ! یہ کیا بات ہے روپیہ پانے پر بھی یہ لوگ اسی طرح چلاّ رہے ہیں۔" سورج سنگھ نے جواب دیا "سرکار! روپیہ تو دے دیا ہے لیکن اس وقت یہ لوگ دعوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اسی لئے یہ سب شور ہو رہا ہے۔"

ذرا سی دیر میں راجا ہری سنگھ سو گئے اگلے روز پھر اسی طرح گیدڑ چلاّنے لگے۔ راجا نے پھر سورج سنگھ سے پوچھا کہ "بھائی کیا قصہ ہے یہ آج پھر شور مچا رہے ہیں۔" سورج سنگھ نے کہا "سرکار اب تو ان کے پاس کمبل کی کمی نہیں اور کھانے کے لئے غلّہ بھی بہت ہو گیا۔ ان کو یہ سب آرام آپ ہی کی بدولت میسر ہوا ہے اس لئے آپ کو دعا دے رہے ہیں۔"

یہ سُن کر راجا ہری سنگھ بہت خوش ہوئے۔ لیکن سورج سنگھ نے سوچا کہ اب اور زیادہ یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں ہے اب گیدڑوں کے چیخنے کی کیا وجہ بتاؤں گا۔ اس لئے بھلائی اسی میں ہے کہ اب یہاں سے چلا جائے۔ چنانچہ اگلے دن سورج سنگھ نے راجا ہری سنگھ کو رائے دی کہ اب یہاں سے چلنا چاہیئے۔ اب تو یہاں رہتے رہتے کئی دن ہو گئے۔ راج کاج کا بھی نقصان ہو رہا ہوگا۔

راجا کو بھی محل کی یاد ستانے لگی۔ اس لئے اس نے سورج سنگھ کی رائے مان لی اور راجدھانی واپس آ گئے۔

کچھ دن بعد راجا کا پہلا وزیر، روپ سنگھ بھی تیرتھ سے واپس آ گیا۔ گاؤں کے لوگوں نے اُن سے جا کر سورج سنگھ کا کچا چٹھا سنا دیا۔ اور جعلی رسیدوں کا حال بھی سنا دیا۔ روپ سنگھ نے فوراً اس معاملے کی تحقیقات کی تو سورج سنگھ کی چالاکیوں کا حال معلوم ہوا جب راجا ہری سنگھ نے یہ سارے قصے سنے تو انہوں نے حکم دیا کہ "سورج سنگھ" کی ساری جائداد ضبط کر لی جائے اور منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا کر ان کو جنگل کے گیدڑوں میں چھوڑ دیا جائے۔ اس طرح سورج سنگھ کو اپنے کئے کی سزا ملی۔

اطہر پرویز



کیا خوب آدمی تھے شیخ چلی بھی

شیخ چلی نے ایک گائے پالی تھی۔ صبح شام اس کی خدمت کرتے تھے۔ انھیں اپنی گائے سے بڑی محبت تھی۔ ایک روز رات کو وہ گائے کو صحن میں باندھ کر سو گئے۔ صبح جو اٹھ کر دیکھا تو کھونٹا خالی تھا۔ خوب روئے چلّائے۔ محلّے کے لوگوں کو معلوم ہوا تو وہ بھی دوڑے دوڑے آئے۔ شیخ چلی نے گائے کے چوری جانے کا حال سنایا۔ لیکن جو سنتا، وہ یہی کہتا کہ "واہ شیخ جی! تم بھی خوب آدمی ہو، کھلے صحن میں گائے کو باندھ کر سو گئے"۔ کسی نے کہا کہ "رات کو ایسے بے خبر سوئے کہ تم کو اتنا بھی ہوش نہیں رہا کہ چور کب گھسا کب نہیں۔ جب اس طرح سوؤ گے تو اپنے آپ چوری ہوگی"۔

کوئی بولا "واہ شیخ جی! گائے ضرور چیخی چلّائی ہوگی۔ تم نے اس کی آواز بھی نہیں سنی۔ خوب مزے میں سوتے رہے"۔

غرض جو بھی آتا وہ شیخ چلی سے یہی کہتا، آخر شیخ چلی سے نہ رہا گیا اور

بولے " آپ لوگ میرا قصور معاف کر دیں۔ آپ لوگوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ غلطی میری ہے، چور بے چارہ بے قصور ہے۔"

ایک بار شیخ چلّی، زرق برق کپڑے پہنے ہوئے ایک سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ ایک بہت بڑی پگڑی باندھے ہوئے تھے۔ اسی راستے سے ایک دیہاتی گزر رہا تھا۔ اس نے شیخ چلّی کو روک کر کہا۔

" شیخ جی! ذرا یہ چٹھی پڑھ دیجئے۔"

شیخ چلّی نے جو خط دیکھا تو کسی دوسری زبان میں تھا۔ شیخ چلّی نے کہا کہ " بھائی یہ زبان میں نہیں جانتا۔" دیہاتی حیرت میں رہ گیا اور پھر غصّے سے بولا " واہ شیخ جی! اتنی بڑی پگڑی پہنے ہو اور خط نہیں پڑھ سکتے۔" شیخ جی نے بڑے اطمینان سے اپنی پگڑی اُتار کر دیہاتی کے سر پر رکھ دی اور بولے " اگر پگڑی پہننے سے پڑھنا آجاتا ہے تو پھر اب آپ ہی یہ خط پڑھ لیجئے۔"

ایک روز کسی شخص نے شیخ چلّی کے دروازے پر دستک دی۔ شیخ جی اوپر کے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ چنانچہ اوپر کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا " کون صاحب ہیں اور کیا کام ہے؟" اس آدمی نے کہا " ذرا نیچے تشریف لائیے۔"

جب شیخ چلّی نے نیچے اتر کر دروازہ کھولا تو اس نے کہا کہ " سرکار! اللہ بھلا کرے گا۔ خدا کی راہ میں کچھ خیرات کر دیجئے۔ آپ کے بال بچے خوش رہیں گے۔"

شیخ چلّی نے کہا " اندر تشریف لائیے۔" یہ کہہ کر شیخ چلّی اس فقیر کو اوپر لے گئے۔ اُس کو کرسی پر بٹھایا اور کہا " اب تشریف لے جائیے، اگلا دروازہ دیکھئے، یہاں اللہ کی برکت ہے۔"

فقیر کو بہت غصّہ آیا۔ اس نے کہا۔ " اجی حضرت! اگر آپ کو نہیں دینا تھا تو پھر یہاں لے کر کیوں آئے۔ نیچے ہی کیوں جواب نہ دے دیا۔"

شیخ چلی بولے "اگر آپ کو بھیک ہی مانگنی تھی تو پھر آپ نے مجھے اوپر سے نیچے کیوں بلایا۔ وہیں سے کیوں نہیں کہہ دیا۔"

اب تو فقیر لاجواب ہو گیا اور اپنی راہ پر چل دیا۔

ایک بار شیخ چلی بیمار ہوئے۔ بیماری بڑھتی گئی۔ کسی کو اُن کے بچنے کی امید نہ رہی۔ آخر ایک دن انھوں نے اپنے پڑوسی کو بلا کر وصیت لکھانی شروع کر دی۔

میرے مرنے کے بعد جو کچھ بچے اس میں سے ۵۰۰ روپیہ تو محلے کے غریبوں اور فقیروں میں بانٹ دیا جائے۔ ۵۰۰ روپیہ پڑوس کے مدرسے میں دے دیا جائے۔ اور ایک ہزار روپیہ مسجد کو چندے میں۔ باقی روپیہ میرے بال بچوں کی گزر بسر کیلئے۔

پڑوسی یہ سُن کر حیرت میں رہ گیا۔ اس لئے کہ شیخ چلی تو غریب آدمی تھے۔ چنانچہ اُس نے کہا۔

"شیخ جی! آپ کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آیا؟"

شیخ چلی نے کہا: "بھائی میرے پاس روپیہ کہاں سے آتا۔ میرے پاس تو کھانے پہننے کو بھی نہیں ہے۔ یہ وصیت تو اس لئے کر دی ہے تاکہ مرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ شیخ چلی کنجوس تھے۔

بقیہ "ملکہ کی تاجپوشی" صفحہ ۲۱ سے آگے

جیسے ہی تاج سر پہ رکھا جائے گا۔ بندوقوں سے سلامی دی جائے گی، توپیں داغی جائیں گی۔ بگل بجے گا اور یہی وہ لمحہ ہوگا جو جشن کو چار چاند لگائے گا۔

اس کے بعد ملکہ کی خدمت میں انجیل پیش کی جائے گی جو اس جشن کا سب سے بڑا تحفہ ہوگی۔ اس کے بعد کچھ اور رسمیں بڑے شاندار طریقے سے منائی جائیں گی اور پھر یہ جشن ختم ہو جائے گا اور ملکہ اپنے محل کی طرف روانہ ہو جائیں گی۔

ایک جاپانی کہانی

کے ایس چوہان

گانے والا کیڑا

ہمارے ملک سے بہت دور مشرق میں ایک ملک ہے جس کا نام ہے جاپان ــــ یہاں بہت زلزلے آتے ہیں۔

کسی زمانے میں جاپان کے شہر ٹوکیو میں ایک بوڑھی رہا کرتی تھی۔ اس کا نام تھا "ٹوکو" وہ اپنی نواسی کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی۔ ٹوکو اپنی نواسی 'نک۔کی' کو بہت پیار کرتی تھی۔ نک۔کی تھی تو دس برس کی ہی مگر گھریلو کام کاج میں بڑی ہوشیار تھی۔ وہ اپنی فراک میں رنگ برنگی تتلیاں بناکر پہنتی تھی۔ اور اونچی کھڑاؤں پہن کر کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتی ہوئی سارے گھر میں گھومتی پھرتی۔ اس کو خوش دیکھ کر ٹوکو کا دل بھی خوشی سے باغ باغ ہو جاتا۔

ایک دن نک۔کی جب چاول اور مچھلی پکاکر باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ اس کی نانی رو رہی ہے نک۔کی فوراً نانی کے پاس دوڑی دوڑی گئی۔ اور اس سے رونے کا سبب پوچھنے لگی۔ ٹوکو کا غذ کے ایک رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی بولی "نک۔کی میری اچھی بیٹی۔ اب میں بوڑھی ہو گئی ہوں اور مجھ سے کام کاج نہیں ہوتا اور گھر بیٹھے کھانا ملنا مشکل ہے کیونکہ ہمارے پاس کوئی جائداد بھی تو نہیں ہے" یہ

سن کر ننک۔ کی ہنسی پڑی اور بولی "بس! اتنی سی بات پر تم رو رہی ہو۔ تو تم فکر مت کرو۔ میں آج ہی شہر جا کر کام تلاش کر لوں گی اور پھر ہم دونوں مزے میں رہیں گے۔

جلد ہی ننک۔ کی کو کام مل گیا۔ وہ کام پر جانے لگی۔ مگر پھر اچانک ایک دن بوڑھی لوٹ۔ کو بیمار پڑ گئی۔ اور ننک۔ کی کو وہ کام چھوڑنا پڑا۔ ننک۔ کی نے بڑھیا کی بیماری پر سب کچھ خرچ کر دیا جو کچھ اس کے پاس بچ رہا تھا۔ یہاں تک کہ دیواروں پر لگے ہوئے پردے اور فرش پر بچھی ہوئی چٹائیاں تک بک گئیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو و اور اس کی نانی بیماری اور روز کے فاقوں سے مر جاتی لیکن اس نے دوا دارو کر کے اپنی نانی کو اچھا کر لیا۔ اب اس نے پھر کام تلاش کیا۔ اس مرتبہ اسے ایک پڑوسی کے پاس کام ملا۔ پڑوسی کا نام تھا ننک کو۔ بچے۔ جہاں اُسے بچے کے کھلانے کا کام سونپا گیا۔

یہ بچہ بھی عجیب سا تھا۔ آپ نے کھلونوں کی دوکان میں سلولائیڈ کا بنا ہوا جاپانی بچہ تو ضرور دیکھا ہوگا۔ بس یہ بچہ بھی کچھ بالکل ویسا ہی تھا۔ اس کی آنکھیں نکیلی تھیں اور ناک اتنی چھوٹی کہ اسے پکڑنا بھی مشکل تھا۔ ننک۔ کی بچے کو پیٹھ پر لاد کر اکثر گھوما کرتی تھی۔ ایک دن ننک۔ کی بچے کو لے کر جب گھر واپس آ رہی تھی تو اس نے ایک دُکان پر بھیڑ دیکھی۔ جب وہ دُکان کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ دُکان میں بہت سے پنجرے تھے جنکو لوگ اُٹھا اُٹھا کر دیکھ رہے تھے۔ ان پنجروں میں چھوٹے چھوٹے ہرے رنگ کے کیڑے تھے اور یہ خوب گا رہے تھے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ جاپان کے یہ کیڑے بھی ویسا ہی گانا گاتے ہیں جیسا کہ ہمارے یہاں کے طوطا مینا۔ اور لوگ انھیں بڑے شوق سے خریدتے ہیں۔ ننک۔ کی نے سوچا اپنی نانی کے لئے بھی ایک پنجرا خرید لے۔ مگر چونکہ قیمت زیادہ تھی اس لئے وہ نہ خرید سکی۔ پھر بھی اس نے ایک خاص کیڑا پسند کر لیا تھا اور روز اسی دُکان پر جا کر وہ اس کیڑے کو دیکھتی۔ کچھ عرصے کے بعد اس کے مالک نے اپنے لڑکے کی سالگرہ کی خوشی میں اس کو کافی انعام و اکرام دیا۔ وہ فوراً دوڑی دوڑی اسی دُکان پر گئی اور وہ کیڑا خرید کر گھر لے گئی۔ اس کی نانی کیڑے کو پا کر بہت خوش ہوئی اور اس نے اس کا نام "دھان کے کھیت کا ہرا گائیک" رکھا۔

ایک دفعہ جب گویئے کیڑوں کا مقابلہ ہوا تو

بقیہ صفحہ ۲۵ پر دیکھئے



بچّوں کی کوششیں

کون بڑا ہے؟

ایک دفعہ ایک بندر اور ایک ہاتھی میں جھگڑا ہوا۔

ہاتھی کہتا تھا میں تجھ سے بڑا ہوں کیوں کہ میں طاقت ور اور بہادر ہوں۔ میں بڑے بڑے راجاؤں کی سواری میں رہتا ہوں۔ میری مدد سے وہ شکار کھیلتے ہیں۔ اور لڑائی کے میدان میں بھی میں کام آتا ہوں۔

بندر بولا میں تجھ سے بڑا ہوں کیونکہ میں پھرتیلا، تیز اور ہوشیار ہوں۔ میں بڑے بڑے درختوں پر چڑھ سکتا ہوں۔ اور بڑے بڑے جنگلوں میں چھلانگ لگاتا پھرتا ہوں۔" ان دونوں کی باتیں ایک بیل سُن رہا تھا۔

اُس نے کہا "بھائی! تم دونوں بوڑھے اُلّو کے پاس جاؤ۔ وہ یقیناً تمھارا فیصلہ کرے گا۔ اس طرح لڑنے سے کیا فائدہ۔"

یہ سن کر بندر اور ہاتھی اُلّو کے پاس گئے، اور لگے اپنی اپنی ڈینگیں مارنے۔

ہاتھی نے کہا "چودھری تم ہی بتاؤ کہ کون بڑا ہے۔" اُلّو نے ذرا سوچ کر کہا "یہ تو میں سوچ کر بتاؤں گا۔ لیکن سامنے والی ندی کے پار جو درخت ہے اُس کے پھل مجھے توڑ کر لا دو۔" بندر نے کہا "چودھری کیا آپ

پنے فیصلے کی فیس لیں گے۔

"نہیں وہی پھل تمھارے سوال کا جواب دے گا۔"

اُلّو نے جواب دیا۔

یہ سن کر دونوں جانور درخت کی طرف چل پڑے۔

جب دونوں ندی پر پہونچے تو بندر ندی کو پار نہ کر سکا۔

تب ہاتھی نے کہا دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ میں تجھ سے بڑا ہوں۔ یہ سُن کر بندر شرما گیا۔

ہاتھی نے کہا "خیر آؤ پیٹھ پر بیٹھ جاؤ، میں تم کو ندی پار کرادوں" ...... اس طرح دونوں ندی کے پار پہونچ گئے۔

ہاتھی نے اب درخت کو گرانا چاہا۔ لیکن درخت نہ ٹوٹنا تھا نہ ٹوٹا۔ بندر تو جھٹ سے درخت پر چڑھ گیا اور پھل توڑ کر وہیں سے بولا "میں نہ کہتا تھا کہ میں تم سے بڑا ہوں۔"

یہ سُن کر ہاتھی شرما گیا۔

بندر نے کہا "خیر چلو اب عقلمند اُلّو کے پاس چلیں" ......

اور دونوں اُلّو کے پاس پہونچ گئے۔

بندر نے کہا "چودھری اُلّو یہ لیجئے پھل آ گئے۔"

اُلّو نے کہا "یہ بتاؤ تم یہ پھل کس طرح توڑ کر لائے۔"

ہاتھی نے پورا واقعہ بیان کیا۔

یہ سُن کر اُلّو نے جواب دیا۔

"دیکھا کوئی کسی سے بڑا نہیں۔ ہر ایک کو اپنا کام کرنا چاہئے۔"

بندر نے پھل توڑا تو ہاتھی نے تیر کر دریا پار کیا۔ سب میں الگ الگ ہُنر ہیں۔

لیکن سب کو مل جل کر کام کرنا چاہئے۔

تب ہی مشکل سے مشکل کام پورا ہو سکتا ہے۔

یہ سُن کر بندر اور ہاتھی نے اپنی اپنی راہ لی اور مل جل کر کام کرنے لگے۔

قیصر حسین زیدی۔ کھرگون

یہ بھی گیا اور وہ بھی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک برہمن یاترا کے لئے بنارس جانے لگا۔ اُس کے پاس ایک ہزار روپے تھے۔ ان روپیوں کو وہ اپنے ساتھ نہ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ کسی سچے آدمی کے پاس چھوڑ جانا چاہئے۔ اُس کے گھر کے پاس ایک سادھو رہتا تھا۔ برہمن نے سوچا اس سے بڑھ کر اور کون آدمی سچا ہو سکتا ہے۔

برہمن روپئے لےکر اُس کے پاس پہنچا اور کہا "مہاراج اسے آپ اپنے پاس رکھ لیجئے۔ میں یاترا کے لئے جارہا ہوں۔ لوٹ کر آپ کے پاس سے لے لوں گا" یہ سادھو بولا "مجھے دھن دولت سے کیا مطلب تم اپنا مال کسی اور کے پاس رکھ دو۔" یہ سن کر برہمن کے دل میں سادھو کا بھروسہ اور بڑھ گیا۔ اُس نے سوچا کہ ایسے سچے آدمی کو چھوڑ کر کہاں جائیں۔ اس لئے جب اُس نے سادھو سے کئی بار پوچھا۔ تو وہ کہنے لگا "اچھا تم میرے پاس رکھنا ہی چاہتے ہو تو اسے لے جاکر اُس کونے میں گاڑ دو۔"

برہمن نے اسی طرح اپنا مال گاڑ دیا۔ اور یاترا کیلئے اگلے دن بنارس چلا گیا۔ چار پانچ مہینے کے بعد برہمن لوٹ کر آیا۔ اُس نے سادھو سے اپنا مال مانگا۔ سادھو نے کہا "تم مجھ سے کیوں پوچھتے ہو میں نے تو اُسے چھوا بھی نہیں۔ جہاں تم نے رکھا تھا وہیں دیکھ لو۔ برہمن نے اُس جگہ کو کھود کر دیکھا تو روپئے کا پتہ نہ تھا۔ بیچارہ سر پیٹ کر رہ گیا۔ اب کہے تو کس سے۔ یہی سب بے چارے کی ساری دولت تھی۔ اُس کے پڑوس میں ایک عورت رہتی تھی۔ وہ بڑی سمجھدار تھی۔ برہمن نے رو رو کر اُسے سب واقعہ سنایا۔ وہ عورت جانتی تھی کہ سادھو بڑا دھوکے باز ہے۔ برہمن کی باتیں سن کر کہنے لگی اچھا تم گھبراؤ مت۔ تمھارے روپئے تم کو مل جائینگے

آٹھ دس روز کے بعد ایک دن وہ عورت اپنے سب زیور لےکر برہمن کے گھر آئی اور اُس سے بولی "میں اُسی سادھو کے یہاں جارہی ہوں جب میں وہاں پہنچ جاؤں۔ تو تھوڑی دیر کے بعد تم وہاں آجانا" پھر اُس نے اپنے نوکر سے کہا "جب یہ برہمن سادھو کے یہاں پہنچ جائے تو پانچ دس منٹ کے بعد تم وہاں چلے آنا۔ اور مجھ سے کہنا کہ تمھارے شوہر گھر آگئے ہیں۔ تم جلدی چلو۔"

برہمن اور نوکر کو یہ باتیں سمجھا کر وہ عورت سادھو کے مکان پر چلی گئی۔ اور اس سے بولی۔ مہاراج میرا بھائی گاؤں میں بیحد بیمار ہے۔ میں اُسے دیکھنے کے لئے جانا چاہتی ہوں۔ میرے شوہر بھی پونا گئے ہوئے ہیں۔ اتنا سارا زیور پہن کر نہ تو جا سکتی ہوں۔ اور نہ نوکروں کے بھروسے پر رکھ سکتی ہوں۔ اس لئے میں چاہتی ہوں کہ یہ سب زیورات آپ کے پاس چھوڑ جاؤں" سادھو نے مالا جپتے ہوئے کہا "مجھے دھن دولت سے کیا مطلب تم کسی اور کے پاس اپنا مال رکھ دو" عورت آنکھوں میں آنسو لاکر بولی "مہاراج آپ کے سوا

مجھے اور کسی پر بھروسہ نہیں ہے۔ اس پر سادھو نے کہا "تم ضد کرتی ہو۔ تو جاؤ اپنے زیورات اُس کونے میں گاڑ دو۔"

سادھو اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ برہمن وہاں پہنچ گیا۔ اُس کو دیکھتے ہی سادھو کو ڈر ہوا۔ کہ کہیں یہ اُس کو سچائی کا سب بھید نہ کھول دے۔ جلدی سے بولا "ارے بابا تم بھی کیسے آدمی ہو۔ مال کہاں رکھنے ہو اور دیکھتے کہاں ہو۔ تمھارے جانے کے بعد میں نے کھودا۔ تو تمھارا مال پایا" یہ کہکر اس نے اپنے چیلے کو بُلایا۔ اور کہا وہ ایک ہزار روپے والی تھیلی ان کو دے دو۔

جب چیلے نے تھیلی لاکر برہمن کے ہاتھ میں دی تو وہ عورت اپنے سب زیورات نکال کر ایک کپڑے میں باندھ چکی تھی۔ اُٹھ کر زیورات زمین میں گاڑنے کے لئے جانا ہی چاہتی تھی کہ اُس کا نوکر پہنچ گیا۔ اور بولا "مائی جی سرکار پونا سے واپس آ گئے ہیں۔ جلدی چلو۔"

عورت گھبرا کر بولی۔ آپ کی مہربانی کا شکریہ۔ زیورات کی گٹھری دبائے وہاں سے چلدی پیچھے۔ برہمن بھی گیا۔

اُن کے چلے جانے کے بعد سادھو کا چیلا زور زور سے ہنسنے لگا۔ سادھو نے غصے میں آکر کہا "تجھے کیا مل گیا۔ جو ہنسے جاتا ہے" چیلے نے جواب دیا "مہاراج! میں یہ سوچ کر ہنس رہا ہوں کہ یہ بھی گیا اور وہ بھی گیا۔"

محسن نظام الدین ناخدا
بھڑوچ۔ عمر ۱۳ سال

محنت اور مزدوری

حمید اپنے ماں باپ کا پیارا لڑکا تھا۔ ابھی وہ ۸ سال کا ہوا تھا۔ کہ اُس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کی ماں محنت مزدوری کر کے حمید کو کھلاتی۔ جب حمید بارہ سال کا ہوا تو وہ بھی ایک دُکان پر نوکری کرنے لگا۔ ہر مہینے اس کو ۲۵ روپئے ملا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حمید گھر سے جارہا تھا کہ راستے میں چاندی کے دو روپے ملے۔ وہ اُسے لے کر دُکان پر گیا رات کے بارہ بجے جب وہ دُکان سے آیا۔ تو اس نے سارا قصّہ کہہ سُنایا۔ اُس کی ماں نے کہا "بیٹا یہ روپے جس جگہ سے اُٹھائے ہیں وہاں رکھ دو۔" دوسرے دن حمید نے وہ روپئے وہاں رکھ دیئے۔

جب حمید کے پاس اتنا پیسہ ہوگیا کہ وہ اسکول میں داخل ہوسکے تو وہ ایک اسکول میں داخل ہوگیا۔ وہ بڑی محنت سے پڑھتا جب سالانہ امتحان ہوا تو وہ ہر بد پچے کو اچھی طرح کرتا تھا۔ جب امتحان ختم ہوگئے، اور نتیجہ سنایا گیا۔ تو حمید پورے مدرسے میں اوّل آیا۔ حمید نے خوشی کے مارے پورا نتیجہ بھی نہیں سنا۔ جب وہ گھر جانے لگا۔ لڑکے بولے حمید تم اوّل کیسے آئے۔ حمید بولا جو لڑکا محنت کرے گا وہ اوّل آئے گا۔ حمید نے اپنی ماں کو اپنے اوّل آنے کا نتیجہ سنایا تو اُس کی ماں بہت خوش ہوئی۔

جب حمید کی عمر ۱۴ سال کی ہوئی تو اُسکی ماں کا انتقال ہوگیا۔ اب حمید بہت رویا۔ اُسکے بعد اسکول جانا بند کردیا۔ اور روز صبح اُٹھ کر محنت کرنے جاتا۔ اب اُس کو روزانہ ۷ روپے ملا کرتے۔ اُس میں اچھی طرح زندگی گزارتا۔

سیّد ستار شاہ جامعہ نگر
عمر ۱۱ سال حیدرآباد۔ دکن

اچھا لڑکا

ایک دن ایک لڑکا جنگل سے واپس گھر جا رہا تھا بھوک کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ اتفاق سے راستے میں ایک مٹھائی سے بھرا گھڑا اس کو ملا۔ اُس نے مٹھائی نکالنے کے لئے گھڑے میں ہاتھ ڈالا۔ گھڑے کی گردن چھوٹی تھی اس لئے اس کا ہاتھ اس میں پھنس گیا۔ وہ ایک لڑکا تھا۔ مٹھی بھرا ہوا ہاتھ نکالنا چاہتا تھا مگر ہاتھ نکل نہ سکتا تھا۔ اس نے مٹھی نکالنے کی کوشش کی۔ اور ساتھ ہی گھڑے میں سے ہاتھ نکالنے کی بھی۔ لیکن نہ مٹھی نکلتی تھی اور نہ ہاتھ ہی۔ آخرکار وہ چلّانے لگا۔ اسی وقت کچھ آدمی آگئے۔ اُنھوں نے سمجھایا کہ اتنی مٹھی بھر کر مٹھائی مت نکالو۔ جتنی مٹھائی آسانی سے نکل سکتی ہو اتنی ہی لو۔ لڑکے نے ویسا ہی کیا جیسا اس سے کہا گیا تھا۔ اور اس طرح اس نے کچھ مٹھائی آسانی سے نکال لی۔

زبیر احمد خاں۔ شاہ گنج



مزیدار کہانیوں کی کتابیں

پرندوں کا ایکا

جنگل کی تمام چڑیاں ہوائی جہاز کو بھوت سمجھ کر ڈر گئیں۔ اس بھوت سے بچنے کیلئے انھوں نے کیسی اچھی ترکیب نکالی۔

قیمت چار آنے

جنگو کی بلّی

گنگو تیلی نے مرتے وقت اپنی چیزیں اپنے لڑکوں میں بانٹ دیں۔ سب سے چھوٹے لڑکے جنگو کے حصّے میں صرف ایک بلّی آئی۔

قیمت چھ آنے

ننھا ٹٹو

نٹ کھٹ جمیل نے ایک دن ننھے ٹٹو کو مارا۔ دوسرے دن ٹٹو بکرے نے جمیل کے ٹکر مار کر اس کا بدلہ لے لیا۔

قیمت چار آنے

مرغی اجمیر چلی

کٹ کٹ کٹاک کالی مرغی سے خواب میں کسی نے کہا: "اجمیر شریف جاؤ ورنہ دنیا اُجاڑ ہو جائیگی" صبح اُٹھتے ہی کالی مرغی اجمیر چلدی۔

قیمت پانچ آنے

چھوٹی لالٹین

سڑک کے گڑھے کے آس پاس لگی ہوئی لالٹینوں میں سب سے چھوٹی لالٹین نے لڑکے کی جان بچالی۔ دوسری لالٹینوں نے کیا کیا؟

قیمت پانچ آنے

شہزادہ اور ٹھگ

شہزادے نے ایک لعل کھو دیا۔ بڑی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اسے اچھالال لاکر باپ کو دیا۔ اسکے ساتھ دو اور مزید کہانیاں۔

قیمت آٹھ آنے

چوہوں کی کانفرنس

اس کتاب میں پانچ مزیدار اور چٹ پٹی کہانیاں ہیں اور سب کی سب کہانیاں دلچسپ ہیں۔

قیمت چھ آنے

لومڑی اور خرگوش کی لڑائی

چالاک لومڑی اور خرگوش کی نوک جھونک۔ تھوڑا سا پڑھنے کے بعد چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

قیمت پانچ آنے

ہمّت کے پھل

چھ با ہمت لڑکوں کی سچّی داستان محنت اور ہمت کی وجہ سے دنیا کو بڑے آدمی بن گئے۔

قیمت چھ آنے

معلومات کی کتابیں

سماجی زندگی

بچوں کے لئے مدرسہ کی تعلیم ہی ضروری نہیں بلکہ اس ماحول کی تربیت بھی جس میں اس کی پرورش ہوتی ہے اور جو انکے ذہنوں کو نکھارتی ہے۔

قیمت حصہ اول ۸ ر دوم ۱۰ ر سوم ۱۲ ر

مقناطیس کی کہانی

مقناطیس آدمی کو پتھر کی شکل میں ملا۔ لیکن اس نے اپنی عقل سے اس پتھر کو دیو جیسی طاقت عطا کی اس کا پورا حال اس کتاب میں پڑھئے۔

قیمت آٹھ آنے

بجلی اور مقناطیس کے کھیل

یہ کھیل کیسے ہوتے ہیں اور کس طرح کھیلے جاتے ہیں؟ اس کے لئے آپ "بجلی اور مقناطیس کے کھیل" پڑھئے۔

قیمت دس آنے

دُنیا کے بچے

ان قوموں اور قبیلوں کے حالات جنہیں ابھی دُنیا کی ہوا نہیں لگی۔

قیمت بارہ آنے

دُنیا کے بسنے والے

چوتھے پانچویں درجے کے لڑکوں کے لئے نہایت آسان زبان ہیں۔

قیمت بارہ آنے

قدرت کے کرشمے

بادل بجلی کا کڑکا، ٹوٹنے والے تارے آتش فشاں پہاڑ اور زلزلے سے متعلق جغرافیائی و سائنسی معلومات۔ قیمت دس آنے

معلومات کی کتابوں کا ایک بہترین سیٹ

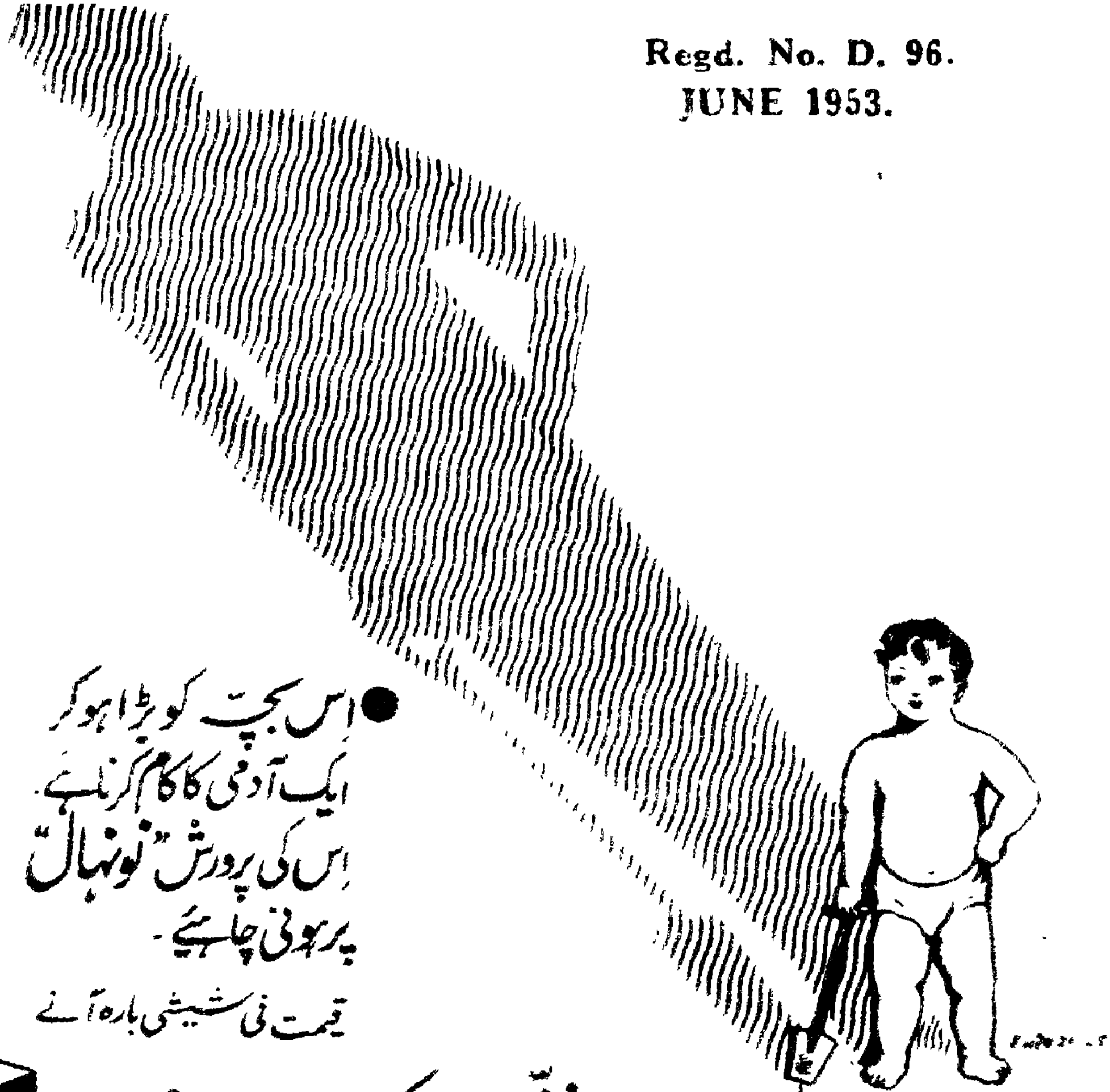
ان میں ہماری اور ہمارے گرد و پیش کی تمام چیزوں مثلاً جانور، درخت، پودے، آسمان، زمین، موسم اور قدرتی قوتوں کا حال بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

معلومات کی پہلی کتاب عہ ۔ معلومات کی دوسری کتاب عہ ۔ معلومات کی تیسری کتاب عہ
معلومات کی چوتھی کتاب عہ ۔ معلومات کی پانچویں کتاب عہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، دہلی



Regd. No. D. 96.
JUNE 1953.



پیام تعلیم

دہلی





وایم ایورسٹ ٹین سدگه لورے

جامعہ ملیہ اسلامیہ

حامد علی خاں بی اے (جامعہ)

اطہر پرویز

ایم اے (علیگ)

پیام تعلیم

جولائی ۵۳ء



فہرست

چندہ سالانہ چار روپے

فی پرچہ چھ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی



بچّوں سے باتیں

آپ نے پچھلے مہینے کے پرچے میں ماؤنٹ ایورسٹ کی فتح کی خبر پڑھی تھی۔ اب اس کا پورا حال محسن حامد کے مضمون میں پڑھئے۔ محسن حامد صاحب نے آپ کی دلچسپی اور معلومات کے لئے اس کی پوری کہانی لکھ دی ہے۔ ایورسٹ پر چڑھنے کی یہ گیارہویں کوشش تھی۔ اس مرتبہ چودہ آدمیوں کی ایک جماعت اپنے بلند مقصد میں کامیاب ہو گئی، اور انسان کے قدم وہاں پہنچ گئے، جہاں اب تک ان کی پہنچ نہ ہوئی تھی۔

ایورسٹ کی اس مہم میں جو لوگ شریک تھے ان میں سے مسٹر بورڈ یلین کے علاوہ سب ہندوستان آئے ہوئے ہیں اور دلّی میں ان کے اعزاز میں پارٹیاں ہو رہی ہیں۔ اس فتح کی خوشی میں ان کو تمغے اور انعامات دئے جا رہے ہیں۔ ہمارے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اس مہم کے رہنما سرجان ہنٹ، سرجان ہلاری اور شیرپا تین سنگ کو خصوصی میڈل دئے۔ اس کے علاوہ مہم میں شریک ہونے والے

تمام ممبروں کو انعامات دئے اور اُن کو راشٹرپتی بھون میں چاء کی دعوت دی۔

ہمارے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی تقریر میں ان کی اس مہم کو سراہا ہے اور اس پوری جماعت کو مبارک باد دی جس کی باہمی مدد کے بغیر یہ کام نہ ہو سکتا تھا۔

یہ کوشش ہم کو بہت کچھ سکھاتی ہے کتنی بار انسانوں نے کوشش کی کہ اس چوٹی پر پہنچ جائیں جہاں ہر دم برفیلی ہوائیں چلتی ہیں۔ جہاں انسان کے لئے سانس لینا بھی ممکن نہیں رہتا۔ مگر اس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ پھر بھی انسان نا امید نہ ہوا۔ اس نے اپنی کوششوں کو اس کے بعد بھی جاری رکھا اور بالآخر انسان کے ان ارادوں کو کامیابی ہوئی اور اس چوٹی کا سر انسان کی کوششوں کے سامنے جھک گیا۔ محنت کبھی رائگاں نہیں جاتی، ناکامیابی سے ہمیں نا امید نہ ہونا چاہیے۔ ہمیں تو اپنی ناکامیابی سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ہمیں اس سے تجربے ملتے ہیں۔ ایورسٹ پر چڑھنے کی اس سے پہلے دس بار کوششیں ہوئیں، وہ کامیاب نہیں ہوئیں، لیکن انھوں نے اس موجودہ جماعت کو اپنے تجربے دئے۔ جن سے فائدہ اٹھا کر مسٹر جان ہنٹ کی رہنمائی میں یہ جماعت ایورسٹ کی چوٹی کو سر کرنے میں کامیاب ہوئی۔

پچھلے سال سوئزرلینڈ سے ایک جماعت آئی تھی جو کامیاب نہ ہو سکی تھی مگر سر جان ہنٹ نے ان کے تجربوں سے جو کچھ سیکھا اس کا اندازہ ان کے ایک جملے سے ہی ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ "در اصل ہم نے یہ کامیابی سوئزرلینڈ کے ان ساتھیوں کے کاندھوں پر چڑھ کر حاصل کی ہے"

آج جب ہم سر جان ہنٹ اور اُن کے ساتھیوں کو مبارک باد دے رہے ہیں تو ہمیں ان آدمیوں کو بھی نہ بھولنا چاہیے جنھوں نے اس سے پہلے دس بار اپنی جان کو خطرے میں ڈالا، کتنے آدمیوں کی جانیں گئیں، کتنی جماعتیں پھر لوٹ کر بھی نہ آسکیں۔ اور تب کہیں یہ تجربے ملے جن سے بعد میں فائدہ اٹھایا گیا۔

محسن حامد

انسان کے قدم ایورسٹ کی چوٹی پر



ہندوستان کے شمال میں ہمالیہ پہاڑ کی ماؤنٹ ایورسٹ دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ ہے۔ اس کی اونچائی ۲۹۰۰۲ فٹ ہے۔ پچھلے تیس برس میں دنیا کے مختلف ملکوں کے لوگ اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور تقریباً دس بار اس اونچی چوٹی کو سر کرنے کے لئے کوششیں کی گئیں۔ لیکن سب کوششیں ناکامیاب ہوئیں۔

پچھلے سالوں کی طرح اس سال بھی چودہ ممبروں کی ایک ٹیم برٹش ایورسٹ ایکسپیڈیشن کے زیرِ اہتمام دنیا کی اس اونچی چوٹی کو فتح کرنے کے لئے بھیجی گئی جس کے لیڈر کرنل ہنٹ ہیں جو پہاڑوں پر چڑھنے کے ہنر سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس ٹیم نے ۲۹ مئی کو ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کر لیا۔ ایورسٹ پر چڑھنے والوں کی ٹیم چنتے وقت اس چیز کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا کہ اس میں اچھے سائنس داں، جغرافیہ داں، ڈاکٹر اور پھر زیادہ سے زیادہ اونچائی پر چڑھ سکنے والے آدمیوں کو شامل کیا جائے۔ تاکہ وقت ضرورت اُن میں سے ہر ایک کے علم و ہنر سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ایک یا دو آدمیوں کو ماؤنٹ ایورسٹ کا فاتح کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ بلکہ ماؤنٹ ایورسٹ فتح کر لینے کا سہرا ٹیم کے سر ہے۔

چند روز ہوئے مسٹر ہلاری کو برطانوی حکومت نے "سر" کا خطاب دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ چوٹی تک پہنچ گئے تھے۔ مگر اُن کی بیوی نے بہت اچھا بیان دیا ہے۔ وہ کہتی ہیں۔

"ایورسٹ کی فتح ٹیم کی فتح ہے۔ اس لئے ٹیم کے ہر ممبر کو سر کا خطاب ملنا چاہیئے"

اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھنے میں بڑی رکاوٹ سب سے زیادہ آکسیجن کی کمی ہوتی ہے۔ آکسیجن ایک گیس ہے۔ جو ہوا میں موجود ہے۔ اور یہ گیس جانداروں کی زندگی کے لئے ضروری ہے لیکن جوں جوں اونچائی بڑھتی جاتی ہے اس گیس کی کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور ۲۵-۲۶ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچنے کے بعد تو یہ گیس ہوا میں اتنی کم ہوجاتی ہے کہ سانس بھی نہیں لے سکتے۔ اسی لئے اِن لوگوں کو جو چوٹی تک جانا چاہتے ہیں۔ اپنے ساتھ آکسیجن اُٹھا کرنے والے آلے لے جانے پڑتے ہیں۔ اونچے اونچے پہاڑوں پر جہاں سال بھر برف گرتی رہتی ہے۔ اتنی سردی ہوتی ہے اتنی سردی ہوتی ہے کہ ٹمپریچر ۰ فارن ہائٹ سے بھی کئی درجے نیچے رہتا ہے۔ پھر برفیلی ہوائیں ایک ایک قدم آگے بڑھنا مشکل کر دیتی ہیں۔ ایسی جگہ پر اچھے سے اچھا گرم کپڑا سردی کی روک تھام نہیں کرسکتا۔ اس لئے انہوں نے ایک خاص قسم کے کپڑے برطانیہ کی کئی بڑی بڑی کمپنیوں کی مدد سے بنوائے۔ یہ کپڑے خوفناک سردی سے بچانے کے ساتھ ساتھ ہلکے بھی ہوں اور تیز ہواؤں کے دباؤ کو بھی برداشت کر سکیں۔

اس لئے ایک خاص قسم کے تاگے سے باہری لباس بنایا گیا جو ہوا کے دباؤ اور اندر پہنے ہوئے کپڑوں کو بھیگنے سے بچا سکے۔ ہوا کے دباؤ کے تجربے کے لئے ۶۵ میل فی گھنٹہ کے حساب سے ہوا کے جھکڑ مشینوں کے ذریعہ اس کپڑے پر چلائے گئے۔ اس کپڑے کا استر سو فی صدی نائی لن (NYLON) سے بنایا گیا جو ہلکا ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط اور ہر قسم کے برفانی موسم کے لئے موزوں تھا۔ ایک اور بڑی دشواری جوتوں کی تھی جوتے دو قسم کے بنائے گئے۔ ایک وہ جو ۲۳ ہزار فٹ کی اونچائی تک استعمال کئے جائیں اور دوسرے وہ جو ۲۳ ہزار فٹ سے زیادہ اونچائی پر استعمال کئے جاسکیں۔ پہلی قسم کے جوتوں میں ایک خاص طرح کا چمڑا استعمال کیا گیا جو سردی میں سکڑ اور اکڑ نہ سکے۔ ان جوتوں کا اوپری حصہ بھی دو چمڑوں کو ملا کر بنایا گیا جن کے بیچ میں سمور لگایا گیا تھا۔ دوسری قسم کے جوتے یعنی زیادہ اونچائی پر استعمال کرنے کے لئے برطانیہ کی ایک بہت

بڑی کمپنی نے دن اور رات کی محنت کے بعد تیار کیے۔ ان کا وزن ساڑھے سیر تھا۔ جوتوں میں چمڑے پیڈ اور ربڑ لگایا گیا تاکہ سردی اور پانی سے بچ سکیں کپڑوں، جوتوں اور آکسیجن اکٹھا کرنے والے آلوں کے علاوہ پیغام بھیجنے والے آلے۔ کھانے کے ڈبے۔ خاص طور سے بنوائے ہوئے کھانا پکانے کے برتن (COKERS) ضروری دوائیں اور چھوٹی چھوٹی دوسری سینکڑوں چیزوں کا انتظام کیا گیا۔ اور اس سے پہلے ان کو ایلپس پہاڑ (ALPS) اور ناروے میں استعمال کیا گیا۔ تاکہ بعد میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

سامان کے انتظام کے بعد قلیوں کا دوسرا مسئلہ تھا جو اس سامان کو لے کر زیادہ سے زیادہ اونچائیوں پر چڑھ سکیں۔ اس سلسلے میں پہلی مہموں پر جانے والی ٹیموں [illegible] منظم کیا گیا شیرپا قبیلے کے لوگ بہت اچھے چڑھنے والے پہاڑ [illegible] ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نیپال کے مشرقی ضلع [illegible] کے رہنے والے تھے۔ لیکن اب روزی کمانے کے لئے دارجلنگ میں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر ہمالیہ کی مہموں میں مختلف ٹیموں کے ساتھ پہلے بھی ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھائی کر چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس سال بھی "برٹش ایورسٹ ایکسپیڈیشن" والوں نے ان ہی لوگوں کو اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ان لوگوں کا کام خیمے گاڑنا۔ کھانے پینے کا سامان چوٹی تک لے جانا اور ایک کیمپ سے دوسرے کیمپ تک پیغامات لانا۔ اور لے جانا تھا۔ ان قلیوں کے انتظام کرنے والے تین سنگھ تھے۔ جو خود اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جو اس مہم سے پہلے بھی چھ دفعہ مختلف ٹیموں کے ساتھ ایورسٹ پر چڑھنے کی کوشش کر چکے تھے۔



جب ہر چیز کا پورا پورا انتظام ہو گیا تو آدمیوں کی یہ ٹیم سر ہنٹ کی رہنمائی میں نیپال کی راجدھانی کھٹمنڈو سے ایورسٹ کی چوٹی کو سر کرنے کے لئے روانہ ہوئی۔



کھٹمنڈو سے ۱۷۰ میل دور "تھی اانگ بوچ" (THYANG BOCH) پر ان لوگوں نے اپنا پہلا یا بنیادی کیمپ لگایا۔ یہ کیمپ تھوڑے فاصلے پر اس لئے لگائے جاتے ہیں کہ اگر کسی وجہ سے پارٹی کے کسی آدمی یا قلی کی طبیعت خراب ہو جائے تو اس کو آسانی سے نیچے کے کیمپ میں بھیج دیا جائے۔ ہر کیمپ پر کھانے کی چیزوں دوائیں اور رات بسر کرنے کے لئے کپڑوں کا انتظام ہوتا ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ آخری کیمپ چوٹی کے جتنا قریب ہو سکے لگایا جائے تاکہ رات وہاں گذارنے کے بعد دوسرے دن صبح ہی چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کی جائے اور شام ہونے سے پہلے ہی آخری کیمپ تک واپس آسکیں۔

"برٹش ایورسٹ ایکسپیڈیشن" کے ممبروں نے اپنا آخری کیمپ ۲۷۹۰۰ فٹ کی بلندی پر لگایا تھا۔ یہاں سے چوٹی تک پہنچنے کے لئے مزید ۱۱۰۲ فٹ چڑھنا رہ جاتا تھا۔ سر ہنٹ نے اب ایسے چار آدمی چنے جو زیادہ تھکے نہ تھے اور آگے چڑھ سکتے تھے۔ ان چار آدمیوں میں بھی دو ٹیمیں بنائی گئیں۔ پہلی ٹیم میں ایونس اور بورڈیلین تھے۔

اور دوسری ٹیم میں تین سنگھ اور ہلاری سب سے پہلی تجویز یہ تھی کہ پہلے چوٹی پر پہنچنے کی ایونس اور بوردِلیون کوشش کریں گے اور اگر یہ ناکامیاب رہے تو دوسری کوشش تین سنگ اور ہلاری کریں گے پہلی کوشش ناکامیاب ثابت ہوئی۔ اس لئے دوسری کوشش ۲۹ مئی کو تین سنگ اور ہلاری نے کی جو ان لوگوں کو دنیا کی سب سے اونچی چوٹی تک لے گئی۔ اس کا بیان خود ہلاری کی زبانی سنیے۔

"صبح کے ساڑھے ۔ ات بجے ہوں گے۔ ہم دونوں اپنے خیمے سے باہر نکل آئے۔ چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ آکسیجن مہیا کرنے والے آلوں کو ہم نے اپنی پیٹھ پر لاد لیا۔ اور بٹن دبا کر آکسیجن کو اپنے پھیپھڑوں میں داخل ہونے دیا۔ کچھ لمبی سانسیں لیں۔ اب ہم چڑھنے کے لئے تیار تھے۔

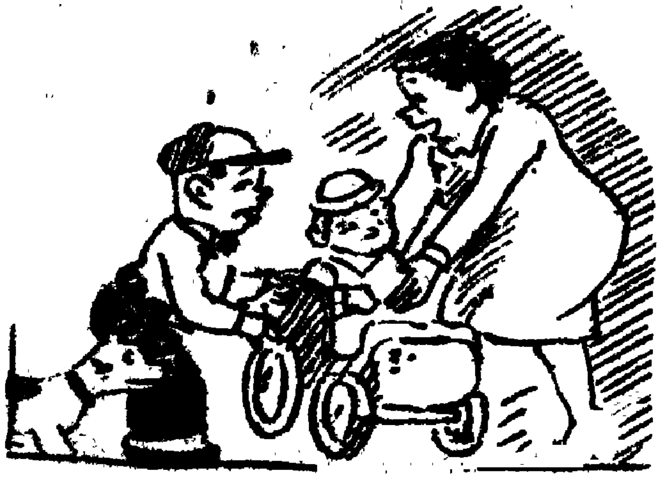
"ہم لوگ آہستہ آہستہ مگر مستقل مزاجی سے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ رات کی تازہ گرمی برف پر آگے بڑھنا بڑا تکلیف دہ ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا خطرناک بھی تھا۔ اسی طرح ہم لوگ [illegible] چوٹی پر پہنچنے کے لئے [illegible] احتیاط [illegible] سے [illegible] [illegible] زیادہ خطرناک ہوتا چلا جا رہا تھا۔ چڑھائی بھی سیدھی (STEEP) اور مشکل ہو گئی تھی۔ لیکن ہم دونوں نے طے کر لیا تھا کہ چوٹی پر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ اچانک برف جس پر ہم چل رہے تھے قدموں کے نیچے سخت معلوم ہونے لگی۔ اب ہم لوگ چوٹی پر پہنچ گئے تھے۔ میں نے اپنی گھڑی دیکھی صبح کے نو بجے تھے۔"

اور پھر یہ دونوں نوجوان ہلاری اور تین سنگ دنیا کی سب سے بڑی چوٹی پر تقریباً بیس منٹ رہے، اور اس وقت اُن کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔ یہی تو وہ جگہ تھی جہاں تک پہنچنے کے لئے انسان کتنے دنوں سے کوشش کر رہا تھا جس پر اس سے پہلے انسان کے قدم بھی نہ پہنچے تھے۔ ہلاری اور تین سنگ نے وہاں اپنے پاؤں کے نشان ہی نہیں چھوڑے بلکہ اقوامِ متحدہ ہندوستان، نیپال اور برطانیہ کے قومی جھنڈے بھی گاڑ دیئے۔ اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ آج ساری دنیا ان چہرہ فاتحوں کے نام بڑی عزت کے ساتھ لے رہی ہے ہر ملک ان کی عزت افزائی کر رہا ہے۔ خطابات میڈل اور انعامات مل رہے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر انسان کی بڑائی کو اور بڑھا دیا۔

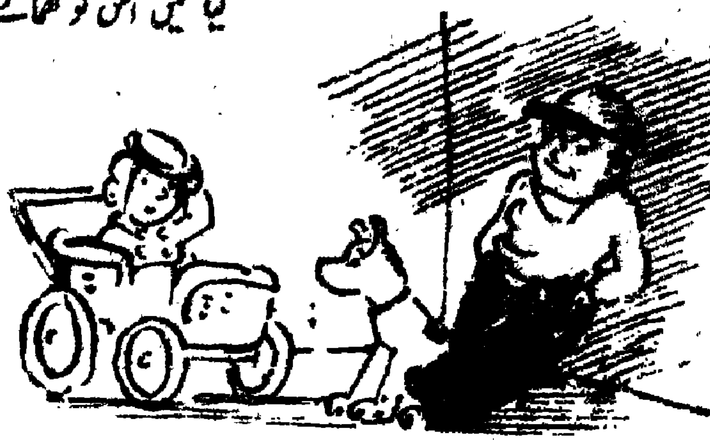
چچی کا بچہ



تمہاری چچی اپنے بچے کو چھوڑ کر بازار گئی ہیں۔ ذرا اس کی خبر رکھنا۔
میں ؟



کیا میں اس کو گھمانے لے جاؤں، جہاں لڑکے مجھے دیکھیں گے۔
ہاں، ہاں۔ سڑک پر جاؤ۔



اگر لڑکوں نے مجھے آیا گیری کرتے دیکھا تو مذاق بنائیں گے
...... اچھا !



اب مشکل ہے۔


اب کون پہچان سکتا ہے ؟
بہت خوب !
مگر یہ تو ٹھیک نہیں۔ تمہیں دیکھ کر لوگ مجھے پہچان لیں گے۔
مگر یہ تم کیوں روتے ہو ؟.......
اچھا اب تو ٹھیک ہے ؟
اب کیا ؟ ۔ معلوم ہوتا ہے ہم لوگوں کا ساتھ ہی اسے پسند نہیں

ہمت




قدم اپنا آگے بڑھا کر تو دیکھو
مقدر کو تم آزما کر تو دیکھو

کبھی اپنی ہمت کو ہارو نہ اب تم　　زمانے سے بازی لگا کر تو دیکھو
سخاوت سے حاتم کی شہرت ہوئی ہے　　رہِ حق میں دولت لٹا کر تو دیکھو
نتیجہ بخالت کا قارون نے پایا　　زمیں میں خزانہ چھپا کر تو دیکھو
جہالت جہاں سے مٹانی اگر ہے　　نصیحت کو اپنی سنا کر تو دیکھو

قمرؔ درگہِ حق سے پاؤ گے اجرت
دل و جاں اس پر لٹا کر تو دیکھو

سید فخر الاسلام قمرؔ

نگین چند

کالی داس

۱

سنسکرت ہمارے ملک کی پرانی زبان ہے۔ آج کل تو ہندوستان میں سنسکرت بولنے اور لکھنے والے شاید انگلیوں پر گنے جا سکتے ہوں لیکن ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب سنسکرت عام بول چال تھی۔ اس زمانے میں یہ سرکاری زبان بھی تھی اور اس میں اچھی کتابیں لکھی جا رہی تھیں۔ کالی داس سنسکرت زبان کے سب سے بڑے ادیب ہیں۔ انہیں شاعروں کا استاد مانا جاتا ہے۔

کالی داس کی زندگی کے بارے میں ابھی تک پوری معلومات نہیں ہو سکی ہیں۔ اسی لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ وہ کب اور کہاں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر وقت کہاں گزارا اور کس راجہ کے دربار میں رہے۔

ان کے والدین اور دوسرے رشتے داروں کے بارے میں ایسی کوئی چیز نہیں ملتی جس سے ہمیں اس بڑے ادیب کی زندگی اور خیالات پر روشنی پڑ سکے۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں اپنے ذاتی تجربوں کو اس طرح گھلا ملا دیا ہے کہ ان کی مدد سے بھی زندگی کا

کوئی خاکہ تیار نہیں کیا جا سکتا۔ اب تک ان کے بارے میں جو کچھ پتہ چل سکتا ہے۔ اُن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ کالی داس چندر گپت وکرمادتیہ دوم کے درباری شاعر تھے اور انھوں نے اجین، مگدھ اور ہمالیہ اور گنگا کی وادی میں اپنی زندگی کا زیادہ تر وقت گذارا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ان کا نام کالی داس نہیں تھا۔ وہ کالی دیوی کی پوجا کرتے تھے اور اسی وجہ سے انھیں کالی داس کہا جاتا ہے۔

کالی داس کی مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں۔ رگھوونش، کمار سمبھو، میگھ دوت، مالوکاگنیر، وکرموورشیہ رتوسنگھار، اور ابھگیان شکنتلا۔ ان میں سے رگھوونش اور کمار سمبھو بڑی بڑی نظمیں ہیں۔ رگھوونش کے ۱۹ حصے ہیں۔ اس میں رام چندر جی اور ان کے خاندان کے دوسرے لوگوں کے حالات درج ہیں۔ کالی داس نے اس بڑے خاندان کی جو تصویر کھینچی ہے۔ اُن سے اُن کی عظمت، دلیری، وفاداری، بلند خیالی کا پورا پورا احساس ہوتا ہے۔

"کمار سمبھو" میں شیو اور پاروتی کی شادی اور ان کے بیٹے کمار کی بہادری کی کہانی ہے۔ پاروتی نے شیو کو پانے کے لئے بہت کڑی تپسیا کی۔ آخر کار انھیں کامیابی ہوئی۔ کمار سمبھو میں پاروتی کی تپسیا کا حال بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

"میگھ دوت" میں ایک شخص جو اپنے گھر سے نکال دیا گیا تھا، اپنا پیغام اپنی بیوی کو بھیجتا ہے۔

رتوسنگھار میں ہندوستان کے مختلف موسموں کی تصویر کھینچی گئی ہے۔

مالوکاگنیر، وکرموورشی اور ابھگیان شکنتلا، کالی داس کے لکھے ہوئے ڈرامے ہیں۔ پہلے ڈرامے میں مہاراج اگنی متر، اور راج کمار مالوکا اور مہاراج پرورکھا اور حور اروشی اور تیسرے ڈرامے میں مہاراج دشنت اور شکنتلا کی کہانی ہے۔

شکنتلا، کالی داس کا سب سے مشہور ڈرامہ ہے۔ اس کا ترجمہ دنیا کی اکثر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اور دیس بدیس کے لوگوں نے اس ڈرامے کی بہت تعریف کی ہے۔ سنسکرت کی ایک کہاوت کے مطابق "ادب میں ڈراما سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اور ڈراموں میں شکنتلا سب سے اچھا ہے۔ شکنتلا میں چوتھا باب سب سے اچھا ہے اور اس باب میں ۴ اشلوک سب سے اچھے ہیں۔ آیئے آپ کو بھی یہ چار اشلوک سنائیں۔

پہلے میں کنو رشی نے شکنتلا کو پالا تھا پیڑ پودوں کو خطاب کرتے ہیں اس لئے کہ شکنتلا اب کنو رشی کے آشرم سے رخصت ہو کر اپنے شوہر دشینت کے پاس جا رہی ہے بیٹی باپ سے رخصت ہو رہی ہے تو کنو رشی کہتے ہیں

"اے پیڑ پودو! جو شکنتلا تمہیں پانی سے سینچے بغیر خود پانی نہیں پیتی تھی، جو زیور پہننے کا شوق رکھتے ہوئے بھی اپنے لئے تمہارے پھول پتے نہیں توڑتی تھی اور جو تمہاری نئی کلیوں کو دیکھ کر پھولی نہیں سماتی تھی، وہ شکنتلا آج یہاں سے جا رہی ہے۔ آؤ! اسے پیار سے رخصت کر دو۔"

دوسرے اشلوک میں کنو رشی دشینت کے نام پیغام بھیجتے ہیں

"اے راجا! کہاں ہم سیدھے سادے جنگلوں میں رہنے والے رشی منی اور کہاں آپ جیسے اونچے گھرانے کے راجا! پھر بھی آپ نے اپنی خوشی سے ہماری اس لڑکی کے ساتھ شادی کی ہے۔ اس لئے آپ کم سے کم اپنی دوسری رانیوں کے برابر تو شکنتلا کی عزت کیجئے گا۔ اس سے زیادہ تو اس کی قسمت کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے لئے بھلا ہم لوگ کیا کہہ سکتے ہیں"

تیسرے اشلوک میں کنو شکنتلا سے کہتے ہیں۔ "بیٹی، شوہر کے گھر پہنچ کر سب بڑے بوڑھوں کی خدمت کرنا، راجا کی دوسری ساتھیوں کے ساتھ بھی محبت کا سلوک کرنا، تمہارے شوہر تم سے ناراض بھی ہوں تب بھی تم ان سے نہ جھگڑنا، اپنے نوکر اور نوکرانیوں کو پیار سے رکھنا اور اپنی خوش قسمتی پر کبھی گھمنڈ نہ کرنا۔ جو عورت ان اصولوں پر چلتی ہے وہی صحیح مانی جاتی ہے، گھر کی دیوی ہوتی ہے۔ اور جو عورت ان باتوں کے خلاف چلتی ہے وہ اپنے خاندان پر دھبا لگاتی ہے۔"

چوتھے اور آخری اشلوک میں کنو کہتے ہیں

"لڑکی تو پرایا دھن ہے۔ آج شکنتلا کو اس کے گھر بھیج کر مجھے بے فکری ہوئی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کسی کی امانت دینے پر ہوتی ہے۔"

ان لفظوں میں ایک باپ کے دل کی کتنی سچی تصویر ہے۔

کالی داس نے اپنی کتابوں کے لئے جو

کہانیاں نہیں گڑھیں۔ انھوں نے تو عوام میں مقبول کہانیوں کو ہی پیش کیا ہے۔ البتہ ان میں طرح طرح کے رنگ بھرے۔ انھیں بنایا سنوارا اور نئی زندگی دی۔

کالی داس نے اپنی زندگی میں بہت کچھ دیکھا تھا اور اسی لئے انہوں نے اپنی کتابوں میں جو لکھا ہے ہر پڑھنے والے کو اپنے دل کی بات معلوم ہوتی ہے

کالی داس صرف ہندوستان کے ہی نہیں ساری دنیا کے تھے اور ان کی کتابیں ہماری ہونے کے ساتھ ساتھ سب کی ہیں۔

(صفحہ ۱۴ کا بقیہ)

کہ اس کو ہاتھ میں لے کر انسان جو چاہے بن سکتا ہے اور جو چاہے منگوا سکتا ہے۔ یہ سن کر نجیب نے خوشی خوشی دیو کو مارنے کی کہانی کہہ سنائی۔

من کی مدد سے نجیب اور شہزادی دو ہی منٹ میں مصر واپس پہنچ گئے۔ نجیب نے سنا کہ لوگوں نے اس کے بھائی کو جیل میں قید کر دیا ہے۔ نجیب نے اپنے بھائی لطیف کو جیل سے نکلوایا۔ اور ہاتھ جوڑ کر بولا...

"بھائی جان! میرے لائق کوئی خدمت ہو میں حاضر ہوں!" لطیف نے نجیب کو چھاتی سے لگایا۔ مگر شرم سے اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ آخر لطیف پھر بادشاہ بنا اور نجیب اس کا وزیر اعظم پھر لطیف نے نجیب کی شادی اسی لڑکی سے بڑی دھوم دھام سے کر دی۔ اور سب لوگ ہنسی خوشی رہنے لگے

کوہِ نور کی کہانی خود اس کی زبانی

میں دنیا کے جواہرات کا سرتاج ہوں۔ مجھے کوہِ نور کہتے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ میرا اصلی نام نہیں ہے۔ اُن کے قول کے مطابق میرا پرانا نام کچھ اور ہوگا مجھے یاد نہیں۔ ہزاروں برس کی بات کون یاد رکھے؟ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا یہی نام سُنا جو آج مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ نام نادر شاہ نے رکھا تھا۔ مجھے اس سے کیا؟ کسی نے بھی رکھا ہو۔ مگر مجھے یہ نام بہت پسند ہے۔



میرا وطن ہندوستان ہے۔ گولکنڈے کی ایک کان نے مجھے جنم دیا سینکڑوں برس میں نے مالوہ کے راجاؤں کے محلوں میں گزارے۔ سولہویں صدی میں میں مغل بادشاہوں کے ہاتھ پڑا۔ دو سو برسوں سے زیادہ ان کی حکومت کا عروج و زوال دیکھ کر نادر شاہ کے پنجے میں پھنس گیا۔ اس طرح پہلی مرتبہ گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ مگر نادر شاہ کا خاندان میری حفاظت نہ کر سکا اور جلد ہی احمد شاہ درانی کے محل میں منتقل ہو گیا۔ اب میرا دوسرا وطن افغانستان بن گیا۔ جہاں میں شاہ شجاع کے عہد تک رہا۔ اس پوری مدت میں وطن کی محبت میرے دل سے نہ [illegible]

میں ہندوستان آنے کے لئے بے چین رہتا تھا
خدا نے میری فریاد سن لی۔ اور ایک مرتبہ پھر
مہاراجہ رنجیت سنگھ کی پگڑی کی زینت بننے
کے لئے میں ہندوستان آگیا۔ اس وقت میں



بہت خوش
تھا لیکن یہ خوشی
مستقل نہ ثابت ہوئی۔
اس مرتبہ مجھے ہندوستان کی
آب و ہوا راس نہ آئی۔ ہندوستان
پر انگریزوں کا قبضہ میری غلامی اور جلاوطنی قریب

قریب ایک سال کے بعد ۱۸۵۰ء میں مجھے اپنے
پیارے وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ اور میں سات سمندر پار
کا سفر طے کرکے ملکہ وکٹوریہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔



اس طرح مجھے اس کی تو خوشی ہے کہ ہندوستان کے غدر کا
خونی منظر میں نے نہ دیکھا مگر وہاں مجھ پر یہ ستم ضرور ٹوٹا کہ
میرے دو حصے کر دیئے گئے۔ پھر بھی مجھے جگہ برطانوی تاج ہی
میں دی گئی۔ یہ تاج میرے لئے خاص طور پر بنوایا گیا تھا۔
یہاں میں آج تک قائم ہوں۔

انگلستان آتے ہوئے مجھے سو برس سے زیادہ ہو گئے۔
اب تک میں برطانیہ کے پانچ حکمرانوں کے
سروں پر چمک چکا ہوں۔ وکٹوریہ، ایڈورڈ ہفتم
ایڈورڈ ہشتم۔ جارج پنجم۔ اور جارج ششم کے
عہد دیکھ چکا

آج ملکہ ایلزبیتھ کے تاج کی رونق ہوں ۔



ہمیشہ کی طرح آج بھی میں دنیا کا سب سے قیمتی اور بڑا پتھر ہوں ۔ قد، وزن اور قیمت کے اعتبار سے ابھی تک میرا کوئی حریف پیدا نہیں ہوا میری شکل انڈے جیسی ہے ۔ قد میں ڈیڑھ انچ لمبا اور نصف انچ اونچا اور چوڑا ہوں ۔ وزن ۳ ۱/۲ تولے کے قریب ہے اور قیمت ؟ اس کا اندازہ آپ ہی لگا لیجئے ۔ اتنا اشارہ میں کئے دیتا ہوں کہ اب سے تقریباً سوا سو برس پیشتر میری قیمت کا تخمینہ ۳۰ لاکھ پونڈ (تقریباً چار کروڑ روپے) تھا یہی وجہ ہے کہ میں کبھی کسی کے ہاتھ نہ آسکا اور پیدائش سے لے کر آج تک بادشاہوں کے تاج کی زینت بنا رہا ۔

میں اتنی بلندی پر ہوتے ہوئے بھی خوش نہیں ہوں ۔ اپنے وطن کی یاد میں تڑپتا ہوں اور خدا سے دعا مانگا کرتا ہوں کہ مجھے پھر میرے وطن میں پہنچا دے کاش میری یہ دعا قبول ہو جائے ۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ

— دنیا میں چار ہزار قسم کے سانپ پائے جاتے ہیں — دنیا کی عمر ۲ کروڑ سال بتائی جاتی — بچہ ایک سال کی عمر میں جس تیزی سے سیکھتا ہے باقی عمر میں اتنی تیزی سے نہیں سیکھتا — ایک بھاری بم گرانے والے ہوائی جہاز پر جو رقم خرچ ہوتی ہے ۔ اس سے ۳۰ مدرسوں کی پکی عمارتیں، دو میل سیمنٹ کی پچاس میل لمبی سڑک اور دو بجلی گھر بن سکتے ہیں ۔ — انسان کے سر پر لگ بھگ ایک لاکھ چالیس ہزار بال ہوتے ہیں ۔ — دنیا کا سب سے پرانا اخبار "پیکنگ گزٹ" ہے ۔ جو چین سے نکلتا ہے ۔


کیوں صاحب آپ کا روزہ ہے
جی حضرت ابھی تو میں زندہ ہوں۔ اور معمولی آدمی ہوں۔ روضہ تو تاج بی بی۔ اکبر، شاہجہان وغیرہ کا ہوگا۔
عصمت نواز احمد انصاری

احسن حامد

بہت پرانی تہذیب



اب سے کوئی پچاس ساٹھ سال پہلے تک لوگوں کا یہ خیال تھا کہ جس زمانے میں مصر، یونان اور چین میں تہذیب کا دور دورا تھا، ہندوستان میں لوگ وحشیوں کی سی زندگی گزارتے تھے۔ مگر پچھلے سالوں میں دریائے سندھ کے ایک علاقے موہن جوداڑو میں کوئی پانچ ہزار برس پہلے کا ایک پورا شہر زمین کے نیچے سے نکلا۔ اس کے بعد دنیا والوں کو اس کا پورا یقین ہو گیا کہ ہندوستان میں بھی اس زمانے کے بسنے والے کسی طرح بھی چین، مصر اور یونان سے پیچھے نہ تھے۔

آپ نقشہ دیکھیں، تو پرانے زمانے میں ساری مہذب لوگوں کی بستیاں کسی نہ کسی بڑے دریا کے کنارے آباد نظر آئیں گی۔ یہ لوگ چین میں دریائے یانگ سی کیانگ، مصر میں دریائے نیل اور عراق میں دجلہ و فرات کے کنارے آباد تھے۔ اس کی وجہ سمجھنا کوئی مشکل نہیں، دریاؤں کے آس پاس کی زمین بہت زرخیز ہوتی ہے اور اس پر کم سے کم محنت سے زیادہ پیداوار کی جا سکتی ہے۔ اور پھر ان دریاؤں ہی سے سامان ادھر سے ادھر لانے لے

جانے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ پہلے زمانے میں آبادی کم تھی اور زمین زیادہ اس لئے اچھی زمین کو چھوڑ کر معمولی زمین پر کھیتی باڑی کرنا کون پسند کرتا۔

ہندوستان کی پرانی تہذیب کا گہوارہ موہن جودارو بھی دریائے سندھ کے کنارے بسا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کب اور کیسے یہ مٹی کے نیچے دب گیا اور اس کا نام و نشان بھی مٹ گیا۔ اب محکمہ آثار قدیمہ نے مٹی تلے سے نکال کر دنیا والوں کو ایک اور مہذب قوم کا پتہ نشان بتایا۔

نئے شہروں کی تو آپ نے بہت سیر کی ہو گی۔ ذرا اس اجڑی ہوئی بستی کو بھی دیکھ ڈالئے۔

سب سے پہلے اس شہر کی سڑکیں اور گلیاں ہیں دیکھئے خوب کھلی کھلی اور سیدھی سڑکیں ہیں۔ برسات کا پانی بہنے کے لئے بڑی بڑی نالیاں ہیں۔ یہ نہیں کہ ادھر پانی برسا اور ادھر گلیوں میں ندی بہنے لگے۔

دیکھئے ذرا اس سامنے والے گھر میں پکی چوڑی اینٹوں کا یہ دو منزلہ باہر سے ہی کتنا شاندار نظر آتا ہے اس میں چھوٹے بڑے کوئی پندرہ کمرے ہیں۔ شاید سونے کے لئے الگ۔ اٹھنے بیٹھنے کے لئے الگ اور مہمانوں کے الگ کمرے ہوں گے۔

سب کمروں میں بڑے بڑے دروازے اور روشندان ہیں تاکہ تازہ ہوا اور دھوپ کا آسانی سے گذر ہو سکے۔ گھر کا صحن بھی کافی بڑا ہے صحن میں ایک کنارے کنواں کھدا ہوا ہے۔ کنویں کے برابر ہی چھوٹے چھوٹے کئی غسل خانے ہیں کہئے پسند آیا مکان؟ مگر کہیں آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ اس زمانے کے سب ہی گھر اس طرح کے تھے یعنی یہ تو امیروں کے گھر تھے غریبوں کے لئے تو اس زمانے میں بھی دو کمروں کے چھوٹے چھوٹے مکان ہوتے تھے البتہ یہ بھی پکے اور خوبصورت ضرور تھے۔

ان مکانوں کے علاوہ آپ کو اس شہر میں کئی بڑے بڑے غسل خانے اور اور ہال بھی نظر آئیں گے جو عام لوگوں کے استعمال کے لئے ہوتے تھے۔

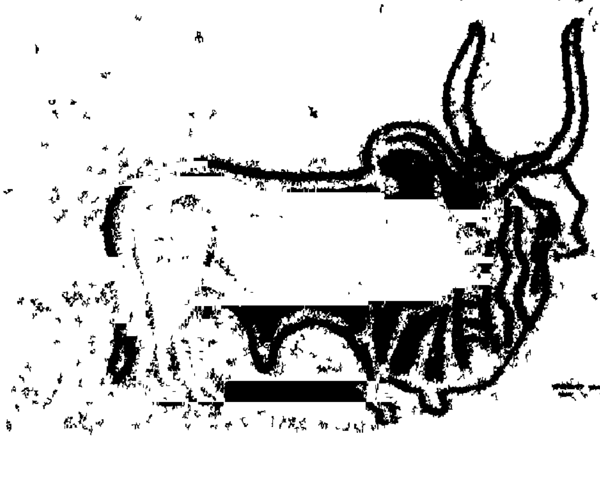
گھروں میں روز مرہ کے استعمال اور کام کی بھی بہت سی چیزیں دکھائی دیں گی۔

کھانے پینے کے برتنوں ہی کو لے لیجئے۔ کتنے دلکش اور سڈول ہیں۔ ان کی خوبصورتی دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کمہار کے چاک سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ مٹی، تانبے اور لوہے کے بہت سے گاۓ، گھوڑے، گینڈے، گڑیاں اور پہیئے والی چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بھی ملیں۔ یہ ان کے بچوں کے کھلونے تھے۔

قیمتی دھاتوں کے زیور بھی سب مرد عورتیں اور بچے پہنتے تھے۔ البتہ یہ پتہ نہیں چل سکا کہ آیا کپڑے مردوں اور عورتوں کے ایک سے ہوتے تھے یا الگ الگ۔ ویسے یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ یہ لوگ روئی کی کاشت بھی کرتے تھے اور کپڑا بننا بھی جانتے تھے۔

ان سب چیزوں کے علاوہ موہن جوداڑو میں آپ کو ایک نئی اور خاص چیز نظر آئے گی۔ علاوہ ازیں تانبے، لوہے اور پتھر کی مہریں ان مہروں پر مختلف جانوروں اور درختوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں، جن کی وہ لوگ پوجا کرتے تھے۔ ان مہروں پر کچھ لکھا ہوا بھی ہے جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ لوگ کچھ پڑھنا لکھنا بھی جانتے تھے۔ مگر ان کی زبان کوئی پڑھ نہیں سکتا۔ اس لئے معلوم نہیں ان مہروں پر کیا لکھا ہے۔ اگر کسی صورت سے ان کو پڑھ لیا جائے تو پھر ہمیں ان لوگوں کے بارے میں نہ جانے کتنی نئی باتیں معلوم ہو سکیں۔

آپ ہی سوچئے کہ اب سے پانچ ہزار برس پہلے کے یہ لوگ کتنے ترقی یافتہ تھے جو پڑھنا لکھنا جانتے تھے، اچھے مکانوں میں رہتے تھے۔ سونے چاندی کے زیورات استعمال کرتے تھے۔ اونی اور سوتی کپڑا پہنتے تھے، مٹی اور دھات کے برتنوں میں کھانا پکاتے اور کھاتے تھے۔ غرض کہ کتنے سمجھدار اور محنتی لوگ تھے جو اب سے پانچ ہزار برس پہلے ایسی زندگی گزارتے تھے۔



سلیم احمد

جھوٹا نائی

مالوا میں ایک گاؤں ہے جس کا نام دھرم پوری ہے ۔ اس میں کسی زمانے میں ایک نائی رہتا تھا جس کا نام کلو تھا ۔ ایک بار کلو کو بیس روپیے کی ضرورت پڑی۔ اس نے بہت سوچا کہ کس سے اُدھار لے مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا ۔ اگر بنئے سے قرض لیتا ہے تو بنیا سود وصول کرتا ہے۔ آخر اس کی سمجھ میں ایک بات آئی ۔ اس نے سوچا کیوں نہ اپنے پنڈت جی سے کہے وہ ضرور ایسے وقت میں اس کی مدد کریں گے ۔ یہ خیال آتے ہی وہ پنڈت جی کے پاس پہنچ گیا ۔ صبح کا وقت تھا پنڈت جی بیٹھے گیتا پڑھ رہے تھے ۔ پنڈت جی نے دیکھا کہ کلو نائی سامنے بیٹھا تھا تو اس سے پوچھا "کیوں بھائی کلو! کیسے آنا ہوا؟"

کلو نے پہلے تو سر جھکا کر پنڈت جی کو نمستے کیا پھر جھجکتے ہوئے کہا "پنڈت جی! آپ کی مہربانی ہے ۔ ایک بڑی پریشانی میں ہوں ۔ آپ ہی اس وقت میری مدد کر سکتے ہیں"

پنڈت جی نے کہا "ارے بھائی کچھ کہو بھی تو میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں"

"مہاراج! مجھے بیس روپے کی بڑی سخت ضرورت ہے ۔ بنئے کے یہاں گیا۔

اس نے منع کر دیا۔ وہ کہتا ہے کہ حجامت کے لئے کوئی اوزار لاؤ۔ سرکار! میرے پاس آپ جانتے ہیں کہ کیا رکھا ہے۔ صبح شام آپ جیسے لوگوں کی خدمت کرتا ہوں۔ اس سے جو کچھ ملتا ہے، بال بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ اگر آپ بیس روپئے دیں تو میں آپ کو چار مہینے کے بعد دیدوں گا۔ زمیندار صاحب کے یہاں شادی ہے۔ اس میں روپیہ ملے گا آپ کے بیس روپئے پہلے ادا کردوں گا۔"

پنڈت جی سیدھے سادے آدمی تھے۔ ان کو نائی پر رحم آگیا اور انہوں نے بیس روپے لاکر کلو نائی کے حوالے کر دیئے۔ چار مہینے تو کلو برابر حجامت بنانے کے لئے آتا رہا مگر جب چار مہینے پورے ہوگئے تو کلو نے پنڈت جی کو دیکھ کر کترانا شروع کر دیا۔ جہاں دور سے پنڈت جی کو آتے دیکھا بس وہ دوسری طرف پلٹ گیا۔ پنڈت جی کو روپیہ ملنا ایک طرف، سب سے بڑی پریشانی تو حجامت کی ہو گئی۔ اس لئے کہ گاؤں میں لے دے کر یہی ایک نائی تھا اور اس نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ آخر پنڈت جی نے کئی بار اپنے شاگردوں سے کہلا کر بھیجا مگر کلو نے ہر بار کہلا دیا کہ ابھی آتا ہوں مگر کبھی شکل بھی نہ دکھاتا۔ آخر ایک دن پنڈت جی سے کلو کی ملاقات ہو ہی گئی اور انہوں نے کہا "کلو! اب تو زمیندار صاحب کے یہاں شادی بھی ہو گئی اور تم نے بیس روپے واپس نہیں کئے۔ یہی نہیں تم نے میرے یہاں حجامت بنانی بھی چھوڑ دی۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ میں نے تو وقت پڑنے پر تمہاری مدد کی اور تم نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا۔"

اب تو پنڈت جی نے پکڑ ہی لیا تھا۔ اس لئے کلو بھاگ کر جاتا بھی تو کہاں۔ آخر مجبور ہو کر اس نے کہا "پنڈت جی! معاف کیجئے گا۔ مجھ سے چوک ہو گئی۔ گھر میں بال بچے بیمار ہو گئے۔ جو کچھ روپیہ ملا تھا وہ اس بیماری میں خرچ ہو گیا۔ اب آپ مجھ کو پندرہ دن کی اور مہلت دیجئے۔ پندرھویں دن آپ کے گھر روپیے لے کر حاضر ہوں گا۔"

پنڈت جی آدمی بڑے سیدھے سادے تھے۔ کلو نائی کی باتوں میں آگئے۔ مگر پندرہ دن تو کیا ایک مہینے کے بعد بھی کلو کا پتہ نہ چلا۔ آخر پنڈت جی نے تنگ آکر گاؤں کی پنچایت سے اس کی شکایت کر دی۔ جب پنچوں کے سامنے معاملہ پیش ہوا۔ تو پنچایت نے کلو کو بلوایا۔ اور پوچھا

کلو سے پوچھا۔

"کیوں کلو نائی! تم نے پنڈت جی سے روپیہ قرض لیا تھا؟"

"جی سرکار"

"اور تم نے یہ روپیئے واپس کئے؟" سرپنچ نے پوچھا۔

"جی سرکار! میں نے وہ روپیئے منگل کے روز واپس کر دیئے۔"

اب سرپنچ نے پنڈت جی سے کہا "پنڈت جی! آپ نے سُنا نائی تو کہتا ہے کہ اُس نے آپ کو منگل کے دن وہ روپیئے دیدیئے۔"

اب تو پنڈت جی بہت چکرائے ان کو بہت غصہ آیا کہ بدمعاش نے روپیئے بھی ہضم کر لئے اور سب کے سامنے مجھے جھوٹا بھی بنا دیا۔ پنڈت جی بڑے غصے میں بولے "کیوں رے کلو نائی! تو نے جھوٹ بولنا بھی سیکھ لیا ہے۔ میری اچھائی کا بدلہ اس طرح دے رہا ہے۔ وقت پر میں نے تیری مدد کی تھی اس لئے اس کے بدلے میں مجھے جھوٹا بنا رہا ہے۔"

مگر کلو نائی بڑا چالاک آدمی تھا۔ فوراً سر جھکا کر بولا "پنڈت جی! آپ نے میرے ساتھ جو بھلائی کی ہے اس کا بدلہ آپ کو بھگوان دے گا۔ میں اس کے لئے آپ کا احسان ہمیشہ مانوں گا۔ مگر آپکو یاد نہیں آرہا ہے۔ اس روز جب آپ نہا کر آرہے تھے۔ تو میں نے آپ کو بیس روپیئے گن کر دیئے تھے۔ ہو سکے تو آپ یاد کیجئے۔ میں نے آپ سے یہ بھی کہا تھا کہ احتیاط سے رکھیئے۔ راستے میں چور اُچکے پھرتے ہیں۔ مگر آپ نے کہا "کلو تم بے فکر رہو۔ ایسی کوئی بات نہیں، میں اپنی چیز کو خود ہی بڑے دھیان سے رکھتا ہوں۔" اور آپ نے اپنے رومال کے کونے میں وہ روپیئے باندھ لئے تھے۔ میں پھر آپ کے پاؤں چھو کر چلا آیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ دماغ پر زور ڈالیں گے تو آپ کو یاد آجائے گا۔"

کلو نائی نے بات کچھ ایسی بنائی کہ پنچوں کو بھی یقین آگیا کہ اس نے پنڈت جی کو روپے لوٹا دیئے ہیں۔ بڑھاپے کی وجہ سے پنڈت جی کو یاد نہیں آرہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ کہیں رکھ کر بھول گئے ہیں۔

اب تو پنڈت جی کا غصہ اور بھی بڑھ گیا کہ روپیے گئے سو گئے مگر پنچوں کے سامنے جھوٹا بن رہا ہوں۔ آخر پنڈت جی کی سمجھ میں ایک بات آئی۔ انہوں نے کہا "اچھا پنچوں سے میری ایک درخواست ہے۔ اگر کلو نائی گنگا جلی اٹھا کر یہ کہہ دے کہ اس نے مجھے میرے روپے لوٹا دیئے ہیں۔ تو میں صبر کر لوں گا۔"

گاؤں کے لوگ کیسے ہی چالاک ہوں مگر گنگا جلی پر ان کا ایمان ہوتا ہے۔ کلو نائی اس کے لئے تیار ہو کر آیا تھا۔ فوراً مان گیا۔ گنگا جلی لائی گئی۔ کلو نائی نے گنگا جلی پکڑتے ہوئے اپنا موٹا ڈنڈا پنڈت جی کے ہاتھ میں دیدیا اور دونوں ہاتھ سے گنگا جلی پکڑ کر قسم کھائی کہ "میں گنگا جلی ہاتھ میں لے کر کہتا ہوں کہ میں نے پنڈت جی کے روپے اُن کے ہاتھ میں دیدیئے۔" پھر نائی نے گنگا جلی رکھ دی اور ڈنڈا لے لیا۔

اب تو پنچوں کو بالکل یقین ہو گیا کہ کلو نے پنڈت جی کو روپے دیدیئے ہیں۔ پنڈت جی سے ہی بھول ہوئی۔ جتنے لوگ اس مقدمے کو سُننے کے لئے آئے تھے سب کو پنڈت جی پر بھروسہ تھا۔ مگر نائی بھی گنگا جلی اٹھا کر اپنی صفائی دے چکا تھا۔ اس پر کیسے شک ہو سکتا تھا۔

مگر گاؤں کا سرپنچ بڑا سمجھ دار اور تجربے کار آدمی تھا۔ گنگا جلی اُٹھانے کے بعد کلو نائی سچا ثابت ہو چکا تھا مگر اس کا دل یہ بھی ماننے کو تیار نہ تھا کہ پنڈت جی جھوٹ بول رہے ہیں۔ اس نے اپنے دماغ پر زور ڈالا تو اس کو ایک بات سمجھ میں آئی کہ گنگا جلی اُٹھاتے وقت کلو نائی نے اپنا ڈنڈا پنڈت جی کے حوالے کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ چاہتا تو اُسے زمین پر بھی رکھ سکتا تھا۔ کہیں اس میں کوئی بھید تو نہیں ہے۔ اس بات کو بھی جانچنا چاہیئے ــــ اس لئے اس نے فوراً کہا "کلو نائی ایک مرتبہ ذرا گنگا جلی پھر تو اُٹھانا۔" کلو نڈر تو تھا ہی اس نے پھر گنگا جلی اُٹھالی اور بولا "ایک بار نہیں سو بار گنگا جلی اٹھوا لو۔ میں کوئی جھوٹا تھوڑی ہوں نہیں۔"

اس بار اس نے گنگا جلی پکڑتے وقت پھر اپنا ڈنڈا پنڈت جی کو دینا چاہا۔ مگر سرپنچ نے ڈنڈا اس کے ہاتھ میں سے لے لیا۔ کلو نائی قسم کھاتے کھاتے رک گیا۔ سرپنچ نے کہا "کلو! رک کیوں گئے؟ گنگا جلی اٹھائی۔ اب پوری قسم کھاؤ۔"

کلو نائی کا منہ فق ہو گیا اور اس کے منہ سے کچھ بھی نہ نکل سکا۔ سرپنچ نے سونٹے کی مٹھی جو گھمائی

تو وہ اس کے ہاتھ میں آگئی اور اندر سے بیس روپے کھنکھاتے ہوئے گر پڑے۔ اب تو پنچوں کو یقین ہو گیا کہ نائی نے ڈنڈے کو کیوں پنڈت جی کے حوالے کیا تھا۔ اور کس طرح بے دھڑک قسم کھائی تھی۔ اس لئے کہ ڈنڈے میں تو روپے تھے اور ڈنڈا پنڈت جی کے ہاتھ میں دے کر نائی کا یہ کہنا سچ تھا کہ میں نے روپے پنڈت جی کو تھما دیئے ہیں۔

اب پنچوں نے وہ روپے تو پنڈت جی کو دیدیئے۔ اور کلو نائی کا منہ کالا کر کے سارے گاؤں میں اُسے گھموا دیا۔

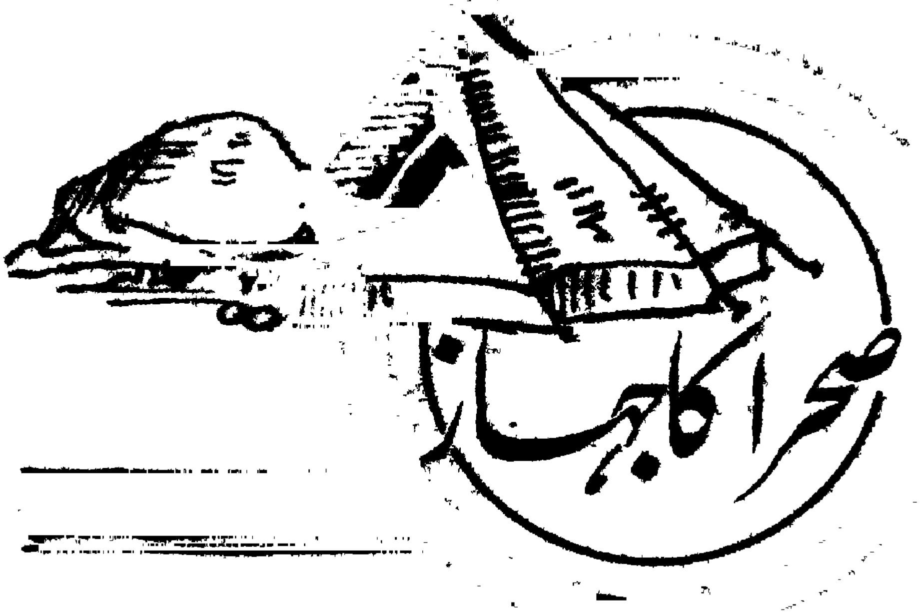
مفید معلومات

ہندوستان کی آبادی

سنہ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے بعد

اتر پردیس	۶,۳۲,۱۵,۷۴۲	سوراشٹر	۴۱,۳۷,۳۵۹
بہار	۴,۰۲,۲۶,۹۴۷	پیپسو	۳۴,۹۳,۶۸۵
اڑیسہ	۱,۴۶,۲۵,۹۴۶	دہلی	۱۷,۴۴,۰۷۲
مغربی بنگال	۲,۴۸,۶۰,۲۱۷	اجمیر	۶,۹۳,۳۷۲
آسام	۹۰,۴۳,۷۰۷	منی پور	۵,۷۷,۶۳۸
مدراس	۵,۷۰,۱۶,۰۰۲	تری پورا	۶,۳۹,۰۲۹
بمبئی	۳,۵۹,۵۶,۱۵۰	کورگ	۲,۲۹,۴۰۵
مدھیہ پردیس	۲,۱۲,۸۷,۵۳۳	کچھ	۵,۶۸,۶۰۶
پنجاب	۱,۲۶,۴۱,۲۰۵	وندھیا پردیس	۳۵,۷۴,۶۹۰
میسور	۹۰,۷۴,۹۷۲	بھوپال	۸,۳۶,۴۷۴
تراونکور کوچین	۹۲,۸۰,۴۲۵	ہماچل پردیش	۱۱,۰۹,۴۶۶
مدھیہ بھارت	۷۹,۵۴,۱۵۴	جزائر انڈمان	۳۰,۹۷۰
حیدرآباد	۱,۸۶,۵۵,۱۰۸	سکم	۱,۳۷,۷۲۴
راجستھان	۱,۵۱,۹۹۷		

سید منیر الحسن



بچے سیر کے پروگرام سے بہت خوش تھے۔ اس پروگرام میں کھیل کود، بھاگ دوڑ اور کھانا پینا سب کچھ شامل تھا، یہی وجہ تھی کہ ان کی خوشی کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا۔ سیر کے لیے جس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا وہ بھی خوب تھی۔ یعنی قطب مینار۔

صبح کا سماں تھا۔ بچے قطب کی سیر کر رہے تھے۔ اور سیر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ چھیڑ چھاڑ اور خوش گپیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اتنے میں قریب سے اونٹ گاڑی گذری اب کیا تھا۔ ایک شور اٹھا ــــ اتنا شور کہ سارا قطب گونج گیا۔ وہ قہقہے لگے کہ خدا کی پناہ ــــ جوں ہی شور تھما کسی نے کہا ــــ اونٹ کو جہازِ صحرا کہتے ہیں۔ یہ ریگستان میں کام دیتا ہے۔ اس پر دوسرے بچے نے کہا جناب یہاں ریگستان کہاں؟ انہوں نے اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے کہا کہ اجی صاحب یہ تو ٹھیک ہے کہ یہاں ریگستان نہیں مگر بوجھ ڈھونے کا کام تو یہاں بھی لیا ہی جاتا ہے۔ اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں۔

ابھی یہ بحث چل ہی رہی تھی کہ تیسرے صاحب نے کہا کہ "اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی" یہ چوتھے صاحب نے کہا کہ "اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے یہ نہیں کہا جا سکتا"۔ بہر حال جتنے منہ اتنی

بڑی باتیں۔

کسی نے کہنا شروع کیا۔ "ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک اونٹنی تیز چلی جارہی تھی۔ اس کا بچہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس کے ساتھ تیز تیز نہیں چل سکتا تھا۔ اس نے اونٹنی سے کہا کہ ماں ذرا دھیرے دھیرے چل تاکہ میں بھی تیرے ساتھ ساتھ چل سکوں۔ اونٹنی نے جواب دیا بیٹا میری نکیل میرے ہاتھ میں نہیں، میں مجبور ہوں۔"

بات یہیں پر ختم ہونے والی نہیں تھی۔ کیونکہ کہانیوں کا بازار گرم تھا۔ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کہانی کا سلسلہ جاری تھا۔ کسی نے بیچ میں سے کہا اچھا وہ مینڈکی اور اونٹ کی کہانی یاد ہے تمہیں؟ جس میں وہ کہتا ہے اسے بی مینڈکی ری تو تو پانی کی رانی۔ آوازیں آئیں — "یاد ہے" "یاد ہے" اچھا تو پھر دوسری سنیئے۔

ایک مرتبہ گائے اونٹ اور گدھا کہیں جارہے تھے۔ راستے میں ایک گھاس کی پولی ملی۔ طے یہ ہوا کہ یہ اس کا حصہ ہے جو اپنی بڑائی ثابت کردے۔

گائے نے کہا — "میں ماں ہوں اور لوگ میری پوجا کرتے ہیں" گدھے نے کہا — "میں حضرت عیسٰی کی سواری میں رہا ہوں" اس بات چیت کے دوران اونٹ نے وہ پولی اٹھائی اور کہا — "ہم تو بڑے ہیں" مطلب یہ کہ جو بڑا ہے وہ بڑا ہے" (قہقہے)

بات یہاں تک پہنچی ہی تھی کہ تیسری کہانی کا اعلان کیا گیا۔ جب کہانی سنانے والے صاحب سامنے آئے تو انہوں نے بتایا کہ اب تک آپ نے جس قدر کہانیاں سنی ہیں یہ کہانی ذرا ان سے مختلف ہے۔ وہ یہ کہ —

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک عربی شخص ایک بہت سرد رات کو اپنے خیمے میں بیٹھا تھا۔ اس کا اونٹ باہر سردی میں کھڑا تھا۔ آخر جب وہ سردی کی تاب نہ لاسکا۔ تو اس نے اپنا چہرہ خیمے میں داخل کرکے اپنے مالک سے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں اندر آجاؤں باہر بہت سردی ہے" عرب نے جواب دیا — "تم اپنا سر اندر خیمے میں کرلو اس طرح تمہاری ناک گرم رہے گی" کچھ دیر گذری تو پھر اونٹ بولا۔ "کیا میں کچھ اور اندر آسکتا ہوں تاکہ میں اپنی گردن بھی گرم کرسکوں" "خیر ذرا اور اندر آجاؤ" عرب نے کہا۔ اس کے بعد اونٹ بولا "کیا میں اگلے پاؤں اندر رکھ سکتا ہوں" یہ کہہ کر اونٹ نے اپنے دونوں اگلے پاؤں خیمے میں داخل کردیئے۔ تنگ عرب خیمے کے ایک کونے میں ہوگیا۔ اب اونٹ کا آدھا جسم اندر خیمے کے تھا۔ اور آدھا اس کے باہر اونٹ

نے کہا کہ "اگر میں نصف باہر اور نصف اندر رہتا ہوں تو خیمہ کھلا رہتا ہے جس سے آپ کو سردی لگنے کا خوف ہے اس لئے میں پوری طرح اندر داخل ہونا چاہتا ہوں" عرب نے جب یہ حالت دیکھی تو کہا کہ "اچھا تو پھر اندر آجاؤ" چنانچہ اونٹ اندر داخل ہوگیا لیکن اس طرح دونوں کے لئے جگہ تنگ ہوگئی۔

اونٹ پھر بولا "آہ میں دیکھتا ہوں کہ یہاں ہم دونوں کے لئے جگہ کافی نہیں۔ اس لئے آپ باہر نکل جائیے" اور یہ کہکر اونٹ نے نیک عرب کو اس کے اپنے خیمے سے باہر سردی میں نکال دیا"

سب بچوں نے کہا کہ بڑے خود غرض ہوتے ہیں یہ حضرت اونٹ۔ اس پر رشید نے کہا کہ اسی لئے تو عرب میں خود غرض کو "اونٹ اونٹ" کہہ کر چھیڑتے ہیں"

چونکہ کھانے کا وقت ہوچکا تھا۔ اس لئے سب کے سب کھانے پر چل پڑے۔

راشد حسن قادری



ننھا ارشد جب بھی آبا جان کو حقّہ پیتے دیکھتا تو اس کا بے اختیار جی چاہتا کہ وہ بھی اسی طرح حقّہ کی نَے منھ میں لے کر "گڑ گڑ" کی آواز نکالے اور پھر منھ سے دُھواں چھوڑے۔ آبا جان کے منھ سے دُھواں نکلتا ہوا کتنا اچھا لگتا تھا بالکل انجن کی طرح سے کالا کالا اور بھورا بھورا دھواں۔ وہ سوچتا کہ جب ہم "ریل ، ریل" کھیلتے ہیں تو بس دھوئیں کی ہی تو کمی رہ جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ انجن بنتا اور بالکل انجن کی طرح "چھک چھک" کرتا ہوا چلتا تھا۔ جب آبا جان جلدی جلدی منھ سے دھواں نکالتے تو اس کا دل بس یہی چاہنے لگتا کہ کسی صورت سے آبا جان جلدی کچہری چلے جائیں اور وہ دو ایک کش لگا کر منھ سے دھواں نکال سکے مگر اُسے کبھی ایسا موقع نہ ملا۔ ابا جان کچہری جاتے وقت تک حقّہ پیتے رہتے اور جب وہ چلے جاتے تو حقّہ ٹھنڈا ہو چکتا۔

آخر ایک دن اُسے موقع مل گیا۔ آبا جان کچہری جا چکے تھے اور حقّہ ابھی

گرم تھا اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، امّاں جان باورچی خانے میں تھیں اور بی آپا دوسرے کمرے میں کچھ سی رہی تھیں اس نے جلدی سے دو ایک کش لگائے اور منھ سے دُھواں نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے ابھی دو ایک کش ہی لگائے ہوں گے کہ اس کی حیرت کوئی انتہا نہ رہی، اس نے دیکھا کہ تمام کمرے میں عجیب عجیب شکلوں کے آدمی بھر گئے کس قدر عجیب اور خوفناک شکلیں تھیں ان کی۔ کسی کا سر بے حد بڑا تھا، کسی کی ناک بہت ہی لمبی تھی کوئی اتنا دُبلا پتلا تھا کہ ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔ ننھے ارشد کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں سے آگئے۔ سب اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ ان کی آوازیں بھی تو عجیب عجیب تھیں ان آدمیوں نے اُسے پکڑ لیا، اس نے چیخنا چاہا مگر آواز نہ نکلی پھر ان آدمیوں نے اسے ایک موٹی رسّی سے خوب اچھی طرح جکڑ کر باندھ دیا اور اُسے لے چلے۔ ننھا ارشد حیران تھا کہ یہ لوگ اُسے کہاں لئے جا رہے ہیں پہلے تو وہ اسے بہت ہی اُونچا اُڑا کر لے گئے ..... اتنا اُونچا کہ ارشد نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیں اور پھر نہیں کھولیں۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے ایسا معلوم ہُوا جیسے وہ بڑی تیزی سے نیچے گر رہا ہو اس نے ڈر کی وجہ سے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس کا ننھا سا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا آخر اسے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ زمین پر کھڑا ہوا ہے اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ دیکھا کہ وہ ایک میدان میں کھڑا ہے اور سامنے ایک بہت بڑا مکان ہے جس کی دیواروں اور کھڑکیوں پر ویسی ہی عجیب عجیب شکلوں کے آدمی بیٹھے ہیں۔ اور اسے دیکھ کر چلّا رہے ہیں وہ آدمی جو اس کے ساتھ تھے اسے لے کر مکان میں گئے وہاں ایک کمرے میں کرسی پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کے دو سر تھے اس آدمی کو دیکھ کر ننھے ارشد کے ہوش اُڑ گئے۔ وہ آدمی ارشد کو دیکھ کر ہنسنے لگا اور بہت دیر تک ہنستا رہا اس کے بعد بولا "کیا تم جادُو جانتے ہو؟"

ننھے ارشد نے گھبرا کر سر ہلا کر جواب دیا "نہیں"

"میں بہت بڑا جادوگر ہوں" یہ کہہ کر وہ آدمی پھر ہنسنے لگا اور پھر بولا "میں تجھے جادو دکھاؤں گا" یہ کہہ کر جادوگر منھ ہی منھ میں کچھ پڑھنے لگا اور ارشد کی طرف پھونک ماری۔ ننھے ارشد نے دیکھا کہ اس کا قد اور بھی چھوٹا ہوتا جا رہا ہے اور پاؤں بڑے ہوتے جا رہے ہیں۔ جوتا بھی کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ ابا جان کے جوتے سے بھی بڑا۔ جوں جوں اس کا قد کم ہوتا جا رہا تھا جادوگر خوب زور سے ہنس رہا تھا اور اس کے بعد اس نے اُن ہی آدمیوں سے جو ارشد کو لائے تھے کہا "اس کو کھڑکی سے باہر پھینک دو" اور باوجود ارشد کے منع کرنے کے انھوں نے اُٹھا کر اُسے نیچے پھینک دیا اور ارشد جس کا قد کچھ انچ رہ گیا تھا نیچے ایک پیڑ کی ڈالی پر گر پڑا اس کے چوٹ تو نہ لگی تھی مگر وہ نیچے نہ اُتر سکتا تھا اس لئے رونے لگا اس کے رونے کی آواز سُن کر جھاڑی میں چھپے ہوئے خرگوش نکل آئے اور اس کو دیکھنے لگے آخر ایک خرگوش کو اس پر رحم آیا اور بولا "ننھے بچے رؤ نہیں، میں اپنی سہیلی گلہری کو بُلا کر لاتا ہوں وہ تمہیں نیچے اُتار دے گی"

ننھا ارشد خرگوش کو بولتے دیکھ کر ڈر گیا۔ وہ خرگوش دوڑا ہوا گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک گلہری کو لے کر آیا۔ گلہری پیڑ پر چڑھ گئی اور ننھے ارشد کو منھ میں دبا کر نیچے لے آئی اور آہستہ سے زمین پر چھوڑ دیا۔ اُسی خرگوش نے کہا "یہ جو سامنے سڑک ہے اسی پر چلے جاؤ تو گھر پہنچ جاؤ گے"

ننھا ارشد جواب بالکل ننھا سا ہو گیا تھا جلدی جلدی سڑک پر چلنے لگا اور دو سر والے آدمی کا خیال آتے ہی بھاگنے لگا۔ تھوڑی دور جا کر سستانے کے لئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے اُس نے دیکھا کہ دو آدمی اسی پتھر کی طرف آ رہے ہیں وہ جلدی سے پتھر کے پیچھے چھپ گیا وہ دونوں آدمی پتھر کے قریب آ کر رُک گئے۔ ان

کے ہاتھوں میں دو تین تھیلے تھے جو رُوپیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ننھا ارشد سوچنے لگا کہ اگر میرا قد بجائے چھوٹا ہونے کے خوب بڑا ہو جاتا تو میں اُن سے یہ روپے چھین لیتا۔ یہ خیال آتے ہی اس کا قد خوب ہی لمبا ہو گیا آبا جان سے بھی زیادہ لمبا اور وہ پیڑ کے پیچھے سے نکل آیا۔ جب ان آدمیوں نے اتنا لمبا آدمی دیکھا تو ڈر کے مارے بھاگ کھڑے ہوئے ارشد بھی ان کے پیچھے انھیں پکڑنے بھاگا۔ سامنے ایک بڑا تالاب تھا۔ ارشد سنبھل نہ سکا اور تالاب میں گر پڑا تمام پانی اُس کی ناک، آنکھ اور کان میں بھر گیا..... اور جب اس نے آنکھیں صاف کر کے اِدھر اُدھر دیکھا تو آبا جان کا کمرہ تھا اور بی آپا اس کے منھ پر پانی کے چھینٹے مار رہی تھیں۔

"اَرے" ایک دم اس کے منھ سے نکلا۔

"تم نے حقہ کیوں پیا تھا جو چکر آ گئے اور گر پڑے" بی آپا نے پُوچھا "چوٹ تو نہیں لگی —— اسی واسطے تو آبا جان منع کیا کرتے ہیں، حقہ پینے کو"

"توبہ" ننھے ارشد نے جلدی سے اپنے کان پکڑ لئے اور پھر کبھی آبا جان کے حقہ کو نہیں چھوا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اُسے دوبارہ زندگی ملی ہے۔

محمد اقبال احمد

مزیدار خواب

ایک گاؤں میں دو دوست رہتے تھے۔ ایک کا نام تھا رامو اور دوسرے کا موہن۔ بہت دنوں سے دونوں بے کار تھے۔ ان کو اپنے گاؤں میں کوئی کام نہیں مل رہا تھا۔ اس لئے ایک دن انھوں نے سوچا کیوں نہ کام کی تلاش میں شہر چلنا چاہیئے۔ شہر میں ضرور کوئی نہ کوئی کام مل جائے گا۔ یہ خیال آنا تھا کہ اگلے دن وہ کچھ کپڑے اور ایک وقت کے کھانے کا سامان لے کر شہر کے لئے روانہ ہوگئے۔ چلتے چلتے راستے میں شام ہوگئی۔ دونوں نے مل کر کھانا پکایا۔ اتفاق کی بات ہے کہ کل ملا کر سات روٹیاں پکیں۔ اب دونوں میں سے ہر ایک کہتا تھا کہ "تم تین روٹی کھاؤ میں چار کھاؤں گا۔ مجھے زیادہ بھوک لگی ہے۔" دونوں میں اس بات پر دیر تک جھگڑا ہوتا رہا۔ آخر معاملہ اس پر طے ہوا کہ اس وقت دونوں بغیر کھائے پیئے سو جائیں اور صبح کو اپنے اپنے خواب سنائیں جس کا خواب سب سے زیادہ اچھا ہوگا اس کو چار روٹیاں ملیں گی۔ اب دونوں سو گئے۔

تڑکے رامو کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سوچا کہ کوئی خواب گڑھ کر سناؤں تو اچھا ہوگا۔ موہن کو کیا معلوم کہ میں نے خواب دیکھا ہے یا نہیں۔ اس نے خواب دیکھا بھی کیا تھا وہ تو رات بھر روٹیاں

ہی دیکھتا رہا۔ اسی لئے اس نے سوچا کہ کوئی اچھا سا خواب گھڑ کر سُنانا چاہیئے۔ تاکہ چاروں روٹیاں کھانے کو ملیں۔ بس پھر کیا تھا اس نے ذرا سی دیر میں سارا خواب گھڑ لیا اور اپنے دوست موہن کو اٹھایا جو بڑے مزے میں خرّاٹے لے لے کر سو رہا تھا۔

راموں نے کہا "موہن! یار تم اپنا خواب سناؤ، ہم نے بڑے مزے کا خواب دیکھا ہے۔"

موہن نے کہا "بھیّا! میں نے تو رات بڑا بھیانک خواب دیکھا ہے۔ اِسی لئے روٹی تو مجھے اب کیا ملے گی۔ مگر تم اپنا خواب ضرور سناؤ دیکھیں تم نے کیا دیکھا۔"

اب تو رامو بہت خوش ہوا۔ اس نے سوچا کہ اب یہ روٹیاں میرے حصہ میں آگئیں۔ بس پھر کیا تھا خوشی خوشی اپنا خواب سُنانے لگا۔

"رات کو میری آنکھ لگی تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شامیانہ تنا ہوا ہے اور اس شامیانے میں سینکڑوں آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور سامنے بہت اچھا ناچ ہو رہا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا سُندر ناچ کب دیکھا تھا۔ میں تو موہن بھیّا پھولا نہیں سمایا۔ میں نے ایک دربان سے پوچھا کہ بھیّا یہ کیسا دربار لگا ہے۔ دربان نے پہلے تو میری طرف غور سے دیکھا اور پھر بولا "یہ راجا اندر کا دربار ہے، وہ دیکھو سامنے تخت پر راجا اندر بیٹھے ہیں۔"

موہن بھیا! ابھی میں دربان سے باتیں ہی کر رہا تھا کہ اتنے میں راجا اندر اپنے تخت سے اُٹھ کر آئے اور مجھے اپنے ساتھ بڑی عزت کے ساتھ لے گئے۔ سارے دربار کی نظریں میری طرف لگی ہوئی تھیں۔ بھیّا بڑی دیر تک یہ ناچ گانا ہوتا رہا۔ اس کے بعد راجا اندر مجھے اٹھا کر اندر ایک بہت بڑے کمرے میں لے گئے وہاں تو بڑی شاندار دعوت تھی۔ اس دعوت میں بڑے بڑے راجا مہاراجا بیٹھے تھے۔ مجھے راجا اندر نے اپنے پاس بٹھایا اور میں بھوکا تو تھا ہی ــــ پھر میں نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ مگر ذرا سی دیر میں میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھو کتنا مزیدار خواب تھا۔ تم اب اپنا خواب سناؤ۔"

موہن بولا "بھیّا تمہارا خواب تو بڑا مزیدار ہے۔ میں نے بڑا بھیانک خواب دیکھا۔ تم سن کر کیا کرو گے۔ اب تو یہ سارا کھانا تم ہی کھالو۔"

رامو یہ سن کر خوش تو بہت ہوا مگر اس نے سوچا کہ بیچارے کا خواب تو سن ہی لینا چاہیئے۔

شرماتے اس نے کیسا ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ موہن نے اس سے کہا " بھیا جیسا بھی ہو تم سناؤ تو ضرور۔ جب رامو نے بہت ضد کی تو موہن نے اپنا خواب سنانا شروع کر دیا۔ اس نے کہا۔

"رامو بھیا رات جیسے ہی سویا تو میں نے دیکھا کہ چھ سات بڑے بڑے بھوت میرے سر پر کھڑے ہیں۔ میں ان کی شکل دیکھتے ہی ڈر کے مارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انھوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا۔ اب میں شور مچا رہا ہوں اور وہ سنتے نہیں، مجھے انہوں نے مارتے مارتے ادھ مرا کر دیا اور غصے میں بولے بدبخت تیرے پاس کھانا رکھا ہے اور تو سو رہا ہے "

میں نے کہا کہ " بھائی میں یہ کھانا صبح کھاؤں گا" یہ سن کر انہوں نے مجھے پھر مارنا شروع کر دیا۔ اور بولے کہ اگر تم یہ کھانا نہیں کھاؤ گے۔ تو ہم تم کو جان سے مار ڈالیں گے "

میں نے بہت کہا کہ میں نہیں کھاؤں گا مگر وہ نہیں مانے۔ آخر میں نے کہا کہ اس میں میرے ایک دوست کا حصہ بھی ہے "

اس پر ان میں سے ایک بھوت بولا۔ جو سب سے زیادہ خطرناک تھا "ارے بیوقوف تو اس کا انتظار کرے گا۔ وہ تو راجا اندر کے ساتھ دعوت اڑا رہا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے بھی مجھے دو تین کوڑے مارے، مجبور ہو کر میں نے کھانا شروع کر دیا۔ جیسے ہی ہاتھ روکتا وہ مجھے پھر مارتے، مجھے نہیں معلوم کہ میں نے کتنا کھایا۔ اور اس کے آگے کا حال مجھے کچھ نہیں پتہ کہ کیا ہوا "

رامو نے جا کر جو دیگچی دیکھی وہاں سب کچھ صاف تھا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا "بھیا میرے حصے کی تین روٹیاں کہاں ہیں "

موہن نے کہا " بھیا اس سے آگے میں کچھ نہیں جانتا۔ دیکھو میرے سارے بدن میں درد ہو رہا ہے۔ انہوں نے مار مار کر مجھے کھلایا ہے اور انہوں نے ہی مجھے راجا اندر کے ہاں تمہاری دعوت کا حال سنایا۔ بھیا تم نے تو راجا اندر کے ساتھ خوب مزے میں کھانا کھایا ہوگا مجھے تو کھانے کے ساتھ مار بھی کھانی پڑی۔ اب تو بے چارہ رامو اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ اور اسے تمام دن بھوکا رہنا پڑا۔

فرماں بردار بھائی

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں مصر میں ایک بوڑھا بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کے دو لڑکے تھے۔ لطیف اور نجیب۔ لطیف بدمزاج اور بے وقوف تھا۔ نجیب سمجھدار اور خوش مزاج تھا۔ اور ہمیشہ اپنے بھائی لطیف کا کہنا مانتا تھا۔ ایک بار بوڑھا بادشاہ اچانک بیمار پڑ گیا اور بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ اس نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلا کر ان کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور پھر وصیت کرتے ہوئے لطیف سے بولا" بیٹا میں کچھ دیر کا مہمان ہوں۔ تم بڑے ہو نجیب ابھی چھوٹا ہے۔ اگر یہ کوئی غلطی بھی کرے تو تم اسے معاف کر دینا" پھر نجیب کے سر پہ ہاتھ پھیر کر کہنے لگا" بیٹا! لطیف تمہارا بڑا بھائی ہے۔ اس کی عزت کرنا۔ جو کچھ یہ کہے اس پہ عمل کرنا۔ اور مل جل کر رہنا" اور ان الفاظ کے ساتھ بڈھے باپ نے دم توڑ دیا۔ دونوں بھائی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

باپ کی وفات کے بعد لطیف بادشاہ بنا۔ مگر وہ بڑا ظالم اور سنگدل ثابت ہوا۔ ہر وقت شراب میں مدہوش رہتا۔ اسے رعایا سے رتّی بھر محبت نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب

لوگ اس سے ناراض ہو گئے۔ درباریوں نے سوچا کہ نجیب کو تخت پر بٹھائیں۔ لطیف کے کانوں میں بھنک پڑگئی۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی نجیب کو موت کی دھمکی دی۔ نجیب بچارا ڈر کے مارے ایک رات گھوڑے پر سوار ہو کر محل سے نکل بھاگا۔

وہ ایک رات اور ایک دن برابر چلتا رہا۔ شام کے وقت وہ ایک گھنے جنگل میں پہنچا۔ سستانے کی غرض سے گھوڑے سے اُترا اور اسے ایک درخت سے باندھ کر لیٹ گیا۔ تھکا ہارا تو تھا ہی۔ جیسے ہی آنکھ بند کی۔ نیند آگئی۔

اس کا گھوڑا بھی بھوکا پیاسا تھا اس لئے وہ ہنہنایا۔ اس کے ہنہنانے سے نجیب کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا کہ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ جنگل میں ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ نجیب نے اپنے دل کو مضبوط کیا۔ اور رات کاٹنے کے لئے ایک بڑے درخت کا تنا ڈھونڈ کر اس پر بیٹھ گیا۔ ذرا سی دیر میں جنگل میں روشنی ہوئی اور سارا جنگل جگمگا اٹھا۔ نجیب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ پل بھر میں اندھیرا ہو گیا۔ پھر روشنی ہوئی اور پھر اندھیرا اس نے دیکھا کہ ایک سانپ اپنے من سے کھیل رہا ہے۔ جو سفید سفید انڈے کی طرح سامنے پڑا ہے۔ جب وہ اس کو چھپا لیتا ہے تو اندھیرا ہو جاتا ہے۔ جب باہر نکالتا ہے تو روشنی ہو جاتی ہے۔ تھوڑی دیر میں سانپ تھک گیا اور من کو زمین پر پھینک کر اس کے قریب لیٹ گیا۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ نجیب درخت سے نیچے اترا اور کپڑے میں بہت سی مٹی اور پتھر بھر کر لایا اور جھٹ سانپ کے اوپر ڈال دیا۔ سانپ پھنکارتا ہوا جونہی باہر نکلا نجیب نے تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ پھر من کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔ روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ اس روشنی میں اس نے دیکھا کہ تھوڑے سے فاصلے پر ایک چھوٹا سا کنواں ہے۔ جس کی منڈیر گول ہے۔ نجیب کنوئیں کے پاس پہنچا اس کو ایسا معلوم ہوا گویا کنواں پانی سے

لبالب بھرا ہوا ہے۔ پانی پینے کی غرض سے نجیب نے جونہی پانی کو چھوا۔ تو پانی اندر نیچے اترتا معلوم ہوا۔ نجیب نے پھر کوشش کی۔ مگر پانی ہاتھ نہ آیا۔ نیچے کچھ سیڑھیاں دکھائی دیں جو کنوئیں کے نیچے تک جاتی تھیں۔ نجیب پانی کو چھوتا۔ سیڑھیوں پر پاؤں رکھتا ہوا کنوئیں کے نیچے تک اتر گیا۔ یہاں تک کہ کنوئیں کا پانی بالکل سوکھ گیا۔ سامنے ایک چھوٹا لوہے کا دروازہ ملا۔ نجیب دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس نے دیکھا کہ ایک بڑے شہر میں پہنچ گیا ہے نجیب سارے شہر میں گھومتا رہا لیکن اسے وہاں کوئی بھی نہ ملا۔ بھوک اور پیاس کے مارے اس کا دم نکل رہا تھا۔ اس لئے اس نے ایک مکان کے دروازہ کو کھولا تو دیکھا کہ انسانی کھوپڑیوں اور ہڈیوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگے ہیں۔ وہ چیخ مارتا ہوا باہر نکل کر بھاگا۔ جب دوسرے مکان میں داخل ہوا تو اس کو وہاں بھی ایسا ہی منظر نظر آیا۔ آخر وہ ایک بڑے محل کے اندر داخل ہوا لیکن وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ آہستہ آہستہ محل کی سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا ایک کمرے میں داخل ہوا۔ اور اس ایک لمحہ میں اس کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ اتنا ڈرا کہ اُسے پیچھے مڑکر دیکھنے کی ہمّت بھی نہ ہوئی۔ ایک خوبصورت لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ نجیب کو دیکھ کر لڑکی مسکرائی لیکن فوراً رو دی۔ نجیب نے اس کے رونے اور مسکرانے کی وجہ پوچھی تو لڑکی نے کہا ''آج بارہ سال کے بعد پہلی بار میں نے ایک زندہ انسان کو دیکھا ہے اس لئے میں اپنی خوشی کو نہ دبا سکی اور مسکرانے پر مجبور ہو گئی اور دُکھ اس بات کا ہے کہ اس محل کا مالک ایک آدم خور دیو ہے جو ابھی باہر گیا ہوا ہے۔ واپس آنے پر وہ فوراً آپ کو موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ اس لئے آپ چند گھڑی کے مہماں ہیں۔ بارہ سال سے میں اس جگہ قید ہوں۔ کاش مجھے اس قید سے کوئی چھڑا سکتا!''

نجیب نے پوچھا ''وہ آدم خور دیو کون ہے؟'' لڑکی نے بتایا کہ وہ ہر رات کو سانپ بن کر باہر جاتا ہے اور اپنے من سے کھیلتا ہے۔ اس من کی خصوصیت یہ ہے

بقیہ صفحہ ۱۵ کالم ۲ پر دیکھئے

لطیفے

فقیر۔ اللہ کی راہ میں ایک پیسہ دے دو۔
بابو صاحب۔ (جیب ٹٹولنے کے بعد) معاف کرو بابا۔
پیسہ پھٹ گیا اور جیب گر گئی۔

——— سکینہ خاتون۔ سندیلہ

پروفیسر صاحب اپنی موٹر کار پر کہیں جا رہے تھے۔ اندھیری رات تھی۔ موٹر کی بتی جلتی نہ دیکھ کر سپاہی نے روک کر پوچھا:۔
سپاہی۔ بتیاں کیوں نہیں جلائیں؟
پروفیسر۔ بتیاں تو جلا دی ہیں، مگر اندھیرے میں نظر نہیں آتیں۔

فاروق علی۔ دریاباد

مجسٹریٹ (ملزم سے) تم اپنی صفائی کے بارے میں کیا کہنا چاہتے ہو؟
ملزم۔ کچھ نہیں حضور، میں نہا دھو کر حاضر ہوا ہوں۔
مجسٹریٹ۔ تمہارا کوئی گواہ ہے؟
ملزم۔ میں کسی کے سامنے چوری نہیں کرتا۔

سید انور۔ ناندیڑ

ماسٹر۔ (لڑکوں کو خون کے دوران پر لکچر دیتے ہوئے) بتاؤ اگر میں سر کے بل کھڑا ہو جاؤں تو خون نیچے کی طرف جمع ہونے لگے گا؟
لڑکے۔ جی ہاں۔
ماسٹر۔ مگر جب میں پیروں پر کھڑا ہوتا ہوں تو...؟
لڑکے۔ خون نیچے نہیں آئے گا۔
ماسٹر۔ کیوں؟
لڑکے۔ اس لئے کہ آپ کے پیر خالی نہیں ہیں۔

ننھی زہرہ بڑی معصومیت سے دعا مانگ رہی تھی "یا خدا، چھ اور سات کا حاصل جمع چودہ کر دے۔"
ماں نے پوچھا "یہ کیا دعا مانگ رہی ہو؟"
زہرہ معصومیت کے ساتھ بولی "کل میں نے امتحان میں یہی جواب لکھا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا جواب غلط نہ ہو۔"

ایک پروفیسر سے جو ہمیشہ اپنے آپ سے باتیں کیا کرتا تھا، اس کے ایک ساتھی نے سوال کیا "آپ اپنے آپ سے کیوں باتیں کیا کرتے ہیں؟"
پروفیسر۔ اس لئے کہ میں ایک ذہین پروفیسر سے بات کرنا اور اسی کی باتیں سننا پسند کرتا ہوں۔

عجائب خانہ کے اس کمرے میں جہاں انسانی کھوپڑیاں رکھی ہوئی تھیں، لڑکے نے ایک بڑی کھوپڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے باپ سے پوچھا "یہ کھوپڑی کس کی ہے؟"
"لارڈ بائرن کی" باپ نے جواب دیا۔
"اور وہ چھوٹی کھوپڑی؟" بچے نے پوچھا۔
"یہ بھی لارڈ بائرن کی ہے" جواب ملا۔
"ان کی دو کھوپڑیاں کیسی ہیں؟" بچے نے حیرت سے سوال کیا۔
نہایت اطمینان سے باپ بولا "دوسری اس وقت کی جب لارڈ بائرن بچے تھے"

بچہ۔ ابا جان، جنگ کس طرح ہوتی ہے؟
باپ۔ فرض کرو کہ آج چین ہندستان پر حملہ کر دے..
ماں۔ (بات کاٹ کر) ایسا نہیں ہوسکتا۔ دونوں ملک دوست ہیں۔
باپ۔ میں بھی جانتا ہوں۔ یہ تو ایک مثال ہے...
ماں۔ غلط مثال دے کر بچے کو کیوں بہکا رہے ہو!
باپ۔ خاموش رہو۔ میں تو صرف مثال دے رہا ہوں
ماں۔ (غصے سے) مگر یہ غلط مثالیں کیوں....؟
بچہ۔ جی، ابا! بس کیجئے۔ میں سمجھ گیا۔

راجہ صاحب۔ (باغ کا معائنہ کرتے ہوئے) مالی، یہ درخت تو بہت جلدی بڑھ گئے۔
مالی۔ جی سرکار۔ بات یہ ہے کہ انھیں اور کوئی کام نہیں ہے۔

زاہد۔ کہو بھائی، بال بچے خیریت سے ہیں؟
ارشد۔ جی ہاں، بچے خیریت سے ہیں، بال تو سارے منڈوا دئے۔

حمیدہ خاتون۔ کرمانی

استاد۔ سردیوں میں موٹے کپڑے کیوں پہنتے ہیں؟
شاگرد۔ تاکہ مار پڑتے وقت زیادہ چوٹ نہ لگے۔

عقیلہ خاتون
شمسی

اطہر پرویز

[redacted]

تین عالم اور ایک ملاح

ایک سائنس داں، ایک پروفیسر اور ایک شاعر دریا کی سیر کے لئے گئے۔ انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ کشتی میں سیر کی جائے۔ انہوں نے کرائے پر ایک کشتی لی اور اس میں بیٹھ گئے۔ اور ذرا سی دیر میں تینوں اپنے اپنے خیال میں مست ہو گئے۔ تھوڑی سی دیر کے بعد شاعر نے ملاح سے کہا۔

"ملاح! اس وقت سورج کے ڈوبنے کا منظر کتنا سہانا معلوم ہوتا ہے۔ وہ دیکھو پانی میں اس کی لالی کتنی بھلی لگتی ہے۔ کیا تم نے کبھی کوئی شعر سنا ہے جس میں شاعر نے ایسے منظر کی تصویر کھینچی ہو—"

ملاح یہ سن کر بھونچکا سا رہ گیا مگر پھر سنبھل کر بولا:۔

"حضور! یہ سورج تو روز ایسے ہی ڈوبتا ہے اور جب پانی میں لال سایہ پڑے گا تو پانی لال لال دکھائی دے گا۔"

شاعر نے کہا "بھئی ملاح تم بڑے عجیب آدمی ہو، مگر تم نے یہ نہیں بتایا کہ کبھی کوئی ایسا شعر سنا ہے جس میں ایسا منظر ہو۔"

ملاح نے کہا "حضور میں نے تو آج تک کوئی شعر نہیں سنا — میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ شعر

کیسے کہتے ہیں ؟"

"ایک شعر بھی نہیں!" شاعر نے حیرت سے پوچھا۔

"جی نہیں ایک بھی نہیں سُنا" ملاح نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

شاعر نے بڑی اُداس صورت بنا کر کہا "تو پھر ملاح تم نے اگر کبھی کوئی شعر نہیں سُنا تو اپنی آدھی زندگی سچ مچ ضائع کر دی۔"

یہ بات سُن کر سائنس داں بھی جیسے چونک پڑا اور اپنے شاعر دوست سے بولا "بھائی تم دوسری دنیا میں رہتے ہو۔ یہ غریب ملاح اس کا حال کیا جانے اس کو تو یہاں کا حال معلوم ہے۔ اگر تم اس سے یہ پوچھو کہ کشتی پانی میں کیوں نہیں ڈوبتی تو وہ ابھی بتا دے گا۔ کیوں بھائی ملاح ذرا بتانا تو ؟"

ملاح یہ سوال سُن کر چکرا گیا۔ اُس نے کہا "سرکار! میں اتنا تو جانتا ہوں کہ جب تک کشتی میں پانی نہ آجائے۔ یہ کبھی نہیں ڈوبے گی۔ ہاں اگر اس میں سوراخ ہو جائے تو ابھی ذرا سی دیر میں غرقاب جائے گی۔"

اب تو سائنس داں کا سر بھی جھک گیا اور اس نے ناامید ہو کر کہا "ملاح! یہ شاعر سچ کہتا ہے۔ تم نے اپنی آدھی زندگی یوں ہی گنوا دی۔ تم کو کچھ بھی نہیں معلوم۔"

اب باری آئی پروفیسر کی اس نے کہا "شاعر تم واقعی دوسری دنیا کے آدمی ہو، ہر وقت ہوا میں اُڑتے رہتے ہو اور سائنس داں تم تو اپنی لیبوریٹری (تجربہ گاہ) کا ہی حال جانتے ہو تم کو ان ملاحوں کا حال کیا معلوم۔ تم بتاؤ ملاح کہ ایک گھنٹے میں کتنے میل تک کشتی چلا سکتے ہو؟"

ملاح پروفیسر صاحب کے سوال کا بھی جواب نہ دے سکا اور بے چارے پروفیسر بھی شرمندہ ہو کر بولے کہ "ہاں ملاح! شاعر اور سائنس داں ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ تم نے سچ مچ اپنی آدھی زندگی مفت میں گنوا دی اور تم کو اپنے بارے میں بھی کچھ نہیں معلوم۔ مجھے تمہارے اوپر رحم آتا ہے۔"

اتفاق کی بات ہے کہ ذرا سی دیر میں کشتی بھنور میں پھنس گئی۔ ملاح نے ہزار کوشش کی مگر کشتی بھنور میں سے نہ نکلنی تھی نہ نکلی۔ آخر اس نے شاعر، سائنس داں اور پروفیسر سے سوال

کیا۔ "سرکار! کیا آپ لوگوں کو تیرنا آتا ہے؟" تینوں نے ایک زبان ہو کر کہا "نہیں ہمیں تو تیرنا نہیں آتا۔"

"تب تو سرکار! آپ نے اپنی پوری زندگی گنوا دی۔ اب میں بھی آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"



اب کشتی پانی میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی۔ اور جب اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو ملاح نے ایک چھلانگ لگائی اور تیرتا ہوا نکل گیا۔ سائنس داں، شاعر اور پروفیسر چلاتے رہ گئے۔ مگر ملاح نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔

شاہد علی خاں

"ابراہیم ادہم کی نصیحتیں"

بہت عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ایک بوڑھا شخص شیخ ابراہیم ادہم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "حضور میں انتہائی گنہگار اور بدکردار ہوں۔ بہت کوشش کرتا ہوں کہ گناہ نہ کروں۔ لیکن مجھے اپنے دل پر قابو نہیں۔ براہ کرم کوئی ایسی نصیحت فرمائیے۔ جس سے میرا دل میرے اختیار میں ہو جائے اور میں بری عادتوں سے نجات حاصل کر سکوں"۔

ابراہیم ادہم نے اُسے بغور دیکھا اور کہنے لگے "جس وقت تمہارے دل میں گناہ کرنے کی خواہش پیدا ہو اس وقت یہ ارادہ کر لو کہ خدا کا رزق نہ کھاؤں گا"۔

اس بوڑھے شخص نے جواب دیا "حضور یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر خدا کا رزق نہ کھاؤں گا تو پھر کیا کھاؤں گا"۔

ابراہیم ادہم نے فرمایا "تم خود ہی سوچو کہ یہ کتنی بُری بات ہے کہ خدا کا رزق کھاؤ اور اس کا حکم نہ بجا لاؤ"۔

بوڑھے شخص نے درخواست کی "ایک اور نصیحت کیجئے"۔

شیخ نے جواب میں کہا "جس وقت گناہ کرنا چاہو۔ خدا کی زمین پر نہ رہو۔ بلکہ کسی اور جگہ چلے جاؤ۔"

بوڑھے شخص نے کہا "یہ تو اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ اگر میں اس کی زمین پر نہ رہوں تو کہاں جاؤں؟"

شیخ نے فرمایا "کیا یہ بُری بات نہیں کہ رزق کھاؤ۔ خدا کی زمین پر رہو اور اس کا کہنا نہ مانو؟"

بوڑھے شخص نے عرض کی "کوئی اور نصیحت، حضور!"

شیخ ابراہیم ادہم نے جواب دیا "جب کبھی گناہ کرنے پر مجبور ہو تو ایسی جگہ جاؤ جہاں خدا تمہیں نہ دیکھ سکے۔"

بوڑھا شخص بولا "حضور یہ تو سب سے زیادہ مشکل ہے۔ خدا تو ہر جگہ دیکھ سکتا ہے۔ کائنات کی کوئی چیز اور کوئی حرکت اس سے چھپی ہوئی نہیں۔"

ابراہیم ادہم نے فرمایا "یہ کس قدر بُری بات ہے کہ تم خدا کا رزق کھاؤ خدا کی زمین پر رہو اور اس طرح گناہ کرو کہ وہ تمہیں دیکھ سکے۔"

بوڑھے شخص نے کہا "بس ایک اور نصیحت۔"

شیخ نے فرمایا "جس وقت ملک الموت تمہارے پاس آئے تو اس سے کہنا کہ مجھے اتنی مہلت دے دے کہ میں توبہ کر سکوں اور قیامت میں باز پرس کی تیاری سے فارغ ہو سکوں۔"

بوڑھے شخص نے جواب دیا "حضور! وہ میری بات نہ مانے گا۔"

شیخ نے فرمایا "تم جانتے ہو کہ موت کو کسی طرح ٹالا نہیں جا سکتا پھر کیا معلوم کہ عین گناہ کی حالت ہی میں موت آ جائے۔"

بوڑھے شخص نے کہا "یا شیخ! یہ نصیحتیں میرے لئے کافی ہیں۔" کہتے ہیں، اس دن کے بعد سے وہ شخص اتنا نیک ہو گیا کہ اپنے زمانے کے مشہور عابدوں اور زاہدوں میں شمار کیا جانے لگا۔

اچھے پیامیو! تم اسے صرف کہانی ہی نہ سمجھو بلکہ ایک اچھی نصیحت جانو۔ اور اس سے سبق حاصل کرو۔

حبشی کا انتخاب

کسی ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ وہ اپنی رعایا کا بہت خیال رکھتا تھا۔ رعایا بھی اس سے بہت خوش تھی۔ بادشاہ بہت سخی تھا۔ اور تہواروں کے موقعوں پر انعام و اکرام دیا کرتا تھا۔ وہ تندرست اور خوبصورت بچوں کو بہت پسند کرتا تھا۔

اس کا ایک حبشی وزیر تھا جو بہت نیک اور وفادار تھا۔ ایک دفعہ کی بات ہے۔ کہ کسی دوسرے ملک کے بادشاہ نے اس کو ایک بہت خوبصورت ٹوپی تحفہ کے طور پر بھیجی۔ مگر وہ ٹوپی اتنی چھوٹی تھی کہ وہ کسی بچہ ہی کے سر پر آسکتی تھی۔

بادشاہ نے اپنے اس حبشی وزیر کو بلایا۔ اور حکم دیا کہ یہ ٹوپی لے جاؤ اور میری سلطنت بھر میں جو بچہ تمہیں سب سے خوبصورت نظر آئے اُسے یہ ٹوپی پہنا کر میرے پاس لے آؤ۔ وزیر نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ٹوپی لے کر روانہ ہوگیا۔

وہ کئی مہینے تک سارے ملک میں گھومتا رہا۔ اُسے کئی جگہ گورے گورے بچے کھیلتے ہوئے نظر آئے لیکن اُسے اُن سے بھی خوبصورت بچوں کی تلاش تھی۔



ممکن ہے کہ آگے چل کر کوئی بہت ہی خوبصورت بچہ مل جائے۔

اس نے سارے ملک کا دورہ ختم کر لیا مگر کوئی بھی بچہ اُسے پسند نہیں آیا۔ آخر کار تھک کر واپس چلا آیا۔ گھر آکر اس نے دیکھا کہ اس کا اپنا بچہ باہر کھیل رہا تھا جس کا رنگ اُسی کی طرح کالا تھا۔ اس نے جھٹ وہ ٹوپی اُسے پہنا دی اُسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا اور کہا "حضور اب بچوں میں مجھے یہی پیارا لگا۔"

بادشاہ مسکرایا اور بولا "ہاں مجھے بھی یہ بچہ پسند ہے۔"

ضیاء الحق (اناؤ)

کہانی

جاڑے کا موسم تھا۔ ایک کیڑا بہت بھوکا تھا۔ اس لئے کہ اس کے پاس کھانے کے لئے کوئی چیز بھی نہ تھی۔ وہ کیڑا ایک مرتبہ چیونٹی کے پاس گیا اور بولا "بی چیونٹی میرے پاس کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے اس لئے میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ کھانے کے ذخیرہ میں سے کچھ مجھے بھی دے دیں۔"

چیونٹی نے کہا "آپ ساری گرمیوں کیا کرتے رہے۔ میں نے تو گرمی بھر خوب محنت کرکے یہ کھانے کا ذخیرہ جمع کر لیا۔" کیڑے نے کہا "میں گرمیوں میں گایا کرتا تھا اس لئے جمع نہیں کر سکا۔"

چیونٹی نے کہا بہت اچھا اب جاڑے میں ناچا کرو۔ میں اگر اپنے ذخیرے میں سے دے دوں تو پھر میں اور میری دوست چیونٹیاں کیا کھائیں گی۔"

مجبوراً کیڑا چپ چاپ چلا گیا۔

فاروق احمد صابری۔ کلکتہ

بُرے کام اور خیال کا نتیجہ

منچوریا کے بہت سے ڈاکوؤں نے اپنی ایک جماعت بنائی تھی۔ اُن بدمعاش ڈاکوؤں کا کام سمندر میں جہاز سے کر کسی جہاز یا جزیروں پر حملہ کرنا تھا۔ وہ ڈاکو بڑے مشہور ہوگئے تھے۔ ان کا نام سن کر بہت سے جزیرے والے کانپ اٹھتے تھے۔ اس کے علاوہ تجارتی یورپ اور امریکہ سے آنے والے جہاز رانوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اُن کے دماغ میں دہشتناک اور ڈراؤنے خیالات چکر لگانے لگتے۔

ایک بار کا قصہ ہے کہ ڈاکو اپنا جہاز لے کر

سمندر میں چکر کاٹ رہے تھے کہ انہوں نے یک بیک ایک جزیرہ دیکھا۔ یہ دیکھ کر ڈاکو اس جزیرے کی طرف بڑھے اور جزیرے کے قریب اپنا جہاز لگایا۔ اس کے بعد سبھی اس جزیرے پر اترنے لگے۔ ابھی آدھے ڈاکو ہی اترے تھے کہ جزیرہ خود بخود دھارے کے مخالف سمت ہٹنے لگا۔ اور فوراً ہی کچھ دور چلا گیا۔ دراصل یہ تھی ایک بہت بڑی مچھلی۔ یہ دیکھ کر ڈاکو چیخنے، بال نوچنے اور اپنے ساتھی ڈاکوؤں کو آواز دینے لگے "بچاؤ، جہاز لاؤ" تاکہ ڈاکوؤں کا کپتان بچا کے جا رہا تھا لیکن سمندر کے مخالف دھارے نے جہاز کی رفتار میں کمی کر دی۔ جہاز جا ہی رہا تھا کہ یک بیک مچھلی پانی کے اندر چلی گئی۔ اس مچھلی پر چڑھے ہوئے ڈاکو کچھ سمندری جانور کا شکار ہو گئے تھے۔ اور کچھ بہے چلے جا رہے تھے۔ جو کچھ دور ہی جا کر لاپتہ ہو گئے۔

اس آفت نے اس جہاز پر بچے ہوئے ڈاکوؤں کو بہت بڑا سبق دیا۔ ان ڈاکوؤں نے اسی وقت توبہ کی اور اپنے وطن کو لوٹ گئے اور اچھے آدمی بن گئے اور یہ سمجھنے لگے کہ "برے کام کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔"

شمیم الحق جہند انوین عمر ۱۲ سال

بھلے کو بھلا، بُرے کو بُرا

کسی گاؤں میں ایک فقیر رہتا تھا۔ جب وہ کہیں بھیک مانگنے جاتا اس کے منہ سے ہمیشہ یہ آواز نکلتی "بھلے کو بھلا بُرے کو بُرا" اسی محلے میں ایک عورت تھی جس کے دروازے پر وہ فقیر بھی جایا کرتا تھا۔ وہ عورت فقیر کی آواز سُن کر جل جاتی۔ فقیر بار بار دروازے پر وہی آواز لگایا کرتا تھا لیکن اس عورت کے گھر سے اس فقیر کو کبھی بھیک نہ ملتی تھی۔ ایک دن پھر وہی فقیر اس عورت کے دروازے پر آیا۔ اور پھر وہی صدا لگانی شروع کر دی۔ عورت فوراً بازار گئی اور وہاں سے ایک آنے کا سنکھیا لائی اور اُس کو آٹے میں ملا کر گوندھنے لگی۔ اور فقیر کو دروازے پر بٹھا کر روٹی پکانے لگی روٹی پکنے کے بعد عورت نے باہر آ کر روٹی فقیر کو دے دی۔ فقیر روٹی لے کر کُٹیا کی طرف چلا آیا۔ ابھی فقیر اپنی کُٹیا میں پہنچا ہی تھا کہ اس کو دو آدمی آتے دکھائی دیئے نزدیک آ کر اس آدمی نے فقیر سے کہا "بابا مہربانی کر کے تھوڑا پانی پلایئے" فقیر کو رحم آگیا اور وہی روٹی لے کر اُن دونوں آدمیوں کے پاس رکھ دی۔ جب اُن لوگوں نے روٹی کھالی تو اُس کا شکریہ ادا کیا۔ اور وہ اپنے راستے ہو لئے۔

گھر پہنچتے ہی اِن لوگوں کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ دونوں آدمی عورت کے لڑکے تھے جس نے فقیر کو روٹی دی تھی۔ ذرا سی دیر میں اس نے حکیم کو بلایا اور دوا وغیرہ دی۔ تب جا کر وہ دونوں ٹھیک ہوئے اور اس طرح اُن کی جان بچ گئی۔ فقیر کا کہنا صحیح ثابت ہوا۔"

محمد مجتبیٰ انصاری گوموہ

شریر لڑکا

ایک لڑکا تھا۔ اُس کا نام تیمور تھا۔ وہ بڑا شریر تھا۔ اس لئے اس کے باپ نے اُسے ایک اسکول میں داخل کر دیا۔ اسکول میں وہ نئی نئی شرارتیں کرتا۔ ایک دن وہ شرارتیں کر رہا تھا کہ ماسٹر صاحب بھی آ پہنچے تیمور کی خوب پٹائی کی۔ تیمور نے ماسٹر صاحب سے معافی مانگی۔ ماسٹر صاحب جانتے تھے کہ تیمور بڑا شریر ہے خوب سزا دی۔ تیمور پھر بھی باز نہ آیا۔ گھر جب آیا تو اس کی ماں نے اُس کو روتے دیکھ کر پوچھا "تم کیوں رو رہے ہو" تیمور نے کہا۔ میں شرارتیں کر رہا تھا تو مجھ کو ماسٹر صاحب نے خوب سزا دی"

ماں نے کہا "ٹھیک ہے بیٹا اگر تم شرارت نہ کرو تو ہیں یا ماسٹر صاحب تم کو کبھی نہ ماریں گے"

تیمور نے کہا "ماں اب سے کبھی بھی شرارت نہیں کروں گا۔"

دوسرے دن جب اسکول آیا تو صاف کپڑے پہنے ہوا تھا۔ ماسٹر صاحب نے کہا دیکھو تیمور آج کتنا صاف آیا ہے۔ جب لڑکوں نے سنا کہ تیمور آج صاف آیا تو سب لڑکے تیمور کے پاس آ گئے۔ اور اچھی اچھی باتیں کرنے لگے۔ جب چھٹی ہوئی تو تیمور گھر آیا۔ اور اپنی ماں سے اسکول کا حال سنایا۔ اور ماسٹر صاحب کا بھی ذکر کیا۔

ماں یہ سب بات سن کر بہت خوش ہوئی اور اس نے اپنے بیٹے کو تاج محل کی تصویر انعام کے طور پر دی۔ مگر پھر اگلے دن تیمور نے اپنے کپڑے گندے کر لئے۔ اور پہلے کی طرح شرارتیں کرنے لگا۔ آخر جب سالانہ امتحان ہوا اور اس کی جماعت کا نتیجہ سُنایا گیا تو معلوم ہوا کہ تیمور فیل ہو گیا۔ اب تو تیمور روتا روتا گھر آیا۔ مگر اب اس کی ماں نے اسکے اسکول جانا بند کرا دیا۔ لیکن تیمور نے اپنی شرارتیں نہ چھوڑیں۔ اور بڑے ہو کر تیمور سڑک پر بھیک مانگنے لگا۔ بیچارے کی گذر بسر بڑی مشکل سے ہوتی۔ مگر اس کے ساتھی پڑھ لکھ کر اچھے اچھے عہدوں پر پہنچ گئے تھے مگر وہ پھر بھی نہیں بچ رہے تھے۔

سید ستار شاہ عمر ۱۰ سال [illegible]

پیامی معمہ نمبر ۲۳ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل صرف دو موصول ہوئے۔ لہذا ۱۵ روپے فی کس تقسیم کیا گیا۔

۱۔ علیم النساء بیگم معرفت احمد حسین صاحب۔ محلہ میرا من کاپوروا۔ نزد حاجی والوں کی مسجد۔ کانپور۔
۲۔ سلیمان ملک معرفت ایم۔ اے۔ ملک۔ ۱۳۹/۷۔ اے سندھ کالونی۔ نیا ٹاؤن۔ کیماڑی (پاکستان)

ایک غلطی والے ۲۲ حل موصول ہوئے۔ لہذا دوسرا انعام ۱۱ فی کس تقسیم کر دیا گیا

۱۔ اسد کمال۔ الہ آباد۔ ۲۔ اکبر علی۔ جمشید پور ۳۔ محمد انور۔ حالنہ ۴۔ شکیلہ پروین۔ احمد نگر ۵۔ سید سمیع اللہ۔ نلدرگ ۶۔ اصغر حسین۔ کراچی ۷۔ شریفہ بیگم۔ جودھپور ۸۔ امینہ بیگم۔ جودھپور ۹۔ رام کمار۔ دہلی ۱۰۔ عبدالرحیم فرازی۔ شیخ گنج ۱۱۔ ایم۔ اے۔ انصاری کانپور ۱۲۔ مس طلعت پروین۔ سہارنپور ۱۳۔ سید آفتاب حسن۔ سہارنپور ۱۴۔ محمد عثمان۔ کلکتہ ۱۵۔ سوہن سنگھ۔ ٹاٹانگر ۱۶۔ اجمل خاں سہارنپور ۱۷۔ جمیل احمد۔ بریلی ۱۸۔ شریفہ خاتون۔ جموں ۱۹۔ شرف الدین۔ ٹونڈلہ ۲۰۔ احمد حسین۔ آگرہ ۲۱۔ انیس فاطمہ آگرہ ۲۲۔ بلقیس فاطمہ۔ آگرہ

صحیح حل معمہ نمبر ۲۳:۔ داہنی سے بائیں (۱) پاکستان (۴) شرما (۵) بچپن (۶) گرا (۷) غافل ۔ ۔ ۔ ۔
اوپر سے نیچے (۱) پچاس (۲) امیر (۳) کاہل (۵) بت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ضروری اعلان:۔ ماہ جون کا شمارہ کچھ مصروفیات کی بنا پر دیر سے شائع ہوا۔ پیامی معموں میں حصہ لینے والے بہت سے حضرات پرچہ دیر سے پہنچنے کی وجہ سے اپنے حل تاریخ مقررہ پر نہیں بھیج سکے اور انہوں نے اپنی اس مشکل سے ہمیں آگاہ کیا۔ لہذا ہم نے پیامیوں کے بے حد اصرار پر پیامی معما نمبر ۲۴ کی تاریخ ۲۵ جون ۵۳ء سے بڑھا کر ۱۵ اگست ۵۳ء کر دی ہے۔

ہمیں اپنے پیامیوں سے قوی امید ہے کہ وہ آئندہ بھی پیامی معموں کے بارے میں اپنے مشورے دیتے رہیں گے۔

۵۴ روپے کے نقد انعامات

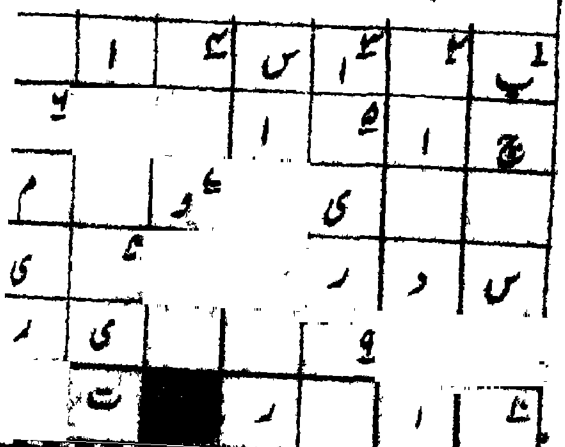
ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں

فیس داخلہ فی حل ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں ۱

★ ★★ ★ ★ پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۵۰ روپے دوسرا انعام ایک غلطی کے ۴ روپے پانچ حلوں کی فیس ۴ آنے

حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۵ اگست

پیامی معمہ نمبر ۲۴



دائیں سے بائیں

۱۔ معمہ نمبر ۲۵ میں پچاس روپے کا انعام ہوگا۔
۴۔ اس کی سب ہی عزت کرتے ہیں۔ (ماں۔ باپ)
۵۔ یہ کس کو عزیز نہیں۔ (جان۔ مال)
۷۔ مریض کے لئے سخت خطرناک ہے (وہم۔ ورم)
۹۔ کامیابی اچھی ۔۔۔ پر ہی منحصر ہے (تدبیر۔ تقدیر)
۱۰۔ ایسے آدمی کو کوئی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ (شاطر۔ جابر)

اوپر سے نیچے

۱۔ معمہ نمبر ۲۵ میں پچاس روپے کا انعام ہوگا۔
۲۔ بچے ۔۔۔ کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔
۳۔ ۔۔۔ کی حمایت لوگ کم ہی کرتے ہیں (حقیر۔ امیر)
۶۔ جس شخص کا ۔۔۔ ہی گندہ ہو اس سے وفا کی امید کہاں۔ (ضمیر۔ خمیر)
۸۔ دیہاتیوں کو اپنے ۔۔۔ کتنے پیارے ہوتے ہیں۔ (گیت۔ کھیت)

کوپن پیامی معمہ نمبر ۲۴

نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

پتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کوپن پیامی معمہ نمبر ۲۴

نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

پتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

پتہ: پیامی معمہ نمبر ۲۴ ماہنامہ پیام تعلیم
• جامعہ نگر۔ نئی دہلی •

ایڈیٹر پبلشر حامد علی خاں

معلومات کی کتابیں

سماجی زندگی

بچوں کے لئے مدرسے کی تعلیم ہی ضروری نہیں بلکہ اس ماحول کی تربیت بھی جس میں اس کی پرورش ہوتی ہے اور جوان کے ذہنوں کو نکھارتی ہے۔

قیمت حصہ اول ۸ر دوم ۱۰ر سوم ۱۲ر

مقناطیس کی کہانی

مقناطیس آدمی کو پتھر کی شکل میں ملا۔ لیکن اس نے اپنی عقل سے اس پتھر کو دیو جیسی طاقت عطا کی۔ اس کا پورا حال اس کتاب میں پڑھئے۔

قیمت آٹھ آنے

بجلی اور مقناطیس کے کھیل

یہ کھیل کیسے ہوتے ہیں اور کس طرح کھیلے جاتے ہیں؟ اس کے لئے آپ "بجلی اور مقناطیس کی کہانی" پڑھئے۔

قیمت دس آنے

دنیا کے بچے

ان قوموں اور قبیلوں کے حالات جنھیں ابھی دنیا کی ہوا نہیں لگی۔

قیمت بارہ آنے

دنیا کے بسنے والے

چوتھے پانچویں درجے کے لڑکوں کے لئے نہایت آسان زبان میں۔

قیمت بارہ آنے

قدرت کے کرشمے

بادل بجلی کا کڑکا، ٹوٹنے والے تارے، آتش فشاں پہاڑ اور زلزلے سے متعلق جغرافیائی و سائنسی معلومات۔ قیمت دس آنے

معلومات کی کتابوں کا ایک بہترین سیٹ

ان میں ہماری اور ہمارے گرد و پیش کی تمام چیزوں مثلاً جانور، درخت، پودے۔ آسمان فضا، موسم اور قدرتی قوتوں کا حال بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

معلومات کی پہلی کتاب عہ — معلومات کی دوسری کتاب عہ — معلومات کی تیسری کتاب عمہ

معلومات کی چوتھی کتاب عمہ — معلومات کی پانچویں کتاب عمہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی



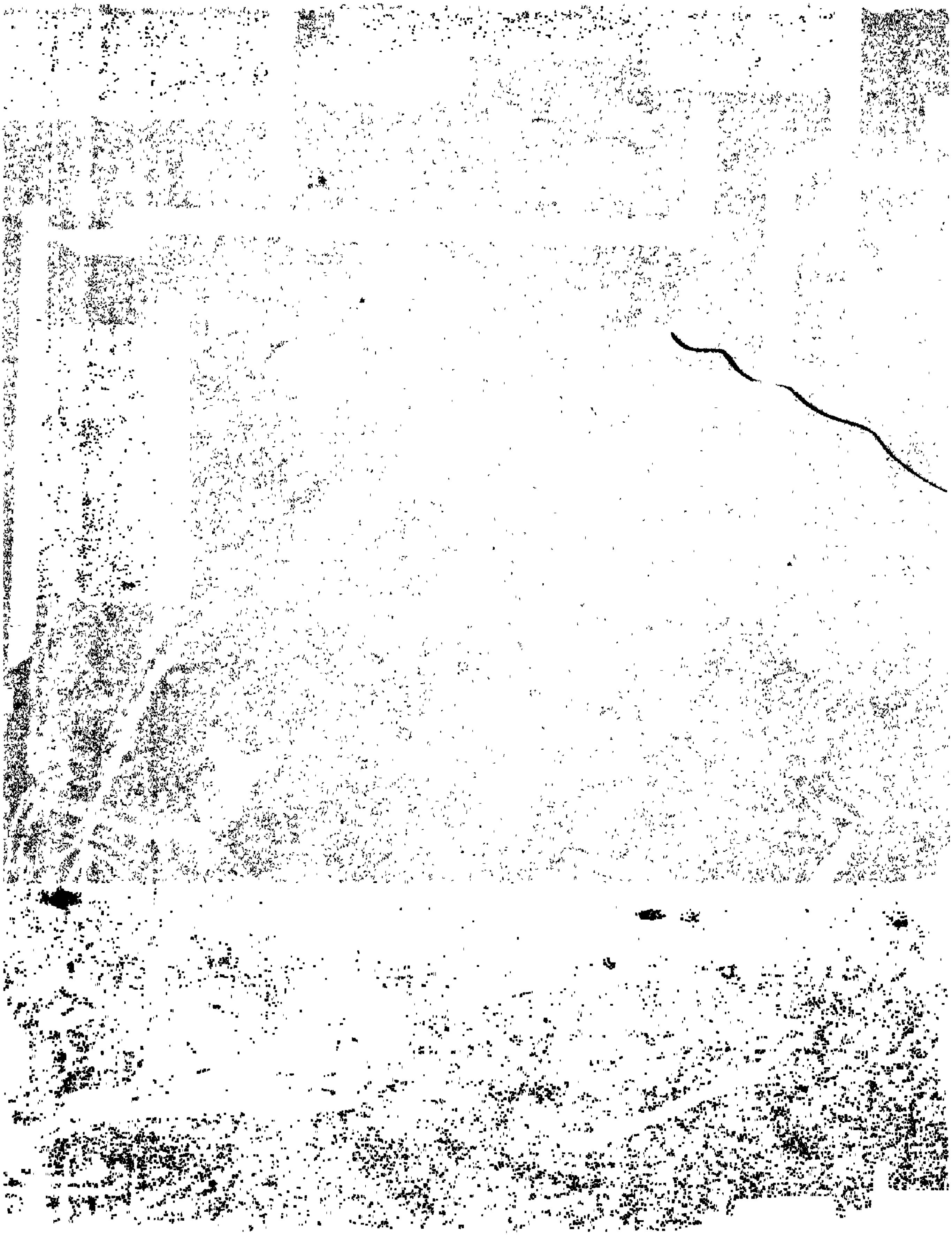
ہماری پیاری پوسی

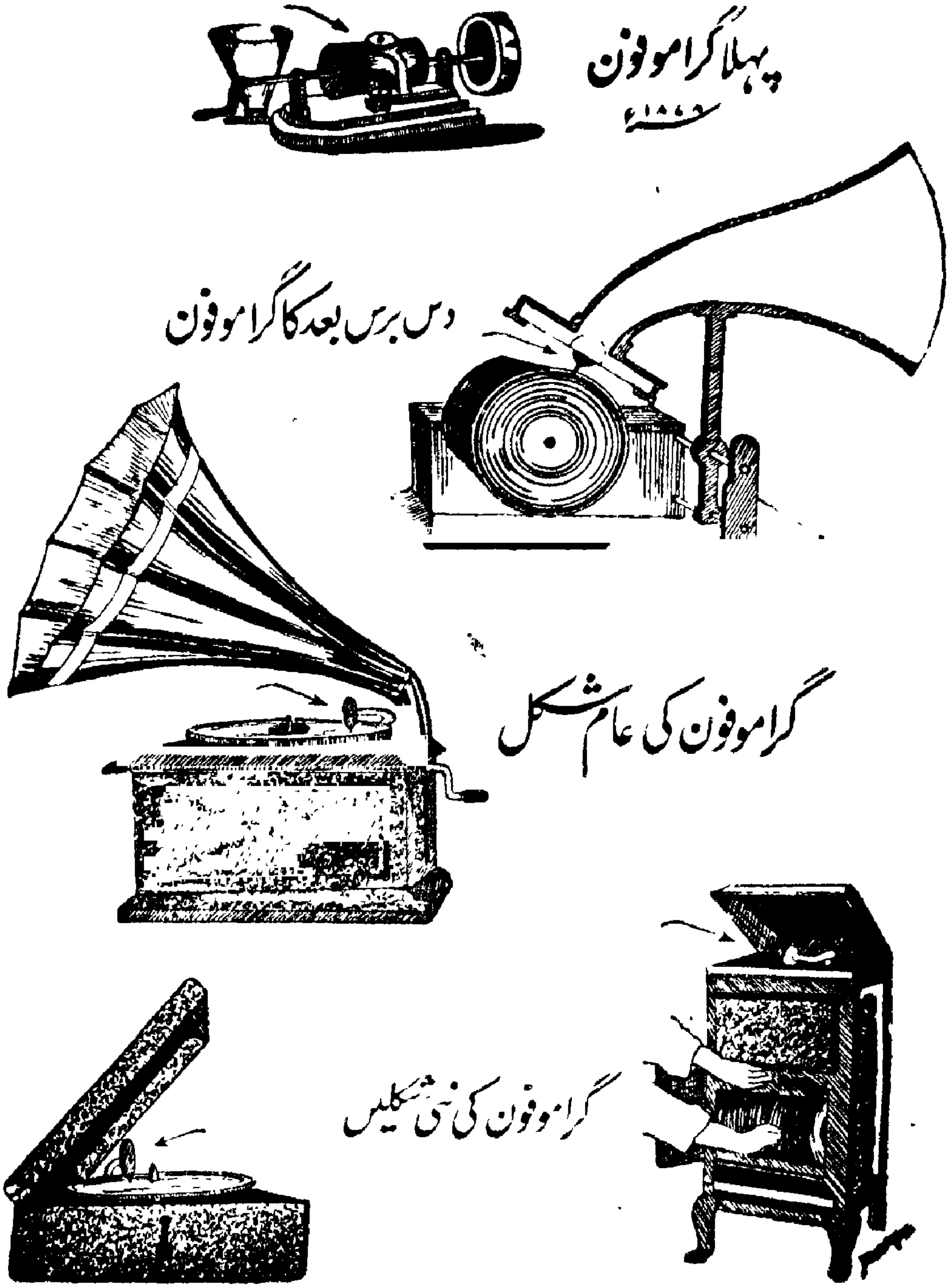


کیا خوب سواری ہے

Regd. No. D. 96.
JULY 1953.







اندر کے صفحات میں "گراموفون" پر محمد معین صاحب کا
مضمون پڑھئے

پیامِ تعلیم

فہرست

مدیران: حامد علی خاں بی۔اے (جامعہ)
اطہر پرویز ایم۔اے (علیگ)

سالانہ چندہ: ۴ روپے
فی پرچہ: ۶ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

ادارہ



بچّوں سے باتیں

اس مرتبہ آپ کو پیامِ تعلیم میں بہت سی تبدیلیاں نظر آئیں گی۔ مضامین چھوٹے چھوٹے اور دلچسپ ہیں۔ کہانیاں مزیدار ہیں اور معلومات بھی بڑھاتی ہیں۔ یہ سب چونکہ مختصر ہیں اس لئے ان کی تعداد بھی پہلے کے مقابلے میں دُگنی ہوگئی ہے۔ اس طرح اب آپ کو بہت سے مضامین پڑھنے کو ملیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پیامی اس تبدیلی کے بارے میں اپنی رائے لکھیں۔

عرصے سے بچیوں کا تقاضا تھا کہ ان کے لئے بھی صفحات مخصوص کردیئے جائیں۔ لیجئے اس بار نجمہ سلطان صاحبہ نے یہ سلسلہ شروع کردیا ہے۔ اب وہ ہر بار ان صفحات میں لڑکیوں کے خطوط کا جواب دیں گی اور ان کی دلچسپی کی چیزیں اکٹھا کریں گی۔ اگر بچیوں نے دلچسپی لی تو یہ سلسلہ اور دلچسپ بن سکے گا۔ ہم نجمہ سلطان صاحبہ کے دل سے شکرگزار ہیں۔

پیامِ تعلیم میں پہلی بار پروفیسر قادری (استادوں کے مدرسے کے ایک استاد) شرکت

فرما رہے ہیں "مٹی کے تیل کی کہانی" قادری صاحب نے ہماری فرمائش پر لکھی ہے۔ معلومات کی معلومات ہے اور کہانی کی کہانی۔ امید ہے کہ قادری صاحب آئندہ بھی پیام تعلیم کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتے رہیں گے۔

پچھلے مہینے ہمارے آرٹسٹ میسی صاحب اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ تشریف لے گئے ہیں۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ آپ کے لئے وہ وہاں کی تصویریں بناکر بھیجیں گے۔
اب ہم نے جمیل اختر صاحب کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔ جمیل اختر صاحب جامعہ میں اُستاد ہیں۔ وہ پہلے بھی تصویریں بنا چکے ہیں۔ ہم ان کے ممنون ہیں کہ وہ اپنی مصروفیت کے باوجود ہمارے لئے وقت نکال رہے ہیں۔



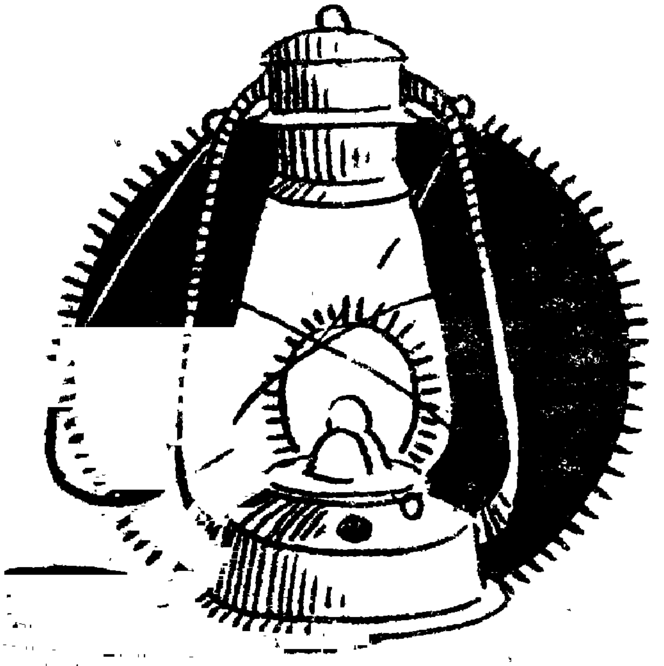


راشد حسن قادری

بزدل شیر

ایک شکاری تھا بہادر اور دلیر — مل گیا جنگل میں اک دن اس کو شیر
تیر اک مارا کماں میں جوڑ کر! — نکلا جو بازو کو اس کے توڑ کر
اور بولا شیر کو کرکے خطاب! — ایلچی بھیجا ہے میں نے اے جناب
شیر کے بازو میں زخم آیا بڑا — بھاگنا ہی اس لئے اس کو پڑا
لومڑی واں اک کھڑی تھی دیر سے — بھاگتے دیکھا تو پوچھا شیر سے
ہیں بہادر آپ تو سب سے سوا — چھوٹتے ہی پھر یہ کیسا بھاگنا
شیر بولا اس سے اے بی لومڑی — تم ہی یاں ٹھہرو جو ہو دل کی کڑی

ایلچی جس کا ہو ایسا خوفناک
وہ خدا جانے ہو کیسا خوفناک



عبداللہ قادری

مٹی کے تیل کی کہانی

میں مٹی کا تیل ہوں۔ مجھے مٹی کا تیل اس لئے کہتے ہیں کہ میں زمین کے اندر رہتا ہوں۔ وہی میرا گھر ہے۔ وہی میرا وطن۔ دنیا والے جب مجھے باہر نکالتے ہیں تو میں بڑے کام کی چیز بن جاتا ہوں اور اندھیرے گھر کو روشن کرتا ہوں۔ جہاں بجلی نہیں ہوتی وہاں لالٹین اور لیمپ میں میری ہی روشنی ہوتی ہے۔ اسٹوو (تیل کا چولھا) بھی میرے ہی دم سے جلتا ہے۔ میرے ہی میل سے موم بتیاں بنائی جاتی ہیں جنھیں دیوالی کے موقع پر بڑے شوق سے جلاتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں ان کے علاوہ مجھ میں ایسے کتنے ہی گن ہیں جن کو دیکھ کر دنیا والے آج دنگ ہیں اور ہر شخص کی للچائی ہوئی نظریں مجھ پر پڑا کرتی ہیں لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ ایک وہ بھی زمانہ تھا جب میں زمین کے نیچے خاک دھول میں ملا ہوا پڑا رہتا تھا۔ کوئی میرا نام بھی نہیں جانتا تھا۔ پھر کچھ امریکہ کے رہنے والوں کو میری اصلیت معلوم کرنے کی فکر ہوئی۔ تقریباً ڈیڑھ سو برس گذرے ان لوگوں نے پہلی دفعہ مجھے زمین کے نیچے سے کھود کر باہر نکالا۔ جانچا اور پرکھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں لوگوں کو پتہ چل گیا کہ میں بڑے کام کی چیز ہوں اور میری تلاش بڑھ گئی۔ رفتہ رفتہ میری شہرت دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئی اور ہر جگہ مجھے ڈھونڈا جانے لگا اور اب امریکہ، میکسیکو، مشرقی اور مغربی روس، ایران، عرب اور

برا میں لوگوں کو میرے ٹھکانوں کا اچھی طرح پتہ چل گیا ہے۔ معمولی طور پر اور بھی ملکوں میں میرا نام و نشان مل جاتا ہے۔ ان ٹھکانوں پر کس طرح مجھے زمین کے نیچے سے اوپر لاتے ہیں؟ میری صورت اس وقت کیا ہوتی ہے؟ کس کس طرح میں کام آتا ہوں؟ یہ کہانی بڑی مزے دار ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب لوگوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ میں کہیں زمین کی تہہ میں چھپا بیٹھا ہوں تو چند مشینیں لگا کر مجھے اوپر کھینچنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں مٹی میں ملا ہوا اوپر نکلنے لگتا ہوں۔ جہاں پر میں اس طرح سے نکلتا ہوں اسے لوگ "مٹی کے تیل کا کنواں" کہتے ہیں کبھی کبھی میں غصہ میں آکر ان مشینوں کو پھینک دیتا ہوں جو مجھے زمین کے اندر سے کھینچنے کے لئے لگائی جاتی ہیں اور فوارے کی طرح اپنے آپ باہر نکلنے لگتا ہوں۔ ایسے مقام کو "مٹی کے تیل کا چشمہ" کہا جاتا ہے۔ مجھے نکالنے والے ایک ہی چشمے یا کنوئیں سے مطمئن نہیں ہوجایا کرتے بلکہ میرے آس پاس بھی اسی طرح مشینیں لگا کر مجھے نکالنے لگتے ہیں۔ اس طرح میرے کئی کئی کنوئیں اور چشمے ایک ہی حصہ میں بن جاتے ہیں۔ ان جگہوں پر کبھی میں مہینوں ابلتا رہتا ہوں، کبھی دو چار ہفتے اور کبھی دو چار دن کے بعد ہی خاموش ہو کر بیٹھ رہتا ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کی کوشش کے باوجود میں قطعی باہر نہیں آتا اور ان کا کنواں خالی پڑا رہ جاتا ہے۔ جب میں کسی جگہ زیادہ مقدار میں نکلنے لگتا ہوں تو نلوں کے راستہ سے قریب کے بندرگاہ پر مجھے لے جاکر دھات کے بنے ہوئے بڑے بڑے حوضوں میں جمع کرتے ہیں یہ حوض نہر کی طرح محفوظ ہوتے ہیں اور ہر طرف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ یہ حوض "ٹینک" کہلاتے ہیں۔ جب میں کم مقدار میں نکلتا ہوں تب اس جگہ مجھے بڑی بڑی ٹنکیوں میں جمع کرتے ہیں اور وہاں سے جہاں مناسب سمجھتے ہیں بھیج دیا کرتے ہیں۔ اس وقت میری صورت کاڑھے شیرے یا کیچڑ کی طرح ہوتی ہے۔ اس حالت میں مجھے کام میں نہیں لایا جاسکتا۔ کیونکہ میرے اندر میل اور مٹی بھری ہوتی ہے۔ لہٰذا مجھے بڑے بڑے "صفائی گھروں" میں لے جاتے ہیں۔ یہ "صفائی گھر" خاص طور پر مجھے صاف کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ یہاں مجھے اچھی طرح صاف کیا جاتا ہے جب میرے اندر ذرا سا بھی میل باقی نہیں رہتا اور میرا رنگ خوب نکھر جاتا ہے۔ اس وقت مجھے "پٹرول" کہنے لگتے ہیں۔ میں وہی پٹرول ہوں جس کی مدد سے تیز رفتار موٹر کاریں اور ان سے زیادہ تیز رفتار ہوائی جہاز چلتے ہیں۔ جب مجھ میں کچھ میل باقی

رہتا ہے اور میرا رنگ صاف نہیں ہوتا۔ اس وقت میری صورت کے لحاظ سے مجھے سب لوگ "مٹی کا تیل" ہی کہتے ہیں۔ اور میرے ہی دم سے گھروں میں چراغ روشن ہوتے ہیں اور ہزاروں مشینوں کے "موٹر" اور "ڈائنمو" چلا کرتے ہیں۔ تیل نکال لینے کے بعد جو کچھ میرا حصہ باقی رہ جاتا ہے وہ بڑا چیپ دار ہوتا ہے۔ میری اس گھٹیا اور خراب شکل کو "گریز" کہتے ہیں جسے مشینوں کے پرزوں کو چکنا رکھنے کے لئے استعمال کرتے ہیں "گریز" بنا لینے کے بعد کچھ میں مٹی باقی رہ جاتا ہے۔ یہ بالکل ہی کھوجڑ ہوتا ہے۔ یہ وہی کھوجڑ ہے۔ جس سے موم بتی بنائی جاتی ہے۔

آج کی دنیا میں میری قدر و قیمت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ اور میرے گن سب پر ظاہر ہو رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ وہ دن دور نہیں جب میں کوئلہ کی جگہ بھی لے لوں گا۔ اور ریلیں اور بڑے بڑے پانی کے جہاز بھی میری مدد سے چلنے لگیں گے۔ پھر لوگ کوئلے کو بالکل بھول جائیں گے۔ صرف میری ہی تلاش میں رہا کریں گے مجھے پورا یقین ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا۔ جب ہر جگہ میری مانگ ہوگی اور دنیا میں وہی کامیاب ہوگا جس کا میں ساتھی ہوں گا۔

ادھر دو مہینے کی مدت بھی پوری ہو گئی۔ پرتھوی راج نے پھر حملہ کیا۔ راجا پرمال بھاگ کر کالنجر میں جا چھپا۔ خوب لڑائی ہوئی۔ مہوبے والے بڑی بہادری سے لڑے۔ پر پرتھوی راج کے سامنے ان کی بہادری اور ہمت کچھ بھی کام نہ آئی۔ لاکھن بھی مارے گئے۔ اُودل بھی کام آئے۔ پرمال کا بیٹا برہم جیت موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اُودل کی موت سے آلہ اتنے رنجیدہ ہوئے کہ وہ گھر بار چھوڑ سادھو ہو کر جنگل کو چلے گئے۔ پرتھوی راج نے پرمال کو کالنجر سے پکڑوا کر بلا لیا۔ پر اس کی جان بخش دی۔ اس کی سلطنت بھی اسی کو سونپ دی۔ تب سے مہوبا بھی دلی کے ماتحت ہو گیا۔ لیکن آلہ اور اُودل کے کارنامے آج بھی گاؤں گاؤں یاد کئے جاتے ہیں۔ گاؤں کے لوگ جب فرصت سے شام کے وقت اپنی چوپال میں بیٹھتے ہیں تو آلہ اُودل کے گانے گاتے ہیں جس میں ان سورماؤں کی بہادری کا حال اور مہوبے کی ساری کہانی ہوتی ہے۔

اطہر پرویز



کھیل کو کھیل کی طرح کھیلو

کرکٹ کا کھیل تو آپ نے اکثر دیکھا ہوگا اور خود آپ کھیلتے بھی ہوں گے۔ لیکن ابھی چند روز ہوئے کرکٹ کا ایک بڑا زبردست میچ ہوا۔ اس میچ میں ہمارے دلی کی پارلیمنٹ کے ممبران نے شرکت کی۔ ایک ٹیم ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی تھی اور دوسری ٹیم نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن کی۔ ان ٹیموں میں ہماری پارلیمنٹ کے ممبروں نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ اور سب سے زیادہ دلچسپی تو ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے لی۔ پنڈت جی کو کھلاڑی کے لباس میں دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ ان کی عمر ۶۳ سال کی ہے۔ اس کھیل میں ہار جیت سے زیادہ مزے کی بات تو یہ تھی کہ میچ میں حصہ لینے والوں میں تمام سیاسی جماعتوں کے اور ہر عمر کے آدمی شامل تھے جو پارلیمنٹ کے جلسوں میں خوب گرما گرم بحث کرتے ہیں۔ بات پڑنے پر برا بھلا بھی کہہ لیتے ہیں۔ ان کے خیالات ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں لیکن کھیل کے میدان میں آکر وہ سب بھول گئے اور سچ مچ کے کھلاڑی ہو گئے۔ لوگ خوب اچھل اچھل کر کھیلے۔ یہ کھیل دو دن ہوا۔ دلی والوں نے اس کھیل کو خوب مزے لے لے کر دیکھا۔ اور جس وقت ہمارے پنڈت جی نے بیٹنگ

چکی ہے تو مزا ہی آگیا اور کھیلنے کھڑے ہوئے تو کون کہہ سکتا تھا کہ انھوں نے دوسروں سے کبھی کھیل میں حصّہ نہیں لیا۔

اس کھیل کو دیکھنے کے لئے ٹکٹ بھی تو تھا اور پھر کھیل کے بیٹ اور دوسری چیزیں نیلام کی گئیں تو اس کی آمدنی ایک لاکھ سے بھی زیادہ ہوئی۔

آپ نے سنا ہوگا کہ شمالی ہندوستان کے بعض علاقوں میں دریاؤں میں باڑھ آئی جس سے ہزاروں لاکھوں آدمی بے گھر ہوگئے۔ یہ ساری آمدنی ان بے گھر لوگوں کو بسانے اور ان کی مدد کے لئے دیدی گئی۔

آپ نے دیکھا کہ کھیل سے کتنے فائدے ہوتے ہیں۔ کھیل کے میدان میں لوگ آپسی جھگڑے بھول جاتے ہیں۔ سب لوگ کھلاڑی ہوتے ہیں اور یہی کھیل کا سب سے بڑا پیغام ہے جو پچھلے ایشیائی کھیلوں کے موقع پر ہمارے وزیر اعظم نے دیا۔ "کھیل کو کھیل کی طرح کھیلو" ہمیں یقین ہے کہ پیامی بچے کھیل کے اس اصول پر ضرور عمل کرتے ہوں گے۔



مشتاق احمد

آلہ اودل

مہوبے کے راجہ پرمال کے دربار میں آلہ اور اودل نام کے دو بھائی تھے۔ آلہ بڑے اور اودل چھوٹے بھائی کا نام تھا۔ اودل بڑا ہمت والا اور بڑا بہادر تھا۔ جہاں اودل پہنچتا وہیں اس کا اور اس کے گھوڑے "بیندولہ" کا سکہ جم جاتا تھا۔ اپنی تلوار کے زور سے وہ بڑی سے بڑی فوجوں کو میدان سے بھگا دیتا تھا آلہ بہادری میں اودل جیسا تو نہ تھا مگر اس سے زیادہ سنجیدہ تھا۔ ان کے باپ کا نام جسراج تھا۔ اور ان کی ماں کا نام دیولدیوی رانی تھا۔ آلہ اور اودل کے باپ نے اپنی جان دے کر پرمال کی خدمت کی تھی۔ اس لئے پرمال نے انہیں کالنجر کی جاگیر انعام کے طور پر دی۔ آلہ مہوبے کی فوج کا سپہ سالار تھا۔ اودل پرمال کا وزیراعظم تھا۔ انھوں نے اپنی طاقت کے زور سے پرمال کی سلطنت کو گیا جی اور نربدا ندی تک بڑھا لیا تھا۔

ایک دفعہ دلی کے راجا پرتھوی راج کے کچھ زخمی سردار اور سپاہی راستہ

بھول کر مہوبے جا پہنچے۔ برسات کا وقت تھا ایک تو زخمی دوسرے نئی جگہ۔ پھر برسات کا موسم تھا اپنی حفاظت کے لئے انھوں نے وہیں ایک باغ میں ڈیرے ڈالے۔ مالیوں نے انہیں روکا۔ اسی پر بات بڑھ گئی اور انھوں نے بد تمیز مالیوں کی خوب مرمت کی۔ مالی روتے روتے پرمال کے دربار میں پہنچے۔ اور انہوں نے اپنی کہانی سنائی۔ دلی کے سرداروں کو سزا دینے کے لئے پرمال نے تھوڑی سی فوج بھیجی پر اُسے دلی والوں نے ذرا سی دیر میں مار بھگایا۔ تب اُودل کو حکم ہوا کہ وہ دلی والوں سے جا کر لڑے اور انہیں شکست دے۔ اُودل نے راجہ پرمال کو بہت سمجھایا کہ ایسا کرنے سے دلی کے بڑے راجہ سے مفت میں دشمنی مول لینا ٹھیک نہیں۔ دوسرے زخمی سرداروں پر حملہ کرنا گناہ ہے لیکن پرمال نے ایک نہ مانی۔ آخر مجبور ہو کر اُودل کو جانا پڑا۔ لڑائی ہوئی اُودل نے سب کو مار ڈالا۔ یہ حال سنتے ہی دلی کا راجا پرتھوی راج آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے اسی وقت اپنی فوج کو مہوبے پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔

ادھر دلی میں مہوبے پر حملے کی تیاری ہو رہی تھیں۔ ادھر مہوبے میں دوسرا واقعہ ہوا۔ آلہ اور اودل کے پاس پانچ بہت اچھے بچھڑے تھے۔ راجہ پرمال نے انہیں مانگا۔ ہر طرح کی لالچ دی۔ لیکن جب انھوں نے بچھڑے دینے سے انکار کر دیا تب پرمال نے ان سے کہا "بچھڑے دے دو نہیں تو ہماری سلطنت چھوڑ کر چلے جاؤ۔ اپنی ماں کی صلاح سے انھوں نے بچھڑے نہیں دئے۔ اور وہ مہوبے چھوڑ کر قنوج چلے گئے۔ وہاں کے راجا جے چند نے ان کی بہادری کا حال پہلے ہی سُن رکھا تھا اس نے بڑے شوق کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ اور وہ ہنسی خوشی وہاں رہنے لگے۔

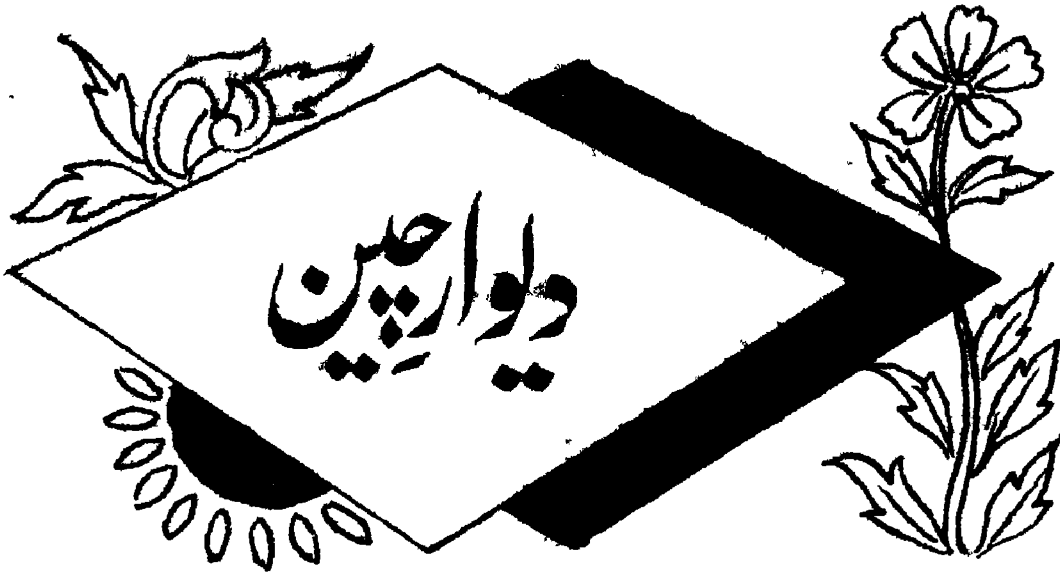
ادھر پرتھوی راج نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ مہوبے پر چڑھائی کر دی۔ بڑی گھمسان لڑائی ہوئی۔ بچارے پرمال کی کیا طاقت تھی جو وہ پرتھوی راج کے سامنے ٹھہر سکتا۔ اس کی فوج پر دلی

والی فوج ٹوٹ پڑی۔ مہوبے کے دربار میں تہلکا مچ گیا۔ بہت صلاح مشورے ہوئے آخر پرمال نے پرتھوی راج کے پاس اپنا سفیر بھیجا۔ اور درخواست کی کہ دو مہینے کے لئے لڑائی بند کر دی جائے۔ پرتھوی راج چھتری تھے۔ چھتری مذہب کو وہ اچھی طرح جانتے تھے۔ انھوں نے خوشی سے پرمال کی درخواست منظور کر لی۔ مہوبے والوں کو دو مہینے وقت مل گیا۔

جب مہوبے والوں پر مصیبت آئی تب انہوں نے آلہ اور اودل کو پھر یاد کیا۔ پرمال نے آلہ اور اودل کو بلانے کے لئے اپنا ایک آدمی بھیجا۔ اس آدمی نے جا کر آلہ اودل کو مہوبے کی مصیبت کی ساری کہانی کہہ سنائی۔ لیکن وہ دونوں ذرا بھی نہ پسیجے انہوں نے کہا "راجا پرمال نے ہمیں وطن سے نکال دیا اب مشکل کے وقت پھر بلاتے ہیں۔ ہم نہ جائیں گے" لیکن ان کی ماں سے نہ رہا گیا۔ انھوں نے اپنے لڑکوں سے گرج کر کہا" وطن پر مصیبت آئی ہے۔ دشمن اس کی آزادی چھین رہے ہیں۔ اور تم دونوں اپنی عزت لئے پھرتے ہو۔ اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر چپ بیٹھے رہنا چاہتے ہو۔ مہوبے والے مار ڈالے جائیں اور تم دور سے بیٹھے تماشہ دیکھو۔ بڑے شرم کی بات ہے۔ اپنی عزت کے لئے دیس کی عزت مٹی میں ملا رہے ہو۔ ماں کی باتوں سے دونوں بھائیوں کے دل پسیج گئے۔ اور وہ فوراً تیار ہو گئے۔

وطن کی لاج رکھتے ہوئے وطن کی پکار پر دونوں بہادروں نے اس مشکل کے وقت اپنی بے عزتی کی بات کو بھلا دیا وہ جے چند کے پاس اجازت لینے کے لئے گئے۔ جے چند نے انھیں جانے سے روکا۔ پر جب آلہ اودل نہ مانے تو اس نے جانے کی اجازت دے دی۔ اور بہت سی فوج بھی ان کی مدد کو بھیجی۔ جے چند کے بھتیجے لاکھن سنگھ بھی ان کے ساتھ مہوبے گئے۔ ان کے پہنچنے پر مہوبے میں پھر سے لڑائی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اور آلہ فوج کا سپہ سالار چنا گیا۔

احمد ولی



دیوارِ چین

آج کی دُنیا عجائبات کی دُنیا ہے۔ جدھر نگاہ اُٹھائیے، آپ کو کوئی نہ کوئی چیز ایسی ضرور نظر آئے گی جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جائے۔ پھر بھی ہمیں یہ چیزیں عجیب نہیں معلوم ہوتیں اس کا سبب کیا ہے؟ وجہ یہ ہے کہ آج دنیا اتنی ترقی کر چکی ہے اور ہماری معلومات اتنی زیادہ ہو گئی ہیں کہ آج کی بہت عجیب چیزیں بھی عجیب نہیں معلوم ہوتیں۔

آج سے پچاس برس پہلے ہوائی جہاز اور ریڈیو کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب ہوائی جہاز تیار ہوا تو اس وقت کے لوگوں کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ کبھی آسمان پر گھڑگھڑاہٹ کی آواز ہوتی تھی تو لوگ گھروں میں سے نکل کر بڑی حیرت سے اسے دیکھتے تھے۔ آج دن بھر میں نہ جانے کتنے ہوائی جہاز ہمارے سروں پر سے گزر جاتے ہیں اور ہم پرواہ بھی نہیں کرتے۔ یہی حال ریڈیو کا ہے۔ اسی طرح اور ایسی ایجادیں ہیں جن کو ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

بات یہ ہے کہ انسان جیسے جیسے علم حاصل کرتا جاتا ہے۔ اس کی معلومات بڑھتی جاتی

ہیں۔ اور کل کی عجیب چیزیں اسے آج معمولی نظر آنے لگتی ہیں۔

اس کے باوجود بعض چیزیں آج بھی ایسی موجود ہیں، جنھیں دیکھکر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ انھیں میں چین کی بڑی دیوار بھی ہے جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کی جاتی ہے۔ دیوارِ چین پورب کے سمندری سال سے شروع ہوکر اتری چین کے جنگلوں تک چلی گئی ہے۔ اس کی لمبائی چودہ سو میل ہے اور یہی اس کی سب سے عجیب خوبی ہے۔ آج کل دنیا میں اتنی لمبی کوئی دیوار کہیں نہیں ہے۔ اس زمانے میں انسان کے پاس جتنے وسائل ہیں، ان کی مدد سے چودہ ہزار میل بلکہ اس سے بھی زیادہ لمبی دیوار بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ لیکن آج سے دو ہزار سال قبل جب نہ آمد و رفت کے وسیلے تھے نہ تار اور ٹیلیفون تھے کہ خبریں ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جا سکیں، اس وقت اتنی لمبی دیوار کا بنایا جانا یقیناً بہت بڑا کارنامہ ہے اور اس کے بنانے اور بنوانے والے کی ہمت اور عزم کا پتہ دیتا ہے۔

یہ دیوار حضرت مسیح سے تین سو سال پہلے یعنی اب سے تقریباً ۲۲۵۲ سال پہلے شہنشاہ شی ہوانگ کے حکم سے بنوائی گئی تھی۔ چین کے اتر میں منگولیا کا علاقہ ہے۔ یہاں کے باشندے تاتاری کہلاتے تھے۔ قتل و غارتگری ان کا پیشہ تھا۔ یہ لوگ چین میں آکر لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ شہنشاہ شی ہوانگ نے پہلے تو فوج کی مدد سے تاتاریوں سے ملک کو پاک کیا۔ لیکن جب بھی موقع ملتا ان کے جتھے ملک میں گھس آتے اور مال اسباب لوٹ کر بھاگا کرتے۔ شی ہوانگ کو اپنی رعایا کا بڑا خیال تھا اس لئے اپنی رعایا کو تاتاریوں سے بچانے کی یہ ترکیب کی کہ ایک اونچی دیوار بنوانے کا حکم دے دیا۔ حکم ملنے کی دیر تھی۔ دیوار بننا شروع ہوگئی۔ ہزاروں مزدوروں نے کام شروع کردیا اور ۱۲ فٹ چوڑی اور بیس پچیس فٹ اونچی یہ دیوار تیار کردی جو آج بھی موجود ہے۔

اس دیوار پر ہر ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر اس سرے سے اس سرے تک پندرہ ہزار برجیاں بنائی گئی تھیں جن میں پہرہ دار رہا

کرتے تھے اور ملک کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ یہ بُرج چالیس فٹ اونچائی پر بنائے گئے تھے تاکہ دور ہی سے دُشمن کے ارادوں کا پتہ چل سکے۔

ساری دیوار مٹی اور اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔ اور سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی جنگلوں کو روندتی، پہاڑوں کو سر کرتی اور دریاؤں کو عبور کرتی ہوئی، شمالی ریگستان تک چلی گئی ہے۔

اس دیوار کے متعلق ایک اور بھی دلچسپ حکایت مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ شی ہوانگ موت سے بہت ڈرتا تھا۔ اسے کسی نجومی نے بتا دیا تھا کہ اس کی موت کا فرشتہ اُتر کی طرف سے آئے گا۔ اسی نجومی نے شی ہوانگ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ چین کے اُتر میں ایسی دیوار بنا دے کہ موت کا فرشتہ چین میں نہ داخل ہو سکے۔ اس لئے شی ہوانگ نے اس دیوار کے بنائے جانے کا حکم دیا۔ مگر موت سے کہاں بچتا۔ ابھی دیوار پوری بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ شی ہوانگ کے پاس موت کا فرشتہ آپہنچا اور اس کی رُوح کو قبض کر لیا۔

یہ تو خیر ایک قصہ ہے لیکن در اصل دیوار حملہ آوروں سے بچنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ اور آج دیوارِ چین ڈھائی ہزار برس گزر جانے پر بھی اپنے بنانے والے کی عزم ہمت اور استقلال کا فسانہ سنائے جا رہی ہے سوائے بعض مقامات کے جہاں یہ دیوار کچھ گر گئی ہے۔ پوری دیوار اچھی حالت میں موجود ہے اور شی ہوانگ کے نام کو زندہ کئے ہوئے ہے۔

۱۔ جب آپ خط لکھیں تو خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

۲۔ اپنا پتہ صاف اور خوشخط لکھیں۔

۳۔ پیام تعلیم میں چھپنے کے لئے جو مضمون بھیجئے اسے ایک لائن چھوڑ کر لکھئے۔

۴۔ جہاں تک ہو سکے مضمون مختصر بھیجئے۔

ادارہ



لالچ بُری بلا ہے

اصغر علی انصاری

پرانے زمانے کی بات ہے، کسی گاؤں میں ایک برہمن رہتا تھا۔ وہ آس پاس کے گاؤں میں پوجا پارٹ کرکے اپنا گذر بسر کرتا تھا۔ ایک بار اس علاقے میں قحط پڑ گیا۔ دو سال تک بارش نہیں ہوئی۔ زمین بالکل سوکھ گئی۔ پھر دو سال تک کوئی فصل نہ ہو سکی گھاس تک کہیں نظر نہ آتی تھی لوگوں کے پاس جو تھوڑا بہت اناج اور روپیہ پیسہ تھا، اس سے انھوں نے کچھ دنوں تک گذارا کیا۔ آخر وہ بھی ختم ہوگیا۔ اب لوگ درختوں کی پتیاں اور دوسری جڑی بوٹیاں ابال ابال کر کھانے لگے۔ ایسی حالت میں کون پوجا پارٹ کرواتا؟ دان اور خیرات کون دیتا؟ برہمن اپنے بال بچوں کے ساتھ فاقے کرنے لگا۔ بچے کھانا نہ ملنے سے بالکل ہڈی کے ڈھانچے بن گئے۔ برہمن چھپ چھپ کر دوسرے گاؤں میں بھیک مانگنے جانے لگا لیکن آس پاس کے سارے گاؤں میں قحط پڑا ہوا تھا۔ اس لئے اسے کہیں بھی بھیک نہیں ملتی تھی ایک دن شام کے وقت برہمن جب گھر واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کا چھوٹا لڑکا بھوک کے مارے مرگیا ہے۔ اس کی بیوی اتنی کمزور ہوگئی تھی کہ بے چاری سے رویا بھی نہ جاتا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس طرح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جینے سے تو مرجانا ہی اچھا ہے یہ سوچ کر وہ قریب کے جنگل میں چلا گیا اور

وہاں ایک اونچے درخت کی ڈال میں اپنا انگوچھا مضبوطی سے باندھکر گلے میں اس کا پھندا ڈالنے جا رہا تھا کہ یکایک اس نے ایک آواز سنی۔ کوئی اُسے پکار رہا تھا۔ وہ درخت کی ڈال سے اپنا انگوچھا کھول کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اس نے دیکھا کہ جنگل میں اُجالا کرتی ہوئی ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی اس کی طرف بڑھتی آ رہی ہے۔

وہ لڑکی اس کے پاس آکر بولی — "برہمن تم درخت میں انگوچھا باندھ کر کیا کر رہے تھے ؟"

برہمن نے جواب دیا — "تم یہ معلوم کر کے کیا کروگی، بیٹی —!" پھر ایک منٹ رُک کر کہنے لگا۔ "میں بہت دُکھی ہوں۔ اس لئے میں مرنا چاہتا تھا میرے کئی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ کئی دن سے ان کے منہ میں ایک دانہ بھی نہیں گیا۔ ایک بچہ آج بھوک کے مارے مرگیا۔"

"اچھا —! میں تمہیں ایک ہانڈی دیتی ہوں اسے تم اپنے گھر لے جاؤ۔ اور روز سویرے اٹھکر اس ہانڈی سے کہنا — "خالی ہانڈی تو بھر جا" — ایسا کہنے سے ہانڈی طرح طرح کے کھانوں سے بھر جایا کرے گی اور اس طرح تمہاری بھوک کی مصیبت دور ہو جائے گی۔ لیکن ہاں ایک بات یاد رکھنا، دن میں صرف ایک ہی بار ایسا کرنا۔ اور یہ کہکر وہ لڑکی غائب ہو گئی۔

برہمن ایسی عجیب و غریب ہانڈی پاکر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ ہانڈی لے کر وہ دوڑتا ہوا اپنے گھر پہنچا اور اپنی بیوی سے ہانڈی کے ملنے کا سارا حال کہہ سنایا۔ اس کی بیوی بولی — "ذرا ایک بار ایسا کہکر تو دیکھو —!" برہمن ہانڈی سے کہنے ہی جا رہا تھا کہ اُسے لڑکی کی بات یاد آگئی اس نے یہ بات اپنی بیوی کو بتائی۔ اس کی بیوی خاموش ہو گئی۔ لیکن رات میں اُسے نیند نہ آسکی بھوک سے بھی اور ڈر سے بھی کہ کہیں ہانڈی کو کوئی چرا نہ لے جائے۔

رات میں لیٹے لیٹے یکایک اُس کی بیوی بول اُٹھی — "تمہیں اس لڑکی نے بے وقوف تو نہیں بنایا۔ مجھے تو شک معلوم ہوتا ہے، کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے ؟"

برہمن کے دل میں بھی شک پیدا ہونے لگا لیکن پھر بھی اُس نے کہا — "خیر، جو کچھ ہو، سویرے تو جھوٹ اور سچ کا پتہ چل ہی جائے گا" لیکن رات ختم ہونے سے پہلے ہی کوئی آکر اُس کے دروازے پر اُسے پکارنے لگا۔ برہمن باہر نکل کر

گھر آیا تو اُس نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت سامنے کھڑی ہے۔ اُسے دیکھ کر بوڑھیا بولی — "بیٹا! اگر تم مجھے ایک خالی ہانڈی دے سکو، تو بڑا ہی ثواب ہوگا۔"

برہمن نے جواب دیا — "میں تمہارے لئے کہاں سے ہانڈی لاؤں؟ تم کمہار کے گھر چلی جاؤ، اُس کے یہاں تمہیں ضرور ہانڈی مل جائے گی —"

لیکن بڑھیا ضد کرنے لگی اور بولی — "اتنی رات گئے میں کہاں بھٹکتی پھروں گی، تم مجھے ایک ہانڈی دے دو، میں اس کے بدلے میں تمہیں ہانڈی بھر کر روپیے دوں گی —"

روپئے کی بات سُن کر برہمن کے منہ میں پانی بھر آیا وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا — "اگر خالی ہانڈی کے بدلے ایک ہانڈی بھر روپیے مل جائیں تو پھر کیا؟ اور پھر سویرے اگر ہانڈی کمالوں سے نہ بھری تو مفت میں پچھتانا ہوگا۔" برہمن لیس وپیش میں پڑ گیا۔ بڑھیا اپنے کے اندر سے روپیوں کی تھیلی نکال کر بولی — بھی یہ روپیے تمہیں دے دوں گی۔"

یہ سُن کر برہمن اپنی بیوی سے مشورہ کرنے گھر کے اندر گیا۔ اُس کی بیوی دروازے کی آڑ میں کھڑی ہو کر ان دونوں کی باتیں سُن چکی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ خالی ہانڈی کے بدلے اتنے روپئے مل جائیں تو بہت ہی اچھا ہے۔ اس لئے وہ فوراً راضی ہوگئی۔ برہمن ہانڈی لے کر باہر آیا۔ لیکن ابھی وہ بڑھیا کو ہانڈی دے ہی رہا تھا کہ اس کے ہاتھ سے ہانڈی چھوٹ گئی اور گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ برہمن ہائے ہائے کرنے لگا۔ اس کی بیوی اس کی آواز سُنکر باہر آئی اور ہانڈی کو زمین پر ٹکڑے ٹکڑے دیکھ کر رونے لگی۔

برہمن کو بڑھیا پر بہت ہی غصہ آیا۔ اُس نے سوچا کہ اسی کی وجہ سے اُس کی ہانڈی پھوٹی اور اُس کا اتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔ اس لئے اس نے اپنے نقصان کے بدلے میں بڑھیا سے روپیہ طلب کیا۔ بڑھیا نے کہا — "اگر میرے ہاتھ سے گر کر ٹوٹتی تو میں اس کی قیمت ادا کرتی، لیکن مجھ سے تو ٹوٹی نہیں، پھر میں کیوں قیمت دوں —؟"

برہمن ہانڈی کے رنج میں پاگل سا ہوگیا۔ اُس کے سوچنے سمجھنے کی طاقت نے جواب دے دیا اس نے بڑھیا سے روپئے چھین لینے کا ارادہ کیا اس کی یہ حالت دیکھ کر بڑھیا بولی — "تم کہتے ہو کہ میری ہی وجہ سے تمہیں نقصان اُٹھانا پڑا ہے۔ اچھا یہی سہی

میں تم کو ایک ایسی چیز دے رہی ہوں، جس سے تمہارا نقصان پورا ہو جائے گا۔ لو میرے ہاتھ کی یہ لاٹھی لے لو ۔۔۔!"

برہمن نے جل بھن کر کہا ۔۔ "تم مجھے ایک معمولی لاٹھی دے کر مجھ سے مذاق کر رہی ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ میری ہانڈی میں کیا خوبی تھی ؟"

بڑھیا نے جواب دیا ۔۔ "میری لاٹھی بھی کوئی معمولی لاٹھی نہیں ہے۔ اسے تین بار زمین پر مارتے ہی، تمہاری جو خواہش ہوگی، وہ فوراً پوری ہو جائے گی۔ لیکن مہینے میں صرف ایک بار، جب چودھویں کا چاند نکل آئے ۔۔۔"

برہمن نے کہا ۔۔ "اگر تمہاری لاٹھی میں یہ خوبی ہے تو میں اسے اپنی ہانڈی کے بدلے میں لے لوں گا۔"

بڑھیا اُسے لاٹھی دے کر بولی ۔۔ "دیکھو! اس لاٹھی سے تم کوئی اور کام نہ لینا۔" اور یہ کہہ کر وہ رات کے اندھیرے میں غائب ہوگئی۔

لاٹھی پاکر برہمن اور اس کی بیوی بہت خوش ہوئے۔ لیکن لاٹھی لے کر وہ دونوں جیسے ہی گھر میں گھسے، انھوں نے دیکھا کہ ایک خوفناک سانپ اس کے ایک لڑکے کے سر پر پھن اٹھائے بیٹھا ہے۔ یہ دیکھتے ہی برہمن کی بیوی نے اس سے لاٹھی چھین لی ۔۔۔!

برہمن بولا ۔۔ "ارے یہ تم کیا کر رہی ہو؟ اس لاٹھی سے کوئی کام نہیں لینا چاہیے۔ بڑھیا نے منع کیا ہے نا ؟"

اتنے میں سانپ حرکت کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر اس کی بیوی اور بھی گھبرائی۔ وہ ماں ہو کر یہ کیسے دیکھ سکتی تھی کہ اس کا شوہر لاٹھی لئے کھڑا ہے اور سانپ اس کے بچے کو ڈس لے۔

برہمن کی بات سن کر اس کی بیوی آگ بگولہ ہوگئی اور اس نے کہا ۔۔ "میرا بچہ مر جائے گا کیا تمہیں اس کی پرواہ نہیں ہے ؟"

برہمن اپنی پوری طاقت سے لاٹھی پکڑے ہوئے سوچ رہا تھا ۔۔ "جو مانگوں گا، وہی ملے گا۔ بے شمار مال و دولت ...... ہیرے لال جواہرات ..... اور ..... اور" لیکن اُس کی بیوی نے ایک نہ سُنی اور لاٹھی اُس سے چھین کر سانپ پر چلا ہی تو دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سانپ غائب ہوگیا اور اس کے ہاتھ سے لاٹھی بھی غائب ہوگئی۔ برہمن سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اتنے میں وہی چھوٹی لڑکی برہمن کے گھر میں داخل ہوئی اور آ کر بولی ۔۔ "برہمن! میری ہانڈی کہاں ہے؟"



کیا آپ اِسے واپس لے سکتے ہیں۔ یہ صرف ایک بار استعمال ہوا ہے

جاپانی بچوں کے کھیل

مجیب احمد خاں



پڑھنے لکھنے کے بعد جب آپ کو کھیلنے کی اجازت مل جاتی ہے تو پھر آپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ آپ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھتا ہے اور آپ جلدی جلدی اپنے ہمجولیوں کو جمع کر کے کبڈی، کوڑا جمال شاہی یا اپنی پسند کے کسی دوسرے کھیل میں لگ جاتے ہیں۔ کتنا مزا آتا ہے ان کھیلوں میں! دنیا کے تمام ملکوں کے بچوں کو کھیل سے اتنی ہی دلچسپی اور محبت ہوتی ہے جتنی کہ آپ کو ہے۔ آپ شاید یہ سمجھتے ہوں گے کہ دنیا کے اور ملکوں کے بچے بھی وہی کھیل کھیلتے ہوں گے جو آپ کھیلا کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ بہت سے کھیل ایسے ہیں جو دنیا کے سب ہی ملکوں کے کے بچے کھیلتے ہیں۔ لیکن ان کھیلوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ آیئے آج آپ کو جاپان میں رہنے والے بچوں کے کچھ ایسے کھیلوں کا حال سنائیں جو کبھی کبھی آپ ضرور کھیلتے ہوں گے۔

گھریلو کھیلوں میں جاپانی بچوں کا سب سے پیارا کھیل "لٹوؤں کی لڑائی" ہے۔

جی ہاں "لٹوؤں کی لڑائی"! آپ تو بس لٹو گھاتا ہی جانتے ہیں مگر جاپانی بچے اپنے لٹو گھما کر لڑاتے بھی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ دو لڑکے اپنے اپنے لٹوؤں پر ستلی لپیٹ کر آمنے سامنے ذرا فاصلہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُن میں سے ایک لڑکا پہلے اپنا لٹو زمین پر پھینک کر بالکل اسی طرح گھماتا ہے جیسے آپ گھمایا کرتے ہیں۔ اِدھر اس لڑکے کے لٹو نے گھومنا شروع کیا نہیں کہ دوسرے لڑکے نے اپنا لٹو اس طرح ہوشیاری کے ساتھ گھما کر پھینکا کہ گھومتے ہی اس کا لٹو پہلے لڑکے کے گھومتے ہوئے لٹو سے ٹکرا جائے۔ اس ٹکر میں دونوں لٹوؤں میں سے ایک نہ ایک لٹو گر ہی جاتا ہے۔ جس کا لٹو گر جاتا ہے اُس کی ہار مانی جاتی ہے۔ تعریف یہ ہے کہ ہر بار لٹوؤں کی ٹکر ضرور ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ پہلا لٹو تو الگ کھڑا گھوم رہا ہے اور دوسرا الگ۔ اگر اتفاق سے کبھی دوسرے لڑکے کا لٹو نہ ٹکرائے تو پھر اس کی بڑی بھد ہوتی ہے اور لڑائی دیکھنے والے بچے دوسرے لڑکے کو خوب آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔

جاپان کے بچوں کا دوسرا گھریلو کھیل زمین پر ریت کی تصویریں بنانا ہے۔ کھیل، کھیل بھی ہے اور ڈرائنگ کی اچھی مشق بھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمارے یہاں کے بچے اکثر انگلی یا لکڑی کی مدد سے زمین پر جانوروں، چڑیوں یا مکانوں کی تصویریں بنایا کرتے ہیں اور جب وہ بن جاتے ہیں تو کھڑے ہو کر دور سے ان کو دیکھتے ہیں اور خوب خوش ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی آپس میں یہ مقابلہ بھی ہو جاتا ہے کہ کون سب سے جلدی تصویر تیار کرتا ہے۔ جاپانی بچے بھی اس طرح کا کھیل کھیلتے ہیں مگر ان کے کھیلنے کا ڈھنگ ذرا بدلا ہوا ہے۔ وہاں کے بچوں کو اس کھیل سے دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کے پاس کاغذ یا کپڑے کی بنی ہوئی پانچ چھوٹی چھوٹی تھیلیاں ہوتی ہیں۔ ان تھیلیوں میں سفید، کالی، نیلی، پیلی اور سنہرے رنگ کی باریک پسی ہوئی چاک مٹی یا ریت بھری ہوتی ہیں۔ کھیلنے والا پہلے سفید مٹی

...ایک ہلکی سی تہ فرش پر پھیلا دیتا ہے۔ اس کے بعد کالی مٹی مٹھی میں لے کر انگلیوں کے بیچ میں سے اس طرح گراتا ہے کہ سفید مٹی کی تہہ پر من مانے پیڑ، پھول، جانور یا مکان کا خاکہ بن جائے۔ جب یہ خاکہ تیار ہو جاتا ہے تو اسی طرح باری باری رنگوں کی مٹی مٹھی میں لے کر اُس خاکہ میں بھر دیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوبصورت رنگ برنگی تصویر تیار ہو جاتی ہے۔ یہ سب کام اتنی پھرتی اور ہوشیاری سے کیا جاتا ہے کہ آپ دیکھیں تو حیرت پڑ جائیں۔ بعض بچے اس کھیل میں اتنے ہوشیار ہوتے ہیں کہ ایک ہی مٹی میں پیلی اور نیلی مٹی لے کر انگلیوں کے درمیان سے اس طرح گراتے ہیں کہ دونوں رنگ کی مٹی الگ الگ گرتی جاتی ہے۔ اور جب چاہتے ہیں ہاتھ کے ایک ذرا سے جھٹکے سے دونوں رنگ کی مٹی کو ملا کر خوب صورت سبز رنگ کی مٹی گرانے لگتے ہیں۔

میدانی کھیلوں میں ان بچوں کا سب سے پیارا کھیل پتنگ اڑانا ہے۔ جاپان کے بچے ہم لوگوں کی طرح سڑک یا چھت پر کھڑے ہو کر پتنگ نہیں اُڑاتے کیونکہ اس سے گرنے اور چوٹ کھانے کا خطرہ رہتا ہے یہ بچے کھلے میدانوں میں جا کر پتنگ اُڑاتے ہیں۔ اُن کی پتنگیں بھی ہماری پتنگوں کی طرح سیدھی سادھی چوکور شکل کی نہیں ہوتیں بلکہ ان کی کوئی پتنگ مگرمچھ کی شکل کی ہوتی ہے تو کوئی کسی چڑیا کی شکل کی۔ اکثر پتنگیں کاغذ کے بجائے باریک ریشمی کپڑے کی بھی ہوتی ہیں۔ ان پتنگوں پر بڑے شوخ رنگوں سے خوب صورت پھول بوٹے بھی بنے ہوتے ہیں۔ پتنگوں کے پیچ بھی لڑائے جاتے ہیں۔ مگر ہم لوگوں کے پیچ لڑانے اور جاپانی بچوں کے پیچ لڑانے میں ایک اور فرق ہے اور وہ یہ کہ ہمارے یہاں تو صرف دو پتنگوں میں پیچ لڑتا ہے لیکن جاپان میں ایک پارٹی کی بہت سی پتنگیں دوسری پارٹی کی بہت سی پتنگوں سے ایک ساتھ لڑائی جاتی ہیں۔ سب سے مزے دار بات یہ ہوتی ہے کہ اس طرح کے پیچوں میں ڈور

بقیہ صفحہ ۱۳۱ پر

ستار صدیقی

گاؤں کی سرکار

کردار ـــ نسیم اور نریندر، دو لڑکے۔ نسیم تیسری جماعت میں پڑھتا ہے اور نریندر چوتھی کا طالب علم ہے ـــ ان کی عمروں میں بھی ایک دو سال کا فرق ہے۔

مقام ـــ شہر سے دور ایک صاف ستھرا گاؤں۔

موسم ـــ برسات۔

وقت ـــ ۵ بجے شام

(موسم نہایت خوشگوار ہے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی دکھائی دیتی ہے۔ گاؤں سے کچھ فاصلہ پر ایک تیز رَو ندی ہے، جس کے بہاؤ کی آواز دور سے سُنائی دے رہی ہے ـــ نسیم اور نریندر گاؤں کی اُس پختہ سڑک پر ٹہلتے ہوئے جا رہے ہیں۔ جو کچھ دور جا کر شہر جانے والی سڑک سے مل گئی ہے ـــ یہ سڑک ابھی کچھ ہی دن ہوئے گاؤں والوں نے مل جل کر تیار کی ہے)

نسیم۔ بھائی نریندر! کیا بتاؤں، آج آپ کا گاؤں دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔

نریندر۔ کیوں نہیں بھائی! پچھلے سال جب آپ یہاں آئے تھے، اُس وقت کے گاؤں میں اور آج کے گاؤں میں فرق بھی تو بہت کچھ ہے۔

نسیم:۔ ہاں بھائی! پچھلے سال جب میں ابا جان کے ساتھ یہاں آیا تھا تو بات ہی کچھ اور تھی۔ گلیوں میں منوں کیچڑ، مکان گندے، اور بڑے سب کے سب ہی میلے۔ یہ سب دیکھ کر تو مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں کیوں ابا جان سے ضد کرکے یہاں آگیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اب پھر کبھی اس طرف کا رُخ نہیں کروں گا۔ لیکن اس بار خود ابا جان نے مجھے اپنے ساتھ یہاں آنے پر مجبور کر دیا۔

نریندر:۔ اس وقت تو واقعی ہمارے گاؤں کی ایسی ہی حالت تھی۔ مجھ سے خود جب میرے شہر کے دوست اپنے گاؤں کا حال بتانے کو کہا کرتے تھے، تو میں اُن کی باتیں ٹال جایا کرتا تھا۔ لیکن اب میں فخر کے ساتھ اپنے گاؤں کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔

نسیم:۔ تو بھائی اب ایک سال میں یہ سب کایا پلٹ کس طرح ہوگئی؟ اب تو میں دیکھتا ہوں کہ گلیوں میں ویسی گندگی بھی نہیں۔ کوڑا کرکٹ بھی ایک جگہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ لچھمن اور طوطا بھی، جنھیں ہم لوگ گندہ ہونے کی وجہ سے اپنے ساتھ کھیلنے نہیں دیا کرتے تھے، مجھ سے ملنے کے لئے آئے تو صاف اور ستھرے کپڑوں میں تھے۔ اب پہلے کی طرح اُن کی گندگی میں کھیلنے کی عادت بھی شاید چھوٹ گئی ہے۔ مکان تو ماشاء اللہ اب ایسے صاف اور ستھرے ہوگئے ہیں کہ شہر کو چھوڑ کر یہاں بس جانے کو جی چاہتا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کچھ تو بتلاؤ بھائی۔

نریندر:۔ نسیم بھائی۔ یہ بڑی دُکھ بھری کہانی ہے۔ پچھلے سال جب آپ یہاں سے چلے گئے تو بڑے زور کی بارش ہوئی۔ ایک ہفتہ تک سورج مہاراج کے درشن کو ہی ترس گئے۔ ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ آپ ہی سوچئے گاؤں کے کچے مکان اس کی کہاں تاب لاتے۔ کسی کی دیواریں گریں، تو کوئی پورا ہی بیٹھ گیا۔ ہمارے اسکول کا ایک کمرہ بھی بارش کی بھینٹ چڑھ گیا۔

نسیم:۔ (بات کاٹتے ہوئے) تب تو آپ لوگوں کو بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

نریندر:۔ ہاں بھائی کچھ نہ پوچھو۔۔۔۔۔۔
خیر کچھ دن بعد رام رام کرکے جب بارش کا زور

کم ہوا، اور ہمارا اسکول بھی کھل گیا، تو ہمارے ماسٹر صاحب "سرپنچ جی" کے پاس پہنچے اور اُن سے پنچایت کا جلسہ کرنے کی درخواست کی۔ گاؤں کے "سرپنچ" ہمارے ماسٹر صاحب کی بات بہت مانتے ہیں۔ انھوں نے فوراً ہی رامو کو بُلایا اور جلسہ کا اعلان کرنے کا حکم دیا۔ رامو جھوجھری ڈھولک گلے میں لٹکائے، ہاتھ میں بانس کی ایک کھپچی لیے، ڈھولک پیٹ پیٹ کر گاؤں میں جلسہ کا اعلان کرآئے۔

نسیم:۔ تب تو پھر رات کو سب لوگ بڑی تعداد میں جمع ہوئے ہوں گے؟

نریندر:۔ ہاں بھائی کیوں نہیں! رات کو گاؤں کے سب ہی بچے، بوڑھے اور جوان جلسہ میں شرکت کے لیے آموجود ہوئے، کچھ تو اپنے ساتھ اپنے حقّے اور چلم تمباکو بھی لے آئے تھے۔ میں بھی پتا جی کے ساتھ جلسہ میں پہنچ گیا۔ سب سے پہلے ہمارے ماسٹر صاحب نے تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں اپنی مدد آپ" کرنے کے اچھے اصول کو سمجھایا۔ اسکے بعد دو ایک آدمیوں نے اور مختصر سی تقریریں کیں۔ بارش سے پیدا ہوئی مصیبت کے حل پر غور کیا گیا۔ تجویزیں پیش ہوئیں۔ آخرکار سب کی رائے سے یہ طے پایا کہ سب سے پہلے گاؤں میں ایک پکّی سڑک بنائی جائے۔ یہ سڑک جس پر ہم چل رہے ہیں اُسی کا نتیجہ ہے۔ اسکے علاوہ یہ بھی طے ہوا کہ ہر گھر سے چار آنے ماہوار چندہ وصول کیا جائے، جو گاؤں کے مفید کاموں پر خرچ کیا جائے، جیسے گاؤں کی صفائی، بچّوں کے اسکول کی پختہ عمارت، روشنی، صحت کی حفاظت وغیرہ۔

نسیم:۔ بھائی نریندر! اس سڑک پر تو بہت روپیہ خرچ ہوا ہوگا۔ چار چار آنے چندہ دینے سے یہ کس طرح تیار ہوگئی۔

نریندر:۔ سنئے تو سہی۔ سب لوگوں نے جب یہ دونوں تجویزیں منظور کرلیں، تو پرکاش دادا نے اس کام میں پچاس روپئے دینے کا اعلان کیا۔ پھر کیا تھا۔ کسی نے دس، کسی نے بیس، اور کسی نے پانچ، جس کی جیسی حیثیت تھی اس نیک کام میں دینے کے لیے اپنے نام لکھوائے رامو نے بھی اس کام کے لیے دس روپئے دینے کا اعلان کیا۔ کچھ لوگوں نے نقد روپئے بھی دیئے۔ آن کی آن میں پانچ سو روپئے اکٹھا

ہو گئے۔

نسیم:۔ بھائی نریندر۔ یہاں کے لوگ بڑی ہمت والے ہیں۔

نریندر:۔ ہاں تو، روپیہ وصول ہونے پر سڑک کا کام شروع کر دیا گیا۔ مزدوری پر کچھ خرچ نہیں ہوا۔ صرف پتھر اور دوسری چیزیں خریدی گئیں۔ ہمارے اسکول کا کمرہ بھی اسی چندے سے تیار کرا دیا گیا۔ رامو کو سڑک اور گلیوں کی صفائی کے لئے نوکر رکھ لیا گیا۔ ایک "صفائی کمیٹی" بھی بنائی گئی جس کے صدر ہمارے پتا جی چُن لئے گئے ہیں۔ یہ کمیٹی گاؤں کے گھر گھر میں جا کر صفائی دیکھتی ہے۔ اگر کسی گھر میں گندگی نظر آتی ہے، تو اس کمیٹی کے ممبر اپنے ہاتھوں سے اسے صاف کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر گھر والوں کو خود ہی شرم آتی ہے اور وہ آئندہ احتیاط برتتے ہیں۔ یہ کوڑا گھر بھی اُس کے بعد ہی بنایا گیا ہے۔ اب کوئی اِدھر اُدھر کوڑا نہیں پھینکتا۔ یہاں کے لوگ اب تو صفائی سے پریم کرنے لگے ہیں۔

نسیم:۔ بھائی نریندر! آپ کی "اپنی مدد آپ" کی اس کہانی کا مجھ پر بڑا اثر ہوا۔ لیکن ذرا یہ تو بتلایئے کہ پنچایت کیا ہوتی ہے اور سرپنچ کسے کہتے ہیں؟

نریندر:۔ (قہقہہ لگاتے ہوئے) واہ بھائی واہ۔ جب ہی کہتے ہو کہ شہر کے لوگ گاؤں والوں سے زیادہ جانکاری رکھتے ہیں۔ آپ کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کہ "سرپنچ" کیا ہوتا ہے اور پنچایت کسے کہتے ہیں؟

نسیم:۔ (شرماتے ہوئے) نہیں بھئی یہ بات نہیں۔ میں نے کبھی آپ سے یہ نہیں کہا کہ شہر کے لوگ زیادہ جانتے ہیں۔ وہ بھی گاؤں والوں ہی جیسے ہوتے ہیں۔

نریندر:۔ (بات کا رُخ بدلتے ہوئے) ہاں تو آپ مجھ سے یہی پوچھ رہے تھے نا کہ پنچایت کیا ہے اور سرپنچ کسے کہتے ہیں؟

نسیم:۔ جی ہاں!

نریندر:۔ اچھا تو سُنئے۔ گاؤں کی پنچایت اصل میں گاؤں کی سرکار ہے۔ گاؤں کا سارا انتظام اُسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ گاؤں والوں کے ہر جھگڑے کا فیصلہ بھی یہیں ہوتا ہے۔ ایک طرح سے یہ ایک "عدالت" بھی ہے۔ آپ کے یہاں تو سُنا ہے کہ لوگ عدالتوں میں اپنے جھگڑوں کا فیصلہ کراتے ہیں۔ ہمارے یہاں ایسا

نہیں ہے۔ پتا جی کہہ رہے تھے کہ پنچایتیں ہمارے دیش میں بہت پرانے زمانے سے چلی آتی ہیں۔ انگریزوں نے ان کو ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب سے ہم آزاد ہوئے ہیں ان میں پھر سے جان پڑ گئی ہے۔

نسیم :- تب تو پنچایت بڑے کام کی چیز ہے۔ ہمارے شہر میں تو شاید ایسی کوئی چیز نہیں۔ میں ابّا جان سے پوچھوں گا۔ شاید وہ کچھ بتلائیں۔

نریندر :- کیوں نہیں نسیم بھائی ـــــ وہاں تو ضرور ایسی کوئی چیز ہو گی۔ پوچھ کر مجھے بھی بتائیے گا۔

نسیم :- ضرور۔

نریندر :- ہاں بھائی نسیم۔ ایک بات بتانا تو میں بھول ہی گیا ـــــ گاؤں کی پنچایت میں پانچ یا سات ممبر ہوتے ہیں، جنھیں "پنچ" کہا جاتا ہے۔ گاؤں کے لوگ انھیں خود چنتے ہیں۔ ان لوگوں کی سچائی، ہمدردی اور فیصلہ پر ہر شخص کو بھروسہ ہوتا ہے ـــــ ان ہی پنچوں میں ایک کو صدر چن لیا جاتا ہے جسے "سرپنچ" یا "پردھان پنچ" کہتے ہیں۔

نسیم :- گاؤں کی پنچایت لوگوں پر جرمانہ بھی کرتی ہو گی؟

نریندر :- جی ہاں! ـــــ یو۔پی میں تو سرکار کی طرف سے گاؤں کی پنچایتوں کو پچاس روپئے تک جرمانہ کرنے کا اختیار مل گیا ہے۔

نسیم :- ایک بات اور بتائیے ـــــ گاؤں کی پنچایت جرمانہ کا کیا کرتی ہے؟

نریندر :- (زور سے ہنستے ہوئے) واہ نسیم بھائی واہ ـــــ ساری رامائن پڑھ لی اب تک یہ نہ سمجھ سکے کہ سیتا مرد تھی یا عورت۔ بھئی کرتی کیا؟ گاؤں کی بھلائی کے کاموں پر روپیہ خرچ کرتی ہے۔

نسیم :- (جھینپ کر بات کا رُخ بدلتے ہوئے) نریندر بھائی۔ جلدی قدم بڑھائیے اندھیرا بہت ہو گیا ہے۔ ابّا جان اور چچا میاں ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔

(دونوں تیزی سے گھر کی طرف چلنے لگتے ہیں)۔

عبدالواحد۔ پورنیہ

بارہ ۱۲ بھائی

ایک بادشاہ تھے۔ اس کے بارہ لڑکے تھے۔ ایک دن بادشاہ نے اپنی ملکہ سے کہا: اگر اب کے تیرھواں بچّہ لڑکی ہوگی تو یہ بارہ لڑکے مار ڈالے جائیں گے۔ یہ سُن کر بچاری ماں کا دل گھبرایا۔ اب وہ سارا دن گم سم رہنے لگی۔ وہ بار بار سوچتی کہ اپنے لڑکوں سے یہ بات کیوں کر کہے۔ آخر ایک دن اس کے چھوٹے لڑکے نے پوچھا۔

”اماں! تم اتنا اُداس کیوں رہتی ہو؟“

”نہیں کوئی بات نہیں“ اس کی ماں نے جواب دیا۔

مگر وہ لڑکا اس سے برابر سوال پوچھتا رہا اور اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر اس کی ماں نے اس کو سارا حال کہہ سُنایا۔ اور آخر میں یہ رائے دی۔

”بیٹا! اب تم سب بھائیوں کا بھلا اسی میں ہے کہ تم یہ شہر چھوڑ کر کہیں چلے جاؤ۔ ورنہ کیا فائدہ تمھاری جان چلی جائے۔ تم اپنے سب بھائیوں سے بھی کہہ دو۔ میری ہمت نہیں پڑتی کہ میں تم لوگوں کو اس محل سے نکالوں“۔

آخر اس چھوٹے بھائی نے اپنے اور دوسرے بھائیوں سے یہ حال سنایا۔ یہ سن کر سب نے طے کیا کہ وہ چپکے سے اس محل کو چھوڑ دیں۔ ان کی ماں نے انھیں سمجھا دیا کہ اگر کوئی لڑکا ہوگا تب پھر کوئی بات نہیں۔ میں محل کی چھت پر ایک سفید جھنڈا لہرا دوں گی، لیکن اگر کالے رنگ کا کپڑا دیکھنا تو سمجھنا کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے اور تمھاری جان کی خیر نہیں ہے۔

چنانچہ یہ شہزادے محل کے پاس پڑوس ہی میں رہے۔ آخر ایک دن صبح صبح ان کی نظر پڑی تو محل پر کالا کپڑا لہرا رہا تھا۔ اب تو سب سمجھ گئے کہ خیریت نہیں ہے اور سب لڑکے ڈر کے مارے جنگل کے اندر چلے گئے۔ وہاں ایک جگہ ان کو ایک خالی جھونپڑی ملی۔ یہ سب لوگ وہیں جا کر ٹھہر گئے اور مزے میں رہنے لگے۔ سب سے چھوٹا لڑکا اکیلے گھر پر رہتا اور باقی دوسرے بھائی شکار کی تلاش میں جنگل جاتے اور جنگلی جانور اور پرندے مار کر لاتے۔

ادھر محل میں یہ حال تھا کہ ملکہ رات دن اداس رہتی۔ کچھ دن بعد لڑکی بھی کافی بڑی ہوگئی۔ تو ایک دن لڑکی کی نظر ایک قمیص پر پڑی اس نے ماں سے پوچھا "اماں یہ قمیص کس کی ہے؟"

ماں نے جواب دیا "بیٹی یہ تیرے بڑے بھائی کی قمیص ہے۔"

اب جو لڑکی نے سوالات کئے تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے بارہ بھائی ہیں جو اس کی وجہ سے محل چھوڑ کر جنگل چلے گئے ہیں۔ آخر شہزادی نے بھی محل چھوڑ دیا اور بھائیوں کی تلاش میں جنگل چلی گئی۔ اور تلاش کرتے کرتے اسے وہ جھونپڑی مل گئی جس میں وہ سب رہتے تھے۔ جب بھائیوں کو معلوم ہوا کہ یہ ان کی بہن ہے تو چھوٹے نے سمجھائے اور سب مل جل کر ایک ساتھ رہنے لگے۔ وہ گھر پر چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتی اور کام کاج میں مدد دیتی۔

ایک دن کی بات ہے کہ شہزادی نے جھونپڑی کے پاس گلاب کے بارہ پھولوں کو توڑا تو اس کے سب بھائی کوے بن گئے اور وہ جھونپڑی اور باغیچہ بالکل غائب ہوگیا۔ اب تو شہزادی بہت گھبرائی۔ آخر اس کو ایک بڑھیا نظر آئی اس نے بتایا کہ وہ بارہ پھول اس کے بھائی تھے۔ اگر اب ان کو پھر حاصل کرنا چاہتی ہو تو آٹھ سال بالکل خاموش رہو۔ اس درمیان میں

نہ ہنسو نہ بولو۔

شہزادی اس طرح چُپ چاپ وہیں ایک پیڑ کے نیچے رہنے لگی۔

اب وہ دن بھر خاموش رہتی نہ بولتی نہ ہنستی۔ اس طرح کئی برس گزر گئے۔ اتفاقاً ایک شہزادہ اُدھر شکار کھیلنے آگیا۔ اس نے جو شہزادی کو دیکھا تو اُسے اپنے ساتھ اپنے یہاں لے گیا مگر اس درمیان میں شہزادی نے کچھ نہ کہا۔ وہ اسے اپنے محل لے گیا مگر شہزادی وہاں بھی کچھ نہ بولی اس طرح اُسے وہاں رہتے رہتے بہت دن ہو گئے مگر شہزادی تو کسی سے بات ہی نہ کرتی بس دن بھر چُپ چاپ رہتی۔ آخر ایک دن شہزادے کو بہت غصہ آیا اور اس نے حکم دیا کہ اُسے آگ میں جلا دیا جائے۔

شہزادے کا حکم دینا تھا کہ لوگوں نے اس کو جلانے کے لئے آگ کا انتظام کر دیا ایک کھونٹے سے شہزادی کو باندھ دیا گیا اور جیسے ہی وہاں آگ لگائی گئی، بارہ کوّے آموجود ہوئے انھیں دیکھ کر ایک دم سے شہزادی چیخ پڑی "میرے بھائی!" اور وہاں کوّوں کی جگہ اُن کے بھائی کھڑے تھے۔ اور در اصل آج آٹھ سال پورے ہوئے تھے۔

پھر تو ذرا سی دیر میں وہاں سے آگ بجھا دی گئی اور شہزادی نے شہزادے کو سارا قصہ سنایا۔ شہزادہ یہ سُن کر بہت خوش ہوا۔ پھر دونوں میں شادی ہو گئی۔ اور جب ان کے باپ کو معلوم ہوا تو اسے اپنی غلطی پر بڑی شرمندگی ہوئی اور ان لڑکوں کو اپنی حکومت میں واپس بلا لیا۔

صفحہ ۲۳ کا بقیہ مضمون

صفحہ ۲۳ کا بقیہ مضمون

کے الجھنے کی نوبت کبھی نہیں آتی۔ جاپان میں ہر سال ۵ مئی کو ایک میلہ ہوتا ہے۔ جس میں جاپان کے بچے اور بڑے سب پتنگیں اُڑاتے ہیں۔ اس میلہ کا میدان اور پتنگ اُڑانے والوں کا شوق اور جوش دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔

نگین چند

مہارانی جھانسی



جھانسی ہمارے ملک کی ایک پُرانی ریاست ہے۔ ایک کے بعد دوسرے حاکم نے اس ریاست پر حکومت کی۔ لیکن جھانسی کی تاریخ میں مہارانی لکشمی بائی کا درجہ بہت اونچا ہے۔ مہارانی لکشمی بائی کا نام ہمیشہ کے لئے جھانسی کے ساتھ جُڑ گیا ہے۔ اسی لئے تو انھیں مہارانی جھانسی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

لکشمی بائی بنارس میں ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئیں۔ ان کے باپ کا نام موروپنت

تانتے تھا۔ اور ماں کا نام بھاگرتی دیوی تھا۔ لکشمی بائی کا بیاہ جھانسی کے صوبے دار راجا گنگا دھر نوالکر کے ساتھ ہوا۔

جھانسی کوئی بہت بڑی ریاست نہ تھی۔ اس میں چھ سات سو گاؤں شامل تھے ریاست کا گورنر صوبے دار کہلاتا تھا۔ گنگا دھر مرہٹوں کی طرف سے جھانسی کے صوبے دار تھے۔

۱۸۱۸ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کو ہرا کر ان کا راج چھین لیا۔ اس طرح جھانسی پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ صوبے دار گنگا دھر موت کی گود میں سو چکے تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی لکشمی بائی چاہتی تھی کہ کسی بچے کو گود لے کر اسے ریاست کا مالک بنا دیں۔ لیکن انگریزوں نے انھیں یہ نہ کرنے دیا۔

رانی کو انگریزوں کا یہ دخل اچھا نہ لگا۔ وہ انگریزوں کی چال کو اچھی طرح سمجھتی تھی انھوں نے اس چال کو ناکام کرنے کی ٹھانی۔ انھیں اس میں کامیابی تو نہ ہوئی مگر اس کے باوجود وہ اپنے خیالات پر اڑی رہی۔ اب رانی کسی اچھے موقع کے انتظار میں تھی۔

۱۸۵۷ء میں یہ موقع آیا۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ دہلی اور میرٹھ سے بڑھتی ہوئی یہ لہر ملک کے دوسرے حصوں میں بھی پہنچی۔ مہارانی لکشمی بائی نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں کے خلاف جنگ کا بگل بجا دیا رانی کے سپاہی تعداد میں تو کم تھے لیکن تھے سب بہادر۔ یہ دیوانے اپنے دیس کے بچاؤ کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار تھے۔ وہ موت سے کھیلے اور اپنے پرائے سب کے دلوں کو انھوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جیت لیا۔

رانی کو قید کر لیا گیا۔ جیل کی دیواریں اس بہادر عورت کو کب تک روک سکتی تھیں وہ بچ نکلی اور ایک بار پھر ان بہادروں کے ساتھ جا ملی جو اپنے ملک کی لاج رکھنے کے لئے موت کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ تانتیا ٹوپی ان بہادروں کا سردار تھا۔

لکشمی بائی اور تانتیا ٹوپی کی ملاقات دلیری اور طاقت کی ملاقات تھی۔ جب وطن اور دلیری کے یہ دو چشمے ایک ساتھ مل کر بہنے لگے۔ راستے میں آنے والے کنکر پتھروں کی طرح یہ سامنے آنے والے دشمنوں کو روندتے ہوئے بڑھتے چلے جا رہے تھے کہ دشمن کی بڑھتی ہوئی طاقت نے ایک چٹان کی طرح سامنے آ کر ان کا راستہ روک دیا۔ آزادی کی لڑائی کے سپاہی تتر بتر ہو گئے رانی اور تانتیا ٹوپی بچ نکلے۔

اس جیت کی خوشی میں انگریز افسر پھولے نہ سمائے انھیں یقین ہو گیا کہ انھوں نے حالات پر پوری طرح قابو پالیا ہے۔ اسی لئے وہ اپنی فوج کو چھٹی دینے کے منصوبے بنانے لگے۔

ادھر رانی تانتیا ٹوپی کو ساتھ لے کر گوالیار پہنچی۔ اب رانی کے پاس فوج بھی تھی اور سامان بھی۔ گوالیار کے مشہور قلعہ پر سے انھوں نے دشمنوں کو للکارا۔ انگریز اپنی پوری طاقت جھونک کر گوالیار کی طرف بڑھے۔ دو دن تک بڑی بھیانک لڑائی ہوئی۔ ایک طرف لکشمی بائی، تیانتا ٹوپی اور اُن کے ساتھی تھے۔ اور دوسری طرف جنرل اسمتھ، سر روز اور اُن کے ساتھی۔ ایک طرف آزادی کی تڑپ تھی، اور دوسری طرف غلام بنانے کا جوش۔ دونوں طرف سے ڈٹ کر سامنا ہوا۔ انگریزوں کا پلڑا بھاری تھا۔ ہندوستانی فوج ہار گئی۔ ہنستے ہنستے چتا کی گود میں سو جانے سے پہلے مہارانی لکشمی بائی پھر ایک بار بجلی کی طرح کڑک اٹھی۔ وہ تلوار جو ملک کی حفاظت کے لئے تیار رہتی تھی، دیکھتے ہی دیکھتے دشمنوں کے خون سے رنگ گئی۔ لیکن کالے بادلوں میں بجلی کی چمک تو بہت تھوڑی دیر کے لئے ہوتی ہے۔ بجلی چمکی اور چھپ گئی، رانی کڑکی اور دشمن نے اُسے ہمیشہ کے لئے چپ کر دیا۔ رانی اٹھی اور اس کی چھاتی دشمن کی گولیوں سے بندھ گئی۔ رانی گر پڑی اور وہ ہمیشہ کے لئے سب کی نگاہوں میں بہت اونچی اٹھ گئی۔ کچھ سپاہیوں کی آواز آئی "لکشمی بائی مر گئی" اسی وقت زمین اور آسمان کو چیرتی ہوئی ایک آواز گونج گئی "لکشمی بائی امر ہو گئی"!



استاد۔ جزیرہ کسے کہتے ہیں ؟
طالب علم۔ جب ہم دریا میں نہلتے ہیں تو ہمارے چاروں طرف پانی ہوتا ہے اس وقت دریا کو جزیرہ کہتے ہیں۔
استاد۔ اچھا تو بتاؤ کہ جوار بھاٹا کسے کہتے ہیں ؟
طالب علم۔ وہی جو ہم روز کھاتے ہیں' جوار کی ترکاری بھاٹے کے ساتھ۔

استاد :۔ احمد! آج تم دیر سے کیوں آئے ؟
طالب علم :۔ پانی برس رہا تھا۔ راستے میں پھسلن ہوگئی تھی۔ میں ایک قدم آگے بڑھاتا تھا تو دو قدم پیچھے جاتا تھا۔
استاد۔ تب پھر تم اسکول کیسے آئے۔
طالب علم :۔ میں نے اپنا منہ گھر کی طرف کر لیا۔

باپ۔ موہن بیٹا تم کیوں روتے ہوئے آ رہے تھے
بیٹا۔ مجھے ماسٹر صاحب نے مارا۔
باپ۔ کس بات پر۔
بیٹا۔ ماسٹر صاحب نے ایک سوال پوچھا جس کا جواب سوائے میرے اور کسی نے نہیں دیا۔
باپ۔ واہ پھر تو انعام دینا چاہیئے تھا۔ انہوں نے کیا سوال پوچھا تھا۔
بیٹا۔ انہوں نے پوچھا تھا کہ میری میز کی دراز میں بلی کا بچہ کس نے رکھا۔

استاد۔ چار میں سے ایک کم کر دیں تو کتنا بچے گا ؟
شاگرد۔ پانچ۔
استاد۔ پانچ کیسے؟
شاگرد۔ اگر آپ میز کے چار کونوں میں سے ایک کونا کاٹ دیں تو پانچ کونے ہو جائیں گے۔

باجی کا خط

پیامی بھتیجیوں کے نام

بھتیجیو! ہم لوگ بہت دن سے سوچ رہے تھے کہ بھتیجیوں کے لئے دو ایک صفحے مخصوص کر دیں تاکہ بچیاں اپنی مرضی کے مطابق حصہ لے سکیں۔ اگرچہ پیام تعلیم میں اچھی اچھی کہانیاں، معلوماتی مضامین، ہنسانے والے لطیفے سب ہی کے لئے ہوتے ہیں۔ مگر بعض بھتیجیوں کی یہی شکایت تھی کہ پرچہ میں ان کی دلچسپی کا سامان نہیں ہوتا۔ بھتیجیوں کی اس شکایت پر غور کیا گیا۔ اور پھر ہم نے سوچا کہ ہم بھتیجیوں کی خواہشات کا خیال رکھیں گے۔ اس لئے اب ہم آپکے لئے دو ایک صفحے الگ کر رہے ہیں۔ ہمارے ذہن میں بھی کچھ اچھے اچھے پروگرام ہیں لیکن ہم آپ کی مدد کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ نے شوق کا اظہار کیا تو وہ دن بھی دور نہیں جب آپ کے صفحے چمک جائیں گے۔

کہیئے کیا چاہتی ہیں آپ؟ اپنے مشورے لکھ کر ہمیں بھیجئے۔ آپ کے صفحے آپ کے ہی ہاتھ میں ہیں۔ آپ جو چاہیں گی ہم آپ کی پوری پوری مدد کریں گے۔

اُمید ہے کہ آپ جلد اپنی رائے لکھیں گی۔ اور ساتھ ساتھ اگر ایک بات کا اور خیال رکھیں تو بڑا اچھا ہو۔

ذرا اپنے اپنے شوق تو لکھئے۔ ہم بھی دیکھیں ہماری ننھی منی بہنیں کس کس چیز سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ یعنی پڑھائی لکھائی کے علاوہ خالی وقت میں آپ کیا کیا کرتی ہیں۔ اگر آپ نے چاہا تو اس سلسلے میں ہم آپ کی مدد بھی کریں گے۔ خالی

وقت میں آپ میں سے کوئی خوبصورت پھول کاڑھتی ہوں گی ۔ کوئی عمدہ عمدہ کھانے پکاتی ہوں گی کوئی گڑیاں کھیلتی ہوں گی ۔ اچھا بتائیے مزا آتا ہے نا گڑیاں کھیلنے میں ۔ ہمیں تو بڑا اچھا لگتا ہے ۔ اس کے علاوہ بہت سی بچیاں قلمی دوستی کرتی ہیں ۔ یعنی بغیر دیکھے ہزاروں میل دور آپ ایک دوست بنا سکتی ہیں ۔ ہماری بھی بہت سی سہیلیاں ہیں ۔ جن کو ہم نے آج تک دیکھا بھی نہیں ۔ کہیئے ہے نا دلچسپ بات ۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے شوق ہیں ۔

دیکھتے ہیں آپ میں سے کون سب سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتا ہے ۔

خط لکھیئے مگر ذرا جلد ۔ آپکی

نجمہ باجی

آپ اگر نجمہ باجی کو خط لکھیں تو حسب ذیل پتے پر بھیجدیں ۔ ہم آپ کا خط نجمہ باجی کو پہنچا دیں گے ۔

ادارہ

نجمہ باجی معرفت مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، دہلی

ص۱۲ کا بقیہ

چند سیپیاں ایک ڈبے میں رکھیں اور تمام تماشائیوں کو دکھائیں اس کے بعد اس نے اس ڈبے کو کھولا ۔ تو اس میں سیپیوں کے بجائے کھنکھناتے ہوئے، چمکتے ہوئے چاندی کے روپے نکلے ۔ اس کے اس کارنامے سے لوگ دنگ رہ گئے ۔ مگر کسی نے یہ نہیں سوچا کہ جب اس کے پاس اتنے روپے ہیں تو پھر اُسے پیسے مانگنے کی کیا ضرورت ہے ۔ اس کے بعد اس نے ایک صاحب کی انگوٹھی لیکر کسی دوسرے کو دی پھر اُس نے ایک ڈبل روٹی منگوائی اور اُسے چیر کر اُس میں سے وہی انگوٹھی نکال کر انگوٹھی والے صاحب کو دے دی ۔ اور جن صاحب کو اس نے انگوٹھی رکھنے کو دی تھی اُن سے انگوٹھی مانگی ۔ اور وہ صاحب بغلیں جھانکنے لگے ۔ آخر ہنس کر انہوں نے اپنی شرمندگی دور کی ۔ جب وہ صاحب انگوٹھی جیب میں رکھ رہے تھے تو میری نظر ڈبل روٹی والے پر پڑی تھی جس نے بڑی صفائی سے وہ انگوٹھی نکال لی تھی ۔ اور میں سمجھ گیا تھا کہ یہ انگوٹھی ڈبل روٹی میں سے کیسے نکل آئی ۔ مگر شاید یہ منظر کسی اور نے نہیں دیکھا تھا ۔ اس لئے کہ مداری کو لوگوں نے خوب خوب پیسے دیئے ۔ اور پیسے جمع کر کے مداری اپنی راہ ہو لیا ۔

(عبدالرحمٰن زین العابدین صغیر عمری)

بچوں کی کوششیں



بنسری والا

پرانے زمانے میں ایک شہر تھا جس میں اتفاقاً بہت سے چوہے جمع ہو گئے تھے۔ کسانوں اور دکانداروں کا ناک میں دم آ گیا تھا۔ یہ چوہے کسانوں کی ساری فصل ختم کر دیتے تھے۔ دکانداروں کا آدھا سامان غائب ہو گیا تھا۔ ان چوہوں نے لوگوں کا بھی ناک میں دم کر دیا تھا یہاں تک کہ [illegible]

ایک [illegible] والا آیا۔ اس نے جب شہر والوں کو اس مصیبت میں دیکھا تو اسے ان پر بڑا رحم آیا مگر اس نے سوچا کہ کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ اسی لئے اس نے کہا کہ "اگر شہر والے مجھے تین ہزار روپیہ دیں تو میں ان تمام چوہوں کو ختم کر سکتا ہوں۔"

شہر والوں نے یہ بات منظور کر لی اور کہا کہ "بھائی تم چوہے نکال دو۔ ہم تم کو تین ہزار روپیہ دیں گے۔"

بس پھر کیا تھا بنسری والے نے بنسری بجانی شروع کر دی۔ بنسری کی آواز کچھ اس طرح نکلی کہ [illegible] بنسری کی آواز سن سن کر جمع ہو گئے۔

اب بنسری والا جدھر جاتا ہے یہ چوہے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ آخر وہ ایک ندی کے کنارے پہنچ کر ایک کشتی میں بیٹھ گیا اور کشتی میں بیٹھ کر بانسری بجانے لگا۔ سب چوہے بھی اس کے ساتھ ہی ندی میں چلے گئے۔

اب بنسری والا شہر واپس آیا اور اُس نے لوگوں سے اپنا انعام مانگا۔ مگر اب تو شہریوں کو چوہوں سے نجات مل ہی گئی تھی انہوں نے کہا کہ "بھائی! روپیہ تو ہمارے پاس نہیں ہے تم ہم کو چوہے ہی واپس کر دو"

اب تو بنسری والے کو بڑا غصہ آیا۔ اور اس نے پھر بنسری بجانی شروع کر دی۔ ذرا سی دیر میں سارے شہر کے بچے جمع ہو گئے اور بنسری والے کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ بنسری والا دریا کی طرف گیا۔ یہ دیکھ کر شہر والے گھبرا گئے کہ کہیں یہ بھی دریا میں نہ کود پڑیں۔ اور انہوں نے بنسری والے کو تین ہزار روپیہ دیئے۔ تب جا کر بنسری والا واپس آیا۔

قیصر حسین زیدی۔ مکھر گون

بیوقوف بندر

ایک دن ایک بندر آم کے پیڑ پر بیٹھا ہوا کچھ بچوں کو مچھلی کا شکار کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اور مزے کے ساتھ آم کھا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سب بچے ندی کے کنارے سے ہٹ کر دوسری طرف کھیلنے چلے گئے۔ اور جال کو اُسی طرح وہاں پڑا رہنے دیا۔ یہاں بندر کے دماغ میں یہ بات گھُس آئی کہ ندی کے کنارے کوئی نہیں ہے اب ہم ہی خود اُتر کر مچھلی کا شکار کیوں نہ کھیلیں۔ میاں بندر پیڑ سے اُتر کر ندی کے پاس آئے اور بچّوں کا جال لیکر دریا میں کود پڑے لیکن بچّوں نے کُودنے کی آواز نہ سُنی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب بچّے ندی کے کنارے اپنے جال کے پاس آئے تو وہ انہوں نے اپنے جال کو ندی کے کنارے سے غائب پایا۔ وہ بہت دیر تک سوچتے رہے۔ اور آپس میں کہنے لگے جال ہوا تو کیا ہوا۔ ایک نے کہا کہ کہیں گھڑیال نہ پھنس گیا ہو اور جال کو لیکر بھاگ گیا ہو۔ دوسرے بچّے نے کہا کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ سب بچّے کچھ دیر کے بعد جال کی تلاش میں چلے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد بچّے کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بندر اس جال میں پھنسا ہوا ہے۔ خیر جال کو کسی طرح پانی کے باہر نکالا اور بندر کو پھنسا کر اپنے گھر لائے۔ اور اس کی خوب مرمت کی۔ بندر کو اپنی بیوقوفی پر بہت شرمندگی ہوئی۔

زینت النساء اعظمی۔ شاہ گنج

لڑائی

جب ہمارے ابا کام سے واپس آتے تو میں اور میری بہن نجمہ اپنے گھر کے دروازے پر کھڑے رہتے تھے اور ابا بھی ٹھیک شام کے پانچ بجے کام سے واپس آتے۔ ہم اور نجمہ ابا کا ہاتھ پکڑ لیتے۔ میں کہتا "اباجی میرے لئے جوتا لائے ہو۔" نجمہ کہتی "اباجی چاکلیٹ لائے ہو۔" ایک روز ہوا کیا کہ ابا میرے لئے جوتے لے آئے۔ نجمہ نے ابا سے کہا "رحمت بھیا کے لئے تو آپ جوتا لے آئے میرے لئے چاکلیٹ کیوں نہیں لائے۔ ابا نے کہا کہ "اچھا تمہارے لئے ایک بکس چاکلیٹ لے آؤں گا" آخر کار نجمہ نے میرا جوتا لے لیا۔ اور کہنے لگی تم کل چاکلیٹ لے لو نا لیکن میں نے ان کی ایک نہ سُنی۔ اگلے دن مجھ میں اور نجمہ میں خوب لڑائی ہوئی۔ شام کو ابا دروازہ پر آئے اور جب میں نے دروازہ کھولا تو ابا آگئے۔ اتنے میں نجمہ نے ابا سے کہا کہ ابا وہی چیز۔ ابا نے کہا کیا وہی چیز۔ تب نجمہ نے کہا "چاکلیٹ"۔ ابا بھی ہاتھ میں ایک بکس لئے ہوئے تھے۔ جھٹ نجمہ نے ابا کے ہاتھ سے وہ بکس لے لیا۔ اور اس میں سے مجھے آدھی چاکلیٹ دیدی۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میں نے نجمہ سے کیوں جھگڑا کیا۔ اور میں نے ابا سے کہا کہ "ابا نجمہ کے لئے جوتے لا دیئے تب میں جوتا پہنوں گا۔ دوسرے دن ابا نے نجمہ کو بھی جوتا لادیا۔ اور پھر ہم میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔

محمد حسین۔ کلکتہ

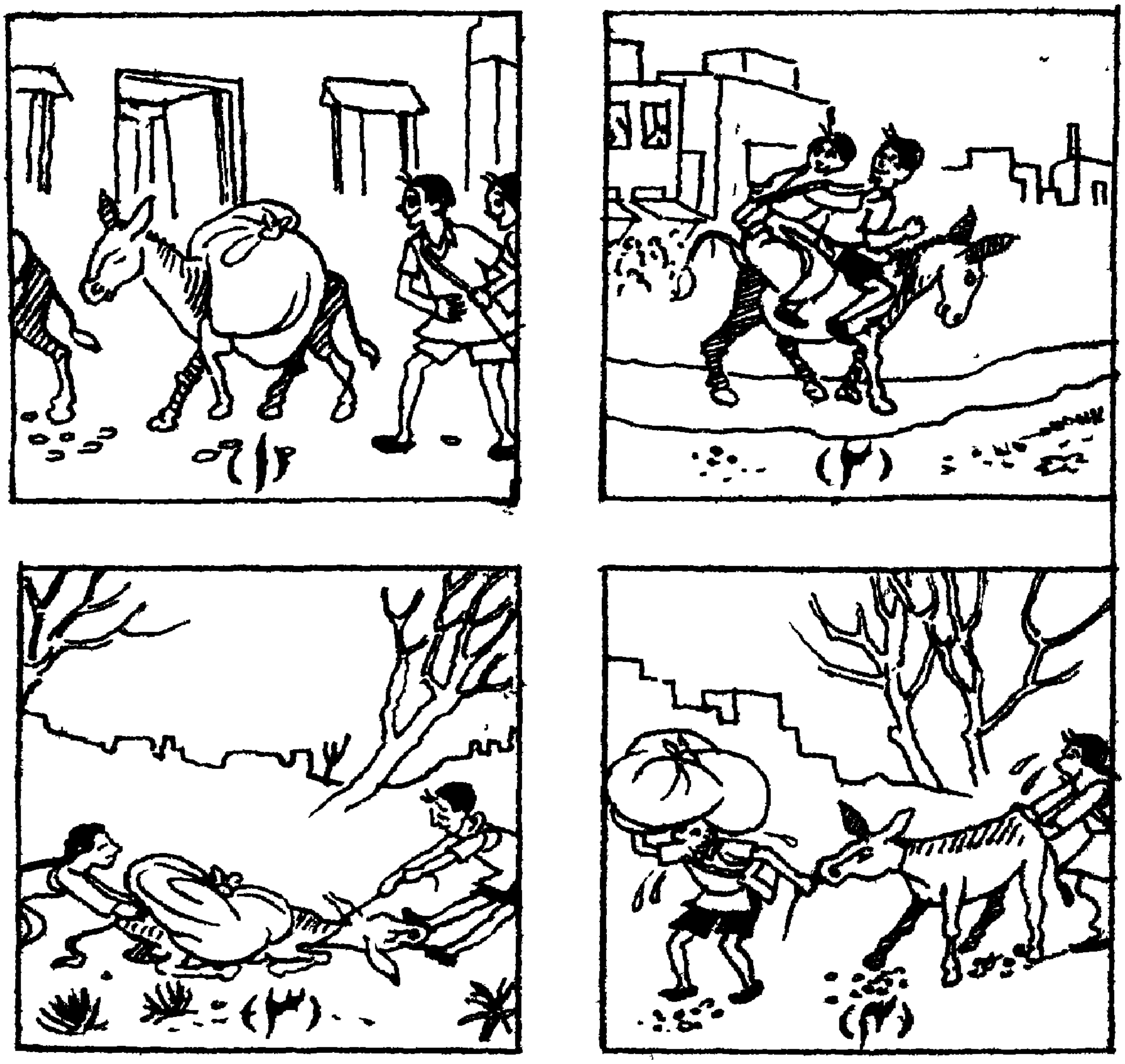
مداری کا کھیل

اتوار کا روز تھا میں اپنے بستر پر دراز ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ یکایک مجھے شور وغل کی آوازیں سُنائی دیں۔ میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا کیونکہ کتاب بڑی مزیدار تھی۔ مگر آہستہ آہستہ شور وغل کی آوازیں بہت قریب آنے لگیں میں کتاب چھوڑ کر کھڑکی کی طرف چل پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں ایک مداری بڑے ساز و سامان کے ساتھ آرہا ہے۔ اس کے پیچھے بچوں کی ایک بھیڑ تھی۔ مداری کا حلیہ تو قابلِ تحریر ہے اُس نے ایک میلی کچیلی دھوتی اور ایک نہایت ہی میلا کچیلا کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر ایک پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ اس نے میری کھڑکی کے قریب آکر اپنا ڈیرہ ڈال دیا جو کسی طرح بھی ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے کم نہیں تھا۔ اس کے بعد اُس نے کسی تجربہ کار پروفیسر کی طرح تقریر شروع کردی اور اس کے اس لکچر کو سُننے کے لئے بچے، بڑے، بوڑھے سب جمع ہوگئے۔

اِس کے بعد اس نے کھیل شروع کیا۔ اُس نے

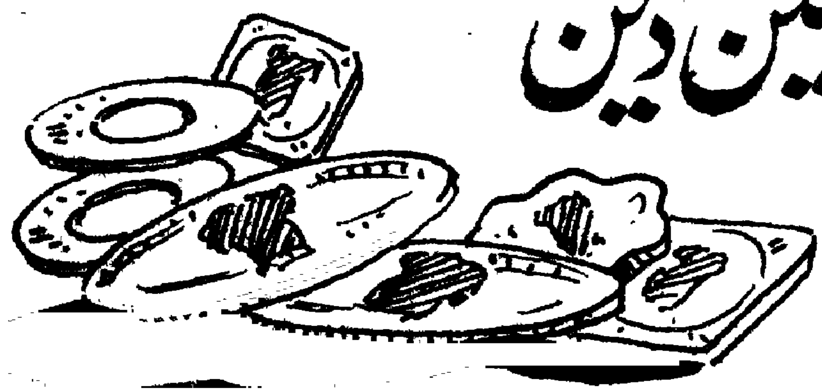
بقیہ صفحہ پر دیکھئے

کالو مینا کی کہانی



اسد اللہ

لین دین



پہلے زمانے میں جب کہ سکے کا رواج نہیں تھا۔ لوگ ضرورت کی چیزوں کو بدل لیا کرتے تھے۔ جب اس سے کام نہ چلا تو کچھ چیزوں کی قیمتیں مقرر کرکے تبادلہ شروع کیا۔ مثلاً دس سیر گیہوں کے بدلے ۵ گز کپڑا یا پانچ سیر دودھ کے بدلے ایک جوڑا جوتا وغیرہ۔ اس کے علاوہ وہ چیزیں جو نہ تقسیم ہوسکتی تھیں اور نہ تبدیل مثلاً جانور، اس لئے کہ ایک بکری ایک گھوڑے کے برابر تو نہیں ہوسکتی۔ اس کو یوں سمجھئے کہ ایک آدمی کے پاس گھوڑا ہے وہ اسے بیچنا چاہتا ہے۔ اس کے بدلے میں وہ کچھ بکریاں، کپڑا اور اناج چاہتا ہے۔ ایک دوسرا آدمی ہے۔ جس کے پاس بکریاں ہیں۔ وہ بکریوں کے بدلے میں گھوڑا لینا پسند کرتا ہے اسے گھوڑے کی ضرورت ہے۔ لیکن گھوڑے والا صرف بکریاں لینے پر تیار نہیں ہوتا اس لئے مشکل یہ ہے کہ مجبوراً بکریوں کے بدلے میں دے یا پھر تبادلہ نہ کرے۔ یہ اور بھی مشکل ہے، اس لئے لوگوں نے اور دوسری اشیا معلوم کرنے کی کوشش کیں۔ پہلے پہل کھالیں، سیپیاں، تمباکو وغیرہ سے تبادلہ کا کام لیا گیا، لیکن یہ چیزیں جلدی خراب ہونے والی تھیں، اس لئے یہ بھی نہ چل سکیں۔ اس کے بعد اور دوسری

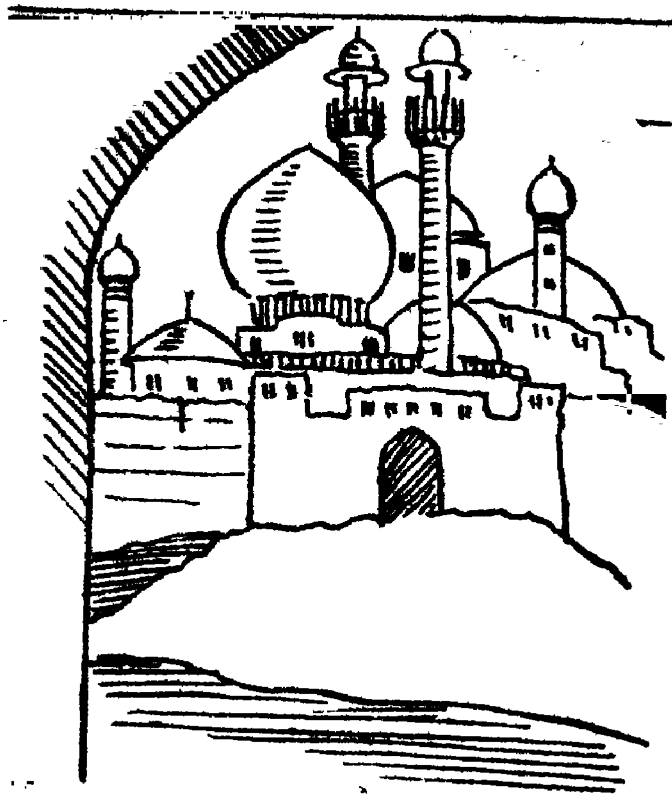
دھاتیں جو ملیں تو لوگوں نے کچھ دن ان کو استعمال کیا۔ سونے اور چاندی کا رواج ہو گیا، یہ دھاتیں دوسری دھاتوں کے مقابلے میں زیادہ اچھی ثابت ہوئیں۔ اس سے تبادلہ کی تمام پریشانیاں ختم ہو گئیں۔ اب اس کے بدلے میں ہر چیز آسانی سے مل سکتی تھی۔ جس کی مرضی میں جو آتا خریدتا۔ اس سے چیزوں کی قیمت آسانی سے معلوم ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ دوسری چیزوں کی قیمتوں کا مقابلہ کرنا آسان تھا۔ یہ دھاتیں زیادہ دنوں تک اچھی حالت میں رہنے والی تھیں۔ ان کا وزن بھی کم تھا اور قیمت بھی زیادہ تھی۔ اس لئے اس کو ہر وقت لوگ اپنے پاس رکھ سکتے تھے اور آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکتے تھے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ سکے ہونے کے علاوہ ان کی اپنی بھی قیمت تھی یعنی اگر سکے کے طور پر نہ بھی استعمال کریں تو دھات سے برتن اور زیورات بھی بن سکتے تھے۔ اسی لئے جب سونے چاندی کے سکے بنے تو لوگوں نے انھیں بہت پسند کیا۔ تبادلہ کے لئے بھی اور قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی۔

پہلے پہل سکے وزن سے چلتے تھے سونے اور چاندی کے مختلف وزن کے ٹکڑے کاٹ دیئے جاتے۔ لیکن یہ ٹکڑے ایسے ہوتے تھے کہ اگر ان میں سے ذرا سا ٹکڑا کاٹ بھی لیا جاتا۔ تو پتہ نہیں چلتا تھا۔ اور بہت سے لوگوں نے کیا بھی یہی۔ وہ اس میں سے ذرا سا ٹکڑا کاٹ لیتے تھے۔ جب یہ بات عام ہو گئی تو لوگ لینے سے پہلے سکے تول لیا کرتے تھے۔ اب تو کافی دقّت ہونے لگی اور کافی دقت بھی لگنے لگا۔ جب نئے سکے بنتے تو وہ جس کے پاس جاتے دبا کر رکھ لیتا۔ اور جہاں پر سونے کا سکہ تجارت کے سلسلے میں تول کر دینا ہوتا وہاں وہ پورے وزن والے سکے دیتے اور جہاں گن کر دینا ہوتا وہاں وہ پرانے سکے دیتے جن کا وزن کم ہوتا۔ ہر دفعہ یہی ہوتا پرانے چلتے رہتے نئے غائب ہو جاتے۔ ادھر جب سناروں کو ضرورت ہوتی تو سکوں کو پگھلا کر ان سے زیورات بنا لیتے اور بزنس کرتے۔ یہ سلسلہ کئی سو سال چلتا رہا۔ تجارت کے سلسلے میں ہمارے ملک کا بہت سونا غیر ملکوں میں پہنچ گیا۔ پہلے زمانے میں سکے صرف حکومت ہی نہیں

بناتی تھی۔ بلکہ اور لوگ بھی اس کام کو کر سکتے تھے۔ حکومت کو کچھ منافع دے کر وہ سکے بنا لیتے۔ مگر جو سکے دوسرے لوگ بناتے وہ اس میں کچھ سستی دھات ملا دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ پھر یہ کام حکومت نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

آج کا سکہ بالکل الگ ہے۔ باقاعدہ مہر کے ساتھ ڈھالا جاتا ہے۔ جس میں اور کوئی خرابی پیدا نہیں کر سکتا۔ مگر جب کاروبار زیادہ بڑھا تو لوگوں کے لئے روپیہ کا بوجھ اِدھر سے اُدھر لے جانا مشکل ہوگیا۔ آخر اس مشکل کو دور کرنے کے لئے نوٹ بن گئے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب لین دین میں کافی آسانی ہوگئی۔ اور دس بیس ہزار روپے کے لئے پہلے چھکڑے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اب تو اتنے روپے کے نوٹ آدمی اپنی جیب میں رکھ سکتا ہے۔ اب سے چند سال پہلے تک ہندوستان میں سونے کا سکہ بھی چلتا تھا جس کو گنی کہتے تھے۔ پہلے امپیریل بنک نوٹ چھاپ سکتی تھی۔ اور اس قیمت کا سونا بنک میں جمع رہتا تھا۔ تاکہ جس وقت بھی کوئی نوٹ کے عوض سونا مانگے تو دیا جاسکے۔ لیکن اب نوٹ اور سکے صرف مرکزی حکومت بنا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی بناتا ہے تو اسے سزا دی جاتی ہے۔

ہر ملک کا اپنا الگ سکہ ہے۔ مثلاً ہندوستان میں روپیہ، برطانیہ میں پونڈ، روس میں روبل، امریکہ میں ڈالر، فرانس میں فرینک، اور جرمنی میں مارک وغیرہ۔ ایک دوسرے سے تجارت کے لئے، سکوں کے معاملے میں سب ملکوں نے آپس میں سمجھوتہ کر لیا ہے، اور اپنے اپنے سکوں کی قیمت مقرر کر لی ہے جیسے اس وقت برطانیہ کا پونڈ، ہندوستان کے تیرہ روپے دس آنے کے برابر ہے اور امریکہ کا ڈالر تین روپے چھ آنے کے برابر ہے، وغیرہ اسی کی بنیاد پر تجارت ہوتی ہے۔ اس سے تجارت میں کافی آسانی ہوگئی ہے۔ اور ایک ملک کا مال دوسرے ملک میں آسانی سے منگایا اور بھیجا جا سکتا ہے۔



شاہدہ خانم

بادشاہ کا محل

کہتے ہیں کہ ایک بوڑھا فقیر گھومتے گھومتے بغداد پہنچا۔ وہ بیچارا اس شہر میں اجنبی تو تھا ہی، بادشاہ کے محل کو سرائے سمجھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس وقت دربان وہاں پر موجود نہ تھا۔ فقیر بلا کھٹکے اندر چلا گیا اور دالان میں جا کر لیٹ گیا۔ ابھی اُسے ٹھیک سے نیند بھی نہ آئی تھی کہ اچانک دربان آ موجود ہوا اور اس نے فقیر کو اٹھا کر کہا "تم یہاں کیوں آئے؟ کیا کام ہے؟"

فقیر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "بھیا مجھے یہاں رات بھر آرام کر لینے دو، مسافر ہوں صبح سویرے چلا جاؤں گا۔"

دربان کو یہ سُن کر بہت غصہ آیا اور اس نے کہا "کیا تو نے اسے سرائے سمجھ لیا ہے، ارے یہ بادشاہ کا محل ہے۔"

ابھی فقیر اور دربان میں بحث ہو رہی تھی کہ بادشاہ بھی اِدھر آ نکلا، اس

صفحہ ۲۰ کا بقیہ

نے فقیر کی بات سن لی تھی، بولا "بڑے میاں تمھاری عقل ذرا موٹی معلوم ہوتی ہے۔ تم سرائے اور محل میں کوئی فرق نہیں سمجھتے ہو۔"

فقیر بولا "جناب میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں ذرا یہ تو بتائیے کہ جب یہ محل بنا تھا تو سب سے پہلے اس میں کون رہتا تھا۔

بادشاہ نے کہا" اس کو میرے پر دادا نے بنوایا تھا اور وہی رہتے تھے۔"

فقیر نے کہا "ان کے بعد پھر کون رہا"

بادشاہ نے کہا "پھر میرے دادا رہنے لگے۔"

فقیر نے کہا "پھر اُن کے بعد یہاں کون رہا"

بادشاہ نے کہا "میرے باپ رہتے تھے۔"

فقیر نے مسکرا کر کہا "بادشاہ سلامت! جس مکان میں اتنے آدمی آکر رہے اور چلے گئے سرائے نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اُسے بادشاہ کا محل کون کہہ سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر فقیر وہاں سے چل دیا۔

برہمن نے روتے ہوئے کہا "ایک بڑھیا کی وجہ سے لڑکی گئی۔"

لڑکی نے کہا "بڑھیا کی وجہ سے نہیں تمہاری لالچ کی وجہ سے۔ تم تھوڑے سے چاندی کے ٹکڑوں کے لالچ میں آگئے۔ چھی چھی۔"

اتنے میں بڑھیا بھی آموجود ہوئی اور کہنے لگی "برہمن! میری لاٹھی کہاں ہے؟"

برہمن اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرکے بولا۔ "اس کی بیوقوفی سے لاٹھی بھی کھو چکا ہوں۔"

بڑھیا نے کہا "اس کی بے وقوفی سے یا عقلمندی سے؟ جو آدمی روپیے کی لالچ میں اپنے بیٹے کی جان کی بھی پروا نہیں کرتا، اس کے ہاتھ میں میری لاٹھی بھی نہیں رہ سکتی۔ تم پہلے جیسے تھے، ویسے ہی رہو۔ تمہارے لئے یہی مناسب ہوگا۔ لیکن تمہاری بیوی کی ممتا اور عقلمندی دیکھ کر میں پھر آئی ہوں۔ تم ڈرو نہیں تمہاری مصیبت کل سے ختم ہو جائے گی۔ لیکن یاد رکھو! لالچ بہت بڑا عیب ہے۔" اور یہ کہکر بڑھیا لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لئے چلی گئی۔

دوسرے دن راجدھانی سے راجہ کے کچھ آدمی برہمن کے گھر آئے اور اُسے بتایا کہ راجہ نے تمہیں اپنا خاص پروہت بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔

ریحان احمد عباسی

جنگل کا بادشاہ



آپ نے کبھی شیر دیکھا ہے؟ ارے بھائی شیر کے تو نام سے ڈر لگتا ہے۔ طاقت اور بہادری میں تو شیر کا جواب ہی نہیں ہے جنگل میں کیسے کیسے خونخوار جانور رہتے ہیں۔ لیکن شیر کے سامنے ان سب کی حیثیت کتّے اور بلّی کی سی ہے۔ اسی لئے تو وہ جنگل کا بادشاہ کہلاتا ہے۔

جب کبھی شیر غصّہ میں ، یا بھوک کی وجہ سے دہاڑتا ہے تو اس کی خوفناک آواز سُن کر پیڑ پر بیٹھے ہوئے پرندے، پکّے ہوئے پھل کی طرح نیچے گر پڑتے ہیں۔ ہرن گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگتے ہیں اور اکثر اس کے سامنے آکر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شیر دھاڑتے وقت اپنا منہ زمین سے ملا دیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب اس کی آواز زمین سے ٹکراتی ہے تو جنگل میں چاروں طرف پھیل جاتی ہے اور جانوروں کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ شیر ہے کہاں۔ وہ بھاگتے ہوئے اُسی کے سامنے آجاتے ہیں اور وہ انہیں دبوچ لیتا ہے۔ اب آپ سمجھے کہ شیر جانور ہوتے ہوئے بھی سائنس کے

اس اصول سے واقف ہے۔

شیر اپنے شکار کو کبھی دوڑ کر نہیں پکڑتا بلکہ جس طرح بلّی، چوہے کو پکڑتی ہے اسی طرح شیر بھی اپنے شکار کے پاس آہستہ آہستہ پہنچتا ہے اور جب ذرا سا دور رہ جاتا ہے تو اچانک چھلانگ مار کر دبوچ لیتا ہے یا پھر وہ کسی ایسے راستے پر چھپ کر بیٹھ جاتا ہے جدھر سے عام طور پر جانور گزرتے ہیں۔

شیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جب تک بھوکا نہیں ہوتا اس وقت تک خواہ مخواہ شکار نہیں کرتا۔ شیر عام طور پر آدمی کا شکار نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی آدمی اس کے سامنے سے چپ چاپ گذر جائے تو وہ اُسے کچھ نہیں کہتا۔ مگر جب کوئی شیر آدم خور ہو جاتا ہے تو پھر وہ انسان کو کبھی نہیں چھوڑتا۔ یہ اتفاق ایسے ہی کبھی ہوتا ہے جب کہ شیر زخمی ہو یا بھوک کی وجہ سے کسی آدمی پر حملہ کر دے اور تبھی اس کو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا مارنا جانوروں کے مارنے سے بھی آسان ہے، اور اس کے ساتھ ہی اس کا گوشت مزیدار بھی بہت ہے۔

شیر کے شکار کے بہت سے طریقے ہیں۔ شکاری گھنے جنگلوں میں پیڑ پر مچان باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور پیڑ سے کچھ فاصلے پر بکری یا بھینس کا بچہ باندھ دیتے ہیں۔ اگر شیر نے کسی جگہ پہلے سے ہی جانور مار کر چھوڑ دیا ہے تو اس کے قریب مچان باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور جب وہ دوبارہ کھانے کے لئے آتا ہے تو بندوق سے مار دیتے ہیں۔ شکاری مچان کو پتوں سے ضرور چھپا لیتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر اُسے ذرا سا بھی شک ہو جائے کہ کوئی اس کی گھات میں بیٹھا ہے تو دور ہی سے بھاگ جائے۔ شیر کو مارنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔ شیر جس دریا یا تالاب کے کنارے آکر پانی پیتا ہے، وہ جگہ بھی شکار کے لئے بے حد موزوں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ شیر بلا خوف و خطر کھا پی کر وہاں آتا ہے اور اُسے کچھ بھی خبر نہیں ہوتی ایسی جگہ کوئی پیڑ ملنا مشکل ہے، اس

لئے لوگ پاس پڑوس کے گڈھے میں بیٹھ کر شکار کرتے ہیں۔ مچان کی طرح گڈھے کو بھی چاروں طرف خوب پتوں سے ڈھک لیتے ہیں تاکہ شیر دیکھ نہ لے۔

زخمی شیر بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اور اسی طرح شیر کی مادین کے ساتھ اس کے بچے ہوں، تو وہ بھی خطرناک ہو جاتی ہے۔ پھر تو اُسے اپنے بچوں کے سامنے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں ہوتی۔

ایک بات اور دلچسپ ہے، جب شیر زخمی ہو جاتا ہے تو اس میں دوگنی تگنی قوت آجاتی ہے پھر تو اس کے سامنے جو چیز بھی آجائے، وہ اُسے چیتھڑے چیتھڑے کر ڈالتا ہے۔ بڑے بڑے پتھروں کو اپنے جبڑوں سے توڑ کر آٹا سا کر دیتا ہے۔ اور اس وقت اس کے دہاڑنے کی آواز اور بھی بھیانک ہو جاتی ہے۔ بڑے بڑے سورماؤں کے دل دہل جاتے ہیں۔

عام طور پر شکاری، شیر کی گردن کی ہڈی یا سر یا دل پر گولی مارتے ہیں۔ اگر ان تینوں جگہوں میں سے کہیں بھی گولی لگ جائے تو وہ فوراً مر جاتا ہے۔ اگر گولی کمر پر لگے تو تڑپتا بھی ہے اور شور بھی بہت کرتا ہے، لیکن مرتا دیر میں ہے پھیپھڑے پر گولی لگے تو کافی دور تک بھاگ سکتا ہے۔ اور گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد مرتا ہے۔ اگر اس کے پیٹ میں گولی لگ جائے یا صرف اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے تو ہفتوں زندہ رہتا ہے لیکن ایسے موقع پر بے حد خطرناک ہو جاتا ہے۔

شیر کا وزن عام طور پر تقریباً چھ من ہوتا ہے۔ اور اس کی لمبائی ناک کی نوک سے دم کے سرے تک ۱۰ فٹ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔

ہندوستان میں شیر اکثر بڑے بڑے جنگلوں میں ہوتا ہے اور ہر صوبے کے شیر دوسرے شیروں سے کچھ نہ کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ بنگال کا شیر سب سے زیادہ طاقتور بہادر اور خوبصورت ہوتا ہے۔ اور ہندوستان میں ہی نہیں، اس کے مقابلے کا شیر تو ایشیا میں اور کہیں نہیں ہوتا۔

کیا آپ جانتے ہیں

۱۔ سب سے بڑا اسٹیشن پلیٹ فارم سون پور (بہار) میں ہے۔

۲۔ سب سے قیمتی کرسی روم (اٹلی) کے پوپ کی ہے جس کی قیمت ۲۷ لاکھ روپیہ ہے۔

۳۔ سب سے چھوٹی کتاب فلیڈلفیا میں ہے جس کی لمبائی چوڑائی آدھا انچ ہے اس میں کئی سو صفحے ہیں۔

۴۔ سب سے پہلی سائیکل ایک فرانسیسی نے ۱۸۸۰ء میں بنائی جس کا نام سوتنس تھا۔

۵۔ دنیا کا سب سے لمبا آدمی جیک ارل ہے جس کی اونچائی آٹھ فٹ سات انچ ہے۔

۶۔ دنیا کا سب سے چھوٹا آدمی میجر مائٹ ہے جس کا قد صرف ۲ فٹ ۲ انچ ہے۔

۷۔ دنیا کا سب سے بڑا سمندری جہاز ملکہ الزبیتھ ہے جس کا وزن ۸۵۰۰۰ ٹن ہے۔

۸۔ کنگ کانگ پہلوان کا وزن ۷½ من ہے۔

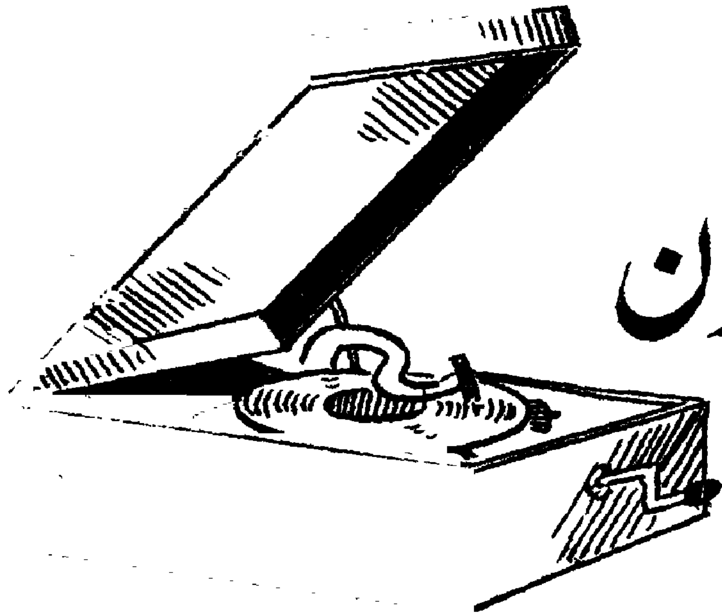
۹۔ شنگھائی میں ایک چینی پجاری کے ہاتھ کے ناخن پونے بتیس انچ لمبے ہیں۔ یہ اس کی ۲۷ سال کی کمائی ہے۔

۱۰۔ شترمرغ دنیا کا سب سے بڑا پرندہ ہوتے ہوئے اڑ نہیں سکتا لیکن وہ ۶۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔

۱۱۔ ہندوستان میں ۱۴۷ زبانیں بولی جاتی ہیں۔

۱۲۔ سنگترے کا پیڑ ڈیڑھ سو برس تک پھل سکتا ہے۔

۱۳۔ سب سے بڑا مینڈھک افریقہ کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ چھوٹے کتے کی برابر ہوتا ہے اور اس کا نام "کیمرون" ہے۔



محمد معین

گراموفون

پڑوس میں جب گانے والی مشین گانا شروع کرتی ہے تو محلّے کے سارے لڑکے دوڑ دوڑ کر جمع ہو جاتے ہیں اور بڑے شوق سے گانا سُننے لگتے ہیں۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ گانے والے کا کوسوں پتہ نہیں لیکن آواز اتنے قریب سے سنائی دیتی ہے جیسے گانے والا سامنے کھڑا ہوا گا رہا ہو۔

گانے کے علاوہ کبھی کبھی اسی مشین سے بلّی کی میاؤں، میاؤں، کتّے کی بھوں بھوں اور چڑیوں کی چہچہاہٹ بھی سنائی دیتی ہے، کبھی کبھی خوب ہنسنے کی آواز، قہقہے اور کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونے کی دردناک آواز سے ایک شور سا مچ جاتا ہے۔ یہ سب کیسے ہوتا ہے؟ اور کون کرتا ہے؟ یہ ایک بڑے مزے کی بات ہے اور یہ ساری کرامات ایک چھوٹی سی مشین کی ہیں جسے گراموفون کہتے ہیں۔ گراموفون کے بنانے والوں نے آواز کی قوت کو گرفتار کر لیا ہے۔ بولنے، گانے، ہنسنے اور رونے کی آواز کی لہریں جب ہوا میں ملتی ہیں تو اسے ایک مشین کے ذریعے 'توے' میں بند کر لیتے ہیں۔ اس 'توے' کو ریکارڈ کہتے ہیں۔ اس ریکارڈ کو گراموفون میں لگا کر چلا دیتے

ہیں اور ایک دوسرے پُرزے میں سوئی لگا کر جسے ' آواز کا بکس ' کہتے ہیں ، ریکارڈ پر لگا دیتے ہیں ۔ جوں جوں ریکارڈ گھومتا ہے ، اس میں بند کی ہوئی آواز پھر سے نکلنا شروع ہو جاتی ہے ۔ اور پھر کیا ، جب تک جی چاہے گانا سُنتے رہیئے ۔

گراموفون جس شکل میں آج ہم دیکھتے ہیں وہ شروع شروع میں ایک پیٹی یا نل کی شکل میں تھا ۔ اس کے بنانے کا سلسلہ سچ پوچھو تو چین سے شروع ہوتا ہے ۔ وہ اس طرح کہ ایک بار ایک افسر کو اپنے راجا کے پاس راجدھانی میں ایک خفیہ خبر بھیجنی تھی ۔ اگر وہ کسی آدمی کے ذریعے بھیجتا تو دوسروں کو معلوم ہو جاتا اور راز فاش ہو جاتا ۔ وہ چونکہ راجدھانی سے بہت دور تھا ، اس لئے وہ خود نہیں جا سکتا تھا ۔ چنانچہ وہ بہت پریشان تھا ۔ سوچتے سوچتے اس نے آخر کار ایک پٹاری بنائی جس میں ان الفاظ کو بند کر کے ، جو وہ راجہ کے پاس بھیجنا چاہتا تھا ، ایک آدمی کے ذریعے بھجوا دیا ۔ راجا نے جونہی پٹاری کھولی اس میں سے آواز نکلنی شروع ہوئی ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ افسر خود ہی بول رہا ہو ۔ راجا کو یہ سن کر بہت تعجب ہوا ۔ اور پھر تو اسی پٹاری کے ذریعے تمام راز میں رکھنے والی خبریں فوجی افسروں کے پاس بھیجی جانے لگیں

مصر اور ایران میں بھی اسی طرح کے تجربے ہونے لگے ۔ اسی زمانے میں یورپ میں یہ تجربے بہت تیزی سے شروع ہوئے ۔ لگ بھگ سات سو برس پہلے کی بات ہے کہ راجا بیکن نامی ایک شخص نے ایک بار ایک لوہے کی مورت بنائی ، اس کے اندر ایک چھوٹی سی مشین لگا دی اور وہ مورت بولنے لگی بالکل ایسے ہی جیسے ہم لوگ ایک دوسرے سے بولتے ہیں ۔

تقریباً تین سو برس بعد اٹلی میں ایک شخص نے نل کے اندر الفاظ بند کر دئے ، اور جب بھی وہ چاہتا نل بولنا شروع کر دیتا ۔ لیکن اسکاٹ نامی ایک انگریز نے ان سب سے اچھی ایک مشین بنائی جو فونو آٹو گراف کہلاتی تھی ۔ یہ مشین اب تک بنی ہوئی تمام مشینوں سے زیادہ اچھی تھی ۔ آج کل کا گراموفون اسی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے ۔

ان سب تجربوں کے بعد بھی گراموفون

ابھی پوری طرح بن نہیں پایا تھا۔ لیکن ایڈیسن نامی ایک امریکن نے اسے بالکل مکمل کر دیا۔ وہ بھی اس طرح کہ ایک بار وہ ٹیلیفون پر کچھ تجربے کر رہا تھا۔ اس نے ٹیلیفون کے تار میں سوئی چبھو کر انگلی سے دبا دیا۔ جونہی سوئی تار میں دبی اس کی انگلی میں چبھ گئی اور دوسرے سرے سے آواز نکلنے لگی۔ یہ آواز سُن کر وہ بہت خوش ہوا اور سمجھ گیا کہ اب گراموفون بنانے میں ضرور کامیابی ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا دو ہی ایک سال کے اندر اس نے گراموفون تیار کر لیا۔ اس کے بعد اس کے دو ساتھیوں نے اس کے کہنے کے مطابق ایک کمپنی بنائی جو آج کل کے ڈھنگ کے گراموفون تیار کرنے لگی۔

گراموفون تو بن چکا تھا لیکن ابھی بہت بھدا ہوتا تھا۔ اس میں پرزے وغیرہ بہت کم ہوتے تھے لیکن ایک دوسرے امریکن نے گول چکّے کا گراموفون بنایا۔ اور اس کے بعد توے کو بھی کچھ ٹھیک ٹھاک کیا پہلے اسے ہاتھ سے گھمانا پڑتا تھا لیکن اب اس میں ایک ایسا پُرزہ بڑھا دیا گیا کہ وہ خود سے چلنے لگے پہلے گراموفون بجاتے وقت کچھ بھدّے الفاظ نکلتے تھے لیکن جونس نامی ایک اور شخص نے اس عیب کو بھی دور کر دیا۔ پہلے گانا سُننے کے لئے ربر کی ایک نلکی کان میں لگانی پڑتی تھی اور آواز تیز کرنے کے لئے بھونپو لگایا جاتا تھا۔ لیکن اب نلکی اور بھونپو کے بغیر بہت اچھی طرح گراموفون کا ریکارڈ سُنا جاتا ہے۔ کیونکہ اب بھونپو بھی مشین کے اندر ہی لگا دیا جاتا ہے اور یہ بھونپو اتنا بڑا نہیں ہوتا۔

اس سے زیادہ مزے کی بات یہ ہے کہ ہنگری میں میکوفون نامی ایک شخص نے ایک ایسا گراموفون بنایا ہے جو بالکل گھڑی کے برابر ہوتا ہے جس میں ایک بار کُنجی دیجئے۔ اور لگے ہاتھوں بارہ ریکارڈ ایک ساتھ ہی سُن لیجئے۔

اتنا ہی نہیں۔ اس سے بھی زیادہ سُنیئے۔ ایک ایسی بھی مشین تیار ہو گئی ہے جس میں گانے والے کی تصویر بھی نظر آتی ہے۔ اور اب تو گانے کے ساتھ ساتھ ناچ کا بھی انتظام ہو رہا ہے۔ یعنی ناچنے والے کی بھی تصویر نظر آیا کرے گی۔ اس طرح کی مشین کو فوٹوگراف کہتے ہیں۔ اب وہ دن دور نہیں جب اس میں اور بھی ترقی ہو جائے گی۔ اور فوٹوگراف گھر گھر پہنچ جائے گا۔ اس وقت گھر بیٹھے بیٹھے دل بہلانے کے ہزاروں سامان مل جائیں گے۔

ذرا غور کیجئے کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ دنیا کتنی ترقی کرتی چلی جا رہی ہے۔ انسان جب کسی دُھن میں لگ جاتا ہے تو اُسے اپنے مقصد میں ضرور کامیابی ہوتی ہے۔

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں

۵۰ روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ فی حل ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں اور پانچ حلوں کی فیس ۴ر آنے

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۳۰ روپے دوسرا انعام ایک غلطی پر ۲۰ روپے

حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۵ اکتوبر ۵۳ء

پیامی معمہ نمبر ۲۵

۳	۲		ہ	د	ل	۱م
[illegible]	[illegible]		ے	ر	۴ب	
ا	ا		ہ	ا	۵ر	
ن	ر		ا	ل	ا	۶ت
ا	ے				■	

دائیں سے بائیں

۱۔ انگلینڈ کی ۔۔ ۔۔ ۔۔ کا نام ایلز بیتھ ہے۔

۴۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ لوگوں سے خدا ہی بچائے۔ (بُرے۔ بڑے)

۵۔ اندھیری ۔۔ ۔۔ ۔۔ میں سفر کرنے کے لئے روشنی کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ (راہ۔ رات)

۶۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ مضبوط ہو تو مشکل ہی سے ٹوٹتا ہے۔ (تاگا۔ تالا)

اوپر سے نیچے

۱۔ آجکل زیادہ ۔۔ ۔۔ کرنے والے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ (مشقت۔ محنت)

۲۔ ڈوبتے کو ۔۔ ۔۔ کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ (سہارے۔ کنارے)

۳۔ بعض لوگوں کا مقصد صرف دوسروں کو ۔۔ ۔۔ ہوتا ہے۔ (لڑانا۔ ستانا)

۵۔ دوسروں کی ۔۔ ۔۔ ۔۔ بغیر سوچے سمجھے اپنا لینا ٹھیک نہیں۔ (راہ۔ رائے)

پتہ:۔ پیامی معمہ نمبر ۲۵، ماہنامہ پیام تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی

کوپن پیامی معمہ نمبر ۲۵

نام ....

پتہ ....

پرچہ کے دیر میں چھپنے کی وجہ سے اکثر بچے اپنے حل مقررہ تاریخ تک نہیں بھیج سکے۔ اس لئے معمہ نمبر ۲۵ کی تاریخ بڑھادی گئی ہے۔

ادارہ

پرنٹر پبلشر حامد علی خاں		مطبوعہ چکرورتی پریس۔ دہلی

مزیدار کہانیوں کی کتابیں

پرندوں کا ایکا

جنگل کی تمام چڑیاں ہوائی جہاز کو بھوت سمجھ کر ڈر گئیں۔ اس بھوت سے بچنے کیلئے انھوں نے کیسی اچھی ترکیب نکالی۔

قیمت چار آنے

جنگو کی بلّی

گنگو تیلی نے مرتے وقت اپنی چیزیں اپنے لڑکوں میں بانٹ دیں۔ سب سے چھوٹے لڑکے جنگو کے حصے میں صرف ایک بلی آئی۔

قیمت چھ آنے

ننھّا ٹٹّو

نٹ کھٹ جمیل نے ایک دن ننھے ٹٹو کو مارا۔ دوسرے دن نٹو بکرے نے جمیل کے ٹکر مار کر اس کا بدلہ لے لیا۔

قیمت چار آنے

مُرغی اجمیر چلی

کٹ کٹ کٹاٹ کالی مرغی سے خواب میں کسی نے کہا "اجمیر شریف جاؤ ورنہ دنیا اجاڑ ہو جائیگی" صبح اٹھتے ہی کالی مرغی اجمیر چل دی۔

قیمت پانچ آنے

چھوٹی لالٹین

سڑک کے گڑھے کے آس پاس لگی ہوئی لالٹینوں میں سب سے چھوٹی لالٹین نے لڑکے کی جان بچائی۔ دوسری لالٹینوں نے کیا کیا؟

قیمت پانچ آنے

شہزادہ اور ٹھگ

شہزادے نے ایک لعل کھو دیا۔ بڑی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اس نے اچھا لعل لاکر باپ کو دیا۔ اسکے ساتھ ۲ دو اور مزیدار کہانیاں۔

قیمت آٹھ آنے

چوہوں کی کانفرنس

اس کتاب میں پانچ مزیدار اور چٹ پٹی کہانیاں ہیں۔ اور سب کی سب کہانیاں دلچسپ ہیں۔

قیمت چھ آنے

لومڑی اور خرگوش کی لڑائی

چالاک لومڑی اور خرگوش کی نوک جھونک تھوڑا سا پڑھنے کے بعد چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔

قیمت پانچ آنے

ہمت کے پھل

چھ باہمت لڑکوں کی سچی داستان محنت اور ہمت کی وجہ سے دنیا کے بڑے آدمی بن گئے۔

قیمت چھ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی

معلومات کی کتابیں

سماجی زندگی

بچّوں کے لئے مدرسے کی تعلیم ہی ضروری نہیں بلکہ اس ماحول کی تربیت بھی جس میں اس کی پرورش ہوتی ہے اور جوان کے ذہنوں کو نکھارتی ہے۔

قیمت: حصہ اوّل ۸ ر دوم ۱۰ ر سوم ۱۲ ر

مقناطیس کی کہانی

مقناطیس آدمی کو پتھر کی شکل میں ملا۔ لیکن اس نے اپنی عقل سے اس پتھر کو دیو جیسی طاقت عطا کی اس کا پورا حال اس کتاب میں پڑھئے۔

قیمت آٹھ آنے

بجلی اور مقناطیس کے کھیل

یہ کھیل کیسے ہوتے ہیں اور کس طرح کھیلے جاتے ہیں؟ اس کے لئے آپ "بجلی اور مقناطیس کی کہانی" پڑھئے۔

قیمت دس آنے

دنیا کے بچّے

ان قوموں اور قبیلوں کے حالات جنھیں ابھی دنیا کی ہوا نہیں لگی۔

قیمت بارہ آنے

دنیا کے بسنے والے

چوتھے پانچویں درجے کے لڑکوں کے لئے نہایت آسان زبان میں۔

قیمت بارہ آنے

قدرت کے کرشمے

بادل، بجلی، کا کڑکا، ٹوٹنے والے تارے آتش فشاں پہاڑ، اور زلزلے سے متعلق جغرافیائی و سائنسی معلومات۔ قیمت دس آنے

معلومات کی کتابوں کا ایک بہترین سیٹ

ان میں ہماری اور ہمارے گرد و پیش کی تمام چیزوں مثلاً جانور، درخت، پودے، آسمان، فضا، موسم اور قدرتی قوتوں کا حال بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

معلومات کی پہلی کتاب ۸ر　　معلومات کی دوسری کتاب ۱۰ر　　معلومات کی تیسری کتاب ۱۲ر

معلومات کی چوتھی کتاب ۱۴ر　　معلومات کی پانچویں کتاب ۱۴ر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی



اب دو سمت دی کر دم لوں ،

Regd. No. D. 96.
SEPTEMBER 1953.





عطیہ پروفیسر قیصر زیدی
جامعہ کالج



اچھا ....!!؟



ہوں .. .. !!!



وہ مارا .... !

پیامِ تعلیم

فہرست

ادارہ:- حامد علی خاں بی، اے (جامعہ)
اطہر پرویز ایم، اے (علیگ)

سالانہ چندہ ۴ روپے
فی پرچہ ۶ آنے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی



بچوں سے باتیں

جامعہ میں میلے کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں، اور کیوں نہ ہوں، وقت بھی تو کتنا کم رہ گیا۔ ۳۱ر اکتوبر سے یہ میلہ شروع ہو گا آپ کو معلوم ہو گا ہی کہ ۲۹ر اکتوبر کو جامعہ کا یوم تاسیس بھی۔ کتنا کم وقت رہ گیا ہے، اور پھر میلے کا کام بھی تو بہت ہے۔ اسی لئے آج کل جسے دیکھو بس ۔ کی تیاری میں رات دن لگا ہوا ہے۔ کہیں ڈرامے کی مشق ہو رہی ہے تو کہیں مشاعرے کے۔ دعوت نامے بھیجے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جامعہ کے تمام شعبے اپنے تعلیمی کاموں کی نمائش تیاریوں میں مصروف ہیں۔ آپ کو یہ سُن کر خوشی ہو گی کہ پچھلے سال کی طرح اس سال بھی پیامِ کا روزنامہ میلے کے دنوں میں برابر چار دن نکلے گا۔ پچھلے سال اس کی اشاعت کا فیصلہ بہت دیر۔ ہوا تھا اس لئے پیامیوں کو اس کی اطلاع نہ جا سکی تھی۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس بار پیامی بھی ا۔ روزنامے سے فائدہ اٹھائیں۔ چنانچہ ہم نے طے کیا ہے کہ جو پیامی بچے ہمیں تین آنے کے ٹکٹ بھیج ہم انھیں میلے کے دنوں میں روزانہ پرچہ بھیجا کریں گے۔ اس طرح آپ کو بروقت میلے کا حال معلوم ہوتا رہے گا۔ آپ جلد سے جلد ۳ر کے ٹکٹ روانہ کریں تاکہ آپ کا پرچہ محفوظ ہو جائے۔

اکتوبر کا پرچہ آپ کے سامنے ہے۔ ہمیں یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اب پرچہ ٹھیک وقت پر شائع ہو گا اور پیامیوں کو شکایت کا موقع نہ ملے گا۔

پیام تعلیم میں ہم ہر مہینے تصویریں شائع کرتے ہیں۔ جو پیامی اپنی یا اپنے بزرگوں کی کھینچی ہوئی تصویریں چھپنے کے لئے بھیجنا چاہیں وہ ضرور بھیجیں اگر وہ اچھی ہوں گی تو ہم انھیں شائع کریں گے۔ بہتر ہو کہ تصویریں چکنے کاغذ پر ہوں اور بڑی بھی۔

---

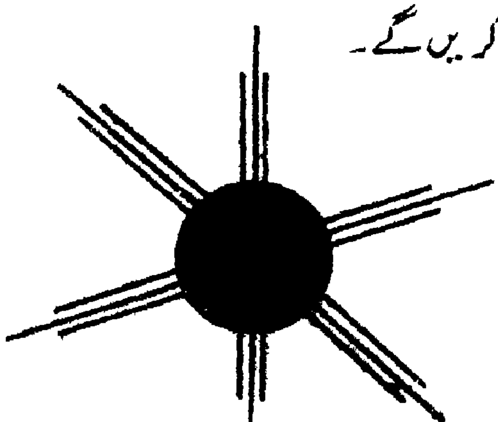
۵ ستمبر کو جرمنی کے ایک نوجوان سیاح مہر پلاٹ تشریف لائے۔ آپ نے ہندوستان آنے سے پہلے یوگوسلاویا، ترکی، عراق، ایران اور پاکستان کی سیر کی تھی۔ ہر پلاٹ صاحب ہمارے ساتھ ایک ہفتہ ٹھہرے اور اس درمیان میں آپ نے اپنے سفر کا دلچسپ حال سُنایا۔ اور ہم لوگوں کو اپنے ملک آنے کی دعوت بھی دی۔ پھر آپ یہاں سے افغانستان چلے گئے۔

آج کل مکتبے میں بچوں کی کتابوں کی تیاری کا نیا پروگرام بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ ۱۰ اگست کو نئی دہلی کے ایک کنڈرگارٹن اسکول کی نگراں مسز گابا اور وہاں کی ایک دوسری کارکن مسز کرشنا چودھری تشریف لائیں اور اس سلسلے میں اُن سے بڑی مفید بات چیت رہی۔ ان کے ساتھ مسٹر شنکھر بھی تھے، جنھوں نے نہ صرف کارآمد مشورے دیئے بلکہ آپ نے اس نئے پروگرام کے تحت بچوں کے لئے "کوئلے" پر ایک کتاب لکھ کر دیدی ہے۔

---

۱۹ ستمبر کو بچوں کے ادب کی تیاری کے سلسلے میں نئی دہلی کی چند معزز خواتین بیگم یونس، کماری کملا، اور کماری کرونا تشریف لائیں بیگم یونس نے حضرت عیسیٰ پر، کماری کملا نے ہیون سانگ پر، اور کماری کرونا نے "میرا بائی" پر لکھا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ ہمارے حلقے کے یہ نئے لکھنے والے بچوں کے ادب کی بڑی خدمت کریں گے۔



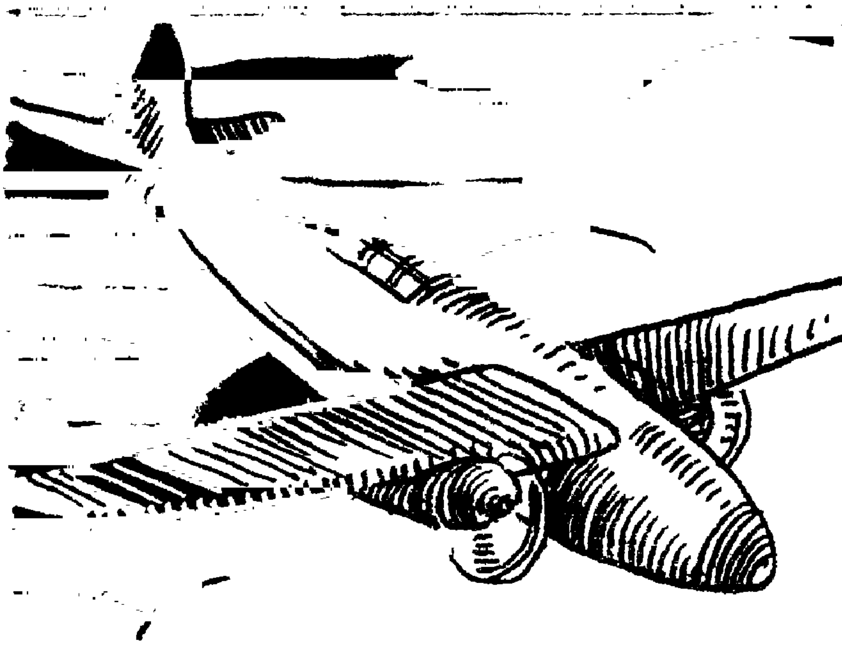


ننھی چڑیا، منی چڑیا چوں چوں کرتی آئی چڑیا
آئی، آکر صحن میں بیٹھی چہکی، اچھلی، کودی، پھدکی
منو بابو غوں غاں کرتے آنگن میں تھے چاول چگتے
کھانا ان کو کب تھا آتا تھا سب چاول بکھرا بکھرا
چڑیا چاول دیکھ کے پہنچی پھر پھر کرتی اڑتی اڑتی
منو کے پاس آکر بیٹھی بیٹھی بیٹھ کے چوں چوں چہکی
اور لگی پھر بکھرے دانے چونچ سے اپنی چگنے کھانے
منو نے جو ایسا دیکھا پاس ہی آکر اس کے بیٹھا
پھر وہ کھانا کھانا بھولا اور خوشی کے مارے پھولا
غوں غوں، خی خی کر کے لپکا تب چڑیا کی جانب جھپٹا
لیکن جونہی ہاتھ بڑھایا اور پکڑنا اس کو چاہا
اڑ گئی چڑیا پھر پھر کر کے
منو بھی رہ گئے منہ تکتے

ضرار محمود

نگین چند

ہوائی جہاز کی کہانی



جب انسان نے چڑیوں کو ہوا میں اُڑتے دیکھا تو یہ خیال اُس کے دل میں بھی آیا کہ وہ بھی آسمان کی سیر کرے۔ بہت دنوں تک تو انسان اپنی خواہش پوری کرنے کے خواب دیکھتا رہا۔ آخرکار جان ڈی مین نامی ایک فرانسیسی نے پہلی بار اُڑنے کی کوشش کی۔ اس نے چڑیوں کی طرح کے اپنے دو بازو لگائے اور ایک قلعہ کی دیوار پر چڑھ کر اڑنے کے لئے چھلانگ لگائی۔ لیکن ہوا کیا۔ وہ اوندھے منھ زمین پر آگرا۔ بیچارے کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔ اور دیکھنے والوں نے خوب مذاق اُڑایا کہ "واہ میاں خوب چلے تھے ہوا میں اُڑنے"۔ کسی نے کہا "بیچارے کا دماغ خراب ہوگیا۔"

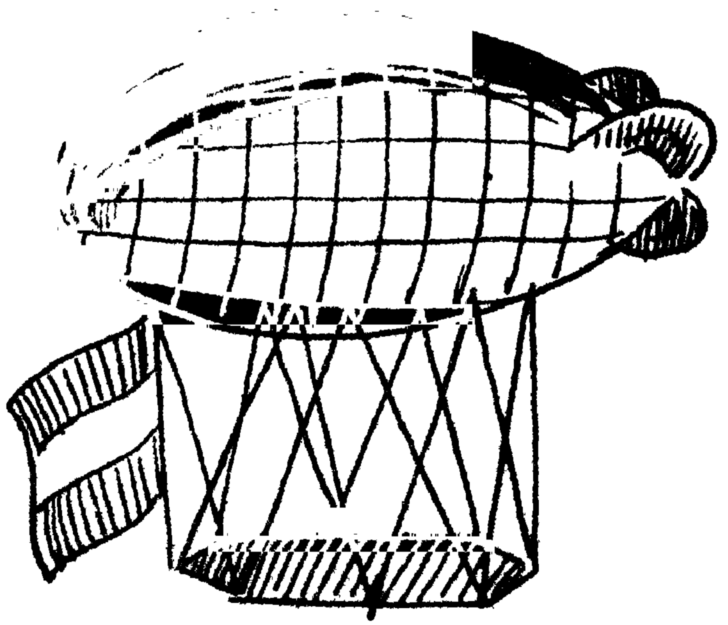
لیکن اس واقعہ کے بعد یہ بات تو صاف ظاہر ہوگئی کہ انسان پرندوں کی طرح نہیں اُڑ سکتا۔ اسی لئے اب لوگوں نے اس کے لئے اور دوسری ترکیبیں سوچنی شروع کر دیں۔

دو فرانسیسی جو آپس میں بھائی بھائی تھے، پھر انھوں نے ایک غبارہ بنایا۔ یہ غبارہ پتلے کپڑے کا تھا۔ اس غبارے میں ایندھن جلاکر دھواں بھر لیا جاتا تھا۔ یہ غبارہ آسمان پر اُڑا تو ضرور مگر دھوئیں سے نہیں۔ غبارے کے اندر کی ہوا گرم ہونے کی وجہ سے ہلکی ہو جاتی تھی اس لئے غبارہ ہوا

میں اُڑنے لگا۔ لیکن ایک میل اُڑنے کے بعد غبارے کی ہوا ٹھنڈی ہو گئی اور وہ پھر زمین پر اُتر آیا۔ اس غبارے میں اُڑنے والوں کو کوئی چوٹ نہیں آئی۔

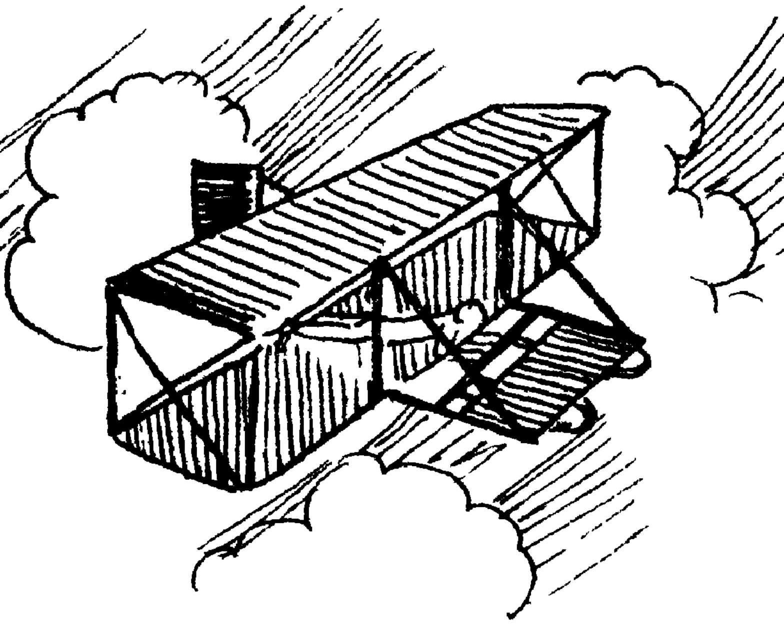
اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد فرانس کے دو اور شہری روزیر اور ارلینڈس ۲۰ منٹ تک فرانس کے دارالخلافہ پیرس پر اُڑتے رہے۔

لیکن اب سوال یہ تھا کہ آگ کی مدد سے غبارے کے اندر کی ہوا گرم کرنے میں آگ لگنے کا بھی اندیشہ تھا۔ کچھ دنوں کے بعد ریشم کے تھیلوں میں ہاڈروجن گیس بھری جانے لگی۔ ان تھیلوں پر پالش کر دی جاتی تھی تاکہ اندر سے گیس نہ نکل سکے۔ کاؤنٹ زیپلن نامی ایک جرمن نے گیس کے تھیلوں والے کچھ ہوائی جہاز بھی بنائے جو بہت کامیابی سے آسمان پر اُڑے۔



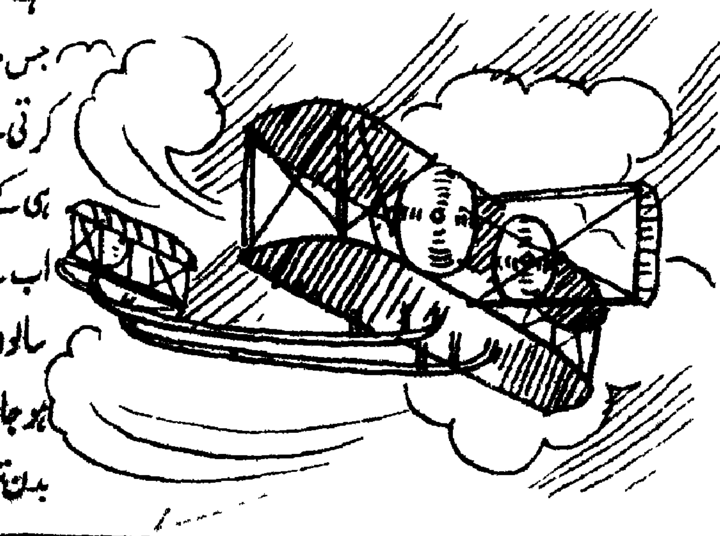
غبارے میں بیٹھ کر انسان آسمان پر اُڑنے تو لگا لیکن اس سے اس کا جی نہیں بھرا۔ کچھ دنوں کے بعد۔ گلائڈر بنائے گئے۔ گلائڈر بغیر مشین اور انجن کے ہوائی جہازوں کو کہتے ہیں۔ ان ہوائی جہازوں میں ایک برائی تھی۔ یہ نیچے سے اوپر نہیں جا سکتا تھا۔ صرف بند ہوا میں اوپر سے نیچے کی طرف جا سکتا تھا۔ امریکہ کے دو شہریوں نے جو اتفاقاً بھائی بھائی تھے، اپنے گلائڈر کے پیچھے ایک پتوار بنالی۔ یہ "رائٹ بھائیوں" کے نام سے مشہور ہیں۔ اس پتوار کی مدد سے گلائڈر کو موڑا جا سکتا تھا۔ انھوں نے ایک ایسی مشین بھی بنوائی جس کی مدد سے

گلائڈر نیچے کی طرف سے اوپر
کی طرف بھی اُڑنے لگے۔
۷ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو یہ دونوں بھائی
اپنے گلائڈر کو لے کر ہوا میں
اُڑے۔ یہ پہلا ہوائی جہاز تھا
جو اپنی قوت سے آسمان میں اُڑا۔
آج کل تو طرح طرح
کے ہوائی جہاز بننے لگے ہیں۔
ہوائی جہازوں کی مدد سے
مسافروں کو ایک جگہ سے



دوسری جگہ پر پہنچایا جاتا ہے۔ خبریں اور ڈاک بھیجنے کا کام لیا جاتا ہے۔ مصیبت کے وقت ایک جگہ سے دوسری جگہ غذا بھی پہنچائی جا سکتی ہے۔ کچھ ہوائی جہاز فوجوں کے لئے بنائے جاتے ہیں۔

پہلے ہندوستان میں ہوائی جہاز کی مختلف کمپنیاں تھیں لیکن یکم اگست سے ان کمپنیوں کو
حکومت نے خرید لیا ہے اور اب یہ ہوائی جہاز
سرکاری ملکیت ہے۔ جس طرح ریلیں اور ڈاک
وتار کا انتظام حکومت کرتی ہے اسی طرح ہوائی جہاز
کا انتظام بھی حکومت ہی کے ذمے ہے۔
چنانچہ وہ سفر جو اب سے سو برس پہلے
لوگ پیدل مہینوں کیا سالوں میں کرتے تھے
اب گھنٹوں میں طے ہوجاتا ہے۔ آپ دیکھ
رہے ہیں کہ آجکل یہ دنیا دن بدن ترقی کرتی جارہی ہے۔





اطہر پرویز

شیر سوار چور

کوریا کی ایک قدیم کہانی

کوریا کے ایک گاؤں میں ایک عورت رہتی تھی۔ اس کا بچہ چھوٹا سا تھا مگر تھا بہت شریر، جب وہ کسی چیز کی ضد کرتا تو اپنی ضد منوا کر چھوڑتا۔ ایک بار شام کے وقت بچہ "کوکم" (مٹھائی) کے لیے ضد کر رہا تھا۔ اور کسی طرح نہ مانتا، اس وقت ایک شیر بھی وہاں آگیا۔ بچے کی آواز سُنکر وہ دیوار کے سہارے کھڑا ہوگیا۔ اور اس نے سوچا کہ چلو آج اچھا شکار ہاتھ آیا۔ ایک چور بھی وہاں چوری کی نیت سے آیا تھا اور دیوار پر چڑھا بیٹھا تھا۔

ابھی بچہ رو رہا تھا اور اس کی ماں اُسے طرح طرح سے دھمکا رہی تھی مگر وہ کسی طرح نہ مانتا تھا۔ آخر اُس نے تنگ آکر کہا "اب اگر رونے کی آواز نکلی تو شیر کو دیدوں گی" مگر شیر کا نام سُن کر بھی بچہ اسی طرح روتا رہا۔ پھر ماں نے کہا "بیٹے مان جاؤ کیا فائدہ شیر آکر کھا جائے" مگر اس کے بعد بھی بچہ نہیں مانا اور اسی طرح روتا رہا۔ تنگ آکر ماں نے کہا "لے یہ کوکم" "کوکم (مٹھائی) کی شکل دیکھ کر بچہ چُپ ہوگیا۔

اب تو شیر بہت گھبرایا اس نے سوچا کہ یہ "کوکم" بہت خطرناک جانور معلوم ہوتا ہے۔ جس سے لوگ مجھ سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں جب میرا نام لیا تو بچّہ بلا خوف اُسی طرح روتا رہا مگر کوکم کے نام سے تو وہ اک دم چپ ہوگیا۔ نہ جانے وہ کتنا بہادر اور نڈر ہوگا۔ اور کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر ہی آجائے ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ چور نے یہ محسوس کیا کہ گھر میں سب لوگ جاگ رہے ہیں۔ اس وقت چوری کی، تو پکڑا جاؤں گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ اِکدم کود پڑا۔ نیچے کافی اندھیرا تھا۔ اس کی نظر شیر پر پڑی تو وہ سمجھا کہ کوئی سواری کا جانور کھڑا ہے۔ بس پھر کیا تھا چور میاں اُس پر سوار ہوگئے۔ ادھر شیر "کوکم" کے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ضرور "کوکم" ہے۔ جو میرے اوپر آگیا۔ اب تو بھلائی اسی میں ہے کہ "کوکم" کو اپنی پیٹھ پر سوار رہنے دے۔

چور کو تو یقین ہو ہی گیا تھا کہ یہ ضرور کوئی پالتو جانور ہے۔ لہٰذا اس نے ٹِک ٹِک کی اور شیر صاحب سر جھکا کر چل کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے جب صبح ہوئی تو چور کو معلوم ہوا وہ تو شیر تھا اور شیر نے جو دیکھا کہ اس پر ایک آدمی سوار ہے تو بہت شرمندہ ہوا۔ چور ڈر کے مارے اُتر کر اپنے گاؤں کی طرف بھاگا اور شیر جنگل کی طرف ــــــ اور بڑی دیر تک دونوں پریشان رہے، لیکن چور کے دل میں یہ خوشی تھی کہ چلو اس کی جان تو بچ گئی اور شیر اس بات پر خوش تھا کہ جنگل کے جانوروں نے اُسے انسان کی سواری میں نہیں دیکھا، ورنہ جنگل کے جانور اپنے بادشاہ کے بارے میں کیا سوچتے۔

صفحہ ۲۴ کا بقیہ

گی۔ تاہم قانون قانون ہی تھا۔ اکبر نے کہا، "بیجو کی جیت اور تان سین کی ہار، نوجوان گویئے، ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ بولو تمھیں اس کا کیا صلہ دیا جائے؟"

اب تان سین کی زندگی کا دارومدار بیجو پر تھا۔ اسے اپنا وعدہ یاد آیا۔ اس نے فراخدلی سے کہا "موسیقارِ اعظم کی جان بخشی کی جائے اور آگرہ میں ہر شخص کو گانے کی اجازت دی جائے"

اکبر بیجو کی اس بلند حوصلگی سے بہت خوش ہوا اور پرانا قانون توڑ دیا گیا۔



چین ہمارا پڑوسی

چین ہمارا پڑوسی ملک ہے۔ جس سے ہمارے دیس کے بڑے پُرانے تعلقات ہیں۔ ہو ین سانگ نامی ایک چینی سیاح اب سے بارہ سو برس پہلے ہرش وردھن کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا اور اسی کے ہاتھوں ہندوستان اور چین کی دوستی کی بنیاد پڑی۔ دوستی کا یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔ بلکہ دن بدن اور مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔

اور —————

کیا آپ کو یہ معلوم ہے؟

۱۔ چین آبادی کے لحاظ سے دُنیا کا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس کی آبادی ۶۰ کروڑ ہے۔

۲۔ چین میں اب سے دو ہزار برس پہلے، دُنیا میں پہلی بار مردم شماری ہوئی۔ اس وقت چین کی آبادی تقریباً ۵ کروڑ تھی۔

۳۔ چین میں ہر روز ۴۵ ہزار آدمی بڑھ جاتے ہیں۔

۴۔ چین میں اب سے دو ہزار برس پہلے (دنیا میں سب سے پہلے) سرکاری نوکری کے لئے امتحان مقابلہ شروع ہوا۔

۵۔ چین کے ایک شہر کانٹن میں ایک مسجد ہے جو پیغمبر اسلام کی زندگی

میں بنی تھی اور دُنیا کی سب سے پُرانی مسجدوں میں سے ایک ہے۔

۶۔ دُنیا میں سب سے پہلے انکم ٹیکس چین میں اب سے ایک ہزار سال پہلے لگا۔

۷۔ چین میں سب سے پہلے کاغذ کے نوٹ چلے۔

۸۔ دُنیا میں سب سے پہلی ملکہ چین ہی میں ہوئی جس نے اب سے تقریباً دو ہزار برس پہلے چین میں حکومت کی۔

۹۔ چین میں ایشیا کی سب سے بڑی ندی بہتی ہے۔ جس کا نام یانگ سی ہے۔

چین کی اور انوکھی باتیں

۱۔ چین نے بارود کی ایجاد اب سے آٹھ سو سال پہلے کی۔

۲۔ چین نے پہلا قطب نما اب سے تین ہزار برس پہلے بنایا۔

۳۔ چین نے بلاک کے ذریعہ چھپائی کا کام اب سے ۱۲۰۰ سو سال پہلے شروع کیا۔

۴۔ چین نے سب سے پہلے ریشم کا کپڑا بُنا۔

آج کا چین

۱۔ موجودہ چین کی حکومت یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء میں قائم ہوئی۔

۲۔ نئی حکومت کے صدر ماؤسی تنگ ہیں۔

۳۔ چواِن لائی چین کے وزیرِ اعظم ہیں۔

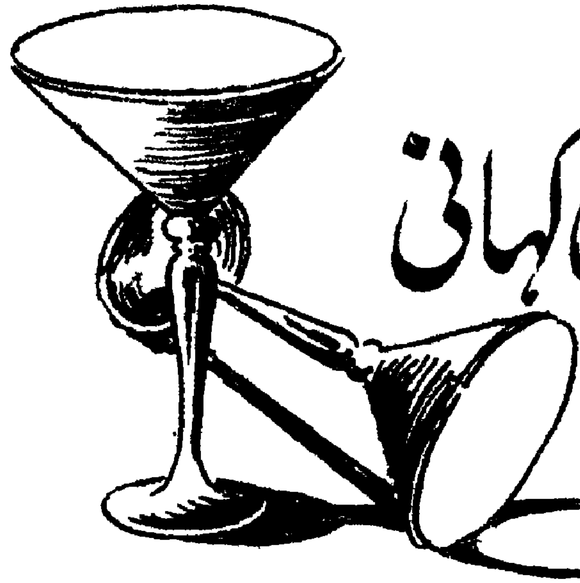
۴۔ چین میں ۲۰۱ یونیورسٹیاں ہیں۔

۵۔ چین میں آج کل ۲۷۶ روزانہ اخبار نکلتے ہیں جن کی مجموعی اشاعت ننّانوے لاکھ ہے۔

۶۔ چین میں تنخواہوں کی رقم غلّے کے حساب سے مقرر ہوتی ہے۔ جو غلّے کی قیمت کے مطابق بڑھتی گھٹتی رہتی ہے۔

★ جہاں تک ہو سکے مضمون مختصر بھیجیے۔

راج کمار



شیشے کی کہانی

شیشے کی کہانی انسانی تہذیب کی کہانی ہے یہ غلط ہے کہ شیشہ بنانے کا فن ہمارے پاس نسل بہ نسل ہزاروں سالوں سے کاریگروں کے ذریعہ چلا آ رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کچھ آدمی سمندری سفر کر رہے تھے۔ راستے میں طوفان آگیا ناچار ہو کر انھیں ایک جزیرے میں لنگر ڈالنا پڑا۔ کھانا پکانے کے لئے انھوں نے کنارے پر ہی چولھا بنایا۔ جب کھانا کھا چکے انھوں نے دیکھا کہ آگ کی گرمی سے چولھے کی ریت چمکیلے تودوں میں تبدیل ہو گئی ہے بات دراصل یہ تھی کہ ریت میں چونے کی ملاوٹ تھی۔ وہ اُن تودوں کو اپنے ساتھ اپنے وطن لے آئے اور اس پر تجربے کرنے لگے۔ آخر کار ان کی مدد سے وہ شیشہ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح انسان نے شیشہ بنانے کا گر سیکھ لیا۔ ہندوستان کے قدیم باشندے بھی شیشہ تیار کرنا جانتے تھے۔ مہابھارت کے زمانے میں پانڈوؤں نے جب ہستناپور کا شہر بسایا۔ وہاں کے محلات میں کچھ اس قسم کے حوض بنائے تھے جن کو دور سے دیکھنے سے یہ نہ معلوم ہو سکتا تھا کہ پانی کا بھرا ہوا حوض ہے۔ یا پتھر کا ٹھوس چبوترہ اسی طرح آج سے چھ ہزار برس پہلے چین والے شیشہ تیار کرنا جانتے تھے وہ شیشے سے پھونک کر برتن بنانا بھی جانتے تھے۔ لیکن ان برتنوں کا استعمال امراء اور رئیس تک ہی محدود تھا۔ مصر والے بھی شیشہ بنانے کے فن سے واقف تھے۔ انھوں نے آج سے تقریباً ساڑھے سات ہزار برس پہلے ایک مکان چھو

نٹ اونچا بنایا تھا جس کی اینٹوں پر کانچ کی قلعی چڑھی ہوئی تھی۔ مصر کے اہرام کے اطراف پر کانچ کی قلعی لگی ہوئی تھی لیکن صحرائی طوفانوں کی وجہ سے وہ جلد اُتر گئی ہے۔

اگر آپ صاف بالو (ایک قسم کا ریت) چونا اور سوڈا یا پوٹاش ملاکر مٹکے میں رکھیں۔ اور اُسے تیز آنچ میں گرم کریں۔ تو آپ دیکھیں گے حرارت بڑھتے ہی سوڈا پگھل جائے گا اور بالو گھُل جائے گا۔ اگر اس میں سوڈا زیادہ ہوگا تو مٹکے میں لیئی سی بن جائے گی۔ اگر بالو زیادہ ہو جائے تو لیئی چکنی ہوئی شفاف چیز بن جائے گی جس کے ایک ہی طرف سے آر پار دیکھا جاسکے گا۔ بس یہی شیشہ ہے لیکن اس میں ایک خرابی ہے یہ پانی میں ڈالتے ہی گھُل جائیگا۔ لیکن اگر چُونا کافی مقدار میں ڈالا جائے تو اس طرح جو شیشہ بنے گا وہ پانی میں نہ گھلے گا۔ اور مضبوط بھی ہوگا۔ کارخانے میں بڑے بڑے بھٹے ہوتے ہیں جن میں مٹی کے برتن رکھے جاتے ہیں جو تیز آنچ میں بھی نہیں گل سکتے۔ ایسے برتن خاص طریقے سے بنائے جاتے ہیں۔ ان ہی برتنوں میں اوپر کی تینوں چیزیں کو ملاکر رکھ لیتے ہیں۔ اور شیشہ تیار کیا جاتا ہے۔ ان شیشوں میں کوئی خاصیت پیدا کرنے کے لئے دو ایک چیزیں اور ملائی جاتی ہیں مثلاً شیشے کے سفوف کی ملاوٹ سے شیشے میں ہیرے کی طرح چمک آجاتی ہے۔ ایسے شیشے سے نقلی ہیرے بنائے جاتے ہیں جو زیورات وغیرہ میں جڑنے کے کام آتے ہیں۔

شیشے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اس کی حرارت کلوں کے ذریعے دھیرے دھیرے گھٹائی جاتی ہے۔ مگر اس کو اپنے آپ ٹھنڈا ہونے کے لئے رکھ دیا جائے تو شیشہ ٹوٹ جائے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ شیشے پر گرمی کا اثر بہت دیر رہتا ہے۔ اپنے آپ ٹھنڈا کرنے سے شیشے کی باہری سطح سکڑ جاتی ہے۔ جبکہ اندرونی سطح ابھی گرم ہونے کی وجہ سے پھیلی ہوئی ہوتی ہے اس پھیلاؤ سے باہر کی سطح پر دباؤ پڑ جاتا ہے اور شیشہ چٹخ جاتا ہے۔

پہلے تو شیشے کو پگھلانے کے لئے کوئلہ یا لکڑی کا استعمال ہوتا تھا لیکن اب بجلی یا گیس کا استعمال ہوتا ہے۔ اس میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ایک تو تیار کرنے والوں کے کپڑے کالے ہو جاتے تھے۔ دوسرے شیشہ بہت دیر میں پگھلتا تھا۔ اور کبھی کبھی تو کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ اب شیشے کو پگھلانے کا کام تین مرتبہ میں ہوتا ہے۔ پہلے ایک بڑے گیس سے بھرے ہوئے حوض میں شیشے کے تین اجزاء یعنی بالو چونا اور پوٹاش ڈالتے ہیں۔ درجہ حرارت بڑھانے میں شیشہ ہی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور اس میں بلبلے اُٹھنے لگتے ہیں۔ دوسری منزل میں حرارت اور بڑھائی جاتی ہے۔ اس سے بلبلے سطح پر آجاتے ہیں۔ اور لئی پانی جیسی پتلی ہو جاتی ہے۔ پھر جس شکل میں شیشہ بنانا مطلوب ہو اُسی حساب سے درجۂ حرارت گھٹایا جاتا ہے یعنی اگر پھونکنا ہو تو اُسی مقدار میں حرارت

گھٹائی جائے گی اور اگر تختے بنانا ہوں تو اسی نسبت سے حرارت کم کردی جائے گی۔

شیشے کو پھونکنے کا ڈھنگ نرالا ہے۔ اگر آپ کی کسی کارخانے میں شیشہ پھونکنے والے سے مڈبھیڑ ہو جائے تو آپ گھبرا جائیں گے۔ اُن کے گالوں کو پھُولتا دیکھکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا دم نکلا جا رہا ہے۔ پھونکنے والے لمبی لمبی نلکیوں سے منہ سے پھونکتے رہتے ہیں۔ نلکی کے نیچے قالب لگا رہتا ہے۔ پھونکنے سے شیشہ قالب میں خاص شکل میں ڈھالا جاتا ہے۔ عام طور پر چمنیاں، پانی پینے کے گلاس، بجلی کے بلب اور دوسری گول گول چیزیں اسی طریقہ سے تیار کی جاتی ہیں۔ آج سے کچھ سال پہلے شیشے کے تختے بھی بڑے بڑے بیلن پر پھونک کر ہی تیار کئے جاتے ہیں۔ ان بیلنوں پر سے شیشے کے ہیرے سے تختے کاٹ لئے جاتے تھے۔ پھر اُن کو دبا کر سیدھا کر لیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ اور ایسا طریقہ ایجاد کیا گیا ہے۔ جس سے ایک طرف تو شیشہ ڈالتے ہیں اور دوسری طرف شیشے کے تختے اور یہ بالکل ندی کیطرح بہ نکلتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے حوض میں ایک طرف پگھلتا ہوا شیشہ ہوتا ہے اور اسی حوض کے ساتھ ہی دو بیلن اوپر نیچے لگے ہوتے ہیں۔ ان بیلنوں کا درمیانی فاصلہ اتنا ہی رکھا جاتا ہے۔ جتنا کہ تختے کی موٹائی۔ بیلن گھومتے رہتے ہیں۔ اور شیشہ کا تختہ ندی کیطرح بیلنوں کے درمیان سے نکلتا ہے پھر اُس کی سطح پر چمک کرنے کے لئے موٹی ریت سے کھرچ لیا جاتا ہے۔ جوں جوں شیشے کی چمک نکھر آتی ہے ریت کی باریکی بھی بڑھتی جاتی ہے۔ پھر ہیروں سے اس کو ضرورت کے مطابق کاٹ لیا جاتا ہے۔ شیشے کے تختے آج کل بہت ہی کارآمد ثابت ہو رہے ہیں۔ کیونکہ اس سے کرسیاں، میز، پلنگ، کھڑکیاں اور تپائیاں وغیرہ بنتی ہیں۔ ان کی مانگ بھی روزانہ بڑھ رہی ہے۔ ویسے چھوٹے کارخانوں میں لوہے کی میزوں پر شیشہ ڈال کر بھی تختے بنائے جاتے ہیں۔

شیشے کی ٹائلیں اور اینٹیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ یہ اینٹیں مکان بنانے کے کام آتی ہیں۔ ان اینٹوں میں یہ خاص بات ہے کہ سورج کی روشنی ان کے اندر جا سکتی ہے۔ لیکن گرمی کو شیشہ نیچے نہیں جانے دیتا اور کمرے میں روشنی بھی بڑھ جاتی ہے۔ ساتھ ہی ان اینٹوں میں ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ باہر سے اندر کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ اینٹیں دوہری قطاروں میں دیواروں میں چُن دی جاتی ہیں۔ شیشے کی کھپریل اگر سمینٹ اور لوہے کے ساتھ فرش اور چھت پر بچھائی جائیں تو دشمن کے ہوائی بم بھی اس مکان پر کوئی خاص اثر نہیں کر سکتے۔ اس بات کا تجربہ پچھلی لڑائی میں انگلستان میں کیا گیا تھا۔ اور شیشے نے کتنے ہی مکانوں کو گرنے سے بچا لیا تھا۔

عام طور پر جو شیشہ بنایا جاتا ہے وہ کسی سخت چیز کے ساتھ ٹکراتے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ کمزوری دور کرنے کے لئے اب سائنسدان ایسا شیشہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس پر ٹکرانے کا تو دور رہا گولی کا بھی اثر نہیں ہوتا۔ یہ شیشہ بڑے آدمیوں اور ریاستوں کی موٹروں اور ہوائی جہازوں میں استعمال ہوتا ہے جن کی زندگی

ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے۔ حال ہی میں یوگوسلاویہ کے مارشل ٹیٹو جب لندن گئے۔ اُن کی حفاظت کے لئے اُن کی موٹر میں بھی ایسا شیشہ لگایا گیا تھا۔

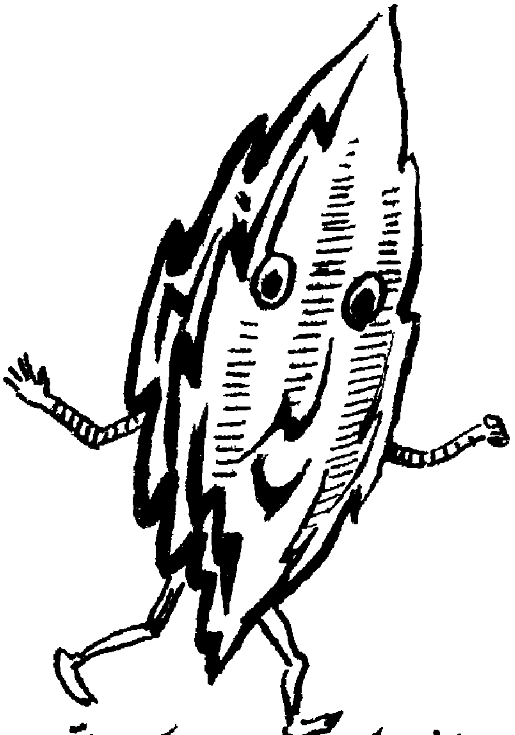
آج کل کے شیشہ میں ایک عام خرابی یہ بھی ہے کہ اس پر نظر پڑتے ہی سنہری مائل رنگ نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیشہ میں ریت نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔ یہ خرابی تجارت پیشہ لوگوں کے لئے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ بڑی بڑی دکانوں پر گاہکوں کو کھینچنے کے لئے چیزیں نمائش کے لئے الماریوں میں سجائی جاتی ہیں۔ لیکن شیشے میں ہرے پن کی وجہ سے چیزوں کی خوبصورتی کا صحیح پتہ نہیں لگ سکتا جس سے دوکانداروں کی تجارت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ شیشہ میں بعض چیزیں ملا دینے سے یہ ہرا پن دور کیا جا سکتا ہے اور ایسا شیشہ تیار کیا جاتا ہے جس پر نظر ڈالنے سے پتہ بھی نہیں چلتا کہ آیا ہماری نظروں اور چیز کے درمیان کوئی تیسری چیز ہے بھی یا نہیں۔

کیا آپ نے کبھی مرتبان سے مربع نکالتے دیکھا ہے؟ آپ نے دیکھا ہوگا کہ چمچی ڈالتے ہی چمچی کے اگلے حصہ کے ساتھ لیس دار تار چپک جاتا ہے۔ اور جوں جوں چمچی مربع سے دور ہوتی جاتی ہے یہ تار بھی باریک ہوتا جاتا ہے۔ اور کچھ دور جا کر ٹوٹ جاتا ہے۔ اس تار میں لچک بھی ہوتی ہے اور ملائمت بھی۔ یہی خاصیت پگھلے ہوئے شیشہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی تک اس بات کا علم نہ تھا۔ لیکن جوں ہی یہ بات معلوم ہوئی سائنسدانوں نے اس سے فائدہ اُٹھانے کے لئے قدم اُٹھایا۔ آجکل شیشہ سے ریشہ تیار کیا جاتا ہے۔ اس ریشے کی موٹائی انسانی بال کی موٹائی کے چھٹے حصے کے برابر ہوتی ہے۔ اس ریشہ کی نزاکت کا یہ حال ہے کہ انسان کی آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں صرف انگلیوں سے چھُو کر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مضبوطی کا یہ عالم کہ اگر ریشہ کے دونوں سروں کو دو تندرست توانا آدمی پکڑ کر کھینچیں جس طرح رسہ کشی کرتے وقت کرتے ہیں۔ پھر بھی اُن دونوں آدمیوں کی طاقت اِس ریشہ کو نہیں توڑ سکتی۔ اس کے دو چار ریشوں کو ملا کر تار بٹتے ہیں۔ اور ان تاروں سے کرگھے پر سوتی کپڑے کی طرح کپڑا بُنتے ہیں۔ پہلے پہل تو موٹا کپڑا بنتا تھا لیکن اب بہت ہی ملائم اور عمدہ کپڑا بُنا جاتا ہے جس کا استعمال یورپ کی فیشن ایبل عورتیں کرتی ہیں۔ اِن عورتوں کو ان کپڑوں کے ساتھ خاص اُنس ہوتا ہے اور بڑے فخر کے ساتھ پہنتی ہیں۔

شیشہ کا تار بجلی کے تاروں اور سمندری تاروں کے لپیٹنے کے کام میں بھی لایا جاتا ہے۔ اب ایسا شیشہ بھی تیار ہو چکا ہے جس پر آگ بھی کوئی اثر نہیں کر سکتی۔ شیشہ کی صنعت ابھی ابتدائی منزل پر ہے اب وہ زمانہ آنے والا ہے جب ہم چاروں طرف شیشے کی ہی چیزیں دیکھیں گے۔ شیشے کے مکان، سڑکیں، میز، کرسیاں فرنیچر وغیرہ۔ شیشہ کی ایک اور صفت یہ ہے کہ ٹوٹ کر ضائع نہیں ہوتا۔ ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے اس سے پھر چیزیں بنائی جا سکتی ہیں۔

محمد اقبال احمد

کریلے میاں



یوں تو اُن کا نام احمد میاں تھا لیکن لوگ انھیں کریلے میاں کہتے تھے اس لئے کہ وہ کریلا نہیں کھاتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے نام سے چڑھتے بھی تھے۔ جہاں کسی بچے نے کریلا کہا اور احمد میاں کا بُرا حال، سارا محلہ شور کر کر کے سر پر اٹھا لیتے تھے۔ بچّے تو بچّے بڑے بھی اُن کو کریلے میاں کہا کرتے تھے۔

ایک دن کریلے میاں کے یہاں نمک ختم ہو گیا، سوچا کہ پنساری کی دُکان سے نمک ہی لیتے آئیں۔ جیسے ہی گھر سے نکلے ایک لڑکے نے کہا "کریلے میاں [illegible] کہاں جا رہے ہو؟" اب کیا تھا۔ غصّے کے مارے لگے آئیں بائیں شائیں کرنے۔ اس کی طرف دوڑے۔ مگر فوراً ہی دوسری طرف سے ایک اور لڑکے نے کہا "کریلے میاں! کیا بات ہو گئی ہے" بس پھر کیا تھا چاروں طرف سے "کریلے میاں، کریلے میاں" کی آوازیں آئیں۔ اب یہ کبھی اِدھر دوڑتے ہیں، کبھی اُدھر۔ اِدھر لڑکے ہیں کہ شور مچائے چلے جا رہے ہیں۔ اس طرح دو تین گھنٹے

شور مچاتے گذر گئے آخر کچھ بڑے بوڑھے لوگوں نے آکر لڑکوں کو ڈانٹا اور ان کو پنساری کی دکان پر لے گئے۔ اس وقت پنساری کا لڑکا دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پیسے لے کر نمک کی پڑیا ہاتھ میں تھما دی اور بڑے اطمینان سے پوچھا "کیوں میاں جی! کیا یہ نمک کریلے کی ترکاری میں ڈالو گے؟"

جب تک یہ کنکر اٹھائیں وہ لڑکا بھی بھاگ گیا۔ میاں جی وہیں کھڑے کھڑے شور مچاتے رہے۔ بالآخر چار گھنٹے کے بعد میاں جی گھر پہنچے۔ جب تک ہانڈی بھی جل گئی تھی۔

اسی طرح روز لڑکے اُن کو تنگ کیا کرتے تھے۔ آخر ایک دن احمد میاں کو بہت غصّہ آیا اور وہ تھانیدار کے پاس پہنچے۔ تھانیدار سے کہا کہ "ہماری رپورٹ لکھو"۔ تھانیدار بھی انھیں خوب جانتا تھا اس نے کہا کہ "جاؤ میاں کیوں پریشان کرتے ہو ایسی بات کی رپورٹ نہیں لکھی جاتی"۔

یہ جواب سُن کر کریلے میاں کا پارہ اور چڑھ گیا۔ بولے "اس کی رپورٹ نہیں لکھی جاتی تو اگر میں کسی جان لے لوں تو اس کی رپورٹ بھی مت لکھنا"۔ یہ کہہ کر اپنے راستے ہولئے۔ جب کچھ دور چلے گئے تو تھانیدار نے آواز دے کر کہا "کریلے میاں! آؤ آؤ اب تمھاری رپورٹ لکھ لیتے ہیں"۔ تھانیدار کی زبان سے یہ سننا تھا کہ کریلے میاں کو اور بھی غصّہ آیا اور بولے "تم حاکم ہو کر جب ایسی بات کہتے ہو تو پھر اور لوگ کیوں نہ کہیں گے"۔ اور پھر جی کھول کر وہاں شور مچاتے رہے۔ آخر ایک دن محلے کے لوگوں نے لڑکوں کو سمجھایا بجھایا کہ اب کوئی ان کو نہ ستائے سب لڑکے مان گئے۔

اگلے دن جب کریلے میاں بازار سودا لینے نکلے تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔ کریلے میاں نے مڑ کر دیکھا مگر اب لڑکے اُن کو دیکھ کر اِدھر اُدھر

نکل جاتے تھے۔ آخر چلتے چلتے ایک آدمی سے ٹکرا گئے۔ فوراً سنبھل کر بولے "پہچانتے ہو میں کون ہوں" وہ آدمی اسی محلے کا تھا بولا۔ "جی ـــ آپ کو کون نہیں جانتا آپ ہیں کر ـــــ جی نہیں احمد میاں"

یہ سُن کر اُن کو اطمینان ہوا آگے بڑھے تو بھی کسی نے کچھ نہیں کہا۔ آخر ذرا سی دیر میں پنساری کی دکان آ گئی جہاں سے انھیں سودا خریدنا تھا۔ مگر وہاں بھی کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اب تو احمد میاں سے نہیں رہا گیا اور بولے "لالہ جی آج معلوم ہوتا ہے کہ محلے کے سب لڑکے مر گئے۔ ہر جگہ سنّاٹا ہے۔ گھر سے یہاں تک آ گیا، راستے میں کسی نے کچھ بھی نہیں کہا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے مجھے کوئی پہچانتا نہیں" ـــــ ابھی احمد میاں کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ پیچھے سے بنئے کے لڑکے نے کہا "کریلے میاں! کیا کہہ رہے ہو؟"

کریلے میاں نے مُڑ کر دیکھا، پہلے تو خوشی کے مارے باچھیں کھل گئیں، مگر پھر ویسے ہی شور مچانا شروع کیا۔ جیسے وہ سچ مچ کریلے میاں کہنے سے چڑھتے ہوں۔

صفحہ ۱۴ کا بقیہ

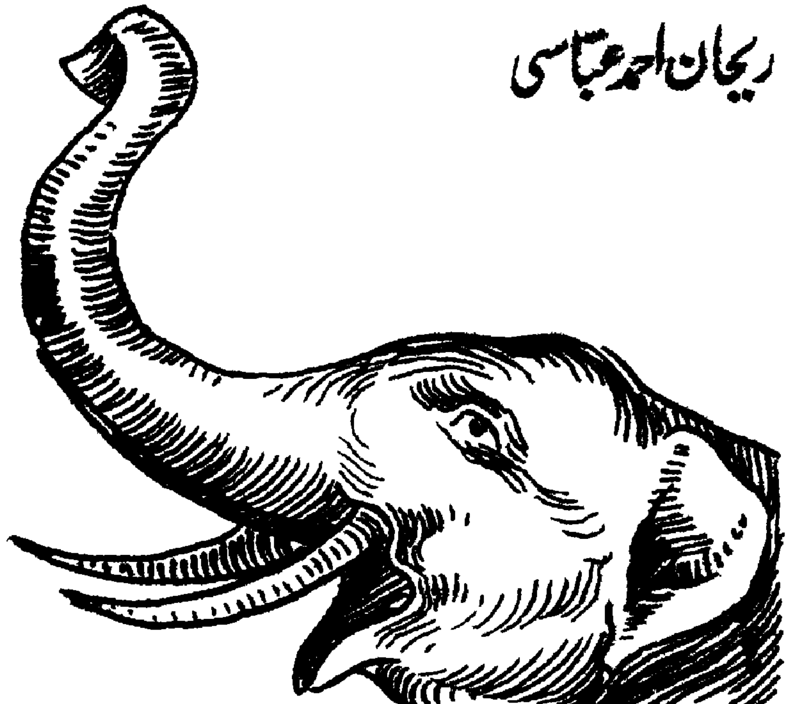
ہے۔ ہاتھی ہمیشہ غول بنا کر رہتے ہیں۔ غول کا سردار ایک بڑا اور طاقتور ہاتھی ہوتا ہے۔ دوسرے ہاتھی اس کا حکم مانتے ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے ہاتھی جب بیمار ہوتا ہے یا مرنے کے قریب ہوتا ہے تو پانی کے نزدیک کئی کئی دن ٹھہر جاتا ہے۔ اور زیادہ تر جنگلی ہاتھی پانی کے قریب ہی مرتے ہیں بلکہ اکثر ہاتھی کسی ایک خاص مقام پر مرتے دیکھے گئے ہیں۔

ہاتھی جب مر جاتا ہے تو اسے ویسے ہی ایک یا دو تین ٹکڑے کر کے زمین میں دبا دیا جاتا ہے۔ گوشت گل کر سڑ جانے کے بعد اس کی ہڈیاں نکال لی جاتی ہیں اور وہ کافی قیمت کی فروخت ہوتی ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ زندہ ہاتھی ایک لاکھ کا تو مرا ہوا سوا لاکھ کا۔

ہاتھی کا دانت بہت قیمتی ہوتا ہے۔ اس سے بڑی اچھی اور قیمتی چیزیں بنتی ہیں۔ ہاتھی دانت سے کھلونے، بٹن، چاقو کے دستے، بنتے ہیں۔ آپ نے ہاتھی دانت کے بنے ہوئے تاج محل ننھے منّے دیکھے ہوں گے۔

ریحان احمد عباسی



ہاتھی

جانوروں میں سب سے بڑا اور سمجھدار جانور ہاتھی ہے۔ کان بڑے بڑے، آنکھیں بہت ہی چھوٹی اور ناک یہ لمبی، پیروں کے برابر۔ اس کی ناک کو ہم سونڈ کہتے ہیں۔ ہاتھی کے لئے سونڈ بڑے کام کی چیز ہے۔ وہ اسی سے کھانے کی چیزیں اُٹھا اُٹھا کر منہ میں رکھتا ہے۔ پانی لے کر منہ میں انڈیلتا ہے۔ اسی سے بڑے بڑے پیڑوں کو اُکھاڑتا اور بھاری سے بھاری بوجھ اٹھا لیتا ہے بس یہ سمجھئے کہ ہاتھی کا ہاتھ ہے۔ اور ہاں سونڈ کا مُکا بنا کر بھی بڑے زور سے مارتا ہے۔

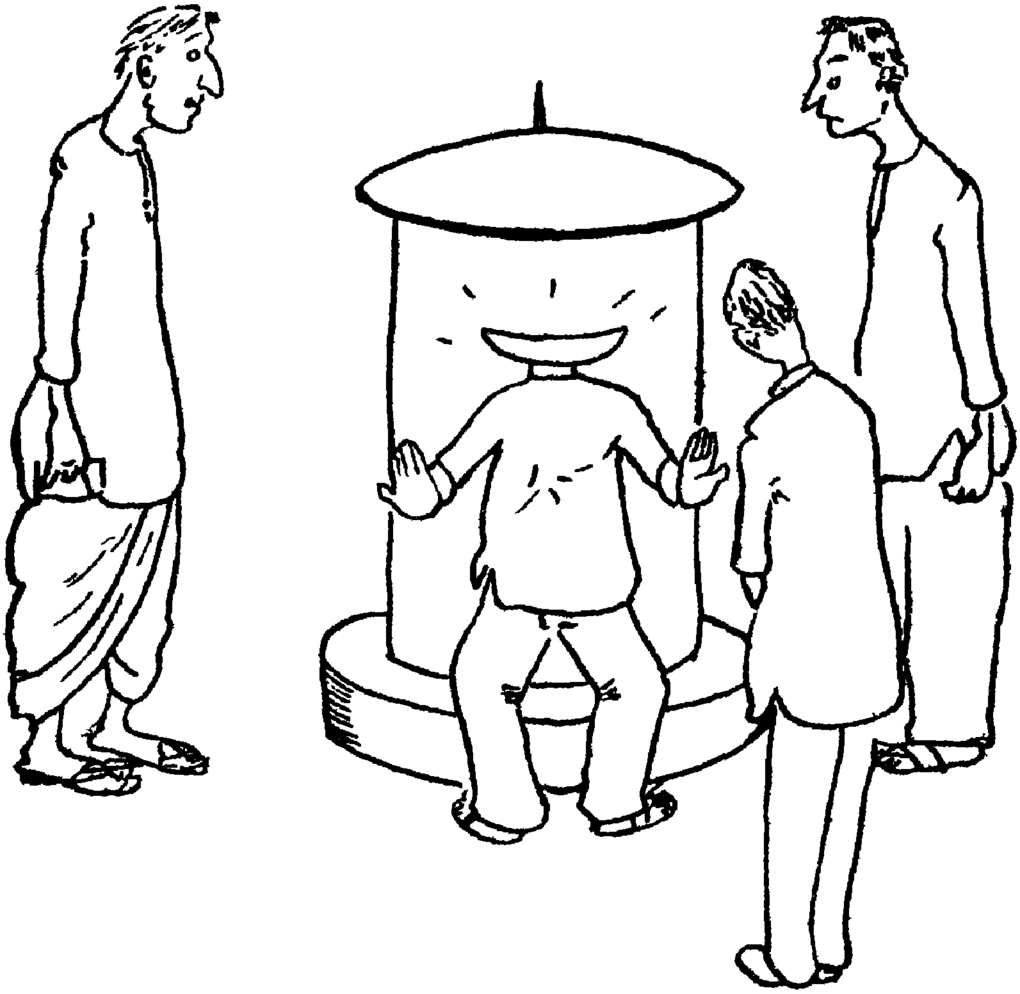
ہاتھی کے چھوٹے بچے کی اونچائی تین فیٹ اور وزن پچھتر سیر کے قریب ہوتا ہے۔ چھ سال کا ہو جاتا ہے تو اونچائی چھ فیٹ تک ہو جاتی ہے۔ ہاتھی اپنے بچے کی بیس سال تک دیکھ بھال کرتا ہے پچیس سال میں ہاتھی پورا جوان ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کی اونچائی گیارہ فیٹ یا اس سے بھی زیادہ اور وزن تقریباً چالیس من ہو جاتا ہے۔ پالتو ہاتھی کی عمر اوسطاً پچھتر سال ہے۔ لیکن جنگلی ہاتھی کی عمر اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ بہت سے جنگلی ہاتھیوں کی عمر ڈیڑھ سو سال سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

ہاتھی کیلا بہت شوق سے کھاتا ہے۔ گنّا بانس کے اوپر کا نرم حصّہ، پودوں کی جڑیں اور گھاس بھی کھاتا ہے۔ ہاتھی کو پانی بہت پسند ہے وہ ہمیشہ ایسی ہی جگہ رہنا پسند کرتا ہے جہاں آس پاس خوب پانی ہو۔ پانی میں نہانا اس کا دل پسند کھیل ہے۔

ہاتھی افریقہ، ہندوستان اور لنکا کے جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے بعض جنگلوں میں سفید ہاتھی بھی ہوتا ہے۔ بُدھ مذہب کے لوگ سفید ہاتھی سے عقیدت رکھتے ہیں۔ افریقہ کا ہاتھی ہندوستان کے ہاتھی سے نسبتاً بڑا ہوتا ہے۔

ہاتھی کے پکڑنے کے مختلف طریقے ہیں۔ جنگلی ہاتھی کو پکڑنے اور سدھانے میں پالتو ہاتھی بڑا کام دیتے ہیں۔ جنگلی ہاتھی بہت کم عرصہ میں پال کر سدھا کر لیا جاتا ہے۔ ہاتھی بہت عقلمند اور سمجھدار جانور ہے اس لئے بہت تھوڑے عرصہ میں ہر ایک کام سیکھ لیتا ہے۔ ہاتھی سے بہت سے کام لئے جاتے ہیں۔ امیر اس کی سواری کرتے ہیں۔ اس پر بیٹھ کر جنگلی اور خونخوار جانوروں کا شکار کھیلتے ہیں۔ اب سے پہلے ہاتھی لڑائی میں بھی کام آتے تھے۔ لیکن اب توپ اور بم کے زمانے میں ہاتھی لڑائی کے لئے بیکار ہوگیا ہے۔ ہاتھی بھاری سے بھاری بوجھ اِدھر سے اُدھر لے جاتے ہیں۔ ندی میں بہہ کر آئے ہوئے لکڑی کے لٹھوں کو ہاتھی اپنی سونڈ اور دانتوں کی مدد سے اٹھا کر ایک جگہ اکٹھا کرتے ہیں پہاڑوں پر جہاں موٹر لاری اور ریل تک کام نہیں دے سکتی وہاں بوجھ لے جانے میں ہاتھی ہی کام آتا ہے۔ آج کل بہت سی جگہ کارخانوں کے مالک ہاتھی سے مزدوری کراتے ہیں۔

ہاتھی کی یادداشت بہت اچھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے مالک۔ مہاوت اور ان کے بچّوں کو بہت جلد پہچان لیتا ہے اور ان سے مانوس ہوجاتا ہے بچّے اگر پریشان بھی کریں تو کچھ نہیں کہتا لیکن جب غصّہ آتا ہے تو بہت خطرناک ہوجاتا ہے۔ اگر مہاوت سے بھی ناراض ہو جائے تو سونڈ اور ٹانگوں میں دبا کر چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اپنے دشمن کو برسوں نہیں بھولتا جب کبھی مل جائے اپنا بدلہ ضرور نکال لیتا ہے۔ یہی حال ہاتھی کا اپنے دوسرے ہاتھیوں کے ساتھ ہے۔ اُن میں بھی آپس میں دوستی اور دشمنی رہتی



زرا ٹھہرو میرے نام راموکی بیرنگ چٹھی آئی ہے یہیں سے اُڑالے جائیں
اور ڈاک خانہ کو دھتا بتائیں



ادریس احمد

بیجو باورا

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ تان سین ہندوستان کا بہت بڑا گویا گزرا ہے۔ اور اپنے فن کا بادشاہ مانا جاتا تھا۔ لیکن کہتے ہیں کہ تان سین کے زمانے میں ہی ایک آدمی ایسا گزرا ہے جو اس سے بھی زیادہ اچھا گویا تھا۔ اس کا نام بیجو تھا۔ اور لوگ اسے بیجو باورا کہا کرتے تھے۔ آیئے ہم آپ کو اس کی زندگی کا کچھ حال سنائیں۔

بیجو باورا، آگرے کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس زمانے میں اکبر بادشاہ کی حکومت تھی۔ تان سین اکبر کا درباری گویا تھا۔ اور یہی نہیں بلکہ وہ اکبر کے دربار میں نورتن تھا۔ نورتن تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ اکبر کے دربار میں ہر طرح کے ذہین لوگ تھے جو اپنے اپنے کام اور اپنے اپنے فن میں ماہر تھے۔ جیسے ابوالفضل، فیضی، بیربل وغیرہ ان کا حال ہم آپ کو پھر کبھی سنائیں گے۔ ہاں تو تان سین بھی اکبر کے 'نورتنوں' میں سے ایک تھا۔ اس زمانے میں اس سے اچھا کوئی گویا نہ تھا۔ اور اسی لئے یہ حکم دے دیا تھا "جو شخص گانے میں تان سین کی برابری نہ کر سکے وہ آگرے میں نہیں گا سکتا"۔ اور اگر کوئی بادشاہ کے اس فرمان کو نہ مانتے ہوئے

ایسا کرے گا تو اسے اپنی جان سے ہات دھونا پڑیگا۔

ایک دن موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سادھوؤں کی ایک چھوٹی سی ٹولی بھجن گاتی ہوئی شہر میں داخل ہوئی۔ یہ سب لوگ اپنے گانے میں مست تھے ان کو ذرا بھی ہوش نہ تھا۔ ابھی وہ گا ہی رہے تھے کہ کچھ سپاہی آئے اور انھوں نے ان سادھوؤں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دیں اور گرفتار کرکے بادشاہ کے دربار میں لے گئے۔

بادشاہ نے تان سین سے کہا کہ "تان سین! ذرا ان کا امتحان تو لو، یہ کیسا گاتے ہیں"۔ بادشاہ کے حکم کے مطابق تان سین نے جب ان کا امتحان لیتے ہوئے گانے کے اصولوں کے بارے میں پوچھا تو انھیں معلوم ہوا کہ انھیں گانا نہیں آتا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ ان بے چاروں نے بہت کہا کہ انھوں نے بادشاہ کا اعلان نہیں سنا ورنہ وہ ہرگز نہ گاتے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ قانون کا جاننا فرض ہوتا ہے، کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں قانون نہیں جانتا۔ بس اسی بات پر ان سب سادھوؤں کو پھانسی دیدی گئی۔ صرف ایک بچے کو چھوڑ دیا گیا اس لئے کہ اس کی عمر صرف دس سال کی تھی اسی بچے کا نام بیجو تھا۔ جن لوگوں کو پھانسی دی گئی ان میں بیجو کا باپ بھی تھا۔ وہ بچارا روتا بلکتا ہوا اپنے گاؤں گیا۔ بیجو کو تان سین پر بہت غصہ آیا اور اس نے اپنے گرو جی شنکر آنند سے کہا کہ "میں تان سین سے اس کا بدلہ لوں گا"۔ شنکر آنند نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا کہ "بیٹا مت رو، میں تجھے خوب گانا سکھا دوں گا جس سے تو تان سین کو ہرا سکے گا"۔

یہ سن کر بیجو کو اطمینان ہوا۔ اور اس نے خوب محنت کرکے گانا سیکھا وہ بارہ برس تک دن رات یہ فن سیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اب وہ خوب اچھا گانے لگا تھا اور کہتے ہیں کہ اُڑتے پرندے اس کا گانا سُن کر بیٹھ جاتے تھے۔

آخر جب بابا شنکر آنند کو اطمینان ہوگیا کہ بیجو بہت اچھا گانے لگا ہے تو اُس نے کہا "بیٹا اب تو آگرے جا سکتا ہے، مگر میری ایک بات کو کبھی نہ بھولنا اور وہ یہ ہے کہ گانا تیرے گلے کا فن ہے اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے"۔ بیجو نے اپنے استاد کی بات مان لی اور ان سے رخصت ہوکر آگرے پہنچا۔ اب وہ جدھر سے گزرتا گاتا ہوا گزرتا۔ اسے اس طرح دیکھ کر لوگ سمجھے کہ کوئی پاگل ہے جس کو اپنی جان تک کی پرواہ

نہیں ہے۔ چنانچہ سپاہی اسے بھی گرفتار کرنے پہنچے۔ مگر اس کا گانا سُن کر وہ سب کچھ بھول گئے۔ اب یہ عالم تھا کہ نہ تو بیجو کو ہوش تھا اور نہ گانا سُننے والوں کو۔ جس کو دیکھو وہ منہ کھولے کھڑا تھا۔ اور جب گانا ختم ہوا تو لوگوں نے دیکھا وہ ساری بھیڑ تان سین کے محل کے پاس کھڑی تھی۔ گانے کی آواز سُن کر تان سین اپنے محل سے نکلا اور اس نے بیجو سے کہا۔ "چپ رہو، اب یہ گانا بند کرو۔ تم کو بادشاہ کا حکم معلوم ہے؟ اب تم کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

بیجو نے کہا جو ہونا ہے ہو جائے۔ میں تو تم سے مقابلہ کرنے آیا ہوں۔ تان سین نے اس کی تجویز مان لی۔ اب سپاہیوں کو گرفتاری کا خیال آیا۔ انھوں نے بیجو کو ہتھکڑیاں پہنا کر دربار میں پیش کیا۔ وہاں یہ طے ہوا کہ کل صبح شہر سے باہر ان دونوں گویّوں کا مقابلہ ہوگا۔ جو ہارے گا اس کی سزا جیتنے والا مقرر کرے گا۔

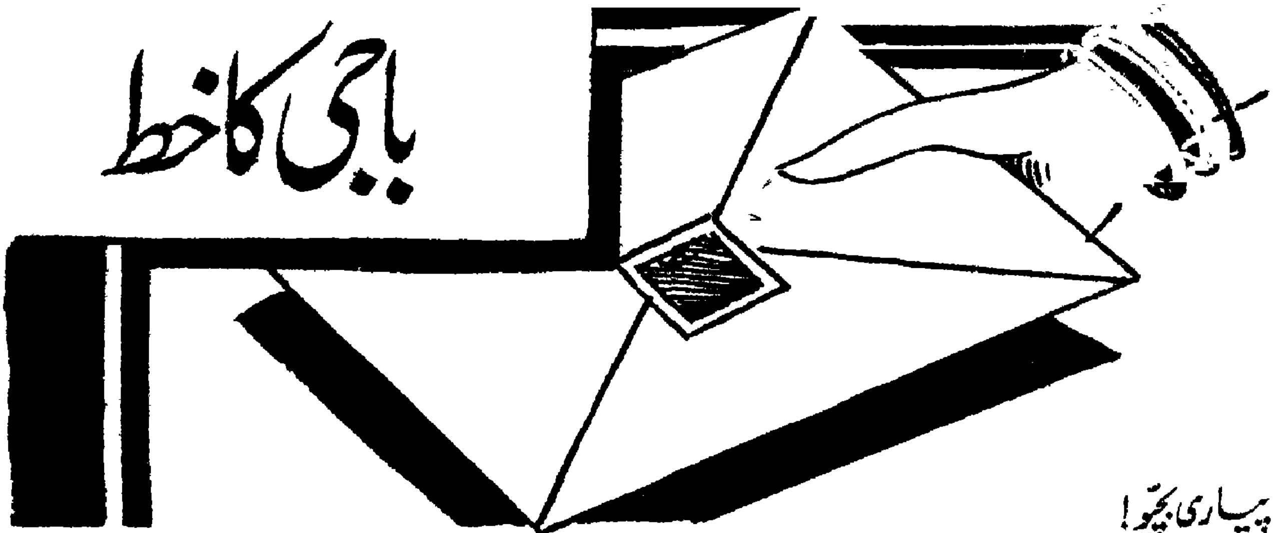
دوسرے دن سب لوگ مقررہ جگہ پر پہنچے۔ درمیان میں تان سین اور بیجو تھے۔ شہنشاہ اکبر تخت پر جلوہ افروز تھے۔

پہلے بیجو نے ستار بجانا شروع کیا۔ سننے والے دنگ رہ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں کچھ جنگلی ہرن بیجو کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ یہ دیکھ کر لوگ اور بھی حیران ہوئے۔ اس وقت اس نے کچھ ہار ان کے گلے میں ڈال دیئے اور ستار بند کر دیا۔ ستار کا رُکنا تھا کہ ہرن جنگل کی طرف بھاگ گئے۔ اس کے بعد بیجو نے تان سین سے ستار بجا کر ہرنوں کو بلانے کے لئے کہا۔

تان سین ستار بجاتے بجاتے اور گاتے گاتے تھک گیا لیکن ہرنوں کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ حالانکہ اس نے اس سے اچھا کبھی نہ گایا تھا۔ آخر عاجز آ کر بیجو سے کہا کہ ہرن اِدھر اتفاقاً آ نکلے تھے۔ یہ کوئی راگ کا اثر نہ تھا۔ میں تو جب جانوں کہ دوبارہ انھی ہرنوں کو بلا دو۔ شہنشاہ اکبر بھی اس مقابلہ میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔

بیجو نے ہنس کر ستار اُٹھایا اور راگ شروع کر دیا پھر ہرن جمع ہو گئے۔ بیجو نے ان کے گلے سے ہار اُتار لئے اور ستار بجانا بند کر دیا ہرن پھر واپس چلے گئے۔ اکبر اور تمام درباری بیجو کے کمال پر حیران تھے۔

اکبر کو تان سین سے بے حد محبت تھی۔ اس لئے تان سین کی ہار پر اسے ٹھیس ضرور



پیاری بچیو!

اس دفعہ آپ کے لئے سلائی کے ابتدائی ٹانکے دیئے جا رہے ہیں۔ یہ ٹانکے بے حد آسان ہیں سلائی کے علاوہ کاڑھنے میں بھی کام آتے ہیں۔

اب کڑھائی کے بارے میں بھی سن لیجئے یہ ہمارے دیس کا بہت پرانا فن ہے۔ ہر زمانے میں اور ملک کے ہر حصے میں یہ رائج رہا ہے۔ یوں تو دیکھنے میں بڑا آسان معلوم ہوتا ہے مگر یہ بھی ایک فن (آرٹ Art) ہے اور دوسرے فنوں کی طرح اس میں بھی بڑی محنت اور ہاتھ کی صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بات اس میں دلچسپی رکھنے والی بہنیں ہی جانتی ہوں گی۔

لیکن سلائی شروع کرنے سے پہلے ذرا چند باتوں کو دھیان میں رکھئے۔ پہلے سامان رکھنے کے لئے ایک لکڑی کا چھوٹا سا ڈبہ لیجئے۔ اور اسے رنگ برنگے کاغذ چپکا کر خوبصورت بنا لیجئے۔ اندر بازار کی یا اچھی دھنی ہوئی روئی ہلکی ہلکی رکھ کر اس پر گوندسے کپڑا چپکا دیجئے۔ اس کے ڈھکنے میں بھی اسی طرح روئی رکھ کر کپڑا چپکا دیجئے۔ اس کے لئے سگار کا بڑا ڈبہ اچھا رہے گا۔ اس کے ڈھکنے میں فیتہ چپکا کر قینچی رکھنے کے لئے جگہ بنا لیجئے۔ اب اس میں ڈی۔ ایم۔ سی۔ سیفن اور چھ تاری کی لچھیاں اوسط درجے کی سوئیوں کا فیتہ پنسل کاربن رکھئے تاکہ ضرورت کے وقت کام آسکے۔

اچھی بچیاں اپنا سامان سلیقے سے ایک جگہ رکھتی ہیں تاکہ ضرورت کے وقت پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔ اب لیجئے آپ کا ڈبہ تیار ہو گیا اور اس میں سامان بھی آگیا۔ اب ایک پرانے لٹھے کے ٹکڑے پر نمونہ بنائیے۔

"ٹانکے"

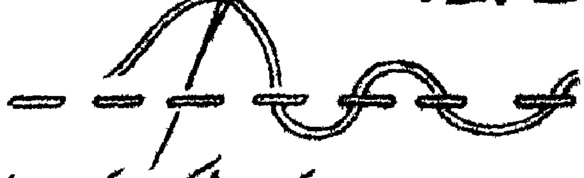
(۱) لنگر۔ یہ سب سے آسان ٹانکہ ہے۔ بس اس کو سلائی کی الف بے کہنا چاہیئے یہ ٹانکہ عموماً دو ٹکڑوں کو جوڑنے کے کام آتا ہے۔ سوئی میں اپنی مرضی کے مطابق دھاگہ ڈال کر نقشہ کے مطابق چلائیں۔

شکل نمبر ۱

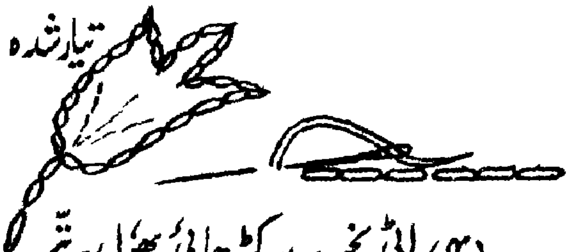


تیار شدہ

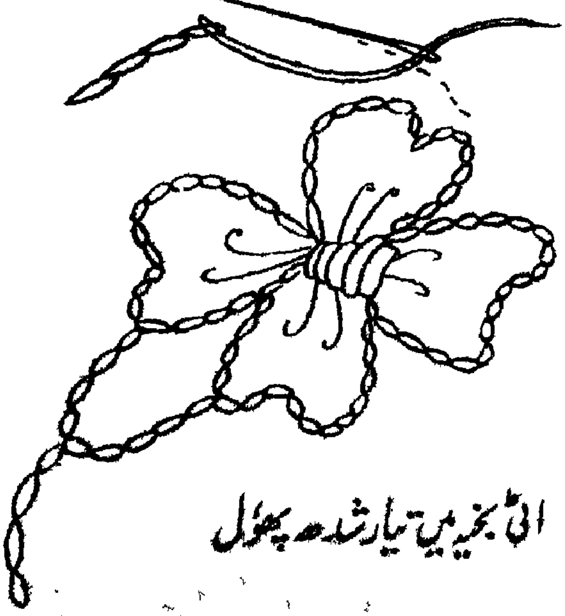
(۲) یہ ٹانکہ لنگر کے اوپر بنایا جاتا ہے۔ یہ موٹے ریشم سے دو رنگ سے اچھا لگتا ہے مثلاً لنگر اگر سیاہ ہو تو اوپر کا کام سرخ یا زرد بنے گا سوئی کو ایک دفعہ لنگر کے ٹانکے کے اوپر اور نیچے سے نکالیے۔



(۳) بخیہ۔ یہ کڑھائی کپڑے کو مضبوطی سے جوڑنے کے کام آتی ہے اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے پھول اور پتیاں بھی اس سے بھر کر بنائیں۔ ٹانکہ پاس پاس اور چھوٹا لیں لیکن صفائی شرط ہے۔ دیکھئے شکل نمبر دو۔

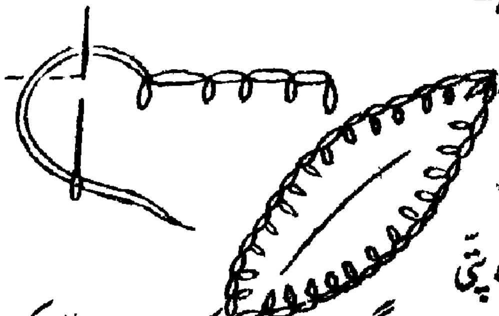


(۴) الٹی بخیہ۔ یہ کڑھائی پھول پتے باسکٹ وغیرہ بنانے کے کام آتی ہے۔ اس کڑھائی سے بہت ہی کم وقت میں خوبصورت نمونے تیار ہو جاتے ہیں۔ سوئی میں ڈی۔ ایم۔ سی کا تار پرو کر الٹے ہاتھ سے سیدھے کی طرف چلائیں



الٹی بخیہ میں تیار شدہ پھول

(۵) کاج کا ٹانکہ۔ یہ ٹانکہ کاج بنانے کے کام آتا ہے۔ لیکن یہ عموماً کڑھائی کے کام بھی آتا ہے اس سے بن کر پھول بہت ہی خوبصورت لگتے ہیں۔ یہی ٹانکہ کٹائی کے کام میں بھی استعمال ہوتا ہے۔



تیار شدہ پتی

موٹا دھاگہ استعمال کریں اور ٹانکہ پاس پاس لیں

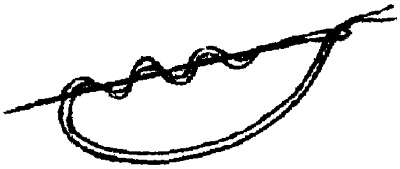
(۶) سیدھا ٹانکہ۔ یہ بالکل آسان ٹانکہ ہے صرف ایک لمبا اور سیدھا ٹانکہ لیں۔ ٹانکہ سے پورے پورے نمونے تیار ہو سکتے ہیں۔ اگر صفائی موٹے دھاگے سے بنایا جائے تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔





تیار شدہ

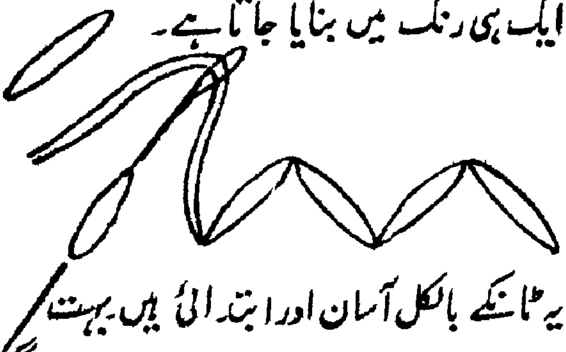
(۷) فرانسیسی زیرہ۔ یہ کڑھائی پھولوں کے بیچ میں زیرہ بنانے کے کام آتی ہے۔ ننھی ننھی بُندکیاں پاس پاس بن کر بہت حسین لگتی ہیں۔



تیار شدہ



(۸) آڑے ٹانکے۔ یہ کڑھائی آڑے ٹانکوں سے بنتی ہے پھر اس کے بعد دوسری طرف سے ٹانکے لئے جائیں گے۔ اس کو دو رنگ یا عموماً ایک ہی رنگ میں بنایا جاتا ہے۔



یہ ٹانکے بالکل آسان اور ابتدائی ہیں۔ بہت سی بچیاں تو شاید ان سے واقف بھی ہوں گی۔ ہم نے سمجھانے کی کافی کوشش کی ہے اب بھی اگر آپ کے سمجھ میں نہ آسکے تو بلا تکلف پیامِ تعلیم کے ذریعے پوچھ لیں۔

آپ کی نجمہ باجی

ستیہ پال ودّیالنکار

دسہرہ



دسہرہ اور دیوالی ہندوؤں کے دو بڑے تیوہار ہیں اور ان دونوں میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ دسہرہ دیوالی سے بیس دن پہلے منایا جاتا ہے۔ یہ وہی دن ہے جب کہ شری رام چند۔ جی نے لنکا کے راجا راون کو مارا تھا۔ اُن کی اس فتح کی یاد تازہ رکھنے کے لئے نہ جانے کتنی صدیوں سے اِس مُلک کے باشندے ہر سال رام لیلا کا ناٹک کرتے اور اپنے دلوں میں بلند حوصلے پیدا کرتے ہیں۔

دسہرہ کو وجے دشمی یا دُرگا پُوجا بھی کہتے ہیں۔ بنگال میں تو ہر کوئی اس تیوہار کو دُرگا پُوجا کے نام سے ہی جانتا ہے۔ کلکتہ کے کالی مندر میں دُرگا پوجا کی رونق سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

دسہرہ کنوار کے مہینے میں منایا جاتا ہے۔ "دسویں" کے دن منایا جانے کی وجہ سے اس کا نام "دشمی" پڑ گیا ہے۔ اس سے پہلے کے نو دنوں کو "نوراتر" یا "نوراتا" کہتے ہیں۔ بھگت لوگ "نوراتے" کو دسہرے سے کم نہیں مانتے۔ ان نو دنوں میں روزہ رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ان دنوں گوشت کا استعمال بہت کم کر دیا جاتا ہے۔

دیہاتوں میں رام لیلا کا بہت رواج ہے ہر نوجوان اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ اسے رام یا لچھمن کا پارٹ دیا جائے۔ وہ اس بات کو فخر سمجھتا ہے۔

رام چندر جی کے حالات زندگی لکھنے والے دو بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ سنسکرت میں تو بالمیک منی اور ہندی میں سنت تلسی داس۔ سنت تلسی داس کی رامائن میں ایسے بند موجود ہیں جنھیں بڑے ترنم سے گایا جا سکتا ہے۔ دسہرے کے ایام میں اس رامائن کو خاص طور سے لوگ جگہ جگہ پڑھتے ہیں۔ شام کے وقت کھانے سے فارغ ہوکر لوگ ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ کتھا کہنے والے پنڈت جی ہارمونیم اور تبلے پر چوپائیاں (بند) گاتے ہیں اور سننے والے خوش ہوتے ہیں۔ یہ سب دسہرے سے ۱۰/۱۵ دن اور کبھی کبھی تو ایک مہینہ پہلے سے شروع ہو جاتا ہے۔ بڑے محو ہوکر لوگ بیچ بیچ میں "رام چندر کی جے" کا نعرہ لگا کر اپنی دلی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ جن دنوں، گلی کوچوں میں شام کے وقت اس قسم کی کتھائیں ہوتی ہوں تو سمجھ لیجیے دسہرہ اب آگیا ہے۔

دلی میں دسہرہ منانے کے لیے، رام لیلا کا میدان ہے جو دلی گیٹ اور اجمیری گیٹ کے بیچ میں ہے۔ اس طرح کے رام لیلا کے میدان ہندوستان کے ہر بڑے شہر میں ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں تو ایک ہی نہیں ایسے دو دو میدان ہوتے ہیں اور رام لیلا دو جگہ ہوتی ہے۔ دلی میں بھی ایسا ہی ہے اور دوسری جگہ رام لیلا کی کمیٹی کا باغ ہے۔

رام لیلا کے میدان کی طرف ذرا نظر دوڑائیے ۴۰ یا ۵۰ فٹ اونچی یہ تین مورتیاں کس کی کھڑی ہیں؟ آئیے ہم آپ کو بتائیں۔ درمیان کی مورتی راون کی ہے، اس کی داہنی طرف اس کے بھائی کمبھ کرن اور بائیں طرف اس کے بیٹے میگھ ناد کی ہے۔ یہ تینوں مورتیاں کاغذ اور بانس وغیرہ سے بنائی جاتی ہیں۔ ان کے اندر ایسا مسالہ بھرتے ہیں جو آگ لگاتے ہی بھبک اٹھے۔ ان میں ایسے ایسے پٹاخے بھی ہوتے ہیں جو جلنے پر کان کے پردے بھی پھاڑ دیں اور سارے شہر کو معلوم ہو جائے کہ راون جل گیا ہے۔

اس مورتی میں راون کے دس سر

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

لطیفے

سلیم :- (نوکر سے) یہ لو روپیہ۔ اور بازار سے "علمی بیاض" لے آؤ۔

نوکر :- لیکن سرکار۔ کتنے کی املی اور کتنے کی پیاز لے آؤں۔

ماسٹر :- (جمیل سے) رکن کی جمع کیا ہے۔

جمیل :- رکن الدین۔

باپ :- (بیٹے سے) بیٹا! بتلاؤ تاج محل کس نے بنایا۔

بیٹا :- جی، مزدوروں نے۔

ایک مرتبہ آنگن میں بہت سے مکوڑے نکلے تھے۔ میری چھوٹی بہن نے جھٹ کہا۔ "باجی! دیکھئے یہاں مکوڑے پھر رہے ہیں۔

(خدیجہ سلطانہ ہاشمی)

اُستاد :- (ایک لڑکے سے) تم نے آفس سے پنسل چرائی ہے اس لئے آج تم مار کھاؤ گے

لڑکا :- آج تو روٹی کھا لینے دیجئے، کل مار کھالوں گا۔

جنرل :- (سپاہی سے) تم نے جاتے ہوئے مجھے سلام نہیں کیا، جانتے ہو میرا کیا نام ہے۔

سپاہی نے پہلے تو دو منٹ جنرل کو غور سے دیکھا اور پھر بولا "ارے بھائیو دوڑو۔ انھیں دیکھو جن کو اپنا نام بھی نہیں معلوم، مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میرا نام کیا ہے۔

عیسائی پادری :- (لڑکے سے) بیٹا بتاؤ! تم رات کو خدا سے دعا مانگتے ہو۔

لڑکا :- جی ہاں۔

پادری :- اور صبح کے وقت۔

لڑکا:۔ مجھے دن میں ڈر نہیں لگتا۔

رات کے تین بجے ایک ڈاکٹر کے یہاں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس نے جو ٹیلیفون اٹھایا تو کسی مریض کی آواز سنائی دی:۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت تین بجے ہیں اور مجھے نیند نہیں آتی۔

ڈاکٹر:۔ اگر آپ حکم دیں تو پھر میں کوئی گانا سناؤں۔

جج:۔ (قیدی سے) جو لوگ تم پر بھروسہ کرتے ہیں تم ان کو کس طرح دھوکا دیتے ہو۔

قیدی:۔ حضور۔ جو لوگ بھروسہ نہیں کرتے ان کو دھوکا بھی تو نہیں دیا جا سکتا۔

گاہک:۔ (دکاندار سے) آپ نے جو سنترے کل دیئے تھے وہ سڑے نکلے ہیں ثبوت کے لئے کل آپ کو دکھادوں گا۔

دکاندار:۔ دکھانے کی ضرورت نہیں، آپ کی بات کیا سنتروں سے کم ہے۔

ایک صاحب نے ایک نیا ملازم رکھا اور اسے پہلے روز ڈاک خانے خط ڈالنے کے لئے بھیجا۔ ملازم نے سوچا کہ کیوں نہ پہلے ہی روز اپنی ایمانداری کا ثبوت دوں۔ چنانچہ اُس نے ٹکٹ کے پیسے صاحب کو واپس کر دیئے۔

صاحب نے کہا:۔ کیوں بھئی کیا لفافے میں ٹکٹ نہیں لگائے۔

ملازم:۔ جی ہاں، در اصل پوسٹ ماسٹر صاحب دوسری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے نظر بچا کر خط ڈال دیا۔ اور یہ پیسے بچا لئے۔

ایک کنجوس کسی ہوٹل میں کھانا کھانے کے لئے گیا۔ اس نے ہوٹل کے منیجر سے پوچھا۔ "ایک روٹی کتنے میں دیتے ہو"

منیجر نے کہا۔ ایک آنے میں ایک روٹی۔

آدمی:۔ اور ترکاری بھاجی کتنے میں۔

منیجر:۔ ترکاری وغیرہ مفت۔

آدمی:۔ تو پھر مجھے ترکاری ہی دیدو۔

ماسٹر صاحب:۔ اچھا لڑکو بتاؤ، پانچ اور چار کتنے ہوتے ہیں۔

ایک لڑکا:۔ ماسٹر صاحب آٹھ ہوتے ہیں۔

ماسٹر صاحب:۔ (سر ہلاتے ہوئے) قریب قریب صحیح ہے۔



تحسین حامد

راجا رام موہن رائے

قوم کے رہنما یا لیڈر بادشاہ تو نہیں ہوتے۔ مگر ان کی بھی حکومت ہوتی ہے۔ بادشاہ کی حکومت کی بنیاد خوف اور ڈر پر ہوتی ہے۔ اور قومی رہنماؤں کی حکومت دل پر ہوتی ہے۔ یہ ہم کو ضرور جاننا چاہیے کہ وہ کس طرح دل پر حکومت کرتے ہیں۔ وہ کس طرح قوم کی کمزوریوں اور ان کی بیماریوں کو دور کرتے ہیں۔

راجا رام موہن رائے ہمارے ایسے ہی رہنماؤں میں سے ایک ہیں۔ آپ ۱۷۷۲ء میں بنگال کے ایک موضع رادھانگر میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں بنگالی پڑھنے کے بعد آپ نے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد سنسکرت پڑھنے کے لئے بنارس چلے گئے۔ بنارس سے جب آپ آئے تو خدا پرستی کے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے۔

رام موہن رائے اتنے ذہین تھے کہ ۱۶ سال کی عمر میں ہی انھوں نے ایک کتاب "مورتی پوجا" لکھ ڈالی۔ اس کتاب کے چھپتے ہی ان کے علم کا چرچا ہونے لگا۔ اس کتاب میں انھوں نے یہ لکھا کہ ہندو اپنے بزرگوں کے عبادت کے طریقوں کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اور غلط طرح سے پوجا پاٹ کرتے ہیں۔

ان کے والد صاحب پُرانے خیالات کے آدمی تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ رام موہن رائے نے ایک کتاب لکھکر لوگوں میں بیداری کا کام شروع کر دیا ہے تو وہ رام موہن رائے سے خفا ہوئے۔ چنانچہ رام موہن رائے گھر چھوڑ کر چلے گئے۔

پھر آپ تبت چلے گئے۔ وہاں سے بہت کچھ سیکھنے کے بعد پھر گھر واپس آ گئے۔ لیکن انکے باپ ان سے اس عرصے میں اور بھی ناراض ہو گئے تھے اس لئے کہ موہن رائے نے اس عرصے میں مذہبی رسومات کے خلاف اور بھی کئی مضامین لکھے تھے۔ لیکن چند سال کے بعد ان کے باپ کا انتقال ہو گیا اور ان کی ماں نے ان کو واپس بلا لیا۔

اب انھوں نے انگریزی سیکھ لی۔ اور چھ سال کے اندر انگریزی میں کافی مہارت بھی حاصل کر لی۔ ۱۸۰۰ء میں انھوں نے سرکاری ملازمت کر لی۔ اور کلکٹری میں اہلکار ہو گئے۔ مگر ملازمت بھی انھوں نے بڑی عزت سے کی۔ اُنکے افسر نے ان سے وعدہ کیا کہ اُن کو معمولی اہلکاروں کی طرح احکام لینے کے لئے حضوری میں کھڑا نہیں رکھا جائے گا۔ رفتہ رفتہ وہ اور ترقی کر گئے۔ لیکن پھر ۱۸۱۴ء میں انھوں نے ملازمت چھوڑ دی۔ اس لئے کہ انھوں نے سوچا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ کھلم کھلا اپنے خیالات کا پرچار کیا جائے۔ بس پھر کیا تھا۔ انھوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اور اسی زمانے میں انھوں نے ایک نیا فرقہ "برہمو سماج" قائم کیا۔ اس کے مطابق خدا سے برتر کے گیت گائے جا سکتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہی عبادت کا ایک ایسا طریقہ ہے جس میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب شریک ہو سکتے ہیں۔ آج بھی ان کے خیالات کے ماننے والے کافی تعداد میں بنگال میں موجود ہیں۔

موہن رائے کے زمانے میں ہندوؤں کے یہاں ایک بڑی بُری رسم تھی وہ یہ کہ جب کسی عورت کا شوہر مرجاتا اور اس کی لاش جلائی جاتی تو اس کی بیوی کو بھی زندہ آگ میں جھونک دیتے۔ اس رسم کا نام ستی تھا۔ رام موہن رائے نے اس رسم کے خلاف آواز اٹھائی آخر کار ان کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور یہ رسم قانونی طور پر ختم کر دی گئی۔

راجا رام موہن رائے کی خواہش یہ تھی کہ وہ یورپ جائیں۔ اور وہاں کے رہن سہن

کا مطالعہ کریں چنانچہ ۱۸۳۰ء میں ان کو انگلستان جانے کا ایک موقع مل گیا۔ اور یہیں ان کو راجا کا خطاب دیا گیا۔ انگلستان میں ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔

آخر ۱۸۳۳ء میں یہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ راجا رام موہن رائے تعلیمی کاموں سے بڑی دلچسپی لیتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کلکتہ میں ایک کالج قائم کیا۔ انھیں کی کوششوں سے عورتوں کی تعلیم کو بھی رواج ملا۔ رام موہن رائے جہاں قوم کے تعمیری کاموں میں دلچسپی لیتے تھے وہاں سیاست سے بھی انھیں دلچسپی تھی۔ اپنے مضامین میں وہ انگریزی حکومت پر بھی نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔

راجا رام موہن رائے بنگالی زبان کے شاعر بھی تھے۔ آج بھی ان کے گیت بنگال کے گھر گھر میں گائے جاتے ہیں۔ اور لوگوں کے دلوں میں اُن کی آج تک وہی عزت ہے جیسے پہلے تھی۔ نیک کام صدیوں تک زندہ رہتے ہیں اور قوم اپنے رہنماؤں کی خدمتوں کو کبھی نہیں بھلاتی اور ہمیشہ اپنے دلوں میں وہ جگہ دیتی ہے جیسے وہ مستحق ہیں۔

صفحہ ۲۹ کا بقیہ

کیوں ہیں؟ اور ان کے بیچ میں ایک سر گدھے کا کیوں ہے؟ کہتے ہیں کہ راون چاروں ویدوں کا عالم تھا لیکن اُس کے سر پر ہمیشہ شیطان سوار رہتا تھا۔ بس اسی بات کو دکھانے کے لیے راون کا بت اس طرح کا بنایا جاتا ہے۔

رام اور راون کی لڑائی تو دراصل اچھائی اور بُرائی کی لڑائی ہے جو ہمیشہ سے انسان کی زندگی میں ہوتی چلی آرہی ہے۔ بُرائی کتنا ہی زور کیوں نہ پکڑلے لیکن آخر میں فتح نیکی ہی کی ہوتی ہے۔ دسہرے کا تیوہار اسی بات کو دُہرانے کے لیے ہر سال منایا جاتا ہے۔

سید منیر الحسن

چکی کا کمال



سمندر کا پانی کھارا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہوا، کب ہوا؟ آئیے آپ سب کو ایک بہت مزیدار اور دلچسپ قصہ سنائیں۔ جس سے آپ کو اس کا جواب مل جائے گا۔

کہتے ہیں کہ ایک گاؤں میں دو دوست رہتے تھے۔ ان میں سے ایک دوست مالدار تھا اور دوسرا غریب اور کنگال۔ ایک بار کیا ہوا کہ گاؤں کے تمام لوگ ایک آنے والے تہوار کی خوشی میں پھولے نہیں سماتے تھے۔ اس کی تیاری بڑے زور شور سے کر رہے تھے۔ دوکانوں پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ لین دین کرنے والوں کی خوب چاندی ہو رہی تھی۔ اور ایک کے دس ہو رہے تھے۔ مالدار دوست بھی آنے والے تہوار کے دن گن رہا تھا اس نے اس تہوار کو منانے کے لئے ایک بڑا لمبا چوڑا پروگرام بنا رکھا تھا۔ کیوں نہ ہو یہ ان کا قومی تہوار تھا۔ اِدھر غریب دوست دانے دانے کو محتاج ہو رہا تھا۔ اس کے گھر میں کھانے کو دانہ تک نہ تھا۔ کہیں سے ملنے کی کچھ اُمید بھی نہ تھی۔ اس کا آخری سہارا اب صرف وہ مالدار دوست رہ گیا تھا۔ چنانچہ غریب دوست نے اُس کے یہاں جانے کا فیصلہ کیا۔

جب وہاں پہنچا تو مالدار دوست نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

اب تو وہ بہت پریشان ہوا اور اداس ہو کر گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں اسے ایک بوڑھا لکڑ ہارا ملا جو ایک بہت ہی بھاری گٹھا سر پر اٹھائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ اس غریب دوست کو اس طرح غمگین دیکھ کر بوڑھے نے ہمدردی سے پوچھا کہ "کیا بات ہے؟ تم پریشان کیوں ہو؟" غریب دوست نے اپنی ساری رام کہانی سنائی اور ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اب کیا ہوگا؟" بوڑھے لکڑ ہارے نے سمجھاتے ہوئے اور تسلی دیتے ہوئے کہا "تم گھبراؤ نہیں میرے ساتھ چلو میری تھوڑی سی مدد کر دو اور اس لکڑی کے گٹھے کو میرے گھر تک پہنچا دو۔ میں وہاں چل کر تم کو ایک ایسی چیز دوں گا جس کی مدد سے تم مالا مال ہو جاؤ گے۔"

غریب دوست نے لکڑیوں کا گٹھا سر پر رکھا اور بوڑھے لکڑ ہارے کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچ کر بوڑھے نے اسے حسب وعدہ کچھ مٹھائی دی اور کہا کہ تم اس کو لے کر اس "کچے" مکان کی طرف جاؤ جو جنگل میں ہے۔ اس مقام پر ایک غار ہے جس میں بہت سے بونے رہتے ہیں۔ ان کو یہ مٹھائی بہت پسند ہے۔ وہ کسی بھی قیمت پر اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے مگر تم اس کے بدلے میں روپیہ پیسہ نہ مانگنا بلکہ ان سے پتھر کی ایک چکی مانگ لینا۔ بعد میں اس چکی کے گن تم کو معلوم ہو جائیں گے۔ اس طرح جاؤ اور کوشش کرو شاید تمھاری قسمت کھل جائے۔ میں تو اب تک اس کو حاصل کرنے میں ناکام رہا ہوں۔"

بوڑھے لکڑ ہارے سے رخصت ہو کر غریب دوست اس جنگل میں پہنچا۔ وہاں جا کر اس نے دیکھا کہ واقعی بہت سے بونے ادھر ادھر آ جا رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ بونے ایک پیڑ کے تنے کو کھینچنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس کام میں ان کو بڑی مشکل ہو رہی ہے اس غریب دوست سے ان کی یہ مشکل دیکھی نہ رہا گیا۔ چنانچہ اس نے بونوں سے کہا کہ اس تنے کو میں تمھارے گھر تک پہنچائے دیتا ہوں۔ جب غریب دوست غار کے منہ پر پہنچا تو اس کو ایک باریک سی آواز سنائی دی۔ "مجھے بچائیے میں مر جاؤں گا۔" یہ آواز سن کر غریب دوست نے چاروں طرف دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے پاؤں کی انگلیوں کے بیچ میں ایک ننھا سا بونا

بوجھ کے مارے دبا جارہا ہے۔ تو اس کے اس بونے کو جھٹ سے اُٹھالیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بونوں کا شہزادہ ہے۔ اتنے میں کیا ہوا کہ بونوں کے شہزادے کی نگاہ اچانک اُس مٹھائی پر جا پڑی جو غریب دوست اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ بونوں کے شہزادے نے کہنا شروع کیا کہ ــــ "یہ مٹھائی تم ہمیں دے دو اور اس کے بدلے میں جتنا روپیہ اور ہیرے جواہرات چاہے لے لو" لیکن غریب دوست کو بوڑھے لکڑہارے کی بات یاد تھی۔ اس لئے اس نے مٹھائی کے بدلے پتھر کی چکّی مانگی۔ بونوں کے راجہ نے اپنے شہزادے یا راج کمار کی ضد پورا کرنے کے لئے غریب دوست سے مٹھائی لے کر چکّی اُسے دے دی اور کہا کہ ــــ "یہ ہماری حکومت کی سب سے اچھی اور قیمتی چیز ہے اس کا استعمال سوچ سمجھ کر کرنا۔ اور اس چکّی کو داہنی طرف گھماکر جو چیز چاہو مانگ لینا وہ اس سے نکلنا شروع ہو جائے گی۔ اور جب تک اُسے بائیں طرف نہ گھماؤ گے اس وقت تک برابر وہ چیز نکلتی رہے گی۔"

غریب دوست خوشی خوشی اس چکّی کو لے کر گھر آیا اور اپنے گھر والوں سے جو اُسکے انتظار میں بیٹھے گھڑیاں گن رہے تھے کہا کہ جلدی سے فرش پر چٹائی بچھاؤ۔ چٹائی بچھائی گئی اور اس پر وہ چکّی رکھدی گئی۔ چکّی کو رکھنے کے بعد غریب دوست نے اُسے داہنی طرف گھمایا اور کہا ــــ "چاول نکالو" اتنا کہنا تھا کہ چکّی چلنے لگی۔ اور چاولوں کے ڈھیر کے ڈھیر لگ گئے۔ اب اُس نے چکّی کو بائیں طرف گھمایا۔ تو وہ بند ہوگئی۔ اس کے بعد پھر اُس نے چکّی کو داہنی طرف گھماتے ہوئے کہا "مچھلی نکالو" چنانچہ مچھلی نکلنا شروع ہوگئی۔ جب مچھلی کافی تعداد میں نکل آئی۔ تو اُس نے چکّی کو بائیں طرف گھمایا اور وہ بند ہوگئی۔ اب کیا تھا۔ غریب دوست کو جس چیز کی ضرورت ہوتی وہ چکّی کے ذریعہ حاصل کر لیتا۔ اتنا تک ہوا کہ اُس نے چکّی کے ذریعہ مکان، گھر کا سامان، گودام، نوکر چاکر باغ غرض کہ عیش و آرام کی سب چیزیں مانگ لیں۔ اس کے بعد اس نے اپنے پڑوسیوں کی ایک بہت بڑی شاندار دعوت کی۔ اور اس طرح اپنے تیوہار کو خوب دھوم دھام اور شان شوکت کے ساتھ منایا۔

یہ حال دیکھ کر مال دار دوست سوچنے لگا کہ آخر یہ دو چار دن میں ہی یہ غریب اور کنگال آدمی اتنا مالدار کیسے بن گیا۔ اس میں ضرور کچھ نہ کچھ بھید ہے۔ اس کا پتہ لگانا چاہیئے۔ چنانچہ اس بات کا پتہ لگانے کے لئے چھپ کر دروازے کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ غریب دوست چکّی کو گھُما کر مٹھائی کے ٹوکروں پر ٹوکرے بھر رہا ہے اور انھیں مہمانوں کو دے رہا ہے۔ مالدار دوست نے دل میں سوچا کہ اس چکّی کو کسی نہ کسی طرح ضرور حاصل کرنا چاہیئے۔

چنانچہ ایک دن جب کہ سب لوگ گہری نیند کے مزے لے رہے تھے وہ گھر کے پیچھے والے حصّے سے گھُسا اور چکّی کو چُرا لایا۔ اور آتے ہی اپنے تمام گھر والوں اور ساز و سامان کو ساتھ لے کر ایک کشتی پر سوار ہو گیا اور کشتی میں اس چکّی کو بھی رکھ لیا۔ اور یہ سوچ کر چل پڑا کہ اس چکّی کے ذریعہ کروڑوں روپیہ کما کر خوب مالدار بن جاؤں گا۔ لیکن اپنی کشتی پر اور تو وہ اپنی ضرورت کی سب چیزیں لے آیا لیکن نمک لانا بھول گیا۔ اُس نے چکّی کو داہنی طرف چلا کر کہا —— "نمک نکالو، نمک نکالو" کہنے کی دیر تھی کہ چکّی سے ڈھیروں نمک نکلنے لگا۔ اب تو وہ بہت پریشان ہوا۔ تمام کشتی نمک سے بھر گئی اور بوجھ کے مارے ڈوبنے لگی۔ کشتی کے اِدھر اُدھر ہچکولے کھانے سے کشتی میں پانی بھی بھرنے لگا۔ اس کو چکّی کو بند کرنے کا طریقہ معلوم نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نمک کے بوجھ سے بے ایمان، چور اور بے رحم مالدار دوست کشتی سمیت سمندر میں ڈوب گیا۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ بس اُسی دن سے وہ چکّی برابر سمندر کی تہ میں چل رہی ہے۔ اور روزانہ ڈھیروں نمک اُگلتی چلی جا رہی ہے جس کی وجہ سے سمندر کا تمام پانی کھارا ہو گیا ہے اور اُس وقت تک رہے گا جب تک کہ یہ چکّی چلتی رہے گی۔

کافی یا قہوہ

آپ نے قہوے کا نام سنا ہوگا۔ اسے "کافی" بھی کہتے ہیں۔ یہ چائے کی طرح پی جاتی ہے۔ قہوہ سب سے زیادہ برازیل میں پیدا ہوتا ہے برازیل امریکہ میں ہے دنیا میں جتنا قہوہ بھی پیا جاتا ہے اس کی آدھے سے زیادہ پیداوار برازیل ہی میں ہوتی ہے۔

قہوہ کا رواج اب سے چار برس پہلے ہوا اور لندن میں ۱۶۳۲ء میں پہلا قہوہ خانہ کھلا۔ آئیے آج ہم آپ کو قہوے کی کہانی سنائیں۔

کہتے ہیں کہ عرب میں حاجی عمر نامی ایک صاحب گذرے ہیں۔ یہ بچارے بڑے نیک اور ایماندار آدمی تھے اور وہ یہی چاہتے تھے کہ اور لوگ بھی اُن کی طرح ہو جائیں مگر اُن کی بات کون سُنتا تھا۔ شہر کے حاکموں کا تو یہ حال تھا کہ وہ کھلّم کھلّا لوگوں سے رشوت لیتے تھے اور اگر کوئی کچھ کہتا تو اُس پر طرح طرح کے ظلم کرتے ہیں۔ حاجی عمر نے اپنی عادت کے مطابق ان کو بھی بری باتوں سے روکنا چاہا، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

حاکموں نے اُن کو جلا وطن کر دیا۔ بیچاروں کا کوئی ٹھکانہ تو تھا ہی نہیں، اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے رہے۔ کھانے پینے کا بھی کوئی سہارا نہ تھا۔ اُن کو اچانک ایک پیڑ پر بیر کی طرح کے چھوٹے چھوٹے پھل نظر آئے۔ انھیں بھوک تو لگ ہی رہی تھی جھٹ توڑ کر چبانا شروع کر دیا۔ یہ سخت اتنے تھے کہ چبائے نہ چبتے تھے حاجی عمر نے آگ جلا کر اُسے پانی میں ڈال کر اُبالا۔ اُبلنے کے بعد تو مت پوچھئے کہ کتنے مزے کے ہو گئے تھے۔ اور خوشبو بھی بڑی اچھی آنے لگی۔ مگر تھے اب بھی سخت۔ اب انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ اُن کو رات بھر پانی میں رکھا جائے۔ صبح سویرے اُٹھ کر اسے پھر ابالا تو وہ اتنے نرم ہو گئے تھے کہ اُن کو کھایا جا سکتا تھا اور مزے کی بات، تو یہ ہے کہ جس پانی میں ابالے گئے تھے وہ بھی بڑا مزے دار ہو گیا تھا۔ حاجی عمر پاس پڑوس کے اور لوگوں کو بھی لے آئے۔ اب تو جو پیتا ہے وہ تعریف کرتا ہے بس پھر کیا تھا بات کی بات میں سارے عرب میں اس پانی کو پینے کا رواج پھیل گیا اور پھر تو اس کا رواج اتنا بڑھا کہ اب یہ قہوہ ساری دنیا میں پیا جاتا ہے۔

حاجی عمر، اب تو سارے میں مشہور ہو گئے اس لئے کہ قہوہ کی دریافت کا سہرہ ان کے ہی سر تھا۔

جس گم نام جھاڑیوں کے سخت اور بد مزہ پھلوں کو انسان تو انسان جانور بھی نہ کھاتے تھے چند ہی روز میں اس کی مانگ اتنی بڑھی کہ اب ہزاروں آدمی اس کے ذریعے اپنا پیٹ پالتے ہیں، کوئی ان جھاڑیوں کو اگاتا ہے، کوئی ان بیروں کو چنتا ہے، کوئی ان کی تجارت کرتا ہے۔ غرض، اس سے دنیا بہت فائدہ اٹھا رہی ہے۔

خط و کتابت کرتے وقت اپنا پتہ پورا اور صاف لکھیں : منیجر

اسرار ندوی



ناتھو گئے پردیس

ہمارے گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ بہت ہی غریب تھا بے چارہ۔ بہت دنوں تک تو وہ دھن اور بچے دونوں ہی سے محروم رہا۔ آخر اس کی شادی ہوئی اور اس کے گھر ایک بہت خوبصورت اور تندرست لڑکا پیدا ہوا۔ کسان کے پڑوس میں ایک کا مبشور سنگھ رہتے تھے۔ کھاتے پیتے آدمی تھے۔ بہت موٹے تازے۔ ان کی بیوی بھی پکّی تول سے ڈھائی تین من سے کم نہ تھیں میری رانیں ان کی باہیں برابر تھیں۔ ہم لوگ ان کو "بھینس" کہا کرتے تھے۔ تھیں بھی واقعی بھینس۔ تن کالا من کالا۔ بہت بُرے دل کی۔ ہمارے کسان بھیّا کے یہاں لڑکا جو پیدا ہوا تو وہ جل مریں۔

کسان کا لڑکا جب پل کر جوان ہوا تو اس نے ایک روز اپنی ماں سے کہا — "ماں، کہیں سے تھوڑا آٹا لا کر دو ایک روٹیاں پکا دے میں کل پردیس جاؤں گا۔"

"ہمیں آٹا کون دے گا بیٹا؟"

"کیوں؟ کیا بھینس چاچی بھی نہ دے گی۔ پرسوں ہی یا ترسوں اس کے کھلیان میں سوا سو من گیہوں تلا ہے۔"

"اچھا بیٹا تو کہتا ہے تو جاتی ہوں۔"

تھوڑی دیر میں دھنیسری، "بھینس" کے ہاں سے آٹا لئے ہوئے آئی۔ روٹیاں پک گئیں۔ رات کو دال دلیا جو کچھ میسر آیا کھا پی کر سب سو گئے۔

دوسرے روز تڑکے تڑکے ناتھو تیار ہوگیا۔ جاتے وقت اس کی بھینس چاچی نے بھی اُسے ایک پوٹلی دی ___ "بیٹا اس میں لڈو ہیں۔ روکھی روٹی کیا اچھی لگے گی۔ اسے رکھ لے۔ راستہ میں کھانا۔"

ناتھو بہت دور تک سوچتا چلا گیا کہ بھینس چاچی نے آج اتنی بڑی سخاوت کیسے کی۔ پھر شہر، اونچے اونچے مکانات، اچھے اچھے کھانے، رنگ برنگے کپڑے، جھک جھک کرتی گاڑی وغیرہ کے خیال میں گم ہوگیا۔ وہ چلتا ہی چلا جا رہا تھا کہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ پیچھے سے آندھی آ رہی ہے۔ پلٹ کر جو دیکھا تو ایک خوفناک ہاتھی اسپر لپکا آ رہا ہے، وہ چیخ کر بھاگا اور فوراً ایک درخت پر چڑھ گیا۔ پوٹلی وہیں گر گئی۔ دم کے دم میں ہاتھی درخت کے نیچے تھا۔ اسے پوٹلی جو ملی تو تھوڑی دیر تک تو وہ اس سے کھیلتا رہا

پھر کپڑے کو پھاڑ کر ساری روٹیاں اور لڈو اس نے ایک ہی مرتبہ منہ میں رکھ لیا۔ اس تر نوالے کا پیٹ میں اُترنا تھا کہ ہاتھی لگا چنگھاڑنے۔ پھر وہ دیکھتے دیکھتے چکرا کے گر پڑا اور وہیں ڈھیر ہوگیا۔

ناتھو کے جب حوس درست ہوئے تو اس نے پاس کے گاؤں میں ایک ڈگی پیٹنے والے کی آواز سُنی: "ملک خدا کا حکم راجہ بہادر کا، آگاہ ہو کہ راجہ کا ایک ہاتھی پاگل ہوگیا ہے۔ جو کوئی اسے مار ڈالے گا اسے اچھی لڑکی اور انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا جائے گا۔

یہ سنتے ہی وہ جھٹ درخت سے کود ہاتھی پر چڑھ بیٹھا اور لگا غل مچانے ___ "میں نے ہاتھی مارا۔ میں نے ہاتھی مارا۔ دوڑو، دوڑو" پاس کے دیہات سے آدمیوں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ سب نے شاباشی دی اور اسے راجہ کے دربار میں لے گئے۔ راجہ نے اٹھ کر ناتھو سے ہاتھ ملایا اور کافی انعام و اکرام اور "ہاتھی مار" کا خطاب دیا۔ وہ راجہ کا خاص محافظ بنایا گیا ___ ناتھو کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔

——— ۰:(۲):۰ ———

کچھ دنوں بعد ——— ایک روز راجہ کو شکار کی سوجھی "ہاتھی مار" کو تیاری کا حکم ہوا۔ راجہ کا حکم تھا۔ اس کو تیار ہونا ہی پڑا۔ راجہ کے اصطبل میں جو گھوڑا سب سے زیادہ دبلا پتلا اور مریل سا تھا اسی کو اس نے اپنے لئے چنا۔ سب لوگ چلے۔ "ہاتھی مار" کا گھوڑا غضب کا راہوار نکلا۔ ذرا سی دیر میں ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ سارے گھوڑے پیچھے رہ گئے۔ کوئی اس کی گرد کو بھی نہ پا سکا۔ وہ دوڑاتا ہوا ایک جنگل میں گھسا۔ ہنہناتا، قدم پھینکتا، گرد اُڑاتا چلا جا رہا تھا۔ کہ سامنے کے ٹیلے پر ایک بڑا جنگلی قسم کا شیر دکھائی دیا۔ ہاتھی مار نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کے روکا۔ اور جھٹ کود کر بمع برچھے کے ساتھ ایک پیڑ پر چڑھ گیا۔ راجہ کی سواری کا سدھایا ہوا گھوڑا تھا وہ بھی فوراً ایک جھاڑی میں جا چھپا۔

شیر تیر کی طرح سیدھا پیڑ کے نیچے پہنچا اور لگا ڈکارنے۔ ہاتھی مار کی سٹی بھول گئی۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے کو سنبھالا۔ اسے بڑے مزے کی ایک ترکیب سوجھ گئی۔ شیر منہ پھاڑے اس طرف غرّا رہا تھا۔ "ہاتھی مار" نے اپنے لمبے برچھے کو ہاتھ میں لے کر تولا اور نشانہ کر کے ایسا گرایا کہ اس کی انی شیر کے حلق میں پیوست ہو گئی۔ برچھے کی ڈانڈ جوں جوں درختوں، ٹیلوں اور جھاڑیوں سے ٹھوکریں کھاتی اس کی انی اور بھی پیوست ہوتی جاتی۔ کچھ ہی دیر میں جنگل کے بادشاہ چپ بول گئے۔

"ہاتھی مار" کو جب شیر کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو وہ درخت سے اُترا اور مزید اطمینان کر کے ایک پاؤں شیر پر ٹکا کے ساتھیوں کا انتظار کرنے لگا۔ راجہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ آپہنچا۔ اس نے جو یہ ماجرا دیکھا تو حیرت میں آگیا۔ گھوڑے سے کود کر ہاتھی مار کی پیٹھ ٹھوکی ——— شکار ہو ہی چکا تھا سب لوگ واپس گئے۔ ہاتھی مار کی بہادری کی دھاک جم گئی۔ وہ سونے کا نوالہ کھانے لگا۔

——— ۰:(۳):۰ ———

"ہاتھی مار چین کی بنسری بجا رہے تھے کہ ایک روز خبر آئی کہ رسلپت نگر کا راجہ کافی ہاتھی گھوڑے کے ساتھ چڑھائی کرنے کے لئے چلا آرہا ہے۔ راجہ کی فوج، جیسی چاہیئے تیار نہ تھی۔ اس نے

"ہاتھی مار" سے مدد چاہی۔ بے چارہ بُرا پھنسا ــــ "ہاں" اور "نہیں" دونوں خطرناک ــــ پھر کچھ سوچ کر بولا ــــ "مہاراج رات کی مہلت دی جائے۔ کل صبح روانہ ہونگا۔ فوج کو حکم دیدیں کہ تیار رہے۔"

دوسرے روز بہت سویرے ساری فوج ایک قطار میں کھڑی تھی۔ ہاتھی مار بہادر گھوڑے پر سوار ہر ہر سپاہی کو ایک ایک گولی تقسیم کر رہے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ یہ ابھی کھالی جائے۔ فوج روانہ ہوئی۔ کچھ دُور جانے کے بعد سپاہی کے پیٹ میں درد اور اینٹھن ہونے لگی۔ ذرا دور چلتے اور سب کے سب پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ پھر چلتے اور پھر بیٹھ جاتے۔ اسی طرح اٹھتے بیٹھتے چلے جا رہے تھے۔ سِلپت نگر کی فوج نے جو یہ منظر دیکھا تو بہت گھبرائی۔ اسکے سپاہی سوچنے لگے کہ یہ سپاہی تو بڑے بہادر معلوم ہوتے ہیں۔ میلوں سے ڈنڈ کثرت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان لوگوں سے لڑنا موت کے منہ میں جانا ہے۔ پھر ہم کیوں جانیں دیں۔ یہ بات دماغ میں آئی تھی کہ سب کے سب نے گھوڑے کی باگیں الٹی طرف موڑ دیں منٹوں کے منٹ میں میدان صاف تھا ــــ ہاتھی مار بہادر زندہ باد!۔

راجہ نے ہاتھی مار کو گود میں اٹھا لیا اور اپنے گلے کا قیمتی ہار اور اپنی جڑاؤ تلوار اس کو انعام میں دی۔ وہ راجہ کی آنکھ کا تارا بن گیا۔ اب وہ شاہی دسترخوان پر کھانا کھانے لگا۔

ــــ ٭٭(۴)٭٭ ــــ

سِلپت نگر کا راجا بڑا ضدی تھا۔ کچھ دنوں بعد اس نے پھر ایک زبردست فوج روانہ کی۔ اس خبر سے یہاں پھر کھلبلی مچ گئی۔ راجا کے پیٹ میں چوہے چھوٹنے لگے۔ راجا پرجا سبھی نے ہاتھی مار بہادر سے درخواست کی۔ ہاتھی مار نے بڑی بے پروائی سے کہا ــــ "مہاراج! آپ جاکر آرام کریں۔ میں کل ان کے دانت کھٹے کر دوں گا۔ فوج کو حکم دیدیں کہ رات کو آرام کرلے اور کل پو پھٹے سے پہلے کمیل کانٹے سے لیس ہوکر میرا انتظار کرے۔"

ہاتھی مار ہانک تو گیا لیکن اپنی جگہ پر آکر سوچنے لگا ــــ "خاک ایسی زندگی پر کم بخت روز روز جان جوکھم کی باری۔ راجا خود تو محل میں موج کرتا ہے اور ہمیں مرنے کے لئے بھیج دیتا ہے

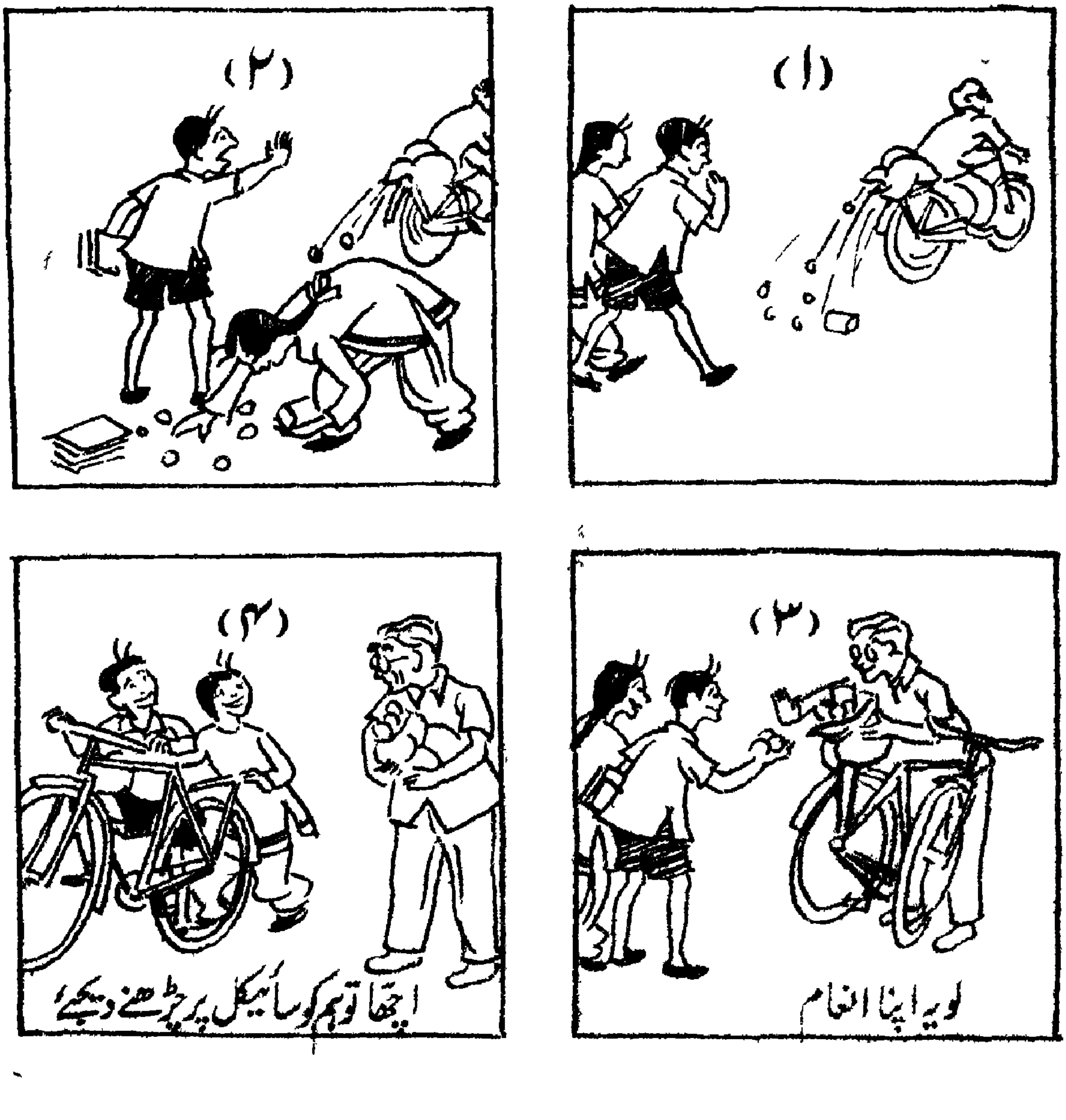
جیسے سپاہی گھرے فاضل ہوں۔ کیوں نہ آج ہی کی رات گھر بھاگ چلوں" وہ دُن سے اٹھا اور سیدھا اپنے اصطبل میں چلا گیا۔ وہاں سے ایک تیز رفتار گھوڑا لے آیا۔ سارے کپڑے لتے، انعام اکرام، روپے پیسے، تیر و تبر، شمشیر و کٹار ایک بڑے سے فوجی تھیلے میں رکھ کے اپنے ساتھ گھوڑے پر رکھ لیا۔

رات بہت تاریک تھی۔ گز دو گز کی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ گھوڑا قدم مارتا چلا جا رہا تھا۔ ایک ندی ملی۔ ندی پر لوہے کا پل تھا۔ بیچ پل پر گھوڑا یکایک بھڑکا۔ تھیلا ندی میں ایک خوفناک آواز کے ساتھ گرا۔ گھوڑا بڑے زور سے ہنہنایا۔ اس کی کنوتیاں کھڑی تھیں۔ اس نے کئی ٹاپیں پل پر ایسی ماریں کہ سارا بن لرزا ٹھا۔ پل کے اُس طرف سلپت نگر کی فوج پڑاؤ ڈالے تھی۔ رات کے سناٹے میں، وزنی تھیلے کے ندی میں گرنے، گھوڑے کے ہنہنانے اور ٹاپوں کی گونج نے مل جل کر ایک ہیبت ناک آواز پیدا کر دی سلپت نگر کے سپاہی نیند کے ماتے تو تھے ہی سمجھے دشمن کی فوج نے دھاوا بول دیا۔ لگے آپس ہی میں تلواریں چلانے۔ ساری رات تلواریں چلتی رہیں۔ صبح ہونے کو آئی تاریکی نے اپنا ڈیرہ اٹھایا۔ یکایک بچے ہوئے سپاہیوں کی نظر ہاتھی مار پر پڑی۔ وہ اس کو دیکھتے ہی سر پر پاؤں رکھ کے بھاگے۔

ہاتھی مار نے میدان مار لیا تھا فوراً گھوڑے سے کود پڑا اور خون میں لت پت ایک تلوار اٹھائی، کپڑوں اور چہرے پر خون کے دھبے لگائے، اور محل کی طرف پلٹ پڑا۔ فوج اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس کو جو فتح کی خبر معلوم ہوئی تو اتنے زور سے "زندہ باد" کے نعرے لگائے کہ آسمان تک آواز پہنچی۔ بادشاہ کی خوشی کی حد نہ تھی۔ اس نے اپنا آدھا راج ہاتھی مار کو دیدیا اور اپنی بیٹی سے اس کی شادی کر دی۔

کچھ دنوں بعد ہاتھی مار نے اپنے ماں، باپ کو بھی بلا لیا۔ انقلاب آنے کو ہوتا ہے تو دیر نہیں لگتی۔ بے چاری "بھینس" ان دنوں بڑے بُرے حال میں تھی۔ چلتے وقت ناتھو کی ماں، باپ کو ترس آ گیا۔ وہ اس کو بھی لیتے آئے۔ ناتھو نے "بھینس" کو بھی بڑی عزت سے رکھا۔

کالو مینا کی کہانی



بچوں کی کوششیں



ابتدائی سوم

ہمارے درجے میں ۳۲ لڑکے لڑکیاں تھیں۔ ہمارے اُستاد کا نام سیّد حسن صاحب ہے۔ یہ بہت اچھے استاد ہیں۔ ہماری جماعت کا کھیل پروجکٹ تھا۔ سب نے بڑی محنت سے کام کیا تھا۔ البم بنائے تھے۔ کھیل اور کھلاڑیوں کی اچھی اچھی تصویریں جمع کی تھیں۔ اور ہم لوگوں نے پھول بنائے تھے۔ البم بھی بنائے تھے۔ ہماری جماعت میں پانچ لڑکے تبت کے رہنے والے تھے۔ ہم نے اپنے کاموں کے چارٹ بھی بنائے تھے۔ ان سب چیزوں کی ہم نے نمائش بھی کی تھی۔ سب لوگ کو آنے کی دعوت بھی دی ۔ سب لوگ ہمارا کام دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور بہت سے بچوں کو انعام دیا۔ جب سالانہ امتحان ہوا تو سب لوگوں نے بڑی محنت کی تھی۔ امتحان سیّد حسن صاحب نے لیا تھا جب امتحان ختم ہوا تو ہمارے درجے کے سب لڑکے پاس ہوگئے۔ ہماری بورڈنگ کا نام محمود منزل تھا اور ہماری اتالیق نجمہ سلطان صاحبہ تھیں اور بورڈنگ کے سب لڑکے پاس ہوگئے۔ اوّل محمد ہاشم صاحب آئے۔ دوم سیّد ستار شاہ صاحب۔ سوم محمد عمر صاحب اور محمد رمضان صاحب چہارم۔

سیّد ستار شاہ، جامعہ نگر عمر ۱۱ سال۔ حیدرآباد۔ دکن

پنسل

(ایک سچا واقعہ)

ایک دن کا واقعہ ہے۔ اسکول میں لڑکے پڑھ رہے تھے۔ ناشتہ کرنے کی چھٹی ہوئی۔ لڑکے ناشتہ کے بعد کپڑے اُتار اُتار کر کھیلنے لگے اچانک ایک لڑکا سب کی نظر بچا کر نکلا اور جہاں پر لڑکوں کے کپڑے رکھے تھے پہنچا۔ جیب ٹٹولنے لگا۔ اتفاق سے ایک بڑی سی سبز رنگ کی پنسل مل گئی۔ اس نے اس کو لے لیا اور کہیں چھپا کر رکھ دیا۔ اور لڑکوں میں آ شامل ہو گیا۔ گھنٹی بجی۔ سب لڑکے اپنے اپنے کپڑے پہننے لگے اس وقت جلدی میں کسی کو کچھ محسوس نہیں ہوا۔ سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

جب اُستاد نے بچے لکھوانا شروع کیا تو سب لڑکے اپنی اپنی پنسل اور کاپی تلاش کرنے لگے۔ ایک لڑکا ہکا بکا رہ گیا۔ استاد نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس کی پنسل کھو گئی۔ اس نے میدان میں جا کر تلاش کیا، نہیں ملی۔ لڑکوں سے دریافت کیا گیا [illegible] پتہ نہ چلا۔ آخر ماسٹر صاحب نے اس لڑکے کو [illegible] لیا۔ وہ لڑکا جس نے چوری کی تھی اپنے آپ پر ملامت کر رہا تھا کہ میں نے چوری کیوں کی۔ وہ شرم کے مارے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ چھٹی ہوئی تو پنسل لے کر چلا آیا۔ اس وقت سے اس کے لئے اُٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہر چیز اسے ملامت کر رہی ہے۔ دو ایک روز تک یہی حالت رہی۔ رفتہ رفتہ وہ اس واقعہ کو بھول گیا۔ لیکن پھر بھی تنہائی میں اپنی زندگی کے کاموں پر غور کرتا ہے تو اسے پھر وہ چوری یاد آجاتی ہے اور اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اس پنسل سے کیسے چھٹکارا پایا جائے۔ اسکے ہر کام میں اور ہر وقت وہ پنسل سامنے آتی۔ اور ملامت کرتی۔ اسے ہر طرف پنسل ہی پنسل نظر آرہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے لئے ایک قدم بھی چلنا مشکل ہو گیا۔ اس کی ندامت بہت بڑھ گئی۔ آخر وہ پنسل لے کر اپنے ساتھی کے گھر کی طرف چل پڑا۔ اس کا ساتھی دروازہ پر بیٹھا تھا۔ اس نے اس کے چہرے کو دیکھا تو گھبرا کر پوچھا کہو دوست خیریت تو ہے۔ اتنا پوچھنا تھا کہ اس کی آنکھ سے آنسو کے قطرے ٹپ ٹپ گرنا شروع ہو گئے۔ ہاتھ سے پنسل زمین پر گر پڑی۔ اس کے منہ سے صرف ایک آواز نکلی "معاف کر دو اور پنسل سے سب

حقیقت پوچھ لو۔"

بہت دن ہو گئے، آج بھی جب اسے چوری کا خیال آتا ہے تو شرمندگی معلوم ہوتی ہے لیکن جب معافی مانگ لینے کا خیال آتا ہے تو شرمندگی ماند پڑ جاتی ہے۔

محمد رفیق مظفر پور

انگوٹھی کی چوری

کریم اور رحیم دونوں ایک ہی درجے میں پڑھتے تھے۔ ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ اس وجہ سے دونوں میں بڑی دوستی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو خوب پہچانتے تھے۔ ایک روز کریم بازار سے اپنے لئے انگوٹھی لایا۔ رحیم کو بھی وہ انگوٹھی بہت پسند آئی۔ اس نے اس کی بہت تعریف کی۔ کریم سمجھ گیا کہ اتنی تعریف خطرہ سے خالی نہیں۔ رحیم کی نیت میں بدی آئی۔ کریم کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے رحیم کو دکھا کر ایک ڈبہ میں انگوٹھی بند کر دی۔ رحیم کسی کام سے بازار گیا۔ کریم نے ڈبیہ سے انگوٹھی نکال لی اور کاغذ پر لکھ کر رکھ دیا۔ "چوری کرنا بری بات ہے۔" میاں رحیم پاؤں دبا کر کمرے میں داخل ہوئے اور کریم کو سویا ہوا پا کر جھٹ ڈبہ کھول کر ہاتھ ڈالدیا۔ لیکن اس میں انگوٹھی کے بجائے ایک کاغذ نکلا جس کو پڑھ کر وہ بہت شرمندہ ہوا اور اس نے کریم سے معافی مانگی۔

سید ممتاز۔ ہسپورہ

گرما گرم جامن

ایک دن ایک بھکارن کا کسی جنگل سے گزر ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ایک گڈریا اپنی بھیڑ بکریوں کو چرا رہا ہے۔ بھکارن کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے گڈریے سے کہا "بھائی گڈریے میں بہت بھوکی ہوں۔" گڈریے نے کہا "اچھا میں تمھیں جامن لاکر دیتا ہوں۔"

مگر یہ گڈریا ذرا مذاقیہ آدمی تھا اُس نے پیڑ پر چڑھ کر کہا "ارے بڑی بی کیسی جامن کھاؤ گی۔ ٹھنڈی یا گرما گرم۔"

بھکارن نے کہا کہ "اگر گرما گرم جامن ملیں تو پھر ٹھنڈی کون کھائیگا اسلئے مجھے گرما گرم جامن ہی دینا"

اب گڈریے نے اوپر سے جامنیں گرانی شروع کر دیں۔ جیسے ہی جامن زمین پر گرتی بھکارن اسے اٹھالیتی اور پھونک کر اس کی گرد جھاڑ کر کھا لیتی۔

جامن کھاتے کھاتے بھکارن نے کہا "ارے بھائی یہ جامن تو گرم نہیں ہے۔"

گڈریے نے ہنس کر کہا "اگر جامن گرم نہیں ہے

سلمیٰ کاظمی



چالاک سپاہی

بہت زمانہ گزرا۔ ایک گاؤں میں ایک غریب سپاہی رہتا تھا۔ اس کے صرف ایک بیوی تھی بال بچہ کوئی تھا نہیں۔ مگر پھر بھی اُن کا گزارا بہت مشکل سے ہوتا تھا۔ آخر ایک دن مفلسی سے تنگ آکر اُس نے اپنے دل میں ٹھانی کہ چلو شہر میں نوکری تلاش کریں اور کچھ کما کر لائیں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں کل صبح شہر جاؤں گا۔ تم میرے لئے کھانا تیار کر دینا خیر صاحب دوسرے دن باجرے کی دو موٹی موٹی روٹیاں اور ایک پیاز کی گانٹھ سپاہی کے ساتھ کر دی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ سپاہی میاں شہر سے سو روپے کما کر لائے۔ جب وہ ستانے کے لئے بیٹھے تو وہاں ایک اندھا فقیر بھی آرام کر رہا تھا۔ فقیر کو جب معلوم ہوا کہ وہ مسافر ہے اور شہر میں رہ کمانے کے بعد اب واپس گاؤں جا رہا ہے تو اس نے کہا "آؤ بیٹھو بھیا" تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد اندھے نے پوچھا "کہو بھائی کیا کما کر لائے" سپاہی نے کہا "کچھ نہیں سو روپے لایا ہوں" اندھے میاں نے کہا: "اچھا سو روپے لائے ہو۔ بھائی میں نے آج تک سو روپے نہیں دیکھے۔

بس ہاتھ میں لے کر دیکھ لوں "سپاہی کو بڑا رحم آیا، اس نے دے دیئے۔

تھوڑی دیر تک تو وہ اِدھر اُدھر کرکے اُلٹ پلٹ کرکے دیکھتے رہے۔ پھر چپکے سے ان کو جیب میں رکھ لیا اور باتیں کرنے لگے۔ سپاہی بھی تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ "اچھا اب میں چلا" اندھے نے جواب دیا۔ "میاں شوق سے جاؤ اب دیر بھی ہو گئی ہے"۔ سپاہی سمجھا کہ یہ بھول گئے ہیں اس لئے چپکے سے پھر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر کہا "اچھا جی اب میں چلا" اندھے نے کہا۔ "ارے بھائی تو ابھی تک گیا نہیں جا بھائی تیرے بال بچے یاد کرتے ہوں گے"۔ اب سپاہی ضبط نہ کر سکا اور دبی آواز میں بولا "جی وہ میرے روپے کہاں گئے"۔ اب تو فقیر میاں چونکتے ہوئے کہنے لگے "کیسے کون سے روپے تو نے دیئے تھے"۔ سپاہی نے کہا "اجی وہی جو آپ نے دیکھنے کو مانگے تھے"۔ اب تو اندھے صاحب خوب زوروں میں چلائے کہ دیکھو یہ مجھے چور بناتا ہے۔ ان کا شور سن کر بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ فقیر میاں برابر کہے جا رہے تھے کہ یہ مجھے چور بناتا ہے۔

اب تو سپاہی میاں کی مصیبت آگئی اُن پر چاروں طرف سے لعن طعن پڑنے لگیں خیر تھوڑی دیر میں سب لوگ چلے گئے۔ سپاہی میاں کو بڑا غصہ تھا۔ اُنھوں نے سوچا کہ اندھے سے نہ بدلہ لیا تو کچھ نہ کیا۔ وہ ایک جھاڑی میں چھپ گیا۔ اور دیکھنے لگا کہ یہ کس وقت کہاں جاتا ہے۔

شام کے وقت فقیر میاں اُٹھے۔ اور جب اچھی طرح یقین ہو گیا کہ یہاں کوئی نہیں تو پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے وہاں سے چل پڑے سپاہی میاں بھی پیچھے پیچھے چل پڑے۔ چلتے چلتے یہ ایک مسجد کے پاس پہنچے۔ اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے۔ پہلے تو فقیر میاں نے اِدھر اُدھر ٹٹولا کہ کوئی ہے تو نہیں جب انھیں پورا اطمینان ہو گیا تو ایک پتھر اٹھایا اور اس میں وہ روپے رکھ دیئے۔ اور پھر کسی کام کے لئے باہر چلے گئے۔ سپاہی چپکے سے اٹھا اور اس نے پتھر ہٹا کر سارے روپے اور اشرفیاں وغیرہ نکال لیں۔ اور پتھر اسی طرح رکھ دیا تھوڑی دیر بعد فقیر آیا انھوں نے آتے ہی سب سے پہلے پتھر کو ہٹا کر روپے دیکھے، ہاتھ ڈال کر جو

ٹٹولا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بس صاحب پھر کیا تھا انھوں نے اپنے داڑھی کے بال نوچنے شروع کر دیئے اور خوب چیخنا چلّانا شروع کر دیا۔ ان کا شور غل سُن کر دوسرے اندھے تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کالے رنگ کی لاٹھی تھی۔ آتے ہی پوچھا کہ "ارے بھائی کیا ہوا" پہلے اندھے نے جواب دیا "ارے بھائی میں تو لُٹ گیا۔ کسی چور نے میری ساری پونجی اُڑالی" دوسرے اندھے نے کہا "میاں تم تو بڑے بے وقوف ہو۔ مجھے دیکھو میں نے اپنی ساری پونجی اس لاٹھی میں رکھ رکھی ہے یہ اندر سے کھوکھلی ہے اور اوپر سے لے کر نیچے تک اشرفیوں سے بھری ہوئی ہے" پہلے فقیر نے کہا کہ "بھائی مجھے دکھانا میں بھی تو دیکھوں یہ کیسی ہے" دوسرے اندھے نے دے دی۔ سپاہی نے بیچ ہی میں اُسے غائب کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد پہلا اندھا بولا۔ "کیوں بھائی دیا نہیں۔ کیا مجھ پر اعتماد نہیں" دوسرے اندھے نے جواب دیا "ارے بھیا میں تو تم کو دے چکا ہوں۔ مجھ سے تم چالاکی کرتے ہو۔ میں ابھی جاکر کہتا ہوں" اب پہلا انھیں کھلائے مگر کسی کو یقین نہیں آتا تھا۔ دونوں میں خوب تُو تُو میں میں ہوئی۔ ان کی آواز سُن کر ایک تیسرے اندھے صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے دونوں کی باتیں سُنیں تو خوب زور سے ہنسنے کہنے لگے۔ "تم دونوں بالکل بے وقوف ہو مجھے دیکھو یہ بنڈی جو میں نے پہن رکھی ہے یہ اوپر سے لے کر نیچے تک اشرفیوں سے بھری ہوئی ہے میں اس کو ایک منٹ کے لئے بھی اپنے جسم پر سے الگ نہیں کرتا۔ سوتے وقت بھی اسے پہن کر سوتا ہوں" سپاہی میاں سب کچھ سُن رہے تھے۔ جب تیسرے اندھے صاحب چلنے لگے تو یہ بھی دبے پاؤں اُن کے پیچھے ہو لیا اور اس کا گھر دیکھ لیا۔

اگلے دن سپاہی نے حلوائی سے بہت ہی مزیدار حلوا بنوایا۔ اور اندھے فقیر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندھے میاں نے اُٹھ کر دروازہ کھولکر پوچھا "کون ہے" سپاہی نے جواب دیا "میں فرشتہ ہوں مجھے اللہ میاں نے بھیجا ہے اور مجھ سے کہا ہے کہ میرے نیک بندے کے لئے یہ جنت کا حلوا لے جاؤ" اب تو فقیر صاحب بہت خوش ہوئے۔ اُس کے تو خواب و خیال میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ خیر صاحب

انھوں نے جلدی جلدی سارا حلوا چٹ کرلیا۔ چلتے وقت سپاہی نے کہا "دیکھو کسی سے اس بات کا ذکر نہ کرنا ورنہ یہ آنا بند ہو جائے گا اور خدا تم پر عتاب نازل کرے گا۔ فقیر نے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے نہیں کہے گا۔

اب اندھے میاں جس چیز کی فرمائش کرتے دوسرے دن وہ حاضر ہو جاتی۔ جب سپاہی میاں کو یقین ہو گیا کہ اب بڑے میاں اچھی طرح دھوکے میں آچکے ہیں تو ایک دن وہ ایک گدھا۔ ایک جوڑی کپڑے جس پر خوب عطر لگا تھا۔ اندھے میاں کے پاس لے گیا اور کہا کہ آج آپ کو اللہ میاں نے ساتویں آسمان پر بلایا ہے۔ اب آپ وضو کرکے اور یہ کپڑے پہن لیجئے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی چیز اُوپر تک نہیں جا سکتی۔ اب اندھے میاں کو بڑی پریشانی ہوئی کہنے لگے یہ تو میرے باپ دادا کے زمانے کی ہے اس کو میرے باپ نے خاص طور پر ...ے دی تھی اور ہدایت کی تھی کہ کبھی مت ...رنا" سپاہی نے کہا کہ "اچھا کوئی بات ... وہاں چل کر دیکھ لیا جائے گا" فقیر میاں ... ادھر کر کپڑے بدلے اور سپاہی کے پاس آئے سپاہی نے کہا کہ "جناب اب آپ یہ منہ پر لگا لیجئے یہ خاص جنت کی چیز ہے" فقیر نے کہا "سبحان اللہ کیا خوشبو ہے" اور خوب منہ پر ملی۔ تیار ہو کر چل دیئے۔ سپاہی ان کو ایک کنوئیں پر لائے اور ایک چکر دیکر کہنے لگے۔ پہلا آسمان اس طرح دو چکر دے کر کہنے لگے تیسرا آسمان۔ بس صاحب یہاں سے میں چلا اب میں آگے نہیں جا سکتا آپ اپنی ہنڈی یہاں اُتار کر رکھ دیجئے جب آپ واپس آئیے گا تو آپ کو مل جائیگی۔ اور دیکھئے چھٹے آسمان پر آپ کو شیطان وغیرہ ملیں گے وہ آپ کو بہت چھیڑیں گے مگر آپ صرف کلمہ پڑھتے جائیے گا" اور انھوں نے گدھے کا منہ بستی کی طرف موڑ اور خود ہنڈی لے کر یہ جا وہ جا۔

صبح ہوئی تو بچوں نے ان کی خوب مرمت کی مگر یہ کلمہ پڑھتے رہے۔ اب بھی جب کبھی ان کو ہنڈی کا خیال آتا ہے تو کلیجہ تھام کر رہ جاتے ہیں۔

ادھر سپاہی صاحب نے سو روپیوں کے بجائے کتنے روپے پائے۔

سلمیٰ کاظمی

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں

۵۰ روپے کے نقد انعامات

فیس داخلہ فی حل ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں اور پانچ حلوں کی فیس ۴ آنے

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر مبلغ ۳۰ روپے دوسرا انعام ایک غلطی پر ۲۰ روپے

حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۱۰ نومبر ۱۹۵۳ء

پیامی معمّا نمبر ۲۶

پ	و	ھ	۱ د
	■	کھ	۲ د
ی	ر		۳ ا
ت		ح	۴ م
	ن		۵ ن
	ت		۶ م

۱۔ گرمی میں اس کی زیادتی۔ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے (دھوپ۔ دھول)

۲۔ یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے دن جلدی گذر جاتے ہیں (سکھ۔ دکھ)

۳۔ ایک بڑا براعظم۔ (امریکہ۔ افریقہ)

۴۔ اس سے بڑے بڑے کام نکالے جا سکتے ہیں۔ (محبت۔ محنت)

۵۔ اس کے بغیر کھاتا کیا؟ (نون۔ نان)

۶۔ بہادر اور مستقل مزاج آدمی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سے نہیں ڈرتے! (موت۔ مات)

پیامی معمّا نمبر ۲۶

نام ....

پتہ ....

پیامی معمّا نمبر ۲۶

نام ....

پتہ ....

پیامی معمّا بھیجنے کا پتہ

پیامی معمّا نمبر ۲۶، ماہنامہ "پیام تعلیم" جامعہ نگر
نئی دہلی




پیام تعلیم



مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی
آپ کے متعلق اسی پرچے میں مضمون پڑھئے

ماہنامہ

پیام تعلیم

ادارہ
حامد علی خاں بی۔ اے (جامعہ)
اطہر پرویز ایم۔ اے (علیگ)

فہرست



سالانہ چندہ ۴ روپے
فی پرچہ ۶ آنے
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی



بچوں سے باتیں

آج پیامِ تعلیم کا نومبر کا پرچہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ کو اس کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ہمیں یقین ہے کہ اب پرچہ برابر وقت پر شائع ہوتا رہے گا۔ ہم نے پچھلے پرچے بڑی جلدی میں نکالے ہیں لیکن مضامین کا معیار پہلے کی بہ نسبت اور بھی اچھا کر دیا ہے اور یہ سلسلہ آگے بھی قائم رہے گا۔

جامعہ کے تعلیمی میلے کی دھوم دھام بڑے زوروں پر ہے۔ ہر ایک اپنے کام میں لگا ہوا ہے۔ جس وقت یہ پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہوگا، میلا ہو رہا ہوگا اور آپ کا پیامِ تعلیم روزنامے کی شکل میں نکل رہا ہوگا۔ پچھلی بار میلے میں مکتبہ کی دکان تھی۔ اس بار دکان کے علاوہ مکتبے کے کاموں کی نمائش بھی ہوگی۔ جس کو دیکھ کر سب کاموں کا صحیح طور پر اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس میں ہماری چھپی ہوئی کتابیں ہوں گی، اور جو کتابیں ہم چھاپنا چاہتے ہیں ان کے مسوّدے بھی ہوں گے۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف نقشوں اور چارٹوں کے ذریعے مکتبے کی کارگزاری کا حال بھی دکھایا جائے گا۔

ہم یہ کوشش بھی کر رہے ہیں کہ نمائش دیکھنے والوں کو یہ بھی بتا سکیں کہ کتاب آپ کے ہاتھ میں پہنچنے سے پہلے کن کن منزلوں سے گزرتی ہے۔

ہمیں یہ لکھتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ بیگم صالحہ عابد حسین صاحبہ ۲۵ اکتوبر کو بخیر و عافیت دلی واپس آگئی ہیں۔ آپ پچھلے ۶ ماہ سے یورپ کی سیر کر رہی تھیں۔ ہم ادارے کی جانب سے ان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

ہم نے پچھلے پرچے میں لکھا تھا کہ مکتبے میں بچوں کی کتابوں کی تیاری کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ اسی سلسلہ میں ۷ اکتوبر کو دہلی کے مشہور آرٹسٹ مسٹر ڈی۔ بدری، مکتبے میں تشریف لائے۔ آپ حال ہی میں چین اور جاپان کی سیر کے بعد واپس آئے ہیں۔ آپ ہماری ایک کتاب 'اچھے مشغلے: لڑکوں کے لئے' کی تصویریں بنا رہے ہیں۔ آپ نے ہمارے کاموں کو دیکھا اور بہت پسند کیا۔

---

۱۰ اکتوبر کو سینٹ زیویر کالج کے پروفیسر نظام الدین صاحب گوریکر اور بیگم گوریکر جامعہ تشریف لائے تھے۔ آپ نے جامعہ کے تعلیمی کاموں کو دیکھا۔ اور مکتبہ میں بھی کچھ وقت ہمارے ساتھ گزارا اور بچوں کے سلسلے میں ہماری تعلیمی کوششوں کو سراہا۔

---

۱۱ اکتوبر کو مشہور ماہرِ تعلیم جناب خواجہ غلام السیدین صاحب اور ان کے رفیقِ کار جناب سردار سوہن سنگھ صاحب بھی تشریف لائے۔ آپ نے پاپولر انسائیکلوپیڈیا کے کام کو دیکھا اور کچھ وقت یہاں کے مقامی مصنفین کے ساتھ گزارا۔

آپ نے اندازہ لگایا ہوگا کہ مکتبے میں بچوں کی کتابوں کے کام کی رفتار کتنی تیز ہے۔ چنانچہ اس کام کی نگرانی کے لئے ہم نے ہندی کے مشہور ادیب شری چندر اگنی ہوتری صاحب کی خدمات حاصل کر لی ہیں۔ آپ یہاں آنے سے پہلے ہندی کے اچھے اخباروں کے اڈیٹر بھی رہ چکے ہیں اور آپ نے بچوں کے لئے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ آپ کی نگرانی میں حسب ذیل کتابیں تیار ہو چکی ہیں۔

بقیہ صفحہ ۳۴ پر

تعلیمی میلا

از محمد شفیع الدین نیّر

آیا ہے میلا ــــ آیا ہے میلا
ہم سب کے دل کو ــــ بھایا ہے میلا
آیا ہے میلا ــــ آیا ہے میلا

میلے کی دھومیں ــــ ہر سو مچی ہیں
دیکھو دُکانیں ــــ کیسی سجی ہیں
خوشیاں فضا میں ــــ بکھری ہوئی ہیں
میٹھی صدائیں ــــ یہ آرہی ہیں

آیا ہے میلا ــــ آیا ہے میلا
ہم سب کے دل کو ــــ بھایا ہے میلا

بچّے ہیں آزاد ــــــ بے فکر دل شاد
ہے دل کی نگری ــــــ اُن سب کی آباد
اسکول کیسا ــــــ اور کیسے اُستاد
کچھ بھی نہیں یاد ــــــ کچھ بھی نہیں یاد

آیا ہے میلا ــــــ آیا ہے میلا
ہم سب کے دل کو ــــــ بھایا ہے میلا

کھمبے گڑے ہیں ــــــ جھولے پڑے ہیں
بچّوں کے چہرے ــــــ کیسے کھلے ہیں
یہ دوڑتے ہیں ــــــ وہ پھر رہے ہیں
کچھ ہنس رہے ہیں ــــــ کچھ گا رہے ہیں

آیا ہے میلا ــــــ آیا ہے میلا
ہم سب کے دل کو ــــــ بھایا ہے میلا

ہے بھیڑ اتنی ــــــ جمگھٹ ہے ایسا
ہے سانس لینا ــــــ دشوار کتنا!
خوش پھر رہا ہے ــــــ ہر ایک بوڑھا
بچّوں کا یارو ــــــ پھر پوچھنا کیا

آیا ہے میلا ــــــ آیا ہے میلا
ہم سب کے دل کو ــــــ بھایا ہے میلا

دیکھو تو آہا ــــــ کیسا تماشا
جادو کے کرتب ــــــ جادو کا ڈنڈا
بچّوں کی محفل ــــــ بچّوں کا جلسا

نغمے رسیلے   منظر سہانے
آیا ہے میلا   آیا ہے میلا
ہم سب کے دل کو   بھایا ہے میلا
جیبیں ٹٹولو   پیسے نکالو
لے کر دکاں سے   کچھ چاٹ کھالو
دل کی یہ خواہش   ہرگز نہ ٹالو
چکھو مٹھائی   قہوا اُڑا لو
آیا ہے میلا   آیا ہے میلا
ہم سب کے دل کو   بھایا ہے میلا
تعلیم کا یہ   میلا ہے اچھا
بنتا ہے اڈّا   علم و ہُنر کا
ہوتا ہے اس کا   منظر انوکھا
سُننے ہیں اس میں   نیّر کا نغمہ
آیا ہے میلا   آیا ہے میلا
ہم سب کے دل کو   بھایا ہے میلا
آیا ہے میلا   آیا ہے میلا

اقوامِ متحدہ

مسز وجے لکشمی پنڈت کا نام کس نے نہیں سُنا۔ ابھی کچھ دن پہلے تو ان کا نام ساری دُنیا کے اخباروں میں ایک ساتھ چھپا تھا۔ اور کیوں نہ چھپتا، آخر ان کو اتنی بڑی عزّت جو ملی تھی۔ مسز وجے لکشمی اقوام متحدہ کی صدر چُنی گئیں۔ اقوام متحدہ کا نام تو آپ نے سُنا ہوگا۔ لیجیے آج ہم آپ کو اس کی کہانی سُنائیں۔

اب سے آٹھ سال پہلے یعنی ۱۹۴۵ء میں جب دوسری بڑی لڑائی ختم ہوئی تو دُنیا کا ہر آدمی اس لڑائی سے تنگ آچکا تھا۔ آخر یہ لڑائی چلی بھی تو کتنے دن ہے۔ چھے سال تک برابر ہوتی رہی اسی لیے تو لوگوں کے دل میں اپنے آپ یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسی ترکیب کی جائے جو یہ لڑائی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ اسی لیے دُنیا کے بڑے بڑے ملکوں نے مل جُل کر یہ طے کیا کہ ایک ایسی پنچایت بنائیں جس میں ساری دُنیا کے ملک شامل ہو جائیں اور آپسی جھگڑوں کو بات چیت سے آمنے سامنے بیٹھ کر طے کرلیں۔ پھر لڑائی میں روپیہ بھی ضائع ہوتا ہے، جانیں بھی جاتی ہیں اور یہ بھی تو ضروری نہیں کہ جو ملک حق اور انصاف پر ہو وہی جیتے۔

یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ظالم اپنے بل بوتے پر جیت جائے۔ اس لئے یہی سوچا گیا کہ ایسی جماعت بنائی جائے جو اس کام کو کر سکے اور دُنیا کے آزاد ممالک اس کے ممبر ہو سکیں تاکہ یہ روز روز کے لڑائی جھگڑے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ آخر ۲۴ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو اقوام متحدہ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس وقت اس میں پچاس ملک کے نمائندے شامل تھے۔ انہوں نے اپنے ہی بنائے ہوئے ایک چارٹر پر دستخط کئے۔ جس کا بنیادی مقصد دُنیا میں امن قائم رکھنا تھا اب اس جماعت میں دس ممبروں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اس طرح اب اقوام متحدہ کے ممبروں کی تعداد ۶۰ پر مشتمل ہے۔ اس کا جنرل اسمبلی دراصل دنیا بھر کے ممالک کی پارلیمنٹ ہے۔ اس کا اجلاس سال بھر میں ایک بار ہوتا ہے۔

لیکن اقوام متحدہ میں اور بھی ۵ شعبے ہیں۔ جن کے کام بٹے ہوئے ہیں (۱) حفاظتی کونسل (۲) معاشی اور مجلسی کونسل (۳) ٹرسٹی شپ کونسل (۴) بین الاقوامی عدالت (۵) سکریٹریٹ۔

اقوام متحدہ کے شعبوں میں سب سے زیادہ اہمیت حفاظتی کونسل کو حاصل ہے۔ اس میں ۱۱ ممبر ہوتے ہیں۔ پانچ ممبر تو بالکل مستقل ہیں جیسے امریکہ، برطانیہ، روس، فرانس اور چین، ممبر کبھی نہیں بدلتے، البتہ باقی [illegible] ممبر ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ اس کا اجلاس برابر ہوتا رہتا ہے اور جنرل اسمبلی کی ایک طرح کی یہی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ اس میں کسی تجویز کے پاس ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ مستقل ممبروں کے علاوہ کو دو ممبر اور اس کی موافقت کریں۔ لیکن مستقل ممبروں میں سے کوئی ایک ممبر بھی اگر کسی تجویز کی مخالفت کرے تو وہ تجویز رد ہو جائے گی۔

دنیا میں امن و امان قائم رکھنے کی ذمہ دار بھی اسی انجمن کے سپرد ہے۔ اور اس لحاظ سے اس کو اور بھی سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس کی ذرا سی چوک سے دُنیا کا امن خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

اس طرح آج آٹھ سال سے اقوام متحدہ اپنا کام کر رہا ہے اور آج جب کہ یہ جماعت عمر کے نویں سال میں قدم رکھ رہی ہے اس کی ذمہ داریاں اور بڑھ رہی ہیں۔ ہمیں یقین ہے یہ جماعت دنیا میں امن و امان قائم رکھنے ضرور کامیاب ہوگی۔

فیض احمد فیض



کسی گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک گدھا تھا اور ایک مرغا، یہ گاؤں ایک بہت ہی اجاڑ جگہ پر تھا۔ اس کے چاروں طرف گھنا جنگل تھا جس میں بہت سے وحشی جانور رہتے تھے، وہاں شیر بھی تھے، چیتے بھی، اور بھیڑیئے بھی، شیر اور چیتے وغیرہ تو جنگل سے نہیں نکلتے تھے لیکن جب برف پڑتی تو ایک بھیڑیا شکار کی تلاش میں گاؤں تک آ جایا کرتا تھا۔

کسان کا گھر گاؤں میں سب سے پہلا گھر تھا، اس کا کھیت بھی اس کے گھر سے ملا ہوا تھا۔ وہ سارا دن کھیت میں کام کرتا تھا۔ اس کے گدھے اور مرغے میں بہت دوستی تھی، یہ دونوں عام طور پر اکٹھے رہتے تھے۔ مگر گدھا تھا بیوقوف اور مرغا سمجھ دار، سردیوں میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بھیڑیا ان کے پاس آ نکلتا، مرغا اُسے دیکھتے ہی ککڑوں کوں، کا شور مچا دیتا۔ ان کا مالک مرغے کا شور سُن کر سمجھ لیتا کہ بھیڑیا آیا ہے۔ وہ کوئی لاٹھی یا کلہاڑی لے کر آیا اور بھیڑیئے کو بھگا دیتا۔ گدھے صاحب تو تھے بیوقوف، وہ یہ سمجھ

بیٹھے کہ بھیڑیا مجھ سے ڈرتا ہے اور مجھے دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ چنانچہ گدھا مرغے کے سامنے ڈینگیں مارا کرتا۔ وہ کہتا بھائی مرغے تم تو اس بھیڑیئے سے یوں ہی ڈرتے رہتے ہو، میں نے کئی ایسے بھیڑیئے دیکھے ہیں۔ مجھے تو دیکھ کر دور ہی سے بھاگ جاتا ہے اگر کسی دن نزدیک آیا تو تم دیکھنا ایسی دولتی دوں گا کہ نانی یاد آ جائے، لیکن مرغا تو جانتا تھا وہ کہتا بھائی گدھے شیخی مارنا اچھا نہیں ہوتا، دشمن سے ہمیشہ خبردار رہنا چاہیئے ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔ گدھا مرغے کی باتیں سنتا لیکن ایک نہ مانتا

ایک دن کسان اپنے پڑوسی کے پاس کام سے گیا ہوا تھا، اچانک بھیڑیا آ گیا۔ مرغے نے بہت ککڑوں کی لیکن کوئی نہ پہنچا اور بھیڑیئے نے آتے ہی گدھے کو دبوچ لیا، مرغا شور مچاتا ہوا گاؤں کی طرف بھاگا اتنے میں کسان بھی آ گیا اور اس نے آ کر بھیڑیئے کو بھگا دیا، گدھے کو چوٹ تو بہت آئی لیکن جان بچ گئی۔ مرغے نے اس سے کہا کہ دیکھو کیا کہتا تھا، اب آگیا نہ مزہ۔

گدھا بے چارا شرمندہ تو بہت ہوا لیکن وہ شیخی سے باز نہ آیا۔ مرغے نے اس سے کہا "دیکھو میں تمھیں کہا کرتا تھا، اب آگیا نہ مزا۔

گدھا شرمندہ تو بہت ہوا، لیکن اس نے اپنی شیخی نہ چھوڑی، کہنے لگا کہ "ہوں۔ وہ تو بھیڑیئے نے مجھ پر اچانک حملہ کر دیا تھا، میں اس وقت تیار نہ تھا، یہ بھی کوئی لڑنے کا طریقہ ہے، اسے تو چاہیئے تھا کہ پہلے کھڑے ہو کر آواز دیتا کہ "میاں گدھے لڑو گے؟" میں کہتا "ہاں لڑیں گے" اس کے بعد پھر ہوتی لڑائی تو تم دیکھتے کہ اسے کیسا پچھاڑتا۔

کچھ دنوں کے بعد کسان کسی کام سے شہر گیا۔ اس نے مرغے کو تو اپنے پڑوسی کے یہاں چھوڑا اور گدھے کو گھر کے اندر بند کر دیا۔ جاتے وقت مرغے نے گدھے سے کہا "دیکھو بھئی آج تم اکیلے ذرا سوچ سمجھ کر رہنا۔ اور گھر کے اندر ہی رہنا، باہر مت نکلنا۔ ورنہ اگر آج بھیڑیا آگیا تو تمھیں کوئی بچا نہ سکے گا۔ گدھے نے کہا "ہوں میں

بقیہ صفحہ ۱۷ پر

مبارز الدین رفعت

اسماعیل میرٹھی

یوں تو اردو میں گیت، نظمیں اور غزلیں کچھ آج سے نہیں، تین ساڑھے تین سو سال سے لکھی جا رہی ہیں۔ نصرتی، سراج، ولی، میر، سودا، نظیر اور غالب جیسے بڑے بڑے شاعروں نے اردو شاعری کو بہت اونچے درجے پر پہنچایا ہے۔ لیکن ان سب نے جو کچھ لکھا ہے وہ بڑوں کے لئے لکھا ہے، بچوں کے لئے انہوں نے کچھ بھی نہیں لکھا۔ اردو میں بھی ہندوستان کی اور زبانوں کی طرح بچوں کی عمر، ان کی سوجھ بوجھ اور ان کی پسند کے لحاظ سے گیت اور نظمیں لکھنے کا رواج تو یہی پچاس ساٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ پہلے ہمارے مدرسوں اور پاٹھ شالوں میں اور طرح کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، لیکن ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہو جانے کے بعد انگریزی طرز کے اسکول کھلنے لگے تو بچوں کو پڑھانے کے لئے درجہ وار ریڈروں کا لکھنا ضروری ہوا۔ اردو زبان پر پنجاب کے ناظم تعلیمات کرنل ہالرائیڈ کا بڑا احسان ہے کہ اس کام پر انھوں نے بعض چوٹی کے لکھنے والوں کو لگایا۔ چنانچہ اردو کے ایک بہت بڑے ادیب اور شاعر شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد نے ایسی اردو

ریڈریں سب سے پہلے لکھیں۔ "ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔" "مولوی صاحب کا گھوڑا" اور "پنڈت جی کی پہیلی" جیسے مزے دار اور مشہور سبق ان ہی ریڈروں میں ہیں۔ مولانا آزاد کے بعد مولانا محمد اسماعیل میرٹھی نے بھی ایسی ہی اردو ریڈریں لکھیں۔ اور گورنمنٹ نے انھیں مدرسوں میں پڑھانے کے لئے منظور کیا۔ مدتوں یہ اسکولوں میں پڑھائی جاتی رہیں وہ اب بھی کہیں کہیں پڑھائی جاتی ہیں۔ مولانا محمد اسماعیل کی لکھی ہوئی اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی بڑی پیاری بڑی میٹھی اور بڑی سہل زبان میں لکھی گئی ہیں۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ بچوں کی سوجھ بوجھ اور ان کے پسند اور لگاؤ کا خیال رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ یہی بات تھی کہ یہ ریڈریں بہت پسند کی گئیں۔ ان میں جو نظمیں ہیں وہ بھی مولانا ہی کی لکھی ہوئی ہیں۔ یہ نظمیں اچھی اچھی باتیں سکھانے والی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی پیاری زبان میں لکھی گئی ہیں اور بہت جلد زبان پر چڑھ جاتی ہیں۔ اسی لئے مولانا کی یہ نظمیں بہت مشہور ہوئیں۔ یہ لکھی تو گئی تھیں بچوں کے لئے پر اب زمانے نے دکھا دیا ہے کہ یہ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں سب ہی کو پیاری لگتی ہیں۔ اور مولانا اسماعیل میرٹھی کا نام بڑی حد تک ان ہی نظموں سے زندہ ہے۔

مولانا محمد اسماعیل ۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ پرانے طریقے پر گھر ہی میں عربی اور فارسی کی تعلیم پائی۔ ابھی سولہ سال ہی کے تھے کہ اسکول میں مدرس کی حیثیت سے نوکر ہو گئے۔ اپنا کام بہت جی لگا کر محنت سے کیا اور چند ہی دنوں میں فارسی کے ہیڈ مولوی مقرر ہو گئے۔ سہارن پور اور میرٹھ کے اسکولوں میں بہت دنوں تک یہی خدمت انجام دیتے رہے۔ پھر ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ میں چلے گئے۔ اس اسکول میں بارہ سال تک پڑھاتے رہے اور آخر ۱۸۹۹ء میں پنشن لے لی اور پنشن لے کر اپنے وطن میرٹھ لوٹ آئے۔ آپ کی بہترین پڑھائی اور آپ کی بہترین کتابوں کے صلے میں حکومت نے آپ کو خان صاحب کا خطاب بھی دیا۔ پنشن لینے کے بعد بھی آپ نے لکھنے پڑھنے کا کام جاری رکھا آخر پہلی نومبر ۱۹۱۷ء کو آپ نے اپنے وطن میرٹھ میں انتقال کیا۔ انتقال کے وقت آپ کی

عمر لگ بھگ ۷۲ سال تھی۔

ابھی ہم نے بتایا کہ مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کا نام بڑی حد تک ان کی بچوں کی نظموں سے زندہ ہے۔ ان نظموں کی زبان درست اور آسان ہی نہیں بلکہ ان میں باتیں بھی ایسی اچھی بتائی ہیں کہ بس دل میں بیٹھ جاتی ہیں۔ ان کی نظم خدا کی تعریف کا یہ مشہور شعر تو تم نے بھی کئی بار سنا ہوگا ؎

تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمین بنائی کیا آسماں بنایا

ایک نظم گائے کے دو چار شعر سنو ؎

رب کا شکر ادا کر بھائی　　جس نے ہماری گائے بنائی
دودھ میں بھیگی روٹی میری　　اس کے کرم نے بخشی سیری
گائے کو دی کیا اچھی صورت　　خوبی کی ہے گویا مورت
کیا ہی غریب اور کیسی پیاری　　صبح ہوئی جنگل کو سدھاری
رب کی حمد و ثنا کر بھائی　　جس نے ایسی گائے بنائی

بھلا بوجھو تو یہ مشہور شعر ان کی کس نظم کا ہے ؎

کھا پی کے آگ پانی چنگھاڑ مارتی ہے
سر سے دھوئیں اڑا کر غصّہ اتارتی ہے

آپ تو سمجھ ہی گئے، اس نظم کا آخری شعر یہی ہے نا؟

جی ہاں سمجھ گیا میں، پہلے ہی میں نے تاڑا
وہ دیکھو آگرے سے آتی ہے ریل گاڑی

"اسلم کی بلّی" والی نظم کا یہ شعر تو آپ میں سے بہتوں کو یاد ہوگا ؎

چھوٹی سی بلّی کو میں کرتا ہوں پیار
صاف ہے ستھری ہے بڑی ہے کھلاڑ

اور ہاں ان کی پیاری پیاری نظم "دال کی فریاد" کو کوئی کیسے بھلا سکتا ہے ؎

ایک لڑکی بگھارتی ہے دال　　دال کرتی ہے عرض یوں احوال
ایک دن تھا ہری بھری تھی میں　　سارے آفات سے بری تھی میں

مولانا محمد اسماعیل کی نظموں میں خاص بات یہ ہے کہ وہ ان نظموں میں پہلے تو مزے دار فرضی قصے سناتے ہیں، اور آخر میں ان سے بڑے بڑے نتیجے نصیحت کی صورت میں نکالتے ہیں۔ ان قصوں کی وجہ سے نصیحتوں کا اثر بہت بڑھ جاتا ہے۔ "بارش کا پہلا قطرہ" والی نظم میں کہنا یہ چاہتے ہیں کہ کسی بڑے کام کو سب مل کر تھوڑا تھوڑا کریں تو وہ بڑا کام چاہے کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کام کو کون شروع کرے اور دوسروں کو بھی اس میں شریک ہونے کی دعوت کون دے؟ اس کے لئے ہمت کا جو انمردی

اور ہمت کی ضرورت ہے۔ اسی بات کو اس نظم میں ایسی خوبی سے بیان کیا ہے کہ بس بات دل میں اتر جاتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی!!! پر بوندا ابھی نہیں پڑی تھی!
ہر قطرے کے دل میں تھا یہ خطرہ ناچیز ہوں میں غریب قطرہ!!
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس اپنی ہی کروں گا ستیا ناس
آتی ہے برسنے سے مجھے شرم مٹی پتھر تمام ہیں گرم!!!
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہی غم سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم
اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور ہمت کے محیط کا شناور
بولا للکار کر کہ آؤ!!!! میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
یارو یہ ہچر مچر کہاں تک اپنی سی کرو بنے جہاں تک
یہ کہہ کے وہ ہو گیا روانہ دشوار ہے جی پہ کھیل جانا
پھر ایک کے بعد ایک لپکا! قطرہ قطرہ زمین پہ ٹپکا!!!!
آخر قطروں کا بندھ گیا تار بارش لگی ہونے موسلا دھار

پھر اس انوکھے سے قصے سے کیا نتیجہ نکالتے ہیں ؎

اے صاحبو! قوم کی خبر لو قطروں کا سا اتفاق کر لو
قطروں ہی سے ہوگی نہر جاری چل نکلیں گی کشتیاں ہماری

ان کی "کچھوے اور خرگوش" والی نظم بہت مشہور ہے۔ اس کا قصہ تو آپ کو بھی یاد ہوگا کہ ایک کچھوے اور خرگوش میں دوڑ کی شرط ہوئی۔ خرگوش کو گھمنڈ ہوا کہ میں تو اتنا تیز دوڑنے والا کہ تیز سے تیز شکاری تک میری بو نہ پا سکیں۔ کہاں رینگ کر چلنے والا یہ کچھوا میری برابری کرنے چلا ہے۔ یہ جو گھمنڈ اس کے سر میں سمایا تو تھوڑی دور دوڑ کر کسی کھیت میں سو رہا کہ جب تک کچھوا یہاں تک پہنچے میں دو چار جھپکیاں لے کر [illegible]

جاؤں گا۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ گھمنڈ اور غفلت دونوں بری چیزیں ہیں۔ کچھوے کی ہمت اور استقلال اور خرگوش کے گھمنڈ اور غفلت کا نتیجہ کیا ہوا وہ مولانا اسماعیل ہی کی زبانی سنئے :

ایک دو کھیت چوکڑی بھر کے ۔۔۔ اپنی چستی پہ آفریں کر کے
کسی گوشے میں سو گیا جا کر ۔۔۔ فکر کیا ہے چلیں گے سستا کر
اور کچھوا غریب آہستا! ۔۔۔ چلا سینے کو خاک پر گھستا
سوئی گھنٹے کی جیسے چلتی ہے ۔۔۔ یا بتدریج چھاؤں ڈھلتی ہے
یوں ہی چلتا رہا یہ استقلال ۔۔۔ نہ کیا کچھ ادھر اُدھر کا خیال
کام کرتا رہا جو پے در پے! ۔۔۔ کر گیا رفتہ رفتہ منزل طے!
حیف! خرگوش رہ گیا سوتا ۔۔۔ ثمرہ غفلت کا اور کیا ہوتا
جب کھلی آنکھ تو سویرا تھا! ۔۔۔ سخت شرمندگی نے گھیرا تھا
صبر و محنت میں ہے سرافرازی ۔۔۔ سست کچھوے نے جیت لی بازی
نہیں قصہ یہ دل لگی کے لئے ۔۔۔ بلکہ عبرت ہے آدمی کے لئے
ہے سخن اس حجاب میں روپوش ۔۔۔ ورنہ کچھوا کہاں کہاں خرگوش

"ایک لڑکا اور بیر" والی نظم میں ایک ایمان دار لڑکے کا قصہ سنایا ہے اور بتایا ہے کہ ایمان دار آدمی کسی حالت میں بھی کوئی چیز نہیں چراتا۔ اسی نظم کے آخر میں ان کا وہ مشہور شعر آتا ہے جو تم میں سے اکثر کو یاد ہوگا۔

واہ وا! شاباش لڑکے واہ وا ۔۔۔ تو جوان مردوں سے بازی لے گیا

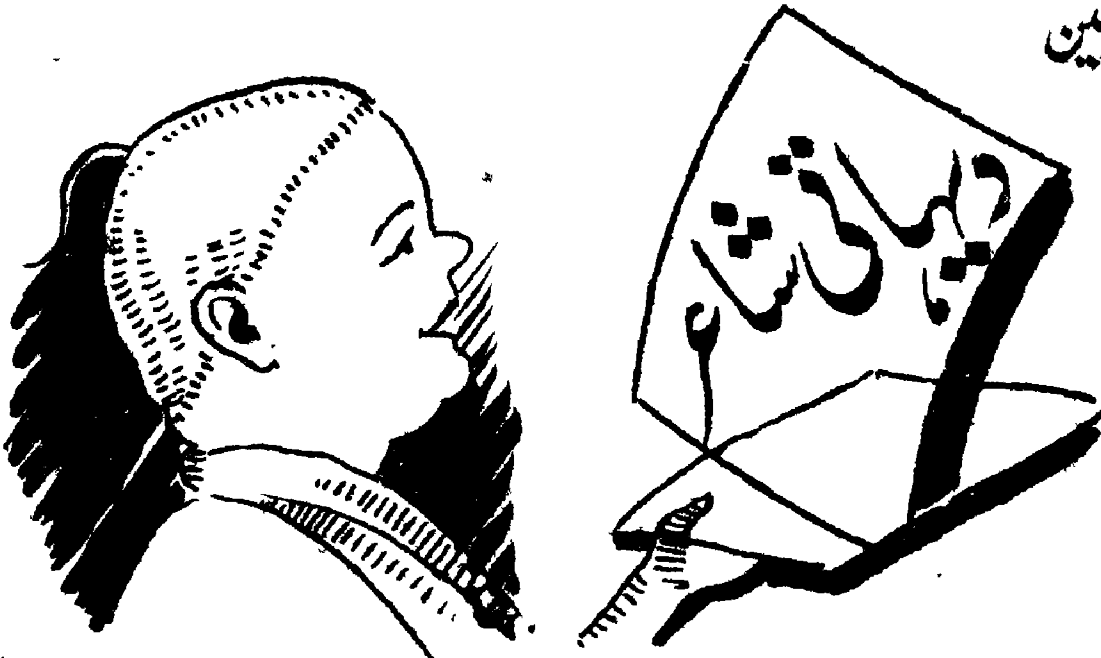
ایک نظم "اچھا زمانے آنے والا ہے" میں کہتے ہیں ؎

کریں سب مرد ایک، کی ایک مل کر ۔۔۔ یہی بات واجب ہے ہر مرد و زن پر
لگے ہاتھ سب کا تو اللہ جانے پھر ۔۔۔ کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ!

غرض میں کہاں تک گنائے جاؤں کہ مولانا اسماعیل نے کتنی اچھی اچھی نظمیں لکھی ہیں۔

بقیہ صفحہ ۱۳ پر

احمد حسین



کسی گاؤں میں پنچو نامی اک برہمن رہتا تھا۔ یہ برہمن جاہل تو تھا ہی لیکن جاہل ہونے کے ساتھ ساتھ بے وقوف بھی تھا۔ وہ گاؤں کے بازار میں دن بھر بیٹھا رہتا تھا اور وہیں اُس نے ایک مُورت بھی رکھ لی تھی اور اسی مورت کی پوجا پاٹ کیا رہتا تھا۔ اس طرح جو لوگ اُدھر سے گزرتے وہ اُسے سادھو سمجھ کر پیسہ دو پیسہ دے دیتے تھے اور شام کو آٹھ دس آنے لے کر گھر چلا آتا۔ اس کے گھر میں کُل مِلا کر چھ آدمی تھے اسی لئے اتنے پیسوں میں اُن کی گزر نہ ہوتی تھی۔ پنچو کی بیوی بڑی تیز عورت تھی۔ وہ روز پنچو پر ناراض ہوتی کہ کوئی ڈھنگ کا کام کاج کرو جو آمدنی بڑھے۔ اس طرح بھیک کے پیسے سے کیسے گزارہ ہوگا۔

اس زمانے میں گاؤں کے قریب شہر میں ایک راجا تھا۔ یہ راجا پڑھے لکھے لوگوں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ پنچو کا ایک پڑوسی ایک دن بادشاہ کے دربار میں گیا وہاں اس نے راجا کو ایک گیت لکھ کر سنایا جس کے انعام میں راجا نے

اس کو کافی زمین دی اور نقد روپیہ بھی دیا۔
اسی لئے ایک دن پنچو کی بیوی نے بھی اپنے شوہر کو یہ مشورہ دیا کہ "تم بھی راجا کے دربار میں جا کر کوئی اچھا سا گیت بنا کر سُنا دو۔ اگر راجا کو پسند آ گیا تو ہمارے دن بھی پلٹ جائیں گے۔"
پنچو نے کہا "مگر مشکل یہ ہے کہ میں بالکل جاہل آدمی ہوں۔ گاؤں کے لوگوں میں تو خیر جیسے تیسے بات چیت کر لیتا ہوں مگر راجا کے دربار میں بات کرنا آسان نہیں ہے۔"
مگر پنچو کی بیوی کب ماننے والی تھی۔ اس نے فوراً کہا "تم برہمن ہو۔ برہمن کو پڑھنے لکھنے کی کیا ضرورت۔ بس ذرا ہمت کر کے راجا کے پاس چلے جاؤ، پھر دیکھو دربار میں تمھاری کیسی عزّت ہوتی ہے۔"
لیکن پنچو کی ہمّت نہ پڑتی۔ اور پنچو کی بیوی روزانہ اس سے یہی کہا کرتی۔ آخر ایک دن پنچو نے ہمّت کر کے راجا کے دربار کا رُخ کیا۔ شہر کے راستے میں ایک گھنا جنگل تھا۔ جب پنچو کا گزر اس جنگل سے ہوا تو اُس نے دیکھا کہ وہاں کچھ جنگلی گائے اور بیل چر رہے تھے۔ سامنے سے ایک بیل بھاگتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر پنچو نے دوڑنا شروع کیا۔ جیسے ہی وہ دوڑا جنگلی بیل بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ اب تو پنچو کو جان بچانا مشکل ہو گیا۔ آخر اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آ گئی۔ موقع پا کر وہ ایک پیڑ پر چڑھ گیا۔ بیل تھوڑی دیر تک تو کھڑا رہا مگر پھر ناامید ہو کر دوسری طرف چل دیا۔ اب پنچو کے دم میں دم آیا اور وہ درخت سے نیچے اُترا۔ بیل بہت دور چلا گیا تھا۔ پنچو نے بیل کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا:۔

پہلی بار گیا تو ہار
تم کو ماریں تیرے یار

جیسے ہی اس کی زبان سے یہ مصرعے نکلے وہ خوشی کے مارے ناچنے لگا۔ اب اس نے سوچا کہ اس طرح کے دو مصرعے اگر اور کہہ لوں تو میرا کام بن جائے گا۔
اس نے پھر کہا:۔

کر تو ہمت اب کی بار
بیٹھا میں بھی ہوں تیار

اب تو دو شعر ہو گئے وہ خوشی خوشی شہر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے بھر اس کو پڑھتا چلا گیا۔ جب وہ بادشاہ کے محل پر پہنچا تو شام ہو گئی تھی درباری اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ راجا اپنے باغ میں ٹہل رہا تھا۔ دربان کو پنچو پر رحم آ گیا اور اُس نے اجازت دیدی۔ پنچو کو راجا کے سامنے پیش کیا گیا۔ راجا کے سامنے آتے ہی پنچو نے اپنے دونوں شعر پڑھ ڈالے راجا سُن کر بہت ہنسا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر راجا نے اس کو تین چار دفعہ پڑھوا کر سنا اور زبانی یاد کر لیا۔ اور پنچو سے کہا کہ اس وقت تم جاؤ کل جب ہمارا دربار ہو آنا۔ اس وقت تم کو اس کا انعام ملے گا۔ پنچو خوشی خوشی وہاں سے چلا گیا۔

اتفاق کی بات ہے کہ انھی دنوں راجا کا وزیر راجا کو مارنے کی فکر میں تھا۔ اُس نے شاہی نائی کو اس کام کے لئے تیار کیا کہ اگلے دن جب صبح صبح راجا اس سے بال بنوائے تو وہ موقع پاکر استرے سے راجا کی گردن اُڑا دے۔

چنانچہ اگلے دن صبح صبح نائی راجا کی حجامت بنانے لگا تو اس کا ہاتھ کانپنے لگا اور استرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جب استرا زمین پر گرا تو اس کی دھار خراب ہو گئی۔ راجا نے کہا "کوئی بات نہیں، دوسرا استرا نکالو" نائی نے جب استرا نکالا اور داڑھی بنانے کے لئے آگے بڑھا تو راجا نے کہا "بھائی کل مجھے ایک دیہاتی نے دو شعر سنائے ہیں تم بھی سنو اور ہو سکے اس کا مطلب بتاؤ"

نائی نے اُسترا روک کر کہا کہ "سرکار ضرور سنائیے"

راجا کو دونوں شعر یاد تو تھے ہی سنائے۔

پہلی بار گھسا تو ہار
تجھ کو ماریں تیرے یار
کر تو ہمت اب کی بار
بیٹھا میں بھی ہوں تیار

یہ سُن کر نائی تھر تھر کانپنے لگا سمجھ گیا کہ راجا کو اس سازش کا حال معلوم ہو گیا اور اسی کی طرف اشار

کر رہا ہے۔ بس پھر تو وہ ڈر کے مارے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے راجا کو سارا حال کہہ سنایا۔

راجا نے نائی کو سچ بولنے پر معاف کر دیا اور وزیر کو اسی روز پھانسی پر لٹکا دیا۔ اس کے بعد راجا کو اس غریب دیہاتی کا خیال آیا جس کے شعروں کی وجہ سے اس کی جان بچ گئی۔ اور برہمن کو بڑا انعام و اکرام دیا۔ حالانکہ غریب برہمن کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس کے شعر کا کیا مطلب تھا۔ اس طرح خوب مال و دولت لے کر برہمن اپنے گھر آیا اور پھر اس نے باقی زندگی بڑی اچھی طرح گزاری۔

صفحہ ۴۵ کا بقیہ

بدولت آج تمہارا بھنڈار اناج سے بھرا پڑا ہے۔ تم غریبی کی حالت میں بھی رحم دل تھے۔ اچھا تم بھی پہلے ہی کی طرح غریب ہو جاؤ۔"

پھر وہ سگھڑ بیوی والے بھائی کے پاس گئی۔ ان لوگوں نے بڑھیا کی بڑی خاطر کی۔ تانبے تانبے پھل کھانے کو دیئے۔ بڑھیا مسکرائی، پھر کہنے لگی۔ "میں وہی پری ہوں جس نے تمہیں یہ سگھڑ دلہن لا کر دی۔ تم لوگ بڑے رحم دل ہو۔ تمہیں انعام ملنا چاہیئے۔" اتنا کہنا تھا کہ وہیں پر ایک محل کھڑا ہو گیا۔ "یہ تم لوگوں کا انعام ہے۔ آرام کے ساتھ اس میں رہو۔ روپے پیسے کی بھی کمی نہ ہو گی۔ لیکن خبردار! کبھی کسی کو نہ ستانا۔" یہ کہہ کر پری غائب ہو گئی۔ یہ لوگ آرام سے محل میں رہنے لگے۔ جب بھائیوں کا حال معلوم ہوا تو ان کو بھی اپنے محل میں بلا لیا۔ تینوں ایک ساتھ رہنے لگے۔ اور ان دونوں بھائیوں نے توبہ کر لی کہ کسی غریب کے ساتھ اس طرح پیش نہ آئیں گے۔

لطیفے

انوار۔ (ہارمونیم کے سُر پر) سارے گاما...
احمد۔ (بات کاٹ کر) تو اور سب چھوٹے چھوٹے پہلوان ہوں گے۔

پروفیسر صاحب۔ (موٹر ڈرائیور سے) یہ موٹر کیوں اُچھل گئی۔
ڈرائیور۔ جناب سامنے گڑھا آگیا تھا۔
پروفیسر صاحب۔ تو تم نے ہارن کیوں نہیں بجایا۔

ماسٹر۔ حامد۔ بتاؤ تاج محل کس سن میں بنا تھا۔
حامد۔ ماسٹر صاحب تب میں پیدا نہیں ہوا تھا۔

ماسٹر۔ (احمد سے) کیوں احمد تم آج سبق یاد کرکے کیوں نہیں آئے کیا مار کھاؤ گے۔؟
احمد۔ جی نہیں ماسٹر صاحب آج میں کچھ نہیں کھاؤں گا کیوں کہ آج میں اپنے ساتھ کوئی برتن نہیں لایا ہوں۔

باپ۔ (بیٹے سے) کیوں بیٹا یہ کتاب کس کی ہے۔
بیٹا۔ ابا جان ایک لڑکے کی۔
باپ۔ تو وہ کون لڑکا ہے۔
بیٹا۔ ابا جان جس کی یہ کتاب ہے۔
(سکینہ خاتون سندیلوی)

ماسٹر صاحب۔ (حامد سے) کیوں حامد تم آج سوال لگاکر کیوں نہیں لائے۔ کیا مار کھاؤ گے۔؟

حامد۔ نہیں ماسٹر صاحب آج مجھے ڈاکٹر نے منع کیا ہے کہ تم کچھ مت کھانا۔

ایک شخص جن کی داڑھی بہت لمبی تھی اپنے دوست سے بولے یار "موہن" سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ٹائی کس طرح باندھوں۔ کیونکہ جب میں ٹائی باندھتا ہوں تو وہ میری داڑھی سے ڈھک جاتی ہے۔

موہن۔ تو داڑھی ہی میں کیوں نہیں باندھ لیتے ہو۔

ایک پاگل نے دوسرے پاگل سے پوچھا "بتاؤ میرے ہاتھ میں کیا ہے"

دوسرے پاگل نے کہا "ہاتھی"

پہلے نے کہا "یار تم نے دیکھ لیا"

ماں۔ بیٹا احمد تم نے اپنے باپ کے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔

بیٹا۔ ماں تم ہی نے تو کہا تھا کہ اپنے بڑوں کی بات کا جواب نہیں دیتے ہیں۔

ماسٹر۔ بتاؤ کتاب کی کیا جمع ہے۔

لڑکا۔ ہماری کتابوں کی الماری۔

(چودھری محمد نور سندیلوی)

اطہر۔ بھائی جاوید آج آپ کی گھڑی سست کیوں ہے

جاوید۔ جی وہ ابھی سو کر اٹھی ہے

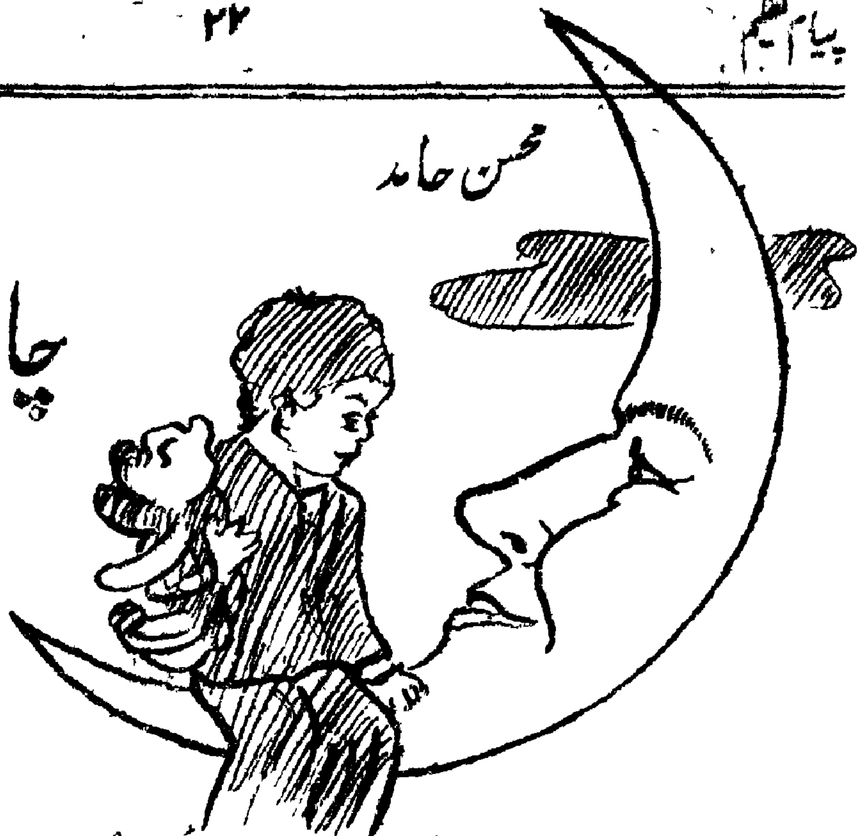
کنڈکٹر۔ اب کوئی صاحب تو بے ٹکٹ نہیں رہ گئے ہیں۔

مسافر۔ ابھی تو آپ بے ٹکٹ رہ گئے ہیں۔

نعیم وسیم سے۔ بھائی وسیم دسمبر کی چھٹیاں کس مہینے میں ہوں گی۔

محمد فضل الرحمٰن نیازی

ابتدائی درجہ پنجم



محسن حامد

چاند کا سفر

چاندنی راتوں میں جب آپ اپنی چارپائی پر صحن میں لیٹتے ہوں گے تو آپ کے دل میں کبھی کبھی یہ خیال ضرور آتا ہوگا کہ کاش آپ چاند تک پہنچ سکتے اور چاند کی چرخہ کاتتی ہوئی بڑھیا یا شریر خرگوش کو قریب سے دیکھ سکتے۔ جس کے بارے میں آپ کی دادی جان نے آپ کو قصّے سنائیں ہوں گے۔ لیکن سائنس کی اس دنیا میں وہ دن دور نہیں جب آپ واقعی چاند کا سفر کر سکیں گے۔ اور پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ چاند میں نہ تو کوئی بڑھیا چرخا کات رہی ہے اور نہ ہی کوئی شریر خرگوش بند ہے۔ بلکہ یہ دھبّے چاند میں بڑے بڑے خشک سمندروں کے ہیں۔

یہ تو شاید آپ جانتے ہی ہوں گے اس زمین کا سب سے قریبی پڑوسی چاند ہے۔ جس کا فاصلہ زمین سے ۲½ لاکھ میل ہے۔ لیکن جب ہم اس فاصلے کا سورج اور دوسرے ستاروں سے مقابلہ کرتے ہیں تو اس کی دوری بہت کم معلوم ہونے لگتی ہے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ سورج زمین سے ۹ کروڑ میل یا چاند سے

تین گنا دور ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض ستارے تو ایسے بھی ہیں جن کا فاصلہ سورج سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ چاندنی راتوں میں جب چاند پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتا ہے تو چاند قریب قریب سورج کے برابر معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے سورج چاند سے ۴ گنا زیادہ بڑا ہے۔ چونکہ سورج زمین سے زیادہ فاصلے پر ہے اس لئے چاند کے برابر نظر آتا ہے۔

آئیے اب ہم اس لمبے سفر کی تیاری کریں جس کے لئے ہم ابھی زمین سے روانہ ہونے والے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ ہم کو ایک بہت تیز رفتار ہوائی جہاز کی ضرورت ہوگی جو ہمیں چاند تک پہنچا دے۔ لیکن بھئی آپ کا یہ خیال غلط ہے دنیا کا تیز سے تیز تر ہوائی جہاز بھی ہمارے اس سفر میں کام نہ آ سکے گا جس کے لئے ہم روانہ ہونے والے ہیں۔ کیوں کے ہوائی جہاز کے اڑنے کے لئے تو ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب ہوا ہی نہ ہو تو ہوائی جہاز بھلا کہاں اُڑے گا۔ ہوا کا یہ سمندر جس میں ہم سب سانس لیتے ہیں اور جس میں صبح و شام ہوائی جہاز زن زناتے پھرتے ہیں اس کی اونچائی زمین سے چند سو میل سے زیادہ نہیں ہے۔ اور پھر ہمیں تو ڈھائی لاکھ میل لمبے سفر پر جانا ہے۔ جہاں پر ہوا کا نام نشان بھی نہیں۔ ایسی صورت میں ہم کو کسی ایسی مشین کی ضرورت ہوگی جو ہمیں چاند تک پہنچا دے۔ اس کے علاوہ یہ مشین اتنی تیز چلنے والی بھی ہونی چاہئیے کہ ہم جلد سے جلد زمین کی کشش سے باہر نکل سکیں۔ سائنس والوں کا خیال ہے کہ اس مشین کی رفتار کم سے کم ۷ میل فی سکنڈ ہونی چاہئیے۔ جو کہ رائفل سے نکلی ہوئی گولی کی رفتار سے بھی کئی گنا زیادہ ہے۔

ہمارا سفر

اچھا چھوڑئیے اس جھگڑے کو اب آپ اور آپ کے تمام دوست اسی قسم کی ایک خیالی مشین میں بیٹھ جائیے جو آپ کو زمین سے چاند تک بحفاظت پہنچا سکے۔ لیجئے آپ کا سفر شروع ہو گیا اور اب آپ چاند کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں۔ آپ ڈر رہے ہیں کہ کہیں آپ کی مشین چاند کی سطح سے نہ

ٹکرا جائے۔ اسی لئے آپ نے جلدی جلدی اپنے پیرا شوٹ باندھ لئے کہ خطرناک موقع پر آپ پیرا شوٹ سے کود کر چاند تک پہنچ سکیں۔ پیرا شوٹ وہی جس سے لوگ جہاز سے کود سکتے ہیں۔ لیکن آپ کے نگراں نے وقت پر آپ کو خبردار کر دیا کہ پیرا شوٹ کا استعمال ممکن نہیں ہے کیونکہ چاند کے گرد ہوا کا نام و نشان نہیں، اور اگر آپ غلطی سے کہیں کود پڑے تو آپ اتنی ہی تیزی سے چاند کی سطح سے جا کر ٹکرائیں گے جتنی تیزی سے آپ بغیر پیرا شوٹ کے گریں گے۔ ممکن ہے کسی زمانے میں چاند کے چاروں طرف بھی ہوا ہو لیکن کیونکہ چاند کی کشش اتنی زیادہ نہیں ہے کہ وہ اس ہوا کو اپنی طرف کھینچے رکھتی اس لئے یہ ہوا کہیں اور چلی گئی ہے۔

لیجئے آپ کی مشین بغیر کسی حادثے کے چاند تک پہنچ گئی۔ آپ نے مشین کی کھڑکی سے منہ نکال کر جھانکا تو آپ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب آپ نے دیکھا کہ سورج پوری طرح چمک رہا ہے لیکن اس کے باوجود آسمان کالا ہے اور یہی نہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ ستارے بھی خوب چمک رہے ہیں۔ لیکن ان ستاروں کی جھلملاہٹ وہ نہیں جو آپ کو زمین سے نظر آتی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ چاند پر ہوا جو نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ہوا ہی کا تو کام ہے کہ وہ روشنی کو چاروں طرف پھیلا دیتی ہے اور آسمان پر نیلاہٹ نظر آتی ہے اور ان ستاروں کو چھپا دیتی ہے۔

اچھا اب آپ مشین کو خیر آباد کہیئے اور چاند کی سیر کو نکل پڑے۔ آپ کی پیٹھ پر ہوا کی کافی مقدار ہونی چاہیئے۔ اس کے علاوہ آپ اس وقت ایک ایسا لباس پہنے ہوئے ہوں گے جو اتنا مضبوط اور سخت ہوگا کہ اس کا اندازہ لگانا بھی بہت مشکل ہے۔ کیونکہ چاند پر پڑنے والے سیکڑوں خطروں سے یہ آپ کی حفاظت کرے گا۔ چاند پر پہنچنے کے بعد سب سے پہلا خطرہ جس سے آپ کا لباس آپ کی حفاظت کریگا وہ چاند کی گرمی [illegible] تو آپ جانتے ہی ہیں کہ چاند بھی زمین کی طرح گول ہے اس

کہ چاند کے ایک حصّہ پر جب سورج چمکتا ہے تو اس کے دوسرے حصے میں ہمیشہ رات رہتی ہے۔ چاند کے اس حصّے کی گرمی کا اندازہ لگانا چاہیئے جو سورج کے سامنے رہتا ہے۔ تو زرا اپنی جیب سے تھرما میٹر نکال کر دیکھئے۔ "ارے یہ کیا" آپ تو حیران ہو کر چلا پڑے۔ ارے یہ تو ۲۱۲ تک پہنچ چکا تھا۔ جب اتنی گرمی ہو تو پانی اپنے آپ اُبل جاتا ہے۔ اس گرمی میں یہ آپ کے لباس ہی کا کام ہے کہ آپ زندہ سلامت بچے کھڑے ہیں۔ اس کے بر خلاف رات میں ٹمپریچر اتنا گرتا ہے اتنا گرتا ہے کہ نقطہ انجماد سے بھی بہت کافی ڈگری نیچے پہنچ جاتا ہے۔ یعنی وہی اُبلا ہوا پانی برف کی طرح جم جائے۔ اور اگر آپ کا لباس اتنا مضبوط اور سخت نہ ہوا کہ اس سردی کو برداشت کر سکے تو آپ یقیناً ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔

اس کے علاوہ ایک اور خطرہ بھی ہے جس سے آپ کا لباس آپ کی حفاظت کرے گا وہ جسم کے پھٹ جانے کا ہے۔ کیوں کہ چاند پر کسی قسم کی ہوا کا دباؤ تو ہے نہیں اس صورت میں جسم کے اندرونی حصّے کا دباؤ بڑھ جائے گا اور آپ کے جسم کی تمام نسیں پھٹ جائیں گی۔ اب یہ کام لباس ہی کا ہے کہ وہ آپ کے جسم پر اتنا دباؤ ڈالے رہے کہ نسیں نہ پھٹنے پائیں۔

چلتے چلتے آپ کو پیاس معلوم ہونے لگی آپ نے اپنی پانی کی بوتل جو آپ زمین سے بھر کر لائے ہیں کھولی اور جلدی سے دو چار گھونٹ پی لئے۔ پانی زرا احتیاط سے استعمال کیجئے گا۔ کیونکہ چاند پر کسی قسم کا پانی نہیں ہے۔ پھر یہ بوتل جس میں پانی رکھا ہے ایک خاص قسم کی ہونی چاہیئے کیونکہ ایسا نہ کیا تو یہ گرمی کی وجہ سے بھاپ بن کر اُڑ جائے یا سردی کی وجہ سے جم جائے گا۔ آپ پانی پی ہی چکے تھے کہ اتفاقاً آپ کی نظر آسمان پر پڑی اور اس وقت پھر آپ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب آپ نے دیکھا کہ آسمان پر پوری آب و تاب کے ساتھ چاند چمک رہا ہے "شاید ہم لوگ غلطی سے کسی دوسرے ستارے تک پہنچ گئے ہیں" فوراً آپ کے دل میں خیال آیا۔ لیکن ایسا

نہیں ہوا۔ آپ چاند پر ہی موجود ہیں۔ البتہ یہ چاند کی طرح چمکنے والی چیز آپ کی اپنی زمین ہے۔ کیونکہ اس پر بھی سورج کی روشنی پڑتی ہے جس سے یہ چمکتا ہے

چلتے چلتے آپ کو اپنی مشین کا خیال آیا جس میں بیٹھ کر آپ زمین سے چاند تک آئے تھے۔ آپ کو خیال ہو گا کہ آپ لوگ زیادہ سے زیادہ اس مشین سے تین چار فرلانگ کے فاصلے پر ہوں گے۔ لیکن جب آپ نے پیچھے مڑکر دیکھا تو آپ کو مشین کا دور دور پتہ نہ چلا۔ آپ کا خیال غلط تھا کیونکہ اس وقت آپ اپنی مشین سے تین چار میل کے فاصلے پر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چاند پر آپ کا ایک ایک قدم تیس تیس فٹ کا پڑ رہا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ زمین کی کشش آپ کو اپنی طرف کھینچے رکھتی ہے جس کی وجہ سے آپ زمین پر ایک خاص حد تک ہی کود یا اچھل سکتے ہیں۔ لیکن بر خلاف اس کے چاند کی کشش زمین کی کشش سے چھے گنی کم ہے اس لئے چاند پر آپ چھ گنا لمبا قدم یا چھ گنا اونچا کود بھی سکتے ہیں۔ دفعتاً آپ کا ایک دوست ایک پتھر سے ٹکرا کر نیچے گر پڑا آپ سب اس کو اٹھانے کے لئے بڑھے اور اس وقت آپ کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب آپ نے محسوس کیا کہ اُس کا وزن کئی گنا کم ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ بھی چاند کی زمین سے چھ گنا کم کشش ہے۔ اسی لئے اگر زمین پر آپ کا وزن ۴۸ سیر ہے۔ تو چاند پر یہ وزن صرف ۸ سیر ہوگا۔

ابھی آپ کو چاند پر آئے ہوئے چند گھنٹوں سے زیادہ نہ ہوئے تھے کہ آپ کے نگراں نے بتایا کہ اب ہم کو واپس جانے کی تیاری کرنا چاہئیے کیونکہ جو ہوا آپ اپنے ساتھ زمین سے لائے تھے وہ ختم ہونے لگی آپ خود بھی اس خطے کو جلد سے جلد چھوڑنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ہر طرف ایک ہی سا منظر دیکھتے دیکھتے آپ اُکتا گئے تھے۔ جدھر دیکھو اونچے اونچے نکیلے پہاڑ تھے یا گول گول غار۔ پھر ہر لمحہ تارے ٹوٹ ٹوٹ کر چاند کی سطح سے ٹکرا رہے تھے اور آپ کو خطرہ تھا کہ ان میں سے کوئی آپ پر نہ گر پڑے

بقیہ صفحہ ۳۴ پر

راشد حسن قادری



کیوں اور کس لئے

۱۔ وہ کون سا سوال ہے جس کا جواب "ہاں" کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا؟
ہ ـــ ا ـــ ن کا تلفظ بتاؤ۔

۲۔ شست باندھتے وقت سپاہی ایک آنکھ کیوں بند کرتے ہیں؟
اس لئے کہ وہ اگر دونوں آنکھیں بند کریں تو گولی نہیں مار سکتے۔

۳۔ نان بائی کو کیوں سب سے بڑا بے وقوف کہنا چاہیے؟
اس لئے کہ وہ خود روٹی کا محتاج ہے اور روٹی فروخت کرتا ہے۔

۴۔ حرص شام کی تاریکی سے کیوں مشابہ ہے؟
اس لئے کہ دم بدم بڑھتی جاتی ہے۔

۵۔ وہ عجیب شے کیا ہے کہ اُس میں سے جتنا نکالا جائے وہ اتنی ہی زیادہ بڑھتی ہے؟
سوراخ۔

۶۔ وہ کیا چیز ہے جس کے بغیر ریل گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی مگر وہ گاڑی میں لگی نہیں ہے؟

کھرے کھرے۔

۷۔ گھڑی اور روپیہ کیوں باہم مشابہ ہیں؟

دونوں خوب چلتے ہیں۔

۸۔ بیماری اور ڈاکٹر میں کیا مشابہت ہے؟

دونوں مریض کو چمٹ جاتے ہیں۔

۹۔ وہ کون ہے جو بادشاہ کی بھی بات نہیں سنتا؟

بہرا

۱۰۔ ایک اکیلا آدمی کب تمام گاؤں کو اپنے پیچھے بھگا سکتا ہے؟

جب لوگ اس کو نقب لگاتے دیکھ لیں اور وہ بھاگ نکلے۔

۱۱۔ چوہے اور ڈاکٹر میں کیا مشابہت ہے؟

دونوں کا بل ہوتا ہے۔

۱۲۔ کہاں ایک بدبخت اور مصیبت زدہ آدمی یقیناً ہمدردی پا سکتا ہے؟

لغت میں۔

۱۳۔ جو شخص خوشامد پسند نہ ہو اسیں کی خوشامد کس طرح کر سکتے ہیں؟

کہہ دیا جائے کہ آپ خوشامد پسند نہیں ہیں۔

۱۴۔ وہ کیا چیز ہے جس کی ہم بڑی آرزو رکھتے ہیں لیکن جب وہ ہم کو حاصل ہو جاتی ہے تو ہم فوراً اس کی طرف سے بے خبر ہو جاتے ہیں؟

نیند۔

۱۵۔ عربی میں سب سے لمبا لفظ کون سا ہے؟

"جمیلہ" اس لیے کہ "ج" اور "ہ" میں ایک "میل" کا فیصلہ ہے۔

۱۶۔ قرض ادا کرنے اور متاحل کرنے میں کیا مشابہت ہے؟

دونوں میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

۱۷۔ قبرستان اور کتب خانہ میں کیا مشابہت ہے؟

گذشتہ زمانے کے بڑے بڑے آدمی انہی دو جگہوں میں رہتے ہیں۔

۱۸۔ وہ کون قابلِ رحم شخص ہے جو اسی چیز پر جو لے ملتی ہے قناعت کر لیتا ہے؟

اُٹھائی گیرا۔

۱۹۔ نصیحت اور اخروٹ میں کیا مشابہت ہے؟

دونوں بڑے خشک ہوتے ہیں۔

۲۰۔ غصہ اور دولت میں کیا مشابہت ہے؟

دونوں کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔

ستّار صدیقی

پمفلٹ

کردار —

نسیم اور نریندر — دو لڑکے

خالد زماں — نسیم کے ابّا جان

پرکاش چندر — نریندر کے پتاجی

ناہید — نسیم کی چھوٹی بہن

(رات کے آٹھ بجے ہیں۔ نسیم اور نریندر ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ نریندر آج شام ہی اپنے پتاجی کے ساتھ نسیم کے یہاں آیا ہے — ڈرائنگ روم میں ان کے علاوہ خالد زماں، پرکاش چندر، نسیم کی امّی جان اور ناہید بھی ہیں۔ یہ لوگ کسی اہم موضوع پر باتیں کر رہے ہیں — کبھی کبھی ناہید کی بھولی باتوں سے کمرے کی فضا قہقہوں سے گونج اٹھتی ہے — یکایک دور سے نعروں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ سب لوگ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں "آپ کے ووٹ کے جائز حقدار محمد میاں ہیں" "محمد میاں زندہ باد" "آپ کی گولک کا نشان شیر ہے"

اور اسی قسم کے دوسرے نعروں سے رات کی خاموشی میں ہلچل مچ جاتی ہے)

نریندر۔ (نسیم سے) یہ نعروں کی آواز کہاں سے آرہی ہے؟

نسیم۔ شہر میں شاید کوئی جلوس نکل رہا ہے۔

نریندر۔ کاہے کا جلوس نکل رہا ہے؟

نسیم۔ آج کل ہمارے یہاں میونسپلٹی کے چناؤ ہو رہے ہیں۔ شہر میں عجیب چہل پہل نظر آتی ہے۔ گلی کوچوں میں بچے تک جلوس نکالتے پھرتے ہیں۔ یہ شاید محمد میاں کی پارٹی کے جلوس کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ چلو باہر چل کر سنیں، یہاں آواز صاف سنائی نہیں دیتی۔

(دونوں باہر چلے جاتے ہیں۔ نعروں کی آواز اب زیادہ صاف سنائی دیتی ہے)

نریندر۔ بھائی نسیم! یہ تو اُن ہی کے جلوس کا شور ہے۔ سنئے تو "محمد میاں زندہ باد" کے نعروں کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔

نسیم۔ واقعی۔ یہ تو اُن ہی کی پارٹی کا جلوس ہے۔

نریندر۔ مگر بھائی! یہ تو بتائیے الکشن کسے کہتے ہیں؟

نسیم۔ آپ نہیں جانتے؟ بس بالکل ایسا ہی سمجھئے، جیسا آپ کے گاؤں کی پنچایت کا چناؤ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں پر چونکہ بہت سے آدمی رہتے ہیں، اس لئے انکی رائے معلوم کرنے کے لئے زیادہ انتظام اور زیادہ تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے۔

نریندر۔ نسیم بھائی! آخر اس چھوٹے سے کام کے لئے جلوس وغیرہ کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیوں نہ لوگ ایک جگہ بیٹھ کر کسی مناسب شخص کا چناؤ کر لیں۔ میرے خیال میں یہ زیادہ آسان بھی ہے اور بہتر بھی۔

نسیم۔ بات تو واقعی بہت آسان ہے۔ مگر بھیا! شہر کے لوگ گاؤں والوں کے مقابلہ میں ذرا زیادہ مقابلہ پرست ہیں۔ میری سمجھ میں خود نہیں آتا کہ آخر اتنے بڑے بڑے جلوسوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ چلو اندر چلیں، ابا جان اور چچا میاں سے پوچھیں گے۔

(دونوں اندر چلے جاتے ہیں)

نریندر۔ (خالد زماں سے) چچا جان! ذرا یہ تو بتائیے کہ الکشن میں اتنے بڑے بڑے جلوس کیوں نکلتے ہیں۔ ہمارے یہاں گاؤں

کی پنچایت کے چناؤ میں تو ایسا نہیں ہوتا ــــ ؟

خالدزماں۔ بیٹا! بات یہ ہے کہ شہر میں بہت زیادہ لوگ رہتے ہیں۔ اس لئے یہاں ممبری کے لئے امیدوار بھی بہت ہوتے ہیں ــــ ان میں سے ہر ایک یہی کوشش کرتا ہے کہ وہ ممبر چُن لیا جائے۔

ناہید۔ (بیچ میں بولتے ہوئے) ابّا جان! میلی گُڑیا دیکھئے کیسی اچھی ہے۔

خالدزماں۔ بیٹی! کیا یہ تم ہی نے بنائی ہے؟

ناہید۔ ہاں ہاں ابا! مُجھے بھی اچھی گُڑیاں بنانا آتی ہیں۔ (نسیم ناہید کو بہلا کر باہر لے جاتا ہے واپس آکر پھر باتوں میں شریک ہو جاتا ہے)

نسیم۔ ابّا جان! جلوس میں تو روپیہ بھی بہت خرچ ہوتا ہوگا؟ ــــ الکشن میں آخر اتنا روپیہ خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے....؟

(نریندر بیچ میں بولتے ہوئے)

نریندر۔ چچا جان! آپ بتلایئے یہ تو یوں ہی فضول باتیں کیا کرتے ہیں؟

نسیم۔ (بگڑتے ہوئے) اور آپ جیسے خود بڑے عقلمند ہیں؟

(خالدزماں دونوں لڑکوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں ــــ پرکاش صاحب جو بڑے غور سے دونوں کی باتیں سُن رہے تھے، اب ایک کتاب اٹھا کر پڑھنے لگتے ہیں)

خالدزماں۔ ہاں! تو میں یہی کہہ رہا تھا کہ ان امیدواروں میں سے ہر شخص یہی کوشش کرتا ہے کہ وہ ممبر چُن لیا جائے۔ اس کے لئے بہت سے تو بڑی بے جا حرکتیں کرنے لگتے ہیں ــــ روپیوں سے لوگوں کی رائے خریدنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ایسے آدمیوں کی فتح ذرا کم ہی ہوتی ہے۔ جو لوگ واقعی ممبری کے لائق ہوتے ہیں، انھیں لوگ بنا کسی لالچ کے ووٹ دیتے ہیں۔ اب ہمارے دیش کے سب ہی لوگ اپنے بُرے بھلے کو سمجھنے لگے ہیں۔ اور جیسے جیسے تعلیم بڑھنے لگے گی، لوگ ان باتوں کو سمجھتے جائیں گے۔

نریندر۔ چچا جان! آخر ایسے آدمیوں کو کھڑا ہونے کا موقع ہی کیوں دیا جاتا ہے؟

نسیم (جو پہلے سے ہی موقع کی تاک میں بیٹھا ہوا تھا)۔ ایسے آدمیوں کو نہیں تو کیا آپ کو موقع دیا جائے؟

نریندر۔ (حاضر جوابی سے) نسیم صاحب!

ہم ہی لوگ بڑے ہوکر اپنے دیش کے وزیر، صدر اور سب کچھ بنیں گے۔

خالد زماں۔ (نریندر اور نسیم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے) بیٹا نریندر! بات تو تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن ابھی ہمارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ کم ہیں، اس لئے اس قسم کی باتیں ہوا کرتی ہیں، ورنہ دوسرے ملکوں میں تو لوگ اگر جلوس بھی نکالتے ہیں، تو ان کی یہ شکل نہیں ہوتی — بڑے بڑے جلسوں میں اپنے امیدوار کی خوبیاں بیان کرتے ہیں، لیکن مخالف کی بُرائیاں نہیں — پھر اس کے علاوہ وہاں کے لوگ اپنی رائے آزادانہ طور پر استعمال کرتے ہیں — شور وغل سے تو اُن لوگوں کو خدا واسطے کا بیر ہے۔

نسیم۔ ابا جان! یہ باتیں تو ہم سمجھ گئے، مگر یہ تو بتایئے اس الکشن کے بعد جو لوگ ممبر چُن لئے جائیں گے، اُن کا کیا کام ہوگا؟

نریندر۔ (ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے) چچا جان! میں بھی یہی پوچھنے والا تھا۔

خالد زماں۔ بات یہ ہے کہ جب —!

(ناہید دوڑتی ہوئی کمرے میں گھس آتی ہے اور خالد زماں سے لپٹ جاتی ہے)

ناہید۔ ابا جان! امی ہمیں مارتی ہیں۔

(خالد زماں ناہید کو پیار کرنے لگتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ناہید سو جاتی ہے)

نسیم۔ (آہستہ سے نریندر سے) چلو بھئی یہ بلا ٹلی، ورنہ یہ ناہید اور ہمیں ابا جان سے باتیں کرنے دیتی۔

نریندر۔ (خالد زماں سے) چچا جان! تو آپ کیا بتلا رہے تھے ہمیں؟

خالد زماں۔ ہاں! تو جب یہ لوگ منتخب ہو جاتے ہیں، اُن کا ایک بورڈ بن جاتا ہے...!

نریندر۔ (جلدی سے بولتے ہوئے) جیسے ہمارے گاؤں کی پنچایت؟

خالد زماں۔ ہاں! مگر تمھارے گاؤں کی پنچایت میں اور اس میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اور وہ فرق بھی صرف آبادی کے کم اور زیادہ ہونے کی وجہ سے ہے۔

نسیم۔ ابا جان! تو کیا بورڈ کا بھی کوئی "سرپنچ" ہوتا ہے؟

خالد زماں۔ ہاں بیٹا! یہاں بھی ایک سرپنچ ہوتا ہے، جسے پریسیڈنٹ یا صدر کہتے ہیں

اس کے چناؤ کا طریقہ پہلے سے اب بدل گیا ہے۔ پہلے اسے چُنے ہوئے ممبر چُنتے تھے، لیکن اب شہر کا ہر رہنے والا اس کے انتخاب میں اپنی رائے دیتا ہے — پہلے کے مقابلہ میں اب اس کو اختیارات بھی زیادہ مل گئے ہیں۔

نریندر۔ چچا جان! یہ تو بالکل ہمارے گاؤں کی پنچایت کی طرح ہی ہے۔ لیکن ذرا یہ اور بتایئے کہ یہ شہر کی پنچایت کام کیا کیا کرتی ہے — کیا یہ شہر کے جھگڑوں کا فیصلہ بھی کرتی ہے؟

خالدزماں۔ (پرکاش چندر سے) اماں کتاب ہی پڑھتے رہوگے — کچھ آپ بھی تو انھیں بتائیں، میں تو تھک گیا —!

پرکاش چندر۔ اب کیوں مجھے بھی پریشان کرتے ہو — خود ہی سمجھا دو۔

نریندر۔ چچا جان! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔

خالدزماں۔ اوّل تو یہ سمجھ لو کہ اس شہر کی پنچایت کو میونسپلٹی کہتے ہیں — رہے کام، تو وہ تقریباً سب وہی ہیں جو گاؤں کی پنچایت کے۔ مثلاً شہر میں پکی سڑکیں، پارک اور کھیل کے میدان بنوانا، صحت و صفائی، روشنی، بچوں اور بڑوں کی تعلیم کا انتظام کرنا، بیماروں کے لئے مفت علاج کے اسپتال کھولنا، گھروں میں صاف پانی کا انتظام کرنا اور بہت سے اسی قسم کے دوسرے مفید کام — مگر یہ شہر کے جھگڑوں کا فیصلہ نہیں کرتی۔

نسیم۔ ابّا جان! ان سب کاموں کے لئے روپیہ کہاں سے آتا ہے؟

خالدزماں۔ اس کے لئے میونسپلٹی شہر والوں پر بہت سے ٹیکس لگا دیتی ہے۔ شہر کے اندر آنے والے مال پر چُنگی سے بھی بہت سا روپیہ وصول ہو جاتا ہے۔ بعض میونسپلٹیاں تو سینما گھر اور چھوٹے موٹے کارخانے بھی کھول دیتی ہیں، جن سے بہت سی آمدنی ہو جاتی ہے — اس کے علاوہ صوبہ کی سرکار بھی ہر میونسپلٹی کو امداد کی صورت میں کچھ رقم دیتی ہے۔

نریندر۔ چچا جان! اتنے بڑے شہر میں اتنے بہت سے کام میونسپلٹی کس طرح کرتی ہوگی؟

خالدزماں۔ بیٹا! ہوتا یہ ہے کہ مختلف کاموں کی چھوٹی چھوٹی کمیٹیاں بنا دی جاتی ہیں۔ ہر کمیٹی میں کچھ ممبر اور ایک چیرمین ہوتا ہے، جو ممبر آپس میں سے کسی کو چُن لیتے ہیں۔ ہر کمیٹی کے سپرد

ایک کام کر دیا جاتا ہے۔ جو اپنے کام کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ مثلاً کسی کے ذمہ بچوں اور بالغوں کی تعلیم، کسی کے سپرد شہر کی صحت و صفائی کا انتظام اور کسی کے ہاتھ میں سڑکیں اور عمارات بنوانے کا کام دیدیا جاتا ہے۔ اس طرح سب کام نہایت آسانی سے ہو جاتے ہیں۔

نسیم۔ ان کمیٹیوں کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟

خالد زماں۔ ہر کمیٹی چونکہ میونسپل بورڈ کے سامنے اپنے کاموں کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس لئے بورڈ ہی ان کے کاموں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اپنے کاموں کو آسانی سے چلانے کے لئے، ہر کمیٹی اپنے کاموں کے بارے میں تجویزیں پاس کر کے منظوری کے لئے بورڈ میں بھیج دیتی ہے۔ یہاں اس پر غور کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ممبروں کی رائے لے کر تجویز منظور یا نا منظور کر دی جاتی ہے۔

نریندر۔ (انگڑائی لیتے ہوئے) بھائی نسیم! مجھے تو اب نیند آنے لگی۔ کل صبح چچا میاں سے اور باتیں پوچھیں گے ـــــ!

خالد زماں۔ ہاں بیٹا! جاؤ اب سوؤ۔ رات کے ساڑھے دس بج چکے ہیں۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔

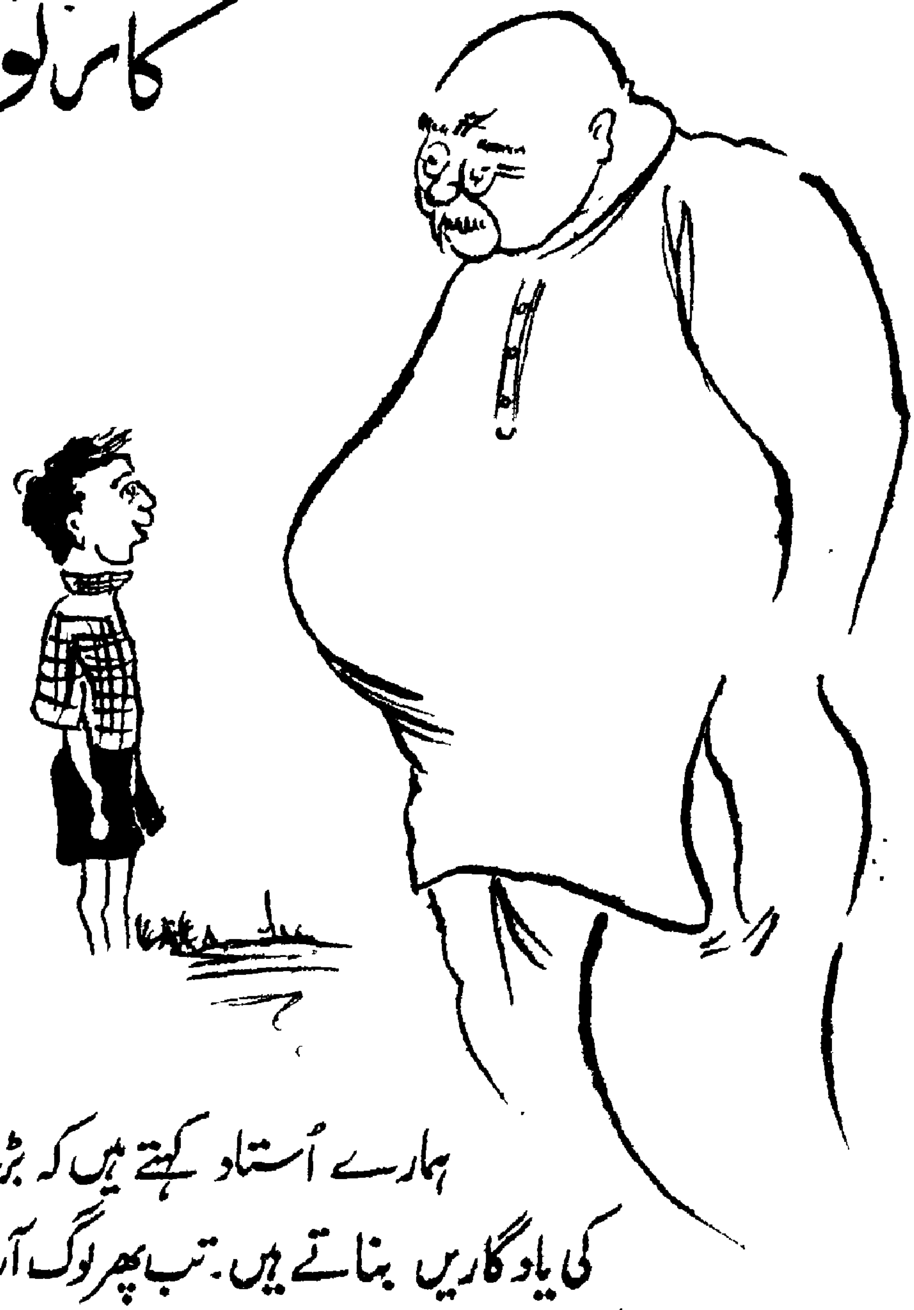
نسیم اور نریندر سونے کے لئے دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں)

لالچی بڑھیا صفحہ ۵۴ سے آگے

اور اس نے جوں ہی ٹوکری کا ڈھکن کھولا۔ ایک چیخ ماری اور تھر تھر کانپنے لگی۔ اس میں سے خطرناک زہریلے سانپ، بچھو اور طرح طرح کے کیڑے مکوڑے برآمد ہوئے، جنھوں نے چاروں طرف سے بڑھیا کو گھیر لیا۔ اور اژدہوں نے اس کے سارے جسم کو جکڑ لیا۔

زرا سی دیر میں بڑھیا مرگئی۔ بڑھیا کے مرنے کے بعد بڈھا اطمینان سے رہنے لگا۔ اس نے ایک یتیم لڑکے کو گود لیا اسے پڑھایا لکھایا اور ہمیشہ نصیحت کرتا رہا ـــــ "بیٹا ـــــ غریبوں پر رحم کرنا۔ دوسروں کے کام آنا۔ اور لالچ نہ کرنا۔ اور وہ دونوں بڑے عیش و عشرت کی زندگی گزارتے رہے۔

کارٹون



ہمارے اُستاد کہتے ہیں کہ بڑے آدمیوں کی یادگاریں بناتے ہیں۔ تب پھر لوگ آپ کی یادگار کیوں نہیں بناتے۔



بچوں کی کوششیں

چالاک آدمی

ایک دن ایک راجہ اکیلا شہر کے باہر گیا۔ اس نے ایک آدمی کو ایک پیڑ کے نیچے بیٹھا ہوا دیکھا۔ اُس آدمی کے پاس گیا اور اُس سے پُوچھا کہ اس شہر کا راجہ کیسا ہے۔ رحم دل یا ظالم۔

اُس نے جواب دیا بڑا ظالم ہے۔" راجہ نے کہا "تم مجھے جانتے ہو؟"

اُس نے جواب دیا "نہیں"

راجہ نے کہا "میں اس شہر کا بادشاہ ہوں"

وہ آدمی بڑا گھبرایا اور بولا۔

"آپ کو معلوم ہے میں کون ہوں" بادشاہ نے جواب دیا "نہیں"

اُس نے کہا کہ میں ایک سوداگر کا بیٹا ہوں۔ ہر مہینہ کے تین دن اپنے حواس میں نہیں رہتا ہوں۔ اُن دنوں میں سے ایک آج کا دن بھی ہے۔

بادشاہ یہ سُن کر چُپ ہو گیا اور چلا گیا۔ (ترجمہ)

چودھری محمد انوار سندیلوی درجہ نہم

ایک چالاک گاہک

ایک دفعہ ایک آدمی ایک حلوائی کے ہاں گیا اور اُس نے لڈوؤں کا بھاؤ پوچھا تو حلوائی نے کہا کہ وہ دو آنے کے تین ہیں۔ اس آدمی نے حلوائی سے کہا کہ مجھے دو آنے کے لڈو دو۔ جب حلوائی لڈو دینے لگا تو اس کی نظر پیڑوں پر پڑی اس نے پوچھا پیڑے کیسے دیتے ہو۔ اُس نے کہا یہ بھی دو آنے کے تین ہیں۔ تو آدمی نے کہا "مجھے لڈوؤں کے بجائے پیڑے دو۔ جب حلوائی پیڑے دینے لگا تو اس نے ایک تھال میں رکھے ہوئے گلاب جامنوں کی طرف دیکھا۔ اور ان کا بھاؤ دریافت کیا۔ تو حلوائی نے کہا گلاب جامن بھی دو آنے کے تین ہیں۔ تو گاہک نے کہا کہ مجھے گلاب جامن پیڑوں کے بدلے میں دو۔ اتنے میں حلوائی کا نوکر تازہ بنے ہوئے رس گلے لے کر باہر نکلا۔ گاہک نے اسے دیکھتے ہی کہا کہ مجھے گلاب جامن کے بدلے رس گلے دیدو۔ حلوائی کو غصہ آگیا اس نے گاہک کو کہا چل بھاگ یہاں سے میں تجھے کچھ نہ دوں گا۔ تو مجھے پریشان کرتا ہے۔ گاہک نے کہا بھائی مجھے اب رس گلے دے دو میں پھر کچھ نہیں لوں گا۔ حلوائی نے اسے ۳ رس گلے دے دیئے اور گاہک رس گلے کھا کر جانے لگا۔

حلوائی نے اُسے روکا اور کہا کہ "پیسے تو دیتے جاؤ۔"

گاہک :۔ "کس چیز کے۔"

حلوائی :۔ رس گلوں کے۔"

آدمی :۔ میں نے تو رس گلے گلاب جامن کے بدلے لیے۔

حلوائی :۔ تو گلاب جامن کے پیسے دو۔

گاہک :۔ وہ میں نے پیڑوں کے بدلے میں لیئے تھے۔

حلوائی :۔ تو پیڑوں کے پیسے۔

آدمی :۔ پیڑے تو میں نے لڈوؤں کے بدلے لیئے تھے۔

حلوائی :۔ تو لڈوؤں کے پیسے۔

گاہک :۔ وہ تو میں نے واپس کردیئے تھے۔

یہ کہہ کر گاہک چلتا بنا اور حلوائی منہ دیکھتا رہ گیا۔

از سید ابوالحسن۔ ناندیڑ دکن

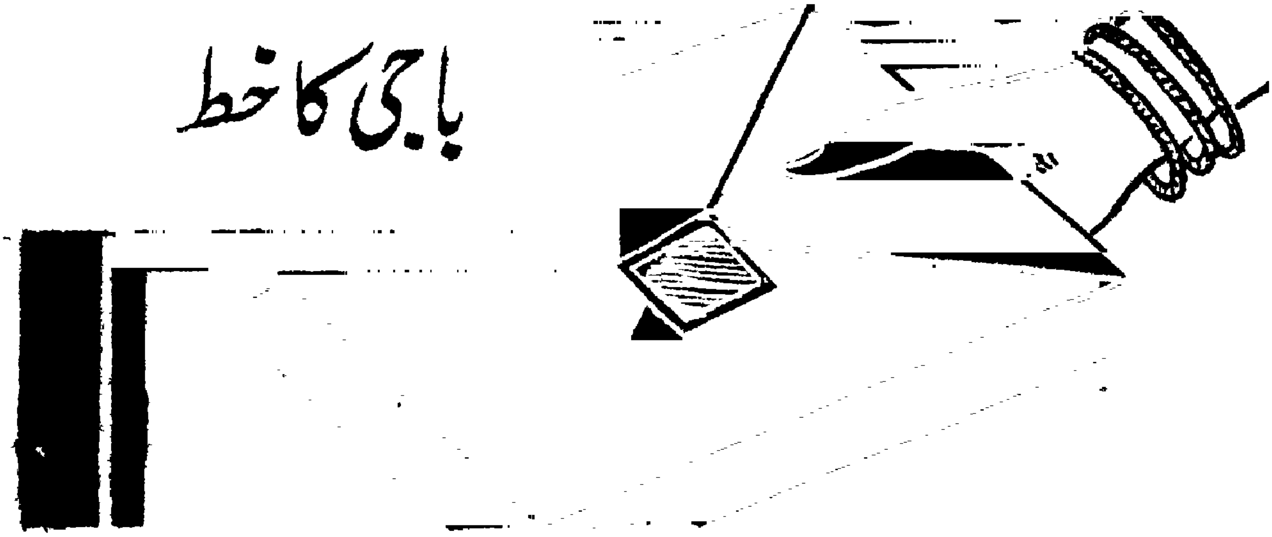
بہادر لڑکا

ایک گاؤں میں ایک لڑکا رہا کرتا تھا۔ اس کے ماں باپ بہت غریب تھے۔ اس کے والد بھی مر چکے تھے۔ اُس کی ماں کہیں سے روٹی مانگ کر کھلاتی تھی۔ ایک دن لڑکے نے اپنی ماں سے کہا کہ اماں مجھے ایک کتاب خرید دو۔ ماں نے کہا کہ میں داروغہ جی کے یہاں جاتی ہوں۔ اگر وہ پیسے دے دیں گے تو کتاب خرید دوں گی۔ ماں داروغہ جی کے یہاں گئی۔ اور چار آنے لے آئی۔ پھر ایک کتاب خرید دی۔ اس کتاب سے اُس نے بہت سے جانوروں کی معلومات حاصل کر لی۔ ایک دن وہ کسی جانور کے بارے میں کچھ پڑھ رہا تھا کہ اُس کی ماں بھاگی بھاگی آئی۔ اور بیٹے سے کہا کہ آج اس گاؤں میں ایک شیر آیا ہوا ہے۔ لڑکا یہ سُن کر بہت گھبرایا۔ مگر اسے شیر کے بارے میں بہت کچھ معلومات تھی۔ یہ باتیں ابھی سُنی ہی رہا تھا کہ اُسے جوش پیدا ہوا۔ اور ایک دن وہ چُپکے سے جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک جنگل میں پہنچا۔ پھر وہ چلنے لگا۔

ابھی اسے چلتے چلتے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ ایک بہت بڑے جنگل میں پہنچ گیا۔ ابھی وہ پہنچا ہی تھا کہ اُسے شیر کے دھاڑنے کی آواز آئی۔ تو وہ اُس آواز کی طرف چل پڑا۔ اُس نے دیکھا کہ شیر غار کے اندر دھاڑ رہا ہے۔ پھر وہ کچھ سوچنے لگا۔ اس کے بعد اسے ایک ترکیب سوجھی۔ پھر وہ جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ اور بہت جھاڑیاں لاکر غار کے اندر ٹھونس دیا۔ اور گھر چلا آیا۔ اور ماں نے پوچھا کہ تم کہاں تھے۔ اُس نے سب بتا دیا۔ اس کی ماں بہت خوش ہوئی۔ اور گاؤں والے بھی۔

صلاح الدین نعمانی
درجہ چہارم — عمر ۹ سال
مدرسہ ابتدائی

پیامِ تعلیم میں چھپنے کے لئے جو مضمون بھیجئے اُسے ایک سطر چھوڑ کر لکھئے۔



باجی کا خط

پیاری بچیو!

لیجئے سردی آ گئی۔ گرم کپڑے نکلنے شروع ہو گئے جس کے ہاتھ میں دیکھئے۔ سلائیاں اور اون ہے۔ آپ کا بھی دل چاہتا ہوگا کہ بنیں۔

اپنے ہاتھ سے بن کر پہننے اور پہنانے میں بڑا لطف آتا ہے۔

اچھی بچیاں بازار کے سوئٹر پسند نہیں کرتیں: آج کل تو گھر میں سوئٹر، مفلر، دستانے، موزے، ٹوپ فراک وغیرہ بنانے کا عام دستور ہو گیا ہے۔ لیکن جس طرح کڑھائی اور سلائی میں صفائی کا خیال رکھا جاتا ہے اسی طرح بنائی میں بھی خاص طور سے کئی باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔

ورنہ سوئٹر کی خوبصورتی چلی جائے گی۔

پہلی بات تو یہ کہ اون بہت نرم لپیٹیں۔ بعض بہنیں بہت سخت لپیٹتی ہیں۔ اس سے اون خراب ہو جاتا ہے دوسری بات یہ کہ اون نے لئے ایک تھیلی سئیں: اس پر پھول وغیرہ کاڑھ سکتی ہیں۔

اس میں اون رکھیں، پھر ذرا ڈھیلا بنیں۔ بہت کس ہوا۔ سوئٹر خوبصورت نہیں



معلوم ہوتا۔

پھر انداز سے پھندے ڈال کر بنائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ڈھیلا ہو یا تنگ اور پھر ادھیڑنا پڑے میں نے کئی اچھی بننے والیوں کو دیکھا ہے کہ ایک سوئٹر کئی دفعہ ادھیڑتی ہیں۔

اس کا علاوہ اس کا بھی خیال رہے کہ زیادہ دن نہ لگیں یعنی ایک سوئٹر اگر لگا لیا تو پھر اسی میں ہو گیا ایک مہینہ۔

بچیاں اگر شروع ہی سے ان باتوں کو نظر میں رکھیں گی تو ان کے کام میں صفائی آئیگی

اب ذرا ابتدائی خانہ بھی سیکھ لیجئے۔ اس کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ دونوں سلائیوں سے خانے ڈالے جاتے ہیں دوسرا طریقہ جو میں لکھ رہی ہوں زیادہ اچھا ہوتا ہے۔

اس طریقے میں ایک فائدہ یہ ہے کہ نیچے سے بارڈر جتنا چاہو تان لو وہ پلاسٹک کی طرح تن جاتا ہے۔ دوسرے نیچے سے بھی اچھا معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد سلائی کو سیدھے ہاتھ میں قلم کی طرح پکڑیئے۔ کئی بچیاں اس طرح پکڑتی

ہیں جیسے کسی کو لکڑی مارنے اٹھا رہی ہوں یہ طریقہ بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے

پہلے طریقہ کو دیکھئے۔ سیدھے ہاتھ میں سلائی ہے ایک پھندا ڈالئے اور ڈالنے سے پہلے ایک گز کے قریب اون چھوڑ دیں تاکہ پورے پھندے آسانی سے ڈل سکیں۔

اب نمبر دو طریقہ دیکھیں۔ یہ دوسرا قدم ہے پھر تیسرے اور چوتھے سے بخوبی سمجھ میں آجائے گا۔

لیجئے پھندے پڑ گئے اب بنائی شروع کیجئے۔ اور باتیں آئندہ ہوں گی۔

آپ کی۔ باجی

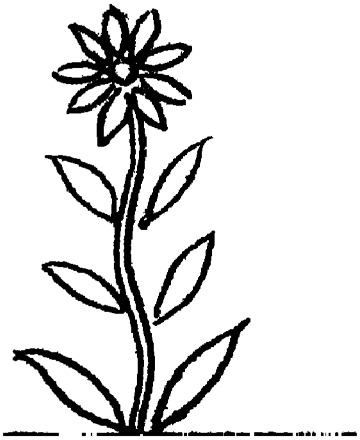
ہاں تم نے مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی کی تصویر تو نہیں دیکھی ہوگی۔ تصویر دیکھو گے تو تمہارا بھی دل گواہی دے گا کہ ان پاکیزہ نظموں کا لکھنے والا بے شک ایسا ہی شریف آدمی ہو سکتا ہے۔ وہ ان کی بڑی بڑی روشن آنکھیں، وہ ان کی اونچی پیشانی وہ ان کی سفید براق سی بھری ہوئی داڑھی، وہ ان کا نورانی چہرہ، سبحان اللہ، ناممکن ہے کہ ایسی شریفانہ شکل دیکھو اور اس کے لئے آنکھوں میں عزت اور دل میں محبت نہ پیدا ہو جائے۔

اس مرتبہ سرورق کے دوسرے صفحہ پر مولانا کی تصویر بھی دیکھ لو۔

صفحہ ۱۰ کا بقیہ

بھلا بھیڑیئے کی پرواہ کرتا ہوں"۔

اب گدھا اکیلا رہ گیا۔ ذرا سی دیر کے بعد ہی اس کا دل گھر کے اندر گھبرانے لگا اور اس نے سوچا کہ چلو سیر کر آئیں، اس نے اپنے منہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ اب جو اس کی شامت آئی تو تھوڑی دیر کے بعد میں کھیت میں کھڑے ہو کر ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگا، بھیڑیا کہیں پاس ہی تھا۔ وہ یہ آواز سنتے ہی بھاگا آیا اور گدھے کو چیر پھاڑ کر چٹ کر گیا، جب کسان اور مرغا لوٹ کر آئے تو انھیں صرف گدھے کی ہڈیاں کھیت میں ملیں۔ مرغے کو اپنے دوست کی موت کا بہت افسوس ہوا مگر وہ بھی کیا کرتا۔ شیخی خوروں کا یہی حال ہوتا ہے۔



کابُل

افغانستان کا دارالسلطنت

کابل کا نام آپ نے سُنا ہوگا۔ وہی کابل جہاں کے رہنے والے کابلی کہلاتے ہیں۔ جو ہمارے یہاں جاڑے کے دنوں میں میوے وغیرہ بیچتے نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ افغانستان کے دارالسلطنت کابل سے آتے ہیں۔ کابل افغانستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی تین لاکھ کے لگ بھگ ہے اور یہ بہت پُرانا شہر ہے۔ پُرانے زمانے میں کابل تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا اب سے دو ہزار برس پہلے ہندوستان سے چین جانے کے لئے قافلے اِدھر سے ہی ہو کر گزرتے تھے۔ آج کل افغانستان کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی شہر ہے۔ اور یہیں سے سارا کاروبار ہوتا ہے۔

کابل ۵۷۰۰ فٹ کی بلندی پر پہاڑی پر بسا ہوا ہے۔ اس کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں جو ۱۲ ہزار فٹ تک اونچے چلے گئے ہیں اور ہمیشہ برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ یہاں جاڑے میں جنوری اور فروری کے مہینے میں بڑی سردی پڑتی ہے اور اتنی برف گرتی ہے کہ بہت دنوں تک زمین پر پڑی رہتی ہے۔ اس وقت تو کابل سچ مچ دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ اتنا خوبصورت شہر معلوم ہوتا ہے کہ بس کچھ مت پوچھئے۔ کروڑوں روپے خرچ کرکے بھی کسی شہر میں اتنی برف نہیں

بچھوائی جا سکتی۔ مکانوں کی چھتوں پر برف، درختوں پر برف، کارخانے کی چمنیوں پر برف، غرض چاروں طرف نظر جاتی ہے برف ہی برف ہوتی ہے۔ اوپر سے دھیرے دھیرے برف گرتی ہے۔

کابل افغانستان کی تعلیم کا بھی بہت بڑا مرکز ہے۔ یہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بہت بڑی یونیورسٹی بھی ہے۔

جس طرح دہلی میں نئی دہلی اور پرانی دہلی ہے اسی طرح کابل میں بھی نیا کابل اور پرانا کابل ہے۔

پہاڑی علاقہ ہونے کے باوجود یہاں کی آبادی بڑی گھنی ہے۔ یہاں پر آپ کو ہر جگہ پھل ہی پھل نظر آئیں گے۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ یہ پھل سستے بھی بہت ہوتے ہیں۔

یہاں دو سینما ہال بھی ہیں۔ جن میں ہمارے یہاں کی فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ ان کو یہاں کے لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کابل والے ہندوستانیوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ہمارا افغانستان سے بڑا پرانا رشتہ ہے۔ اور یہ رشتہ دن بدن مضبوط ہوتا جا رہا ہے۔

بقیہ چاند کا سفر ص۲۶ سے آگے

اس لئے آپ جلدی مشین کی طرف واپس آ گئے۔ اور چاند کی سطح پر ایک آخری منظر ڈال کر آپ مشین میں بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دن بعد آپ زمین پر اخبار نویسوں کے جھمگٹے میں بیٹھے تھے۔ اور ایک اخبار نویس آپ سے پوچھ رہا تھا کہ آپ میں سے کس نے چاند پر پہلے قدم رکھا۔ اور یہ سن کر آپ ہنس پڑے۔ کیونکہ اس کا تو آپ نے کبھی خیال بھی نہ کیا تھا۔

بقیہ بچوں سے باتیں ص۳ سے آگے

ایلس انوکھی دنیا میں۔	جناب اسمٰعیل سعد صاحب
۲۔ موہن جو داڑو اور ہڑپا	" اقبال احمد صاحب
۳۔ یو، این، او	" احسن حامد صاحب
۴۔ انتخابِ گلستاں	" حفیظ الدین صاحب
۵۔ لوہے کی کہانی	" شیکھر صاحب
۶۔ کوئلے کی کہانی	" "
۷۔ گھڑی کی کہانی	" "
۸۔ گوتم بدھ	" شری چندر اگنی ہوتری

اُمید ہے کہ یہ کتابیں جلد شائع ہو سکیں گی۔

اسرار ندوی

پری کا انعام

تین بھائی تھے۔ ان کے پاس ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ گرمی کی تپتی دوپہر ہوتی یا برسات کی کالی رات، پھاوڑا کدال لیئے، تینوں بھائی باغ میں لگے رہتے۔ پیڑ پڑے۔ جبھی تو ان کا باغ سدا ہرا بھرا رہتا تھا۔

گرمی کی ایک دوپہر تھی۔ غضب کی لو چل رہی تھی۔ تینوں بھائی اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ ٹھیک اسی وقت آسمان پر پریوں کا ایک تخت اڑتا جا رہا تھا۔ ایک بوڑھی پری ادھر سے گزر رہی تھی۔ اس نے ان لوگوں کی جو محنت دیکھی تو اس کو ترس آگیا۔ اس نے سوچا ان لوگوں کو کچھ انعام دینا چاہیئے۔ وہ فوراً نیچے اتر آئی اور ایک فقیرنی کا بھیس بدل کر باغ میں داخل ہو گئی۔

ان لوگوں نے اس بھری دوپہر میں ایک پریشان حال فقیرنی کو جو دیکھا تو دوڑ پڑے۔ کوئی ٹھنڈا پانی لایا، کسی نے پھلوں کا رس نچوڑا۔ کسی نے شربت بنایا۔ تینوں اس کی خاطر تواضع میں بچھ گئے۔ فقیرنی بے حد خوش ہوئی۔ اس نے اپنے کو ظاہر کر دیا

اور کہا" اس وقت جو کچھ تم لوگ مانگو گے ملے گا۔ میں تم لوگوں سے مل کر بے حد خوش ہوئی۔ بولو کیا چاہتے ہو؟"

ایک بھائی بولا" میں چاہتا ہوں کہ امیر کبیر بن جاؤں"

پری" ایسا ہی ہوگا۔ لیکن اپنی دولت کو اچھے کام میں لانا"

دوسرا بھائی" میں چاہتا ہوں کہ بہت بڑا زمین دار بن جاؤں"

پری" ایسا ہی ہوگا، لیکن غریبوں پر رحم کرنا"

تیسرا بھائی" مجھے ایک سگھڑ بیوی چاہیئے جو میرے کاموں میں میری مدد کرے"

پری" بھئی یہ کام ذرا ٹیڑھا ہے۔ اچھا کوشش کروں گی۔ امید رکھو"

تینوں کی مرادیں پوری ہو گئیں۔ دو بھائیوں نے تو اپنے لئے محل کھڑے کرائے اور اسی میں اٹھ گئے۔ ایک بے چارہ اسی باغ میں رہتا تھا۔ لیکن اس جھونپڑی کو اس کی سگھڑ بیوی نے پھول کی بیلوں اور گملوں سے ایسا سجایا تھا کہ بس دیکھا کیجئے۔

کوئی دو سال بعد پری کو ان بھائیوں کا خیال آیا کہ" دیکھوں کس رنگ میں ہیں یہ لوگ" اس بار اس نے کوڑھی کا روپ بدلا۔ سارا جسم رسنے لگا۔ پہلے وہ امیر کبیر بھائی کے پاس گئی۔ ابھی وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکی تھی کہ اس نے نوکروں کو پکارا" کوئی ہے! نکالو اسے۔ یہ کیوں یہاں گھس آئی؟"

بڑھیا نے ڈانٹا" خبردار جو کوئی اِدھر بڑھا۔ میں وہی ہوں جس کی بدولت تمہیں یہ محل ملا ہے۔ میں تمہیں جانچنے آئی تھی۔ جاؤ تم پہلے ہی کی طرح غریب ہو جاؤ۔ تمہارا دل آج سے پہلے ہی اچھا تھا"

پھر وہ زمین دار بھائی کے پاس گئی۔ "خدا کی راہ میں مٹھی بھر کھانا کھلا دو۔ بہت بھوکی ہوں"

زمین دار بھائی نے ڈانٹ بتائی" چل چل بڑی وہاں سے آئی ہے خدا کی راہ میں لینے والی یہاں کچھ رکھ گئی ہے جو مانگ رہی ہے۔ بھوکی ہے تو جا کہیں مر جا"

بڑھیا گرجی" میں وہی ہوں جس کی

بقیہ صفحہ ۱۹ پر

ہندوستان میں ایک نئی ریاست آندھرا

آپ نے پچھلے دنوں اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ ہمارے ملک میں آندھرا کے نام سے یکم اکتوبر ۵۳ء کو ایک نئی ریاست بنی ہے۔ اس طرح پہلے ہمارے ملک میں ۲۷ ریاستیں تھیں اب ۲۸ ہوگئیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ ریاست آئی کہاں سے۔ دراصل آندھرا پہلے ریاست مدراس ہی کا ایک حصہ تھا۔ آندھرا کے لوگوں کی یہ پرانی خواہش تھی کہ ان کی ریاست مدراس سے الگ کردی جائے اس لئے کہ ان کا رہن سہن اور زبان اوروں سے مختلف ہے۔ یہ لوگ تیلگو زبان بولتے ہیں۔ اسی سوال پر آندھرا کے ایک قومی کارکن شری رمولو نے فاقہ کشی کی، اور اسی فاقے میں اپنی جان بھی دے دی۔ آپ جانتے ہیں کہ قربانیاں بیکار نہیں جاتیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند نے اُن کی اور آندھرا کے باشندوں کی اس خواہش کو پورا کردیا۔ چنانچہ پہلی اکتوبر ۵۳ کو ہمارے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے نئی ریاست کا افتتاح کیا۔ اس کے پہلے گورنر شری چنی لال ترویدی بنائے گئے۔ اور پہلے وزیر اعظم شری پرکاشم چنے گئے۔ شری پرکاشم پہلے مدراس کے وزیر اعظم رہ چکے تھے اور آپ کا لقب آندھرا کیسری یعنی آندھرا کا شیر تھا۔

کرنول کو عارضی طور پر ریاست آندھرا کا صدر مقام بنایا گیا۔ یہ اختیار نئی ریاست کو دیدیا گیا کہ وہ چاہے تو کرنول ہی کو اپنا دارالسلطنت رکھے یا اس کو بدل دے۔

ریاست آندھرا میں ۱۲ ضلع ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ (۱) کرنول (۲) اننتاپور (۳) کڈاپا (۴) نیلور (۵) مشرقی گوداوری (۶) مغربی گوداوری (۷) کرشنا (۸) گنٹور (۹) وشاکھاپٹنم (۱۰) بلاری (۱۱) سری کاکولم (۱۲) چتور

ریاست کا رقبہ ۶۳ ہزار ۶ سو مربع میل اس کے سمندر کے ساحل کی لمبائی ۴ سو میل ہے۔ وہاں تیس میونسپلٹیاں ہیں۔ ۴۵ اہم شہر اور ۲۵۰ پنچایتیں ہیں۔ اس طرح اب آندھرا مدراس سے بڑا ہو گیا یوں سمجھئے کہ آندھرا کے پاس مدراس سے ۲۰ لاکھ ایکڑ زمین زیادہ ہے۔ آندھرا کے حصے میں جنگل اور کھیتی باڑی کی زمین بھی زیادہ ہوگی۔ یہاں کی دو تہائی آمدنی کھیتی باڑی سے ہی ہوتی ہے۔

آندھرا کی آبادی ۲ کروڑ ۵ لاکھ ہے۔

آندھرا کی سرزمین سے یوں تو کئی دریا گزرتے ہیں مگر ۴ ندیاں کافی بڑی ہیں۔ شمالی پنا، گوداوری کرشنا اور تنگ بھدرا۔ یہاں کی خاص پیداوار تو چاول ہے۔ جو سال بھر میں تقریباً ۱۹ لاکھ ٹن پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جوار، دال گنا اور تمباکو بھی کافی پیدا ہوتا ہے۔ یوں تو گیہوں بھی پیدا ہوتا ہے مگر اتنا زیادہ نہیں۔ آندھرا کے باشندے عام طور پر چاول کھاتے ہیں۔

ضلع نیلور میں مویشی خوب ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ امریکہ تک منگائے جاتے ہیں اور دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ جنوبی ہند کا سب سے مشہور مویشیوں کی نسل بڑھانے کا مرکز اسی جگہ ہے۔

کرنول اچھا خاصا صنعتی مقام ہے۔ یہاں کی خاص صنعت سوتی، ریشمی اور اونی کپڑا بننا ہے۔ کرنول سوتی چٹائیوں کے لئے مشہور ہے یہاں پر روئی کو صاف کرنے اور مونگ پھلی کا چھلکا اتارنے کی بہت سی فیکٹریاں ہیں۔

آندھرا میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۱۷ لاکھ ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر کھیتی باڑی کرتے ہیں اور تاجر پیشہ ہیں۔

ضلع وشاکھاپٹنم کا نام ایک مسلمان بزرگ ہی کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس کا اصل نام

بقیہ صفحہ ۴۹ پر

اقبال احمد



عقل مند کون

بادشاہ اکبر خاندانِ مغلیہ کے بڑے بادشاہوں میں سے گزرے ہیں۔ ان کے دربار کے نورتن مشہور تھے۔ ان میں بیربل بھی تھے۔ بیربل بڑے حاضر جواب تھے۔ اور ان کی حاضر جوابی ہی کی وجہ سے بادشاہ بھی اُن سے بڑے خوش تھے کیونکہ بیربل کی باتوں سے ان کا جی بھی بہت بہلتا تھا۔ ایک دن دربار میں بیربل موجود نہ تھے۔ اس لیے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بادشاہ بڑا اُداس تھا۔ درباریوں میں سے ایک نے کہا" حضور! بیربل میں ایسی کون سی خوبی ہے جو ہم میں نہیں ہے۔ آپ بات کیجیے دیکھیے پھر آپ کی طبیعت کیسے بہلتی ہے۔"

بادشاہ نے کہا" بھائی تم میں سے کسی میں بھی بیربل کی سی بات نہیں ہے اسی لیے میں جانتا ہوں کہ تم بیربل کی کمی کو پورا نہیں کر سکتے۔"

ایک دوسرے درباری نے کہا" پہلے حضور موقع تو دیں، پھر ہم اپنی عقلمندی ظاہر کریں گے۔"

جب بادشاہ نے دیکھا کہ یہ کسی طرح نہیں مانتے تو اس نے کہا" جاؤ ڈھائی گز کی ایک چادر لے کر آؤ۔"

جب چادر آگئی تو بادشاہ نے کہا کہ میں بستر پر لیٹا جاتا ہوں تم زرا اس چادر سے میرا سارا جسم ڈھک دو کہ جسم کا کوئی حصّہ دکھائی نہ دے" اب بچارے درباریوں نے لاکھ کوشش کی کہ سارا جسم ڈھک دیں مگر بھلا ڈھائی گز کپڑا کس طرح اس کو ڈھکنے کے لئے کافی ہوتا وہ پیر ڈھکتے تو سر کھل جاتا تھا اور سر ڈھکتے تھے تو پاؤں کھل جاتے تھے آخر تنگ آکر اُنھوں نے کہا کہ "حضور چادر چھوٹی ہے۔ اس سے آپ کا جسم نہیں ڈھکا جا سکتا"

بادشاہ نے حکم دیا کہ "بیربل کو فوراً حاضر کیا جائے" جب بیربل آئے تو اکبر نے کہا کہ "یہ چادر ہے۔ میں بستر پر لیٹتا ہوں تم میرا جسم ڈھک دو۔ بس اسی لئے بلایا ہے"

سارے درباری غور سے دیکھ رہے تھے کہ بیربل کس طرح ڈھک سکتے ہیں۔ انھیں پورا یقین تھا کہ بیربل کو بھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔

بیربل چادر لے کر بستر کے پاس پہنچے اور انھوں نے بادشاہ کے پیر سکوڑ کر پیٹ کے پاس کر دیئے۔ اب بادشاہ کے جسم نے بہت تھوڑی جگہ گھیری۔ پھر تو بیربل نے بڑے اطمینان سے چادر ڈال دی۔ سارا جسم ڈھک گیا۔

بادشاہ نے کہا "مگر بیربل تم نے میرے پاؤں کیوں دُہرے کئے۔

بیربل نے فوراً جواب دیا "حضور گستاخی معاف کیجئے گا، آپ نے ہزرگوں کی کہاوت سنی ہوگی کہ چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانا چاہیئے"

یہ جواب سُن کر بادشاہ بے حد خوش ہوا اور اُس نے بیربل کو بہت انعام واکرام دیکر رُخصت کیا۔

درباری بھی بیربل کی حاضر جوابی اور دانائی سے بڑے متاثر ہوئے اور اس کے قائل ہوگئے۔

صفحہ ۴۷ کا بقیہ

اسحاق پٹم تھا۔ پٹم کے معنی تیلگو زبان میں شہر کے ہوتے ہیں۔

صدیاں گزریں کہ ایک بزرگ حضرت مولانا محمد اسحاق مدینہ منورہ سے تشریف لائے تھے۔ ان کا مزار ایک اونچی پہاڑی پر ہے اور ہر سال ہزاروں مسلمان دور دور سے اس کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔

احمد ولی



سنگیت اور جانور

کہتے ہیں کہ موسیقی یا گانے میں جادو ہوتا ہے۔ یہ بات سچ بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ گانے بجانے میں محویت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ آدمی اکثر ضروری سے ضروری کام بھی بھول جاتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو بچپن میں ہی میٹھی میٹھی لوریوں کے ذریعہ ہماری نیند بلائی جاتی ہے۔ اس طرح گانے کی یہ عادت بڑے ہونے کے بعد بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی ہی رہتی ہے۔ بعض لوگ تو گانے بجانے کے اتنے شوقین ہوتے ہیں کہ رات کو بغیر گانا سُنے انھیں نیند بھی نہیں آتی۔ بس ریڈیو کھول دیا اور سو گئے، ریڈیو بجتا رہتا ہے اور یہ مزے میں سوتے رہتے ہیں۔

یہ تو ہوئی انسانوں کی حالت۔ مگر چھان بین سے پتہ چلا ہے کہ حیوانوں میں بھی بعض جانوروں کو موسیقی سے بہت اُنس ہوتا ہے۔ حال ہی میں لندن کے ایک چڑیا گھر میں اس کا تجربہ کیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وائلن، بانسری، اور منہ سے بجانے والا باجا لے کر جب کچھ لوگ چڑیا گھر میں داخل ہوئے اور باجے بجانا شروع کیا تو بعض جانوروں کے بارے میں معلوم ہوا کہ اُن کو بھی گانے میں لطف آتا ہے۔

دریائی بچھڑے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسے
ت شوق سے گانا سُننا۔ یہ جانور باجا سُن کر
کھیں بند کر لیتا ہے اور بہت انہماک سے
ـنا کرتا ہے۔ اسکاٹلینڈ میں تو اب بھی ایسا کرتے
ں کہ جنگل میں جاکر باجا بجاتے ہیں۔ باجے کی
از سُن کر جانور سامنے آجاتا ہے اور یہ لوگ
ں کا شکار کر لیتے ہیں۔

شمالی امریکہ میں ایک بھیڑیا ہوتا ہے۔
ے بھی موسیقی کا دلدادہ پایا گیا ہے۔ اس کی
پسپی تو اتنی زیادہ تھی کہ باجے کی آواز کے بند
جانے پر اس نے اس قسم کی حرکتیں کیں جیسے
ہ رہا ہو کہ اور بجاؤ۔ دوسرے بھیڑیے بھی گانے
ں دلچسپی لیتے ہوئے پائے گئے۔

کُتّے عام طور پر گانے کے شوقین ہوتے
یں۔ گراموفون اور ریڈیو ان کے لئے بڑی



دلچسپی کی چیزیں ہیں۔ آپ نے گراموفون کے
ریکارڈ پر کُتّے کی تصویر دیکھی ہوگی جو بیٹھا
گراموفون سُن رہا ہے۔

سب سے زیادہ تعجب خیز یہ واقعہ ہے
کہ مکڑی موسیقی کی بہت شوقین ہوتی ہے۔ ایک
انگریز عورت کا بیان ہے کہ جب وہ گرجا میں
باجا بجانا شروع کرتی ہے تو دیواروں پر سے
اُتر کر مکڑے، مکڑیاں اور ان کے بھائی بند
فرش پر آجاتے ہیں اور اس وقت تک سکون
کے ساتھ بیٹھے رہتے ہیں جب تک باجا بجتا رہتا
ہے۔ یہ خاتون جو ایک پادری کی لڑکی ہے، کہتی
ہے کہ اس کو ہمیشہ یہ منظر نظر آتا ہے۔ اس کا یہ
بھی کہنا ہے کہ کسی اور وقت یہ مکڑے اونچی
دیواروں پر تو چپکے رہتے ہیں لیکن فرش پر
نظر نہیں آتے۔

بعض جانور ایسے بھی ہیں جنھیں موسیقی سے
سخت نفرت ہے۔ اور بعض ایسے جن پر کسی قسم کا
اثر نہیں ہوتا۔ بندر اور لنگور بظاہر موسیقی میں
دلچسپی تو لیتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
انھیں باجے کی آواز سے کوئی تعلق نہیں بلکہ
باجے سے دلچسپی ہے تو اتنی کہ اگر مل جائے تو

اپنی عادت کے مطابق اس سے کھیلیں اور توڑ ڈالیں۔
بلّی بھی باجے سے نفرت کرتی ہے۔ اس کے بہت سے قصّوں میں سے یہ بھی ایک عورت کا بیان کیا ہوا واقعہ ہے کہ جب وہ پیانو بجاتی ہے تو بلّی فوراً اچک کر پیانو پر بیٹھ جاتی ہے اور بجانے والی کے منہ پر پنجہ مار کر اسے خاموش کر دیا کرتی۔

دریائی گھوڑا اور گینڈا بھی ان جانوروں میں ہیں جنہیں موسیقی سے چڑ ہے۔ شیر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ البتہ اگر شور زیادہ ہو تو وہ ناراض ہوجاتا ہے۔

حیرت ہے کہ چڑیاں جو خود مجسم موسیقی ہوتی ہیں، ہماری موسیقی سے عام طور پر کوئی اثر نہیں لیتیں لیکن بعض تو بہت ناراض ہوتی ہیں باجوں کی آواز سے۔ باز کے متعلق معلوم ہوا کہ صرف وہی ایک چڑیا ایسی ہے جو موسیقی پسند کرتی ہے دیکھا گیا ہے کہ باز آنکھیں موسیقار پر گاڑ دیتا ہے اور اس وقت تک پلک نہیں جھپکاتا جب تک کہ باجا ختم نہ ہو جائے۔

جانوروں کی موسیقی کے سلسلے میں سب سے زیادہ غلط روایت سانپ کے متعلق مشہور ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سانپ موسیقی کا دلدادہ ہوتا ہے۔ ثبوت میں سپیروں کو پیش کیا جاتا ہے کہ کس طرح کالا سانپ اس کی تونبی پر نثار ہوتا ہے اور اس کے ساتھ لہراتا رہتا ہے۔ یہ غلط ہے۔ ایک مشہور ماہرِ حیوانات مسٹر ای۔جی۔ بولنگر نے کہا ہے کہ سانپ کے لہرانے کا راز باجے کی آواز میں نہیں ہے بلکہ باجے کی شکل میں ہے تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ سانپ کے کان نہیں ہوتے اور وہ بالکل سُن نہیں سکتا۔

سپیرے کی تونبی کے ساتھ لہرانے کا راز اس میں ہے کہ وہ تونبی کو اِدھر اُدھر حرکت دیتا رہتا ہے اور سانپ اس پر منہ مارنے کے لئے خود بھی اسی کے ساتھ لہرایا کرتا ہے۔ جب بھی ایسا موقع ہو تو یہ ضرور غور کیجئے کہ سپیرا سانپ کی پٹاری کھول کر ہاتھ مار کر سانپ کو کھڑا کرتا ہے اور پھر سر ہلا ہلا کر تونبی بجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کبھی کالے سانپ کے سوا کوئی دوسرا سانپ اس طرح بین کی آواز پر سر نہیں دُھنتا۔

عرفان عباسی



لالچی بڑھیا

پہاڑی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک سیدھا سادا غریب بڈھا رہتا تھا ـــــ وہ جتنا سیدھا اور نیک تھا اس کی بڑھیا اتنی ہی بدمزاج اور جھگڑالو تھی۔ اس کی بدمزاجی کا یہ عالم تھا کہ اس کی وجہ سے پاس پڑوس والے بھی اس سے کترانے لگے تھے۔ بڈھا اس خیال سے ہمیشہ اداس اور غمگین رہتا تھا۔ اس کے پڑوس کے لوگ بھی اس سے نہیں ملتے۔ آخر اس تنہائی سے عاجز آکر اس نے ایک مینا پال لی۔ وہ جب کام سے فرصت پاتا تو "مینا" کو سامنے بٹھا کر اس سے طرح طرح کی باتیں کرکے دل بہلاتا۔

جب بڑھیا نے یہ دیکھا کہ بڈھا دن بھر مینا کے پاس بیٹھا رہتا ہے تو وہ مینا سے بھی جلنے لگی۔ ایک دن بڈھا کسی کام سے باہر گیا۔ بڑھیا کو کپڑے دھونے تھے۔ وہ کپڑوں میں صابن لگاکر کلف کے لئے چاول تیار کرکے چشمے سے پانی بھرنے چلی گئی۔ جب واپس آئی تو مینا کو چاول کھاتے دیکھ کر آگ بگولا ہوگئی ـــــ اور بولی "آج تجھے چوری کی پوری پوری سزا دوں گی" یہ کہتی ہوئی جھپٹی اور مینا کی زبان کاٹ لی۔ وہ بے چاری خون سے لت پت تڑپنے لگی۔ جیسے ہی

بڑھیا نے اُسے اُچھال کر دور پھینکا ــــ مینا پھر سے اُڑ گئی۔

جب شام کو بڈھا کھیت سے واپس آیا اور اُس نے مینا کا حال سُنا تو تلملا کر رہ گیا۔ گھنٹوں بڑھیا سے جھگڑا ہوتا رہا۔ اب وہ بچارا دن بھر اُداس رہتا۔

ایک دن کی بات ہے کہ تنہائی سے اُکتا کر بڈھا گھر سے دور ایک اونچی پہاڑی پر بیٹھا اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا کہ ایک آواز آئی "آیئے آیئے بڑے میاں ہم لوگ کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں"

بڈھے نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ وہی مینا اس کو بُلا رہی ہے۔ وہ مینا کو دیکھ کر پھولا نہ سمایا۔

وہ مینا کی طرف بڑھا اور اُسے گلے لگا کر خوب پیار کیا۔ مینا اُسے بانس کے ایک خوبصورت مکان میں لے آئی جہاں وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ مکان ایک اونچی پہاڑی پر تھا جہاں سے سارا شہر دکھائی دیتا تھا ــــ مینا کی ماں نے بڈھے کی خوب خاطر مدارات کی۔ طرح طرح کے تازے پھل کھلائے اور پیالی میں چائے اُنڈیلتے ہوئے کہنے لگی: "جناب آپ نے جس طرح میری بچی کو رکھا، اس کو دیکھتے ہوئے میں آپ کے لئے کچھ نہ کر سکی۔ اس کے لئے ہم سب آپ کے شکر گزار ہیں۔

بچارا بڈھا جس کا زندگی میں شاید پہلی بار اتنا شاندار استقبال ہوا تھا خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ مینا اور اس کے گھر کے سب لوگوں نے بڈھے کو کئی روز مہمان رکھا۔ اور جب چلنے لگا تو مینا نے دو ٹوکریاں لاکر سامنے رکھ دیں اس میں ایک وزنی تھی اور ایک ہلکی۔ اس نے بڈھے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "اس میں سے جو ٹوکری آپ پسند کرلیں" بڈھا بچارا نیک دل تھا۔ اس نے ہلکی ٹوکری ہی پسند کی۔ اور اپنے میزبانوں کا شکریہ ادا کیا۔ بچوں کو دعائیں دیں اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

جوں ہی اس نے گھر میں قدم رکھا بڑھیا نے اس کی خیریت پوچھنے کے بجائے الٹی اُسے گالیاں دینی شروع کر دیں اور گھنٹوں بڑبڑاتی رہی۔

بچارا غریب بڈھا خاموش بیٹھا سب کچھ سُنتا رہا، کرتا ہی کیا؟

جب بُڑھیا خوب بڑبڑا چکی اور اس کا غصّہ کچھ کم ہوا تو بڈّھے نے اپنی کہانی سُناتے ہوئے لُٹکری کا ڈھکن کھولا۔ اور ہیرے، جواہرات وغیرہ کی دمک سے دونوں کی آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ اس میں ایک ٹوپی تھی جسے پہن کر بیٹھنے والے کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک جادو کی کتاب تھی جس کے ذریعہ من مانی مُراد پوری ہوسکتی تھی۔ ایک جادو کا تھیلا تھا۔ جسکی یہ خاصیت تھی کہ اس میں دولت بھر دو پھر چاہے جتنی بار نکالو اور خرچ کرو تھیلا کبھی خالی نہ ہوگا۔

یہ سب دیکھ کر بُڑھیا پھولی نہ سمائی۔ اس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ دانت نکالتے ہوئے بُڈّھے سے بولی "میں بھی اپنی پیاری مینا کے پاس جاتی ہوں، دیکھنا اگر تم سے دونی دولت نہ لائی ___

بڈّھے نے بہت کوشش کی کہ بڑھیا اب نہ جائے، آخر اب کس چیز کی کمی تھی۔ مگر بڑھیا نے اس کی بات نہ مانی اور پہاڑی کی طرف چل پڑی۔

آخر مینا کے گھر پہنچی۔ بچّوں کو پیار کیا اور مینا کی ماں کو خلوص و محبت کی داستانیں سُنانے لگی۔ مینا تو اس کی حرکتوں سے خوب واقف تھی اور وہ اس کی چکنی چپڑی باتوں سے بڑھیا کا مطلب سمجھ گئی اور ماں سے کہا کہ تم اس بُڑھیا کو جتنی جلدی ہوسکے چلتا کر دو۔

اگلے دن جب بُڑھیا نے دیکھا کہ مینا نے کچھ بھی نہ دیا تو خود ہی اُس نے سوال کر دیا مینا کی ماں نے دو لُٹکریاں لا کر سامنے رکھ دیں اور کہا "ان میں سے جو چاہو لے لو۔" بڑھیا کب چوکنے والی تھی اس نے ہلکی سی چھوٹی لُٹکری پر نظر بھی نہ ڈالی۔ اس نے جھپٹ کر وزنی لُٹکری اُٹھالی۔ اس کی زبان سے شکریے کا ایک لفظ بھی نہ نکلا اور مکان کی طرف چل دی۔

لُٹکری بڑی وزنی تھی۔ اس کی کمر ٹوٹ رہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح گھر تک ہانپتی کانپتی ہوئی پہنچی۔

گھر میں قدم رکھتے ہی اس نے بڈّھے سے کہا ___ "دیکھ بیوقوف! یہ وہی لُٹکری ہے جو تو چھوڑ آیا تھا۔ اس میں تیری لُٹکری سے دُگنا ہے۔ بھلا میں بڑی چھوڑ کر ہلکی اور چھوٹی کیوں لینے لگی۔ تو تو بڑا نازک ہے۔

صحیح حل پیامی معما نمبر ۳۵

دائیں سے بائیں

۱۔ ملکہ

۲۔ برے

۵۔ رات

۶۔ تائی

صحیح حل پیامی معما نمبر ۳۵

اوپر سے نیچے

۱۔ محنت

۲۔ سہارے

۳۔ لڑنا

۵۔ رائے

پیامی معما نمبر ۳۵ کا شاندار نتیجہ

اس بار صحیح حل ۱۳۱ وصول ہوئے۔ لہٰذا مبلغ ۳۰ روپے کا پہلے انعام میں ایک روپے کا اضافہ کر کے ایک روپیہ فی کس تقسیم کر دیا گیا

۱۔ سید سمیع اللہ۔ نلارگ۔ ۲۔ محمد عمر۔ جمشید پور۔ ۳۔ علاء الدین۔ جامعہ نگر۔ ۴۔ بلقیس بیگم۔ عثمان آباد۔ ۵۔ محمد شمیم۔ اعظم گڑھ۔ ۶۔ احمد علی۔ کانپور۔ ۷۔ محمد شارق۔ علی گڑھ۔ ۸۔ اکرام الدین۔ کاسگنج (۹) محمد زبیر پرویز۔ پوسا۔ احمد علی۔ کانپور۔ ۱۱۔ شمیم احمد۔ جونپور۔ ۱۲۔ وقار احمد۔ الہ آباد۔ ۱۳۔ ریحانہ بیگم۔ احمد نگر ۱۴۔ شمیمہ خاتون۔ آگرہ۔ ۱۵۔ محمد احمد خاں۔ لکھنؤ ۱۶۔ محمد اکرام خاں۔ لکھنؤ۔ ۱۷۔ اجیت سنگھ۔ انارے ۱۸۔ مشتاق احمد۔ ٹاٹانگر۔ ۱۹۔ مس صفیہ بانو۔ علی گڑھ۔ ۲۰۔ افتخار حسین۔ کانپور۔ ۲۱۔ شفیق عالم۔ آرہ عالم آرا۔ لکھنؤ۔ ۲۳۔ اشرف بانو۔ لکھنؤ۔ ۲۴۔ محمد غنی۔ شیو گنج۔ ۲۵۔ رمیش۔ جالندھر۔ ۲۶ محمد ابراہیم استاد۔ سجے پور۔ ۲۷۔ شگفتہ خانم۔ آگرہ۔ جمیل احمد۔ قنوج۔ ۲۹۔ جمال الدین۔ قنوج ۳۰۔ رفیق میاں۔ بریلی۔ قاضی احمد علی۔ بلند شہر۔

ایک غلطی والے ۳۲ حل موصول ہوئے لہٰذا دوسرا انعام بحساب موازی ۱۰ ر فی کس تقسیم کر دیا گیا۔ جگہ کی کمی کے باعث اس بار انعام پانے والوں کے نام نہیں دئے جا رہے ہیں

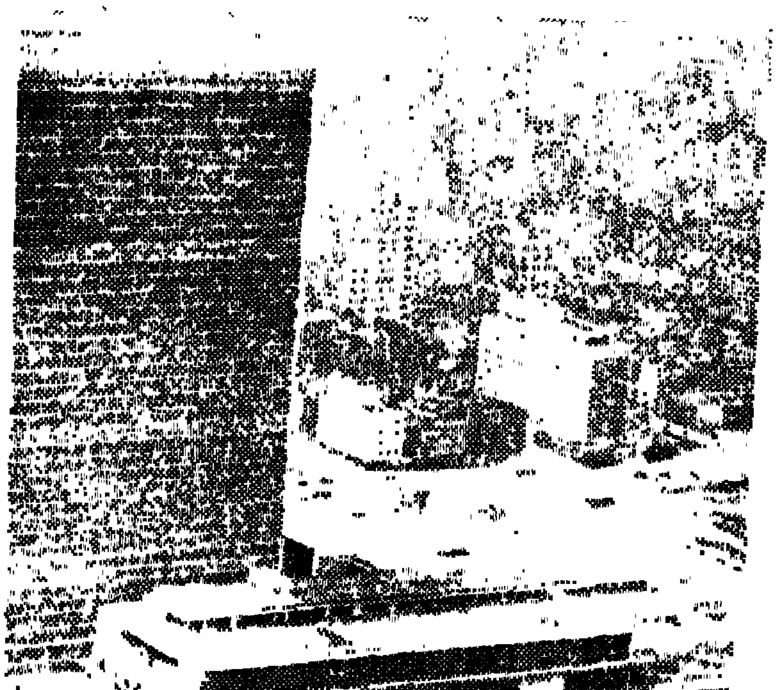
اس بار جگہ کی کمی کے باعث معمّا نہ جا سکا۔ اگلے مہینے سے برابر جاتا رہے گا۔

ایڈیٹر پیامی معمے

جامعہ نگر۔ نئی دہلی

اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی
نئی صدر مسز وجے لکشمی پنڈت
اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل
کے ساتھ۔





نیویارک میں اقوام متحدہ کی
عمارت کا ایک منظر

Regd. No. D. 96.
NOVEMBER 1953.




پیام تعلیم
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ



بچوں کی کانفرنس کا ایک منظر

ادارہ:
حامد علی خاں بی اے (جامعہ)
اطہر پرویز ایم اے علیگ

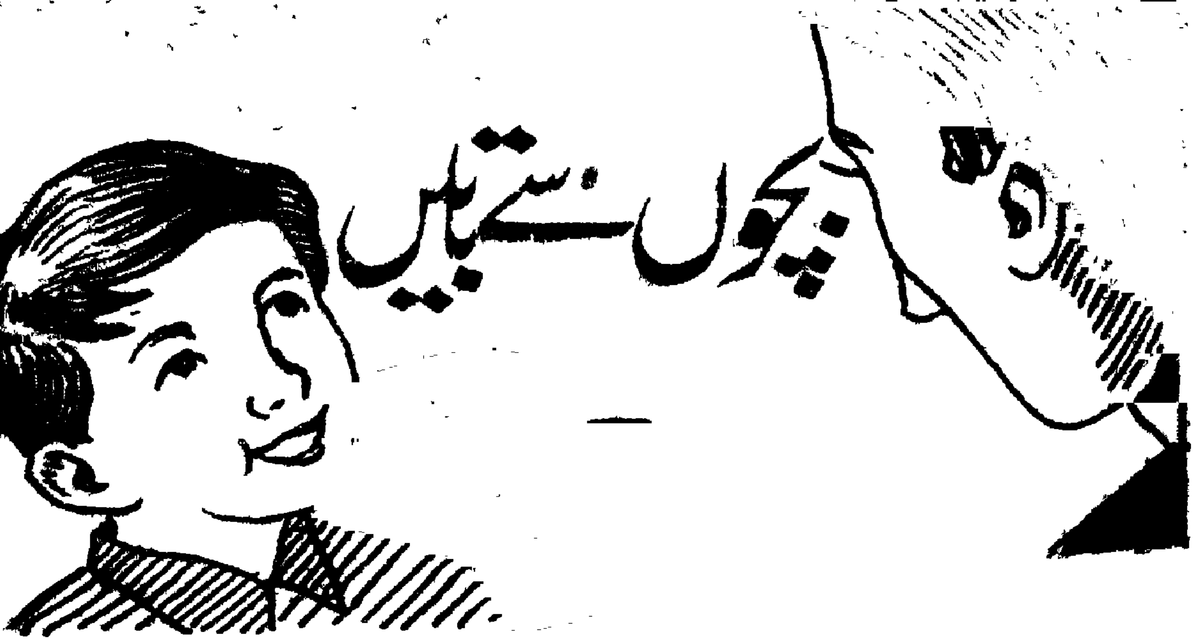
پیام تعلیم

فہرست

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
دہلی

سالانہ چندہ ۴ روپے
فی پرچہ ۶ آنے

بچوں سے باتیں



میلہ ختم ہو گیا۔ لیکن اس کی آواز ابھی تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ آپ میں سے کتنے اس انتظار میں ہوں گے کہ اس کا آنکھوں دیکھا حال پیام تعلیم میں پڑھیں۔ اس لئے ہم نے خاص طور پر کچھ صفحے اس کے لئے الگ کر دئے ہیں۔ جن میں آپ کو میلے کے خاص خاص پروگراموں کی جھلکیاں ملیں گی۔ میلے کے بارے میں جتنے مضامین ہیں وہ سب ہی دلچسپ ہیں اور ان کو پڑھ کر میلے کا منظر آپ کی نظروں کے سامنے پھر جائے گا۔ اکثر پیامیوں نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ بچوں کی کانفرنس کے بارے میں ان کو زیادہ سے زیادہ معلومات دی جائیں۔ ہمیں یہ خوشی ہے کہ سید منیر الحسن صاحب نے کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال بڑے دلچسپ پیرائے میں لکھا ہے۔ آپ اس کو پڑھ کر یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بچے اس کانفرنس میں کس طرح کامیاب ہوئے۔ اگر آپ بھی اپنے شہر میں اس طرح کی کانفرنس کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

میلے کے بعد ابتدائی کے بچے "بچوں کی حکومت" کے چناؤ میں مصروف ہو گئے۔ اور پچھلا ایک ہفتہ تو ایسا گذرا، معلوم ہو رہا تھا کہ پارلیمنٹ کا انتخاب ہو رہا ہے۔ جدھر دیکھو پوسٹر تیار ہو رہے تھے، جلوس نکل رہے تھے، نعرے لگ رہے تھے اپنے اپنے نمائندوں کی خوبیوں کا ذکر تھا۔ اور نہ جانے کیا کیا۔

اگلے پرچے میں ہم اس پر ایک مضمون شائع کر رہے ہیں جس کو پڑھ کر آپ بچوں کی حکومت کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے۔ پھر آپ بھی اپنے ماسٹر صاحب سے کہیئے گا کہ ہمارے اسکول میں بھی ایسا ہی انتظام کر دیجئے۔

مکتبے کا کام جس تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہمارا اپنا ایک پریس بھی ہو۔ آپ کو یہ سُن کر خوشی ہوگی کہ ہم جلد ہی اپنا ایک پریس بھی لگا رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ کا پیامِ تعلیم اور اچھا چھپے گا۔ پہلی نومبر کو میلے کی خوشیوں میں ایک اضافہ اور ہوگیا۔ ہز ہولی نس سیدنا طاہر سیف الدین صاحب کو جامعہ کی طرف سے ایک عصرانہ دیا گیا۔ ہز ہولی نس نے ہماری پریس کی عمارت کے لئے دس ہزار روپیہ کا عطیہ عنایت فرمایا۔

حکومتِ ہند نے اپنے تعلیمی کاموں کے سلسلہ میں صلاح مشورہ دینے کے لئے ایک کمیٹی بنائی ہے جس میں بڑے بڑے ماہرِ تعلیم ہیں۔ اس کمیٹی کے ممبران ہمارے یہاں ۹ر نومبر کو تشریف لائے۔ مکتبے کے کاموں کی نمائش کی گئی تھی جسے انھوں نے بغور دیکھا اور بہت پسند کیا۔

۱۱ر نومبر کو مسٹر دیوی سنگھ چوہان، وزیرِ تعلیم حیدرآباد، ڈائرکٹر تعلیمات مدراس اور ڈپٹی ڈائرکٹر تعلیمات مدراس مکتبہ میں تشریف لائے۔ آپ حضرات نے مکتبہ میں کچھ وقت گذارا۔ اور بچوں کی کتابوں کے بہت سے مسودے دیکھ کر اپنے اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا۔

اس بار ہمارے یہاں آنے والے مہمانوں میں ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال، ہز ہائنس مہارانی صاحبہ کوچ بہار، اور بیگم صاحبہ پٹودی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ ۲۳ر نومبر کی شام کو یہاں تشریف لائیں۔ آپ نے مکتبے کے کاموں کو دیکھا اور اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ہز ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال اور مہارانی صاحبہ کوچ بہار نے مکتبے کے حصّے بھی خریدے۔ بیگم صاحبہ پٹودی اس سے پہلے بھی مکتبے کے حصّے خرید چکی ہیں۔

۱۷ر نومبر کو جامعہ میں میلاد النبی کا جلسہ ہوا۔ جس میں جامعہ کے تمام مدرسوں نے حصّہ لیا۔ جمیعۃ العلما ہند کے ناظمِ اعلیٰ مولانا حفظ الرحمن صاحب ممبر پارلیمنٹ نے سیرت پر بڑی پُر مغز تقریر کی۔ جسے حاضرین نے بڑی دلچسپی سے سُنا۔

ادارہ

بیداری

سعادت نظیر

اے سونے والے ساتھی! وہ دیکھ! "صبح آئی"
ہنگامے ساتھ لائی دُنیا نئی بنائی
جاگا ہے پتّہ پتّہ چٹکا ہے غنچہ غنچہ
گلشن مہک رہے ہیں پنچھی چہک رہے ہیں
کھیتوں میں لہلہاہٹ گردوں پہ جگمگاہٹ
پھولوں میں مدھ بھری ہے کانٹوں میں دلبری ہے
دریا میں جوش اُٹھا ساحل بھی گنگنایا
چشمے اُبل رہے ہیں ارماں نکل رہے ہیں
دھرتی کی یہ جوانی ہے نقشِ کامرانی
یہ حسنِ زندگانی ہے روحِ جاودانی
اے سونے والے ساتھی!
وہ دیکھ — ! "صبح آئی"

تارے جو ضوفشاں تھے وہ شب کے پاسباں تھے
نورِ سحر کے ڈر سے غائب ہوئے نظر سے
وہ کارواں سحر کا مشرق کی سمت آیا
وہ باغ کے پرندے شاخوں پہ بیٹھے جم کے
نغمے سُنا رہے ہیں سب کو جگا رہے ہیں
انساں سنبھل رہا ہے کروٹ بدل رہا ہے
بچے ٹُھمک رہے ہیں چہرے دمک رہے ہیں
ہر دل میں اک خوشی ہے ہر سمت روشنی ہے
اے سونے والے ساتھی!
وہ دیکھ — ! "صبح آئی"

۵

حکیم صاحب کی بکری

مصنف: رام چندر جیٹلی
مترجم: ا۔ع۔ انصاری



پنڈت دُھرندھر ناتھ شاستری اگر دنیا میں کسی چیز سے نفرت کرتے تھے، تو وہ حکیم جمال صاحب کی بکری تھی اور اُس بکری کو اگر کسی سے محبت تھی، تو وہ پنڈت جی کا گھر تھا اسی لئے بار بار مار کر بھگا دئے جانے پر بھی، وہ وہیں پہنچ جایا کرتی تھی۔ پنڈت جی شاستر کے بارے میں اُتنے ہی کورے تھے، جتنے حکیم صاحب حکمت کے بارے میں۔ لیکن گاؤں کے ان پڑھ جاہل لوگوں میں دونوں کی خوب چلتی تھی۔ حکیم صاحب لوگوں کو بے وقوف بنانے میں پنڈت جی سے بھی زیادہ چالاک تھے۔ وہ دوا علاج کے ساتھ دعا تعویذ اور جھاڑ پھونک میں بھی اپنے کو بہت ہی ہوشیار ثابت کر چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کے یہاں گاؤں والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔

حکیم صاحب اپنی فیس میں روپے سے لے کر مُرغی انڈے تک لے لیا کرتے

تھے۔ ایک بار کسی دور کے گاؤں سے ایک دھوبی، جس کا گدھا کچھ دنوں پہلے، کہیں کھو گیا تھا، اُن کے پاس اپنا علاج کرانے کے لئے آیا۔ حکیم صاحب کا تکیہ کلام تھا۔ "دھڑا دھڑ دست اور بڑے بڑے روگ پست"۔ اس لئے انھوں نے دھوبی کو جلاب کی کچھ گولیاں دے دیں۔ اتفاق سے دھوبی جب "فراغت" کے لئے جنگل میں گیا تو وہاں اُس کا کھویا ہوا گدھا مل گیا۔ اُس بے وقوف نے سمجھا کہ اس میں بھی حکیم صاحب کی کوئی کرامت تھی۔ وہ عقیدت کے ساتھ اپنی دودھ دینے والی بکری انھیں دے گیا۔ حکیم صاحب نے بکری کو پوری آزادی دے رکھی تھی۔ وہ سارا دن گاؤں میں اِدھر اُدھر چرتی رہتی اور شام ہوتے ہی گھر چلی آتی تھی۔

پنڈت جی کو اگر پھلواری لگانے کا شوق تھا، تو حکیم صاحب کی بکری کو اس کے صفایا کرنے کی دُھن تھی۔ وہ کہیں نہ کہیں سے کود پھاند کر اُن کے باغ میں پہنچ جاتی تھی۔ پنڈت جی کے باغ کے بیچوں بیچ پیپل کا ایک درخت تھا۔ وہ روز سویرے نہانے کے بعد اس کے نیچے بیٹھ کر پوجا پاٹ کیا کرتے تھے۔ ایک بار گرمی کے دنوں میں وہ اپنی لمبی چٹیا میں اور کانوں میں پھول لگائے شیو جی کی پوجا میں مشغول تھے۔ اتنے میں حکیم صاحب کی بکری چرتی پھرتی وہاں آ پہنچی۔ پنڈت جی کی چٹیا میں ہری ہری پتیاں دیکھ کر اُس کی طبیعت مچل ہی تو گئی۔ اُس نے چپکے سے پیچھے جا کر انھیں جو کھینچا، تو چٹیا بھی اُس کی پکڑ میں آ گئی۔ پنڈت جی کے سر کو زور سے جھٹکا لگا، گھبراہٹ میں جو پیچھے مڑے، تو سب چالیسے ایک دم لڑھک گئے۔ یہ دیکھتے ہی بکری بھاگ نکلی۔

پنڈت جی غصّے میں [illegible] حکیم صاحب کے یہاں پہنچے، تو وہ مریضوں سے گھرے ہوئے بیٹھے تھے۔ پنڈت جی سے اپنی بکری کی گستاخی کا پورا قصّہ سن کر حکیم صاحب حقّے کا ایک لمبا کش لے کر، جیسے زور سے ہنستے ہوئے بولے "یہاں اُچھل پتہ چوٹی میں نہیں باندھا جاتا ہے۔ بھلا بکری کو باندھ کر ہم اس کی آزادی کو کیسے چھین

سکتا ہوں، جب کہ ہمارے بڑے بڑے لیڈر آزادی کے حامی ہیں اور اُس کے لئے ہزاروں لاکھوں کو قربان کرا دیا"۔ پاس بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی قہقہہ لگا کر حکیم صاحب کی حمایت کی اور پنڈت جی لے جارے خون کا سا گھونٹ پی کر لوٹ آئے۔

مگر یہ سلسلہ تو روز روز کا تھا۔ حکیم صاحب کی بکری سے پنڈت جی سخت پریشان تھے۔ روزانہ اُن کے گھر پہنچ کر کبھی باغ میں، کبھی دالان میں، کبھی باورچی خانے میں اور کبھی اناج والے کمرے میں کچھ نہ کچھ ضرور نقصان کر دیا کرتی تھی۔

ایک بار جاڑے کے دنوں میں پنڈت جی نے باغ میں گوبھی اور کچھ دوسری سبزیاں بوئی تھیں۔ چاروں طرف مضبوط گھیرا باندھ کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی خدا جانے کہاں سے موقع پا کر بکری اندر گھس گئی اور مزا لے لے کر ننھے ننھے پودوں کو صاف کرنے لگی۔ آہٹ پا کر پنڈت جی باہر نکلے۔ لیکن اس وقت تک اُن کا آدھا باغ اُجڑ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور جب وہ اندر سے ڈنڈا لے آئے تو بکری گھیرا پھاند کر رفو چکر ہو چکی تھی۔ غصے سے تھر تھر کانپتے جب وہ حکیم صاحب کے یہاں پہنچے تو وہ ایک آدمی کو، جسے بھوت نے پکڑ رکھا تھا، جھاڑ پھونک کر رہے تھے اور بہت سے لوگ اُن کے پاس جمع ہو کر، اُن کی کرامت کا تماشہ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ پنڈت جی سے بکری کی شکایت سُن کر، وہ صرف مسکرائے اور داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فلسفیوں کی طرح بولے۔ "پنڈت بکری ساگ سبزی نہیں کھائے گی تو کیا گوشت کباب کھائے گی؟ بھئی آدمی تو تم خوب ہو۔ اچھا ہو کہ تم مجھ سے علاج کروا کر دماغ کے ڈھیلے پُرزے کسوالو......!"

سب لوگ یہ سُن کر ہنس پڑے اور اس آدمی نے، جس پر بھوت سوار تھا، پنڈت جی کی طرف کچھ اس طرح لال لال آنکھیں نکال کر جھپٹنے کا ارادہ ظاہر کیا کہ بے چارے ڈر کے مارے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اور پھر سچ مچ ایک ایسا موقع آ گیا

کہ پنڈت جی کو حکیم صاحب سے علاج کرانا ہی پڑا۔ انھیں خونی پیچش نے ایسا پکڑا کہ چارپائی سے لگ گئے۔ اب یہ خدا کی مہربانی یا حکیم صاحب کا علاج، جس سے بھی فائدہ ہوا ہو، لیکن وہ کچھ دنوں کے بعد ہی اچھے ہونے لگے پھر بھی کمزوری بہت آگئی تھی۔ اچھی طرح چلنے پھرنے یا کام کرنے سے مجبور تھے۔ اس لئے دکھشنا اور سیدھا وغیرہ کی آمدنی میں بھی کمی آگئی تھی اور خرچ بڑھ گیا تھا۔ حکیم صاحب نے انھیں بکری کا دودھ پینے کے لئے کہا۔

"بکری کا دودھ؟" پنڈت جی نے چڑھ کر غصے میں کہا: "کبھی نہیں ۔۔۔ کبھی نہیں! اس کا دودھ ۔۔۔۔ چھی!"

"پینا ہی پڑے گا۔ مجبوری ہے۔ ورنہ مرض بڑھنے کا اندیشہ ہے اور اگر بڑھ گیا تو پھر خدا حافظ!" حکیم صاحب نے آنکھیں نچا کر، اور کچھ ایسا منہ بنا کر کہا کہ پنڈت جی کو نظر کے سامنے موت ناچتی دکھائی دینے لگی۔

وہ گھبرا کر بولے: "ٹھیک ہے ۔۔۔ ٹھیک ہے لیکن بکری ملے گی کہاں ۔۔۔۔؟"

"بکری کہاں ملے گی؟ یہ بھی خوب رہی۔ اماں! میرے پاس جو ہے۔ اسے خرید لو تمہیں کم سے کم قیمت میں دے دوں گا صبح شام مزے میں دودھ پینا۔ جی چاہے تو دن بھر گھر میں باندھے رکھنا۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا!" حکیم صاحب نے مذاق کرتے ہوئے کہا اور مسکرانے لگے۔

تھوڑی دیر بعد پنڈت جی حکیم صاحب کی اسی بکری کو، جس سے وہ اتنی نفرت کرتے تھے، سر نیچا کئے اور دل ہی دل میں کڑھتے جھینپتے گھر لئے چلے جا رہے تھے۔

(ترجمہ)


یہ تین دن کا میلہ

مجیب الرحمٰن



بیت بازی اور بچوں کا مشاعرہ

"تعلیمی میلے" میں اس سال بھی بیت بازی اور بچوں کے مشاعرے کا پروگرام رکھا گیا تھا۔ پہلے ہی دن یعنی ۳۱ر اکتوبر کو میلے کے افتتاح کے بعد بیت بازی کا مقابلہ ہوا۔ بیت بازی تو آپ سمجھتے ہی ہوں گے۔ یہ کھیل کا کھیل ہے اور تعلیم کی تعلیم ہے۔ بیت بازی میں شعر پڑھنے کا مقابلہ ہوتا ہے۔ دو پارٹیاں ہوتی ہیں۔ جب ایک پارٹی کا ایک ممبر ایک شعر پڑھتا ہے تو دوسری پارٹی کی طرف سے ایک اور شعر دیا جاتا ہے۔ مگر اسی حرف سے شروع ہونے والا شعر جس پر مقابل کی پارٹی کا شعر ختم ہوا ہو۔

یوں تو بھی پارٹیاں تو دونوں ہمارے مدرسہ ثانوی ہی کی تھیں لیکن مقابلہ اتنا شاندار ہوا کہ دیکھنے والوں کو مزا ہی آ گیا اور پورے ایک گھنٹے لوگ خاموشی سے اچھے شعروں کا لطف اٹھاتے رہے۔ بیت بازی کی تیاری کا سہرا مدرسہ ثانوی کے استاد اور بچوں کے شاعر مولوی فصیح الدین صاحب کے سر ہے۔ اور بھی حصہ لینے

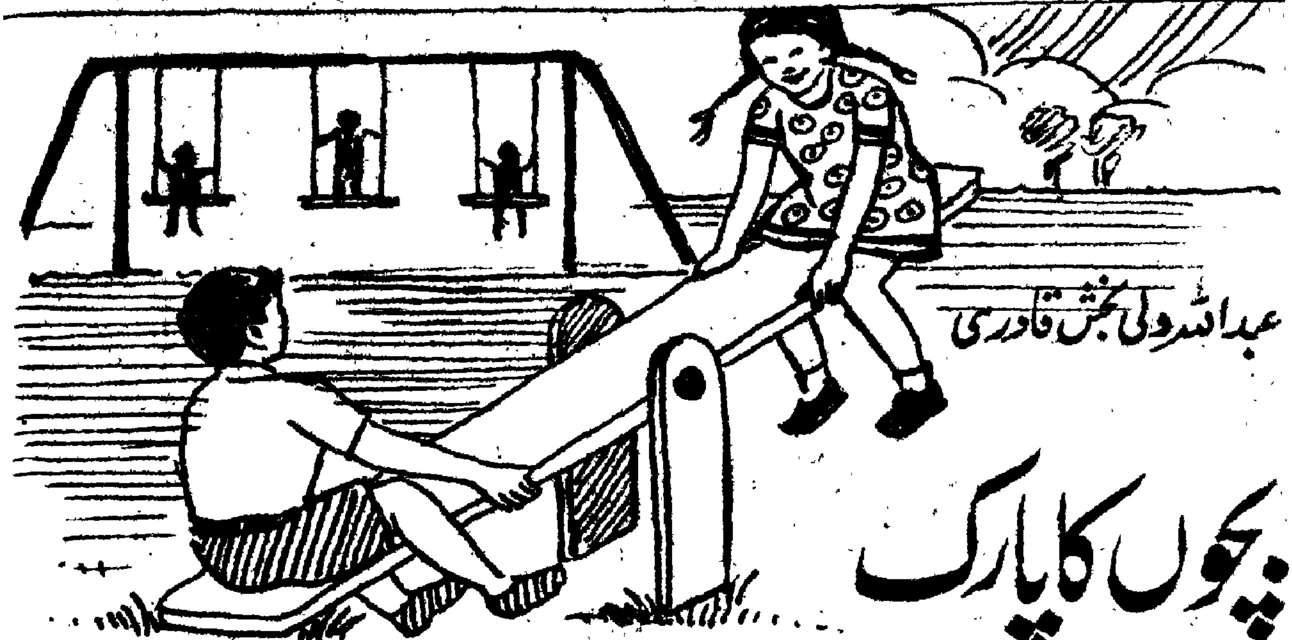
والے لڑکوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ دونوں پارٹیوں کی طرف سے اچھے اچھے شعر تو دئے ہی گئے۔ لیکن مزے کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے پڑھے بھی بڑے اچھے انداز میں۔ بعض بعض موقعوں پر تو جواب میں ایسے موزوں شعر دئے گئے ہیں کہ حاضرین واہ، واہ چلّا اٹھے اور صدر صاحب نے اپنی تقریر میں کہہ ہی دیا کہ مدرسہ ثانوی کے یہ طالب علم قابل مبارک باد ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اچھے اردو ادب کو پڑھنے کا شوق ان میں پیدا ہو رہا ہے۔

اور ہاں پارٹیوں کے نام بھی سُن لیجئے۔ ایک پارٹی عابد پارٹی تھی دوسری واحد پارٹی۔ ججوں کے فیصلے کے مطابق عابد پارٹی اول رہی۔ دونوں پارٹیوں میں طاہر نیّر اور طارق نیّر اوّل قرار دئے گئے۔ بہر حال دونوں پارٹیوں نے اچھے شعر دئے۔

لیکن بیت بازی کے بعد ہی شعر خوانی کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا۔ ابھی تو بچوں کا مشاعرہ باقی ہے اس کے فوراً ہی بعد جناب ششیش چندر طالب دہلوی کی صدارت میں مشاعرہ شروع ہوا۔ اس مشاعرے میں خاص بات یہ تھی کہ اس میں مدرسہ ابتدائی (جامعہ نگر) کے علاوہ دہلی کے مدرسوں میں "بچوں کا گھر" دریا گنج اور دہلی ماڈل اسکول، باڑہ ہندو راؤ، اور اوکھلے کے بنیادی مدرسے کے ننھے منّے شاعروں نے بھی حصہ لیا۔ یہ پروگرام بھی تقریباً ایک گھنٹے جاری رہا بچوں کی لکھی ہوئی نظمیں اور گیت حاضرین نے پسند کئے۔ ان ننھے شاعروں میں بعض نے اپنی نظمیں ترنم سے سنائیں مدرسہ ابتدائی کے اظہار عالم کی نظم "سبزی منڈی" بہت پسند کی گئی۔ اور جب انھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

چھلکے ہم نے بکھرے دیکھے
ان پر لوگ پھسلتے دیکھے

تو حاضرین سے ہنسی نہ رُک سکی۔ ان کے پڑھنے کا انداز بھی بہت اچھا تھا۔



بچوں کا پارک

عبداللہ ولی بخش قادری

اس بار میلے میں بچوں کا پارک، ایک نئی اور بچوں کے لئے بڑی دلچسپ چیز تھی۔ وہ کیا تھا اور کیسا تھا اس کو قادری صاحب نے اپنے مضمون میں اچھی طرح بتا دیا ہے۔ آپ لوگ یہ پڑھ کر خوش ہوں گے کہ اس پارک کا بنیادی خیال اور اس کے سارے انتظامات قدسیہ بیگم صاحبہ کی سوجھ بوجھ اور کوششوں کا نتیجہ تھا۔ وہی قدسیہ بیگم جنھوں نے آپ کے لئے "گاندھی بابا کی کہانی" اور دوسری اچھی اچھی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ ستیش کمار صاحب اور قیصر نقوی صاحب نے بھی اس میں بڑا کام کیا ہے۔

اس پارک کا افتتاح بیگم صاحبہ پٹودی نے کیا۔ ادارہ

"ارے یہ کیا۔ یہ ہاتھی کہاں سے آ گیا۔ ارے اس پر تو کچھ لڑکے بھی بیٹھے ہوئے ہیں!" پیچھے سے ایک لڑکے نے غول کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ کر کہا۔ "ارے یار

اس کے پیچھے اونٹ بھی تو آ رہا ہے" لڑکوں نے پھر شور مچایا، ارے واقعی یہ اونٹ" پاس سے چند لڑکے تیزی سے دوڑتے ہوئے گزرے۔ ایک نے پوچھا "ارے بھئی کہاں" کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں "بچوں کے پارک۔ وہاں سے ہم بھی ہاتھی پر بیٹھ کر آئیں گے۔ دوسرے نے بھی للکارا، میں تو اونٹ پر بیٹھوں گا" زرا اور آگے بڑھے تو مدرسہ ابتدائی کے بائیں طرف حیدری پارک کے دروازے پر موٹے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ "بچوں کا پارک" ہم نے بھی جلدی سے بیری والے باغ کے بچوں کی دکان سے ایک آنے کا ٹکٹ لیا اور اندر داخل ہوئے۔

یہاں تو ایک اور ہی سماں ہے۔ کوئی جھولا جھول رہا ہے۔ کوئی لوہے کی سیڑھی پر چڑھ رہا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں آئس کریم ہے، کوئی غبارے اڑا رہا ہے۔ غرض ہر طرف چہل پہل۔ دھوم دھام۔ دروازے کے سامنے بیچوں بیچ۔ بہت سے بچے ایک دائرہ بنائے کھڑے تھے کچھ باہر جا رہے تھے۔ ایک لڑکے نے اچھل کر اندر جانے کا ارادہ کر ڈالا کہ دروازے پر دوسرے سے ٹکرا گیا۔ پاس ہی ایک آدمی چٹکیاں بجاتے ہوئے اعلان کر رہا تھا "آئیے آئیے۔ اژدھا دیکھئے۔ بھیڑیا دیکھئے۔ بندر کے کرتب دیکھئے۔ جلدی آئیے ایک آنہ ٹکٹ" باہر نکلتے ہوئے ایک بچے نے پوری طرح گردن ہلاتے ہوئے کہا "بھائی جان! سچ مچ کتنا موٹا سانپ ہے جیسے موسل۔ اور بھیڑیا! کتنا ڈرونا معلوم ہو رہا ہے۔ اور بندر کیسا تماشہ کر رہا ہے" بھائی جان نے گردن ہلاتے ہوئے تائید کی" "اور ہاں طوطا بھی تو ہے۔ تمھارے طوطے سے اچھا ہے" "نہیں بھائی جان" "اچھا بولو اب کدھر چلو گے" "وہ دیکھئے دائیں طرف کیسی اچھی اچھی دکانیں ہیں۔ وہاں لے چلئے بھائی جان" واقعی کیسی کیسی دکانیں ہیں

ان کو چھوڑیے اب زرا آگے بڑھیں ابھی تو بہت کچھ دیکھنا ہے۔

بچوں کی تفریح کا ایک اچھا سامان موجود تھا۔ ان سب میں جب دلچسپی لیتے لیتے آدمی تھک جائے تو "بچوں کا ریسٹورنٹ" اپنی طرف کھینچتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہاں پہنچ کر گرم گرم چائے۔ مزے دار سموسے۔ تازہ مٹھائی اور عمدہ بسکٹ سب ہی کچھ موجود ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ ہر مال ملے گا ایک آنہ۔ ایک پارٹی کی ابھی چائے بھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ہلکی ہلکی گھنٹیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اور ایک ساتھ شور مچا "ہاتھی آیا، ہاتھی آیا" آدھی پونی چائے چھوڑ چھاڑ بچے بھاگ لئے اور مشرقی دروازے کے قریب ہاتھی کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہر بچہ کوشش کر رہا ہے کہ وہ پہلے ہاتھی پر بیٹھے۔ لیکن چالاک بچے پہلے ہی سے اپنے بیٹھنے کا انتظام کر چکے تھے۔ دو چار ہی منٹ بعد ہاتھی جھومتا ہوا چل پڑا۔

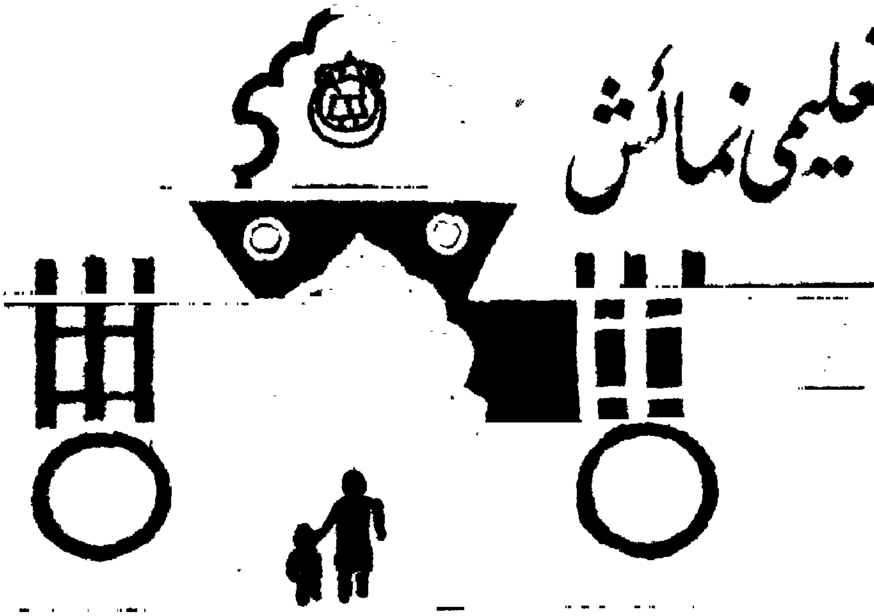
(صفحہ ۱۲ کا بقیہ)

ترین عمارتیں۔ مناظر اور بڑا باریک قسم کا آرٹ کا کام ہے اسی کمرے میں جامعہ میوزیم بھی ہے۔ یا یوں سمجھ لیں کہ جامعہ کی کہانی تصویروں کی زبانی ہے۔ اس کمرے سے باہر نکلئے چبوترے پر آپ کو خطاطی، نقاشی اور مصوری کے لاجواب نمونے نظر آئیں گے۔ چلئے یہیں سے ہسٹری، کلاس اور دہلی میوزیم کی طرف ہکل چلیں۔ آہا ہا یہ کمرہ کیا ہے جیسے سچ مچ کوئی عجائب گھر پادرے ہندوستان کی تاریخ پوری دلّی کا حال، نہ صرف آج کی دلّی بلکہ ان سے پہلے کی سات آٹھ دلیوں کی پوری کہانی فقروں میں عبارتوں میں۔ تصویروں میں صنعت و حرفت کے نمونوں میں۔ نقشوں کے ذریعہ، سکوں کے ذریعہ چارٹس، کتابچوں اور نقشوں کے حوالے سے ملتی ہے۔

ہسٹری یا تاریخ کے ساتھ جغرافیہ کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اسی عمارت میں کتب خانے کے بعد جو کمرا ہے وہاں جغرافیے کی طلسم کارفرمائی ہے ہندوستان کا جغرافیہ، ایشیا کا جغرافیہ بلکہ دنیا کا جغرافیہ پڑھنا چاہیں اور نرالی دنیا کے شعبدے دیکھنا چاہیں تو اس کمرے کا چکر لگائیے۔

ایک سیلانی

تعلیمی نمائش



نمائشیں تو بہت ہوتی ہیں۔ آئیے ہم آپ کو اس تعلیمی نمائش کی سیر کرائیں۔ پہلے مدرسہ ابتدائی کی طرف چلیں۔ اچھا بھائی دیکھئے یہ پہلا کمرہ ہے۔ یہاں چوتھی جماعت کے بچوں کا کام رکھا ہوا ہے۔ اس کمرے کو دیکھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ چوتھی جماعت کے بچوں نے چند مہینوں کی مدت میں کیا سیکھا ہے۔ یہ بچے ہر ہفتے "کھیل کھلاڑی" کے نام سے ایک اخبار نکالتے ہیں۔ یہ اخبار سائکلو اسٹائل سے چھپتا ہے۔ اس کے مضامین اور خبریں سب لڑکوں کی حاصل کی ہوئی ہوتی ہیں۔ ترتیب اور چھپائی میں استاد اُن کی مدد کرتے ہیں۔

دوسرے کمرے میں دوم جماعت کا "ہماری معلومات پروجکٹ" اور سوم جماعت کا "کپڑا پروجکٹ" دیکھئے۔ سوم جماعت کے بچوں نے کپڑے کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں ان کو اپنی سمجھ کے مطابق لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہر بچے کا ایک کتابچہ بھی تیار ہے۔ چارٹوں کی تیاری میں رنگ اور روشنائی سے زیادہ مختلف قسم کے کپڑوں کے ٹکڑوں سے کام لیا گیا ہے۔

اسی کمرے میں گتے اور لکڑی کا کام بھی سجا ہوا رکھا ہے۔ اسی کمرے میں ایک طرف بچوں کی

حکومت کی گیلری ہے۔ ابتدائی میں بچّوں کی حکومت کے ذریعہ بچّے مدرسے کے انتظام میں استادوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ آپ کو یہاں پر بچّوں کی حکومت کے بارے میں پوری معلومات ملیں گی۔

دوسرے کمرے میں جانے کے لئے آپ کو چبوترے سے ہوکر گزرنا پڑے گا۔ چبوترے کے بیچ میں تری پلائی کا بنا ہوا ایک نازک سا پھاٹک نظر آتا ہے۔ اس کو بنانے والے استادوں اور طالب علموں نے ہندوسلم اور جرمن فن تعمیر کو بڑی خوشنمائی کے ساتھ اکٹھا کردینے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد آگے بڑھیے تو برآمدے میں شیشے کے شوکیسوں میں سانپ، بچھو، مختلف قسم کے انڈے، سیپیاں اور سمندر سے نکلنے والی عجیب وغریب چیزوں کا ایک معقول ذخیرہ ہے۔ اس کے علاوہ مختلف کاموں کے چارٹ شیشے کے ڈبوں میں بچّوں کے بنک کے جمع کئے ہوئے مختلف ملکوں کے سکّے اور نوٹ رکھے ہوئے ہیں۔ ایک ڈبے میں تاریخی اور یادگاری ٹکٹ ہیں۔ اب کمرے کے اندر چلئے یہاں پانچویں جماعت کے بچّوں کا کام رکھا ہوا ہے۔ دیواروں اور میزوں پر آزادی پروجکٹ کا پورا کام نظر آتا ہے۔ ہندوستان آج سے

چھ برس پہلے غلام تھا اس کو آزاد کرانے کے لئے ہمارے بزرگوں نے کیا کیا۔ ان کی کہانی یہاں تصویروں کے ذریعہ دیکھئے۔ اس سلسلے میں ہمارے ادیبوں شاعروں کی خدمت، سپاہیوں اور دوسرے پیشہ وروں کے کارنامے تصویروں اور مضمونوں کی شکل میں موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں بائیں طرف دیس پروجکٹ کے نام سے اس سال کے پانچویں جماعت کے بچّوں کا کام ہے۔ یہاں ہندوستان کے جغرافیہ کے متعلق معلومات ہیں۔ یہاں کی پیداوار، رسم و رواج، دریا پہاڑ اور دوسری قدرتی چیزوں کے بارے میں معلومات ہیں۔

اب چوتھا اور آخری کمرہ اور رہ گیا ہے۔ اس کمرے میں زیادہ تر وہ سامان ہے جس کی مدد سے استاد یہاں کے لڑکوں کو پڑھاتے ہیں۔ یعنی بڑے بڑے نقشے کتابیں، گلوب، دوربین اور خوردبین وغیرہ اٹلس اور البم۔ یہ دیکھو بیچ کی بڑی سی میز پر کچھ لکڑی کے فریم، گتے کے ٹکڑے، گولیاں، تیلیاں، چکر، چوخانے اور تکون رکھے ہوئے ہیں۔ انسان کے جسم اور دماغ کی بناوٹ اور ان کا کام سمجھانے کے لیے ماڈل رکھے ہوئے ہیں۔ مکھی مچھر اسی طرح کے بہت سے کیڑے مکوڑے بھی

آدمی کو بیمار اور ہلاک کرتے رہتے ہیں۔ ان کی بڑی بڑی شکلیں اور ان سے پھیلنے والی بیماریوں کو اگر آپ سمجھنا اور پھر ان سے خود بچنا اور دوسروں کو بچانا چاہتے ہیں تو تھوڑی دیر یہاں ٹھہریئے اور ان کو سمجھئے۔

ابتدائی کی تعلیمی نمائش کی تو آپ نے اچھی طرح سیر کر لی ابھی نمائش کے دو حصے باقی ہیں۔

نئی عمارت میں "استادوں کے مدرسے" کی نمائش ہے۔ کمرے کے اندر داخل ہوتے ہی آپ کو پورا کمرہ طرح طرح کے نقشوں اور قسم قسم کے چارٹوں سے سجا ہوا نظر آئے گا۔ بعض نقشے اور چارٹ ایسے ہیں جن میں تعلیم کے مختلف طریقوں کو سمجھایا گیا ہے۔ پھر نیچے میزوں پر آپ کو بہت سے چھوٹے چھوٹے کتابچے رکھے ہوئے ملیں گے کسی کتابچے میں بچوں کے قابل نظمیں، چھوٹے چھوٹے مضمون، ایک کتاب میں مختلف درجوں کے بچوں کے لئے خطوں کے نمونے اور طریقے جمع کئے گئے ہیں۔ اب یہ تصویریں دیکھئے کیسی ہیں؟ ان تصویروں میں سے دو تین تصویریں اٹھا لیجئے آپ کو ایک بنی بنائی کہانی مل جائے گی انکے بعد دیکھئے یہ پیچ چکر کیسے ہیں جو آپ ان کو خالی کھیل کی چیز نہ سمجھ لیں، اس کھیل سے استاد بچوں کو حرفوں کی پہچان پھر ان حرفوں سے لفظ اور لفظوں سے جملے بنا لینا سکھا دیتا ہے۔ ان کے علاوہ اب چلئے دوسرے کمرے میں، یہ تعلیم و ترقی کی نمائش کا کمرہ ہے۔ جامعہ میں یہ ادارہ بڑی عمر کے بے پڑھے لکھے لوگوں کے لئے کتابیں، نقشے اور طرح طرح کے چارٹ تیار کراتا ہے ان چیزوں کی مدد سے ان پڑھ لوگوں کو کم مدت میں لکھنا پڑھنا آجاتا ہے اور بہت سی دوسری مفید باتیں معلوم ہوجاتی ہیں۔ یہاں سے نکلتے ہی مکتبہ جامعہ کی نمائش کے کمرے کی طرف قدم مڑنے لگتے ہیں۔ قدم رکھتے ہی نظر بس ایک شفاف اور پُر سکون کمرے کی خاموش کتابی دنیا میں گم ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ شعبہ ہے جہاں سے بیسوں برس سے بچوں، بوڑھوں، نوجوانوں، عورتوں اور مردوں کے لئے ان گنت کتابیں تیار ہو کر سارے ملک میں پہنچتی رہتی ہیں مکتبے کی تمام نئی پرانی کتابوں کے نمونے، چھپنے والی کتابوں کے مسودے کی کارگزاری، نقشوں اور چارٹوں کے ذریعہ دیکھنے والوں کے سامنے رکھ دی گئی ہے۔ اس عمارت کے چوتھے اور آخری کمرے میں مدرسۂ ثانوی کی لیبارٹری ہے جہاں

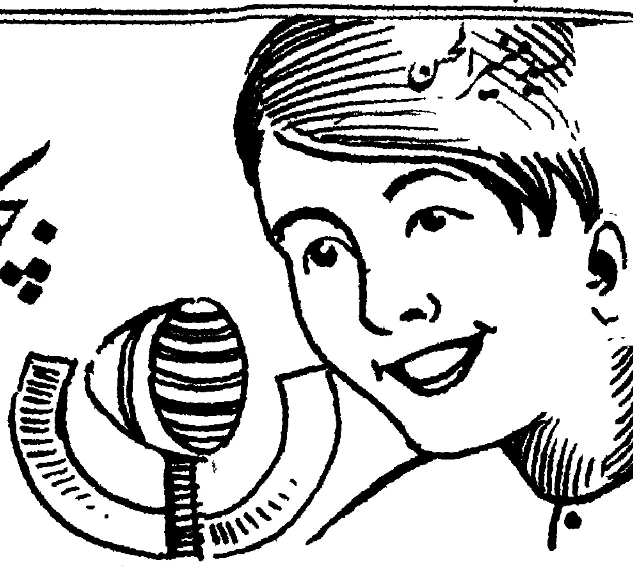
سائنس پڑھنے والے طالب علم سائنسی تجربے کرتے ہیں، آلات اوزار، متعدد قسم کے ترازو، کئی طرح کی خورد بینیں رکھی ہوئی ہیں۔ ثانوی کا ذکر آگیا تو اب ثانوی کے باقی کمرے بھی دیکھ لینا ضروری ہیں چلیئے اب اس عمارت سے نکلیں اور اسی طرف چلیں مگر نہیں ابھی اسی عمارت کے ایک کمرے میں آرٹ کے طلبار کی نمائش تو دیکھنے سے رہی جا رہی ہے۔ یہ استادوں کے مدرسے کا ایک حصہ یا سیکشن ہے۔ یہاں اسکولوں میں تعلیم دینے کے لیئے آرٹ اور ڈرائنگ کے استاد تیار کئے جاتے ہیں۔ کمرے، فرش اور دیواریں سجانے کا کتنا اچھا سامان تیار ہے۔ پھول بوٹے اور بیلوں کے طرح طرح کے رنگین اور حسین نمونے رنگین پنسلوں پانی اور تیل کے رنگوں سے بنی ہوئی تصویریں، سانچے اور طرح طرح کے نقش و نگار کے ڈرائن، اس کمرے میں چیزیں تھوڑی ہیں مگر سب کی سب اچھی اور دل کش ہیں۔

اس عمارت سے نکل کر ثانوی کی طرف جاتے ہوئے داہنی جانب ایک شامیانے کے نیچے کالج والوں کی چائے چپل کی دکان ملتی ہے۔ یہاں بیٹھ کر چائے پیجئے اور چپل بنانا سیکھئے کالج کے طالب علم اپنی فرصت کے وقت میں چپل بنا سیکھتے ہیں اور بہت تھوڑی مدت میں قسم قسم کی چپلیں بنانے لگتے ہیں۔ جن کے نمونے یہاں موجود ہیں۔ اب آگے بڑھیں۔ شفا خانے کی طرف سے ثانوی کی عمارت کے پہلے کمرے میں داخل ہوجائیے برآمدے میں، یہاں بھی بڑی بڑی قلمی تصویریں لگی ہوئی نظر آتی ہیں۔ پریم چند۔ یہ اردو کے سب سے بڑے کہانی کار مانے جاتے ہیں۔ انھیں کے برابر مرزا غالب، اردو کے سب سے بڑے شاعر۔ چلیئے کمرے کے اندر چلیں، یہاں اردو کے تمام شاعروں اور ادیبوں کی ہات کی بنی ہوئی تصویریں ایک سرے سے دیکھنا شروع کردیجئے۔ میر سے لے کر فیض تک ہر شاعر کو یہاں دیکھ لیجئے۔ اسی کمرے میں آپ کو نئے پرانے شاعروں اور ادیبوں کی تمام اچھی اچھی کتابیں بھی الماری میں رکھی ہوئی مل جائیں گی، یہ ثانوی مدرسے کا اردو کلاس ہے۔ ان کے برابر میں ڈرائنگ کلاس ہے بلکہ اس کو تو نگار خانہ کہنا چاہیئے۔ ڈرائنگ کے نہایت حسین نمونے، جامعہ اور ملک کے بڑے لوگوں کی بیش قیمت اور منہ بولتی بڑی بڑی تصویریں۔ لڑکوں کی بنائی ہوئی حسین

بقیہ ص۳۱ پر دیکھئے

بشیر الحسن

بچوں کی کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال



لیجئے اچھا ہوا کہ ہم وقت سے آ گئے اب کانفرنس شروع ہونے میں صرف ایک منٹ باقی رہ گیا ہے۔ لوگ بڑی مشتاق نگاہوں سے اسٹیج کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ کانفرنس کے صدر جناب صہیب احمد قدوائی بچوں کی حکومت مدرسہ ابتدائی کرسی صدارت سنبھال چکے ہیں ان کے قریب ہی کانفرنس کے سکریٹری بیٹھے ہوئے ہیں صدر اور سکریٹری کے پیچھے نصف دائرہ بنائے ہوئے کرسیوں پر کانفرنس میں حصّہ لینے والے مقرّرین رونق افروز ہیں۔ اب صدر صاحب کانفرنس کے شروع ہونے کا اعلان فرما رہے ہیں۔ اور انھوں نے بچوں کی برادری رامپور کے وزیر اعظم صاحب کو نظم پڑھنے کے لئے پکارا ہے۔ لیجئے۔ بچوں کی برادری رامپور کے وزیر اعظم صاحب بچوں کو اچھا اور نیک بناتے والے خیالات سے بھری ہوئی نظم سنا رہے ہیں۔ نظم کے ختم ہوتے ہی تالیاں بجنے لگی ہیں۔ اب صاحب صدر نے پروگرام کے مطابق جناب محمد اسلم صاحب (نونہال کلب کوچہ رحمٰن دہلی) کو اپنا خطبۂ استقبالیہ پڑھنے کی دعوت دی ہے۔

محمد اسلم صاحب نے اپنا خطبہ پڑھا۔

اب جناب صدر کی باری تھی چنانچہ جناب صدر نے اپنا خطبۂ صدارت شروع کرنے سے پہلے ایک نظر مجمع پر ڈالی (اسٹیج) اُس وقت حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ بچوں کا اتنا بڑا مجمع پہلی بار اس جگہ جمع ہوا تھا انہوں نے نہایت اہتمام سے اپنا خطبۂ پڑھنا شروع کیا۔ آپ نے کہا "کہ آج آپ نے مجھے جو عزت بخشی ہے اس کا دل سے شکریہ۔ آگے چل کر آپ نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا کہ یہ ہماری تیسری کانفرنس ہے اور دہلی جیسے شہر میں ہو رہی ہے جو ہمارے دیس کی راجدھانی ہے۔ کانفرنس کا پہلے پہل سوچنا اور اُسے بار بار بلانا ہمارے لئے بڑے فخر کی بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم نے راجدھانی میں رہنے کا حق ادا کر دیا۔ اور ہم نے یہ کانفرنس بلا کر دوسرے صوبوں کے بچوں کے لئے ایک مثال قائم کر دی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ بھی چاہیں تو اپنے صوبوں میں اسی طرح کانفرنسیں بلائیں اور اپنے لئے کچھ سوچ بچار کریں

چنانچہ آئندہ کے لئے آپ نے کاموں کا پروگرام پیش کرتے ہوئے کہا (۱) صفائی (۲) ستھرائی (۳) بھائی بہنوں سے ساتھیوں اور دوستوں سے میل ملاپ (۴) پڑھائی لکھائی میں محنت اور کوشش (۵) اپنے بس بھر دوسروں کی مدد (۶) بزرگوں کا ادب (۷) خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کی عزت اور ایسی ہی بہت سی چیزیں۔ پھر یہ کہ ہمارے ملک میں ابھی تعلیمی کام زیادہ نہیں ہوا ہے ہمارے بہت سے بھائی بہنوں کو پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ ان کے لئے کوئی ایسی بات سوچنا جس سے ہمارا ہر ساتھی تعلیم پا سکے۔ آگے چل کر ملک کا انتظام ہمارے ہاتھ میں آنے والا ہے اس کے لئے ہمیں ابھی سے محنت اور کوشش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اپنے کو ابھی سے اس کے لئے تیار کر سکیں۔ اس کے لئے ہماری یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ گھروں میں، مدرسوں میں چھوٹے چھوٹے کاموں میں اپنے ماں باپ اور استادوں کا ہاتھ بٹائیں۔

آپس کے جھگڑوں کو خود ہی طے کر لیا کریں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب وہ باتیں ہیں جن کو آپ میں سے ہر ایک محسوس کرتا ہوگا آئیے ہم سب مل کر کچھ کہنے اور کرنے کی صورت نکالیں۔ وہ عزت جو آپ نے مجھے بخشی ہے اس کا ایک بار پھر شکریہ۔

خطبہ صدارت کے ختم ہوتے ہی تمام حاضرین نے بے ساختہ بڑے زور زور سے تالیاں بجائیں اور اس طرح اپنی مسرت اور خوشی کا اظہار کیا۔

لوگوں کو بچوں کی یہ کانفرنس بہت ہی بھلی معلوم ہو رہی تھی اور وہ خوش ہو رہے تھے کہ ہمارے ملک کے بچے بھی اتنے اچھے اور بڑے بڑے کام سلیقہ اور کامیابی سے کر سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ ابھی ابھی آپ کو ان پیغامات سے ہو جائے گا جو سکریٹری صاحب سنانے والے ہیں، لیجئے وہ دیکھئے صدر صاحب سکریٹری صاحب سے پیغامات پڑھ کر سنانے کے لئے فرما رہے ہیں۔ ہاں سنئے۔ سکریٹری صاحب فرما رہے ہیں کہ کامیابی کے لئے جو پیغامات آئے ہیں ان میں صوبۂ دہلی کے چیف منسٹر صاحب کے علاوہ جرمنی، جاپان، اٹلی، کناڈا، لنکا اور دیگر کئی ممالک کے سفیروں نے بھی اپنے اپنے پیغامات سے نوازا ہے۔

صوبہ دہلی کے چیف منسٹر چودھری برہم پرکاش صاحب نے اپنے پیغام میں فرمایا کہ "بچے بلاشبہ ہمارے مستقبل کی امیدیں ہیں" آپ نے فرمایا کہ "آئندہ جمہوریت کی کامیابی کا دارومدار انھیں پر ہے اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کی برادری کی طرف سے بلائی ہوئی یہ کانفرنس ہمارے ملک کے لئے بہت ہی اہم کام انجام دے رہی ہے"

جرمن سفیر نے اپنے پیغام میں کہا کہ "میرے خیال میں مختلف قوموں کے بچوں میں ملاپ اور بھائی چارہ پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ آپ نے کانفرنس کی کامیابی کی خواہش کا اظہار فرمایا۔

اٹلی کے سفیر نے کانفرنس بلانے پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے یہ بھی خواہش

ظاہر کی کہ کانفرنس میں تعلیمی اور سماجی باتوں پر جو تجویزیں پاس ہوں ان کی اطلاع بھی آپ کی دی جائے۔

مذکورہ بالا پیغامات کے علاوہ بلجیم، فلپائن، آسٹریلیا، نیوزیلینڈ اور سوئیڈن وغیرہ کے سفیروں نے بھی اپنے پیغامات بھیجے تھے۔

ان پیغامات کو سنانے کے بعد ونّا اور ان کے ساتھیوں نے ایک ترانہ پڑھا جو بہت پسند کیا گیا۔ اس کا پہلا مصرعہ یہ تھا

ہندوستان کے ہم ہیں ہندوستان ہمارا

اس ترانہ کے بعد تجاویز پیش ہونے کا نمبر آ گیا ہے۔ اس کانفرنس میں جو تجاویز پیش ہونے والی ہیں ان میں سے ہر ایک تجویز اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ان تجاویز کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت بچوں کے سامنے کون کون سے مسائل درپیش ہیں اور وہ ان کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ اور ان کو منظور کرانے کے لئے اس حد تک بے چین ہیں کہ ان تجاویز کو کانفرنس کے ایجنڈے یعنی پروگرام میں شامل کرا دیا ہے۔ انھوں نے ان تجاویز کی موافقت اور مخالفت میں بولنے کے لئے اور اپنی بات منوانے کے لئے ان کو تیار کرنے میں رات دن ایک کر دیا ہے۔ آپ ان تجویزوں کو سننا چاہتے ہوں گے اچھا تو لیجئے سن لیجئے وہ یہ ہیں۔

۱۔ بچوں کی یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ ہر اسکول میں بچوں کی پنچایتیں قائم کی جائیں اور اسکول کا انتظام بچوں کے سپرد کیا جائے

۲۔ بچوں کی یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ اسکولوں میں تعلیم کتابوں کی بجائے ریڈیو اور فلموں کے ذریعہ دی جائے۔

۳۔ بچوں کی یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں مدرسوں میں فیس بالکل نہ لی جائے۔

۴۔ بچوں کی یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ تمام اسکولوں میں ایک ہی قسم کا لباس (یونیفارم) ہونا چاہیئے۔

۵۔ بچوں کی یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ حکومت کی طرف سے ہر اسکول میں بچوں کو انٹرول یعنی وقفہ میں ناشتہ ملے۔

ان تجویزوں پر صوبہ دہلی کے بچوں کی برادری کے بہت سے کلبوں کے بچے بولے

ان تجاویز کی مخالفت اور موافقت میں جن بچوں نے تقریریں کیں ان کے نام یہ ہیں صلاح الدین نعمانی، ستار شاہ، عرفان عالم ہرچرن سنگھ، محمد سلیمان بیگ، محمد طارق، گل محمد نواب بیگ اور محمد حبیب حسان۔

ان سب بچوں کی تقریریں اپنی اپنی جگہ بہت کامیاب رہیں۔ان سب کا تقریر کرنے کا انداز اچھا تھا۔جن باتوں کو اپنی تقریر میں ان بچوں نے پیش کیا ان میں ایک ربط اور تسلسل تھا۔زبان بڑی سیدھی سادی تھی۔ بیان کرنے کا انداز دل نشین تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان سب میں جھجک اور شرم نام کو نہ تھی نہایت بے خوفی اور نڈر پن سے تقریریں کیں۔

بحیثیت مجموعی کانفرنس کی کارروائی سب کو پسند آرہی ہے۔ اب ان تجویزوں کے بعد بچوں کے گھر کے بچے ترانہ پڑھ رہے ہیں اس ترانہ کا عنوان ہے ؎

ابھی بچے ہیں لیکن ایک دن ہم بھی جوان ہونگے

ترانہ عام طور پر پسند کیا جا رہا ہے اچھا ہے اس کے بعد پروگرام کے مطابق سکریٹری صاحب اب سب کا شکریہ ادا کر رہے ہیں اور صدر صاحب جلسے کے خاتمہ کے اعلان کے ساتھ ساتھ ایک ڈرامہ "امتحان" جو بچوں کے پارک دریا گنج نے تیار کیا تھا، دیکھنے کے لئے رُکنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ڈرامہ نقل کرنے والوں کے لئے عبرت آموز تھا۔ سب سے آخر میں طبلے کے ساتھ بانسری پر ہرچرن سنگھ نے گیت سنایا جو بہت پسند کیا گیا۔

اس کے بعد یہ پروگرام ختم ہوا مجمع اس قدر تھا کہ کافی دیر تک لوگوں کو باہر جانے کا راستہ نہ مل سکا جلسہ بہت کامیاب رہا اور بخیر و خوبی ختم ہوا۔

جلسے کے دوران میں کوئی ہنگامہ اور گڑ بڑ نہیں ہوئی۔جناب صدر صاحب نے کانفرنس کی کارروائی اس خیر و خوبی سے چلائی اور مجمع کو ایسا قابو میں رکھا کہ لوگ حیرت میں تھے اور کہہ رہے تھے کہ واقعی ایک کانفرنس کا صدر ایسی ہی خوبیوں کا ہونا چاہئے۔



عبدالستار بجنوری

میلے کا دیہاتی پروگرام

جامعہ کے میلے میں پچھلے سال سے دیہاتی بھائیوں کو جو جامعہ کی آبادی کے آس پاس آباد ہیں۔ شرکت کی دعوت دی جاتی ہے اور ان کے فائدے اور پسند کی چیزیں خاص طور سے میلے کے پروگرام میں شامل کی جاتی ہیں۔

پچھلے سال پہلی مرتبہ جامعہ والوں نے دیہاتی بھائیوں کو میلے میں شریک کیا اور یہ سال دیہاتی بھائیوں کا پہلا اور آزمائشی سال تھا۔ جب جامعہ والوں نے یہ دیکھا کہ اس میں دیہاتی بھائیوں نے صرف حصہ ہی نہیں لیا بلکہ اپنے پروگراموں کو کامیاب طریقے سے چلا کر میلے کی دلچسپیوں کو اور بھی بڑھا دیا تو اس سال ان لوگوں کو خاص طور پر دعوت دی گئی۔ اور میلے کے ۳ مصروف دنوں میں سے تقریباً ایک دن گاؤں کے لوگوں کے سپرد کر دیا گیا اور انھیں اجازت دی گئی کہ مرضی کے مطابق خود بھی اس دن سے فائدہ اٹھائیں۔ اور اپنے اور دوسروں کے لئے دلچسپی کے سامان اکٹھا کریں۔ چنانچہ ان بھائیوں نے اپنے ذمہ ۵ پروگرام لئے اور ان کو چلایا۔ ۱؎ دیہاتی کانفرنس ۲؎ دیہاتی نمائش ۳؎ دیہاتی کشتیاں ۴؎ فلم شو ۵؎ دیہاتی کلچرل شو (دیہاتی ناٹک)۔

آئیے اب ہم ایک اک پروگرام کو غور سے دیکھیں۔

۱۔ پہلا پروگرام دیہاتی کانفرنس کا تھا۔ دیہاتی بھائیوں نے ٹھنڈے دل سے اپنے مسائل کو سوچنے اور حل کرنے کے لئے دیہاتی کانفرنس کی۔ اس کانفرنس کی میزبان چونکہ جامعہ خود تھی۔ اس لئے جامعہ کی طرف سے پروفیسر محمد عاقل صاحب نے استقبالیہ خطبہ پڑھا اور کانفرنس میں شریک ہونے والوں کا استقبال کیا۔ کانفرنس نے پہلے دیہاتی بھائیوں کے محبوب کارکن جناب شفیق الرحمٰن صاحب مرحوم کی وفات پر ریزولیشن پاس کیا۔ اور سب حاضرین ان کی یاد میں ایک منٹ تک خاموش کھڑے رہے۔

گاؤں والوں کی طرف سے دہلی کے وزیر اعلیٰ جناب چودھری برہم پرکاش صاحب سے اس موقع پر دیہی نمائش کا افتتاح کرنے اور کانفرنس کی صدارت کرنے کے لئے درخواست کی گئی تھی اور موصوف نے خوشی سے اس دعوت کو قبول کیا اور تشریف لائے۔ گاؤں والوں نے آپ کا استقبال بڑی شان کے ساتھ کیا اس موقع پر دہ گاؤں کے باجوں نے مل کر آپ کو خوش آمدید کہا۔

کانفرنس میں گاؤں والوں نے سبزی بونے والوں میں اتم سنگھ اور نتھو حلوائی نے اپنی مشکلات مچھلی پکڑنے والوں کی جانب سے عنایت اللہ صاحب سکریٹری انجمن ماہی گیران نے ان کی دقتیں پیش کیں۔ پنڈت سیس رام نے دودھ کا کام کرنے والوں کی مجبوریوں کو پیش کیا۔ جامعہ کے ایک استاد عبدالرزاق صاحب نے مل جل کر کام کرنے والوں کی انجمنوں کے بارے میں بتایا کہ اگر ہم لوگ اپنے اپنے گاؤں میں انجمنیں بنا کر کام کریں تو اس سے نہ صرف ہمارا ذاتی فائدہ ہوگا بلکہ اس سے پورا گاؤں اچھا، عمدہ اور خوشحال گاؤں بن سکے گا۔

چودھری برہم پرکاش صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں جامعہ والوں اور گاؤں والوں دونوں کو مبارک باد دی۔ جامعہ کے متعلق آپ نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ "نیا ہندوستان جامعہ میں بن رہا ہے"۔ اسی کے ساتھ ساتھ آپ نے تمام لوگوں کو یقین دلایا کہ ان کی تکلیفوں کے بارے میں حکومت پہلے ہی سے غور کر رہی ہے۔

دیہاتی نمائش میں کاشتکاری، مرغی خانہ،

جنگلات اور مچھلی پکڑنے کے متعلق بہت اچھی اچھی چیزوں کی نمائش کی گئی تھی۔ جامعہ کی درخواست پر دہلی حکومت کے محکموں اور مرکزی حکومت کے تحقیقاتی پوسا انسٹیٹیوٹ نے اس نمائش میں حصہ لیا تھا۔ جامعہ کے دیہی معاشیات کی طرف سے جو جنتری اور دودھ کے کام پر تحقیقات ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں بھی اس نمائش میں بہت مفید معلومات کی چیزیں تھیں۔

کانفرنس کے ختم ہونے کے فوراً بعد دیہاتی کشتیوں کا دلچسپ پروگرام تھا، اور اس کو دیکھنے دور دور کے دیہاتی بھائی آئے تھے۔ یوں بھی اور کھیلوں کی بہ نسبت دیہاتی بھائی دنگل کو بہت پسند کرتے ہیں۔

کشتیوں کا سماں بھی خوب تھا۔ ایک شخص اکھاڑہ پر کھڑا ڈھول بجا رہا تھا گویا بہادروں کو میدان میں آنے پر اُکسا رہا ہو۔ ایک لکڑی کے ڈنڈے پر ایک پگڑی ٹنگی تھی اور وہ پہلوانوں کو للکار رہی تھی۔ کہ آؤ اور مجھے جیتو۔ جو پہلوان کشتی جیت لیتا اس کو یہ پگڑی انعام میں مل جاتی تھی۔ اس اکھاڑے میں دیہات کے بچوں نے بھی خوب کشتیاں لڑیں۔ اور جن بچوں نے کشتیاں ماریں ان کو انعام میں بنیائن دیئے گئے۔

دن چھپ گیا تھا اور اب فلم شو کی باری تھی۔ جامعہ نے حکومت سے درخواست کر کے دیہاتی بھائیوں کے لئے فلم شو کا انتظام کرایا تھا۔ اس میں کھیتی، دودھ اور مل جل کر کام کرنے والی انجمنوں (کوآپریٹیو) کے بارے میں فلم دکھائے گئے۔ یہ پروگرام بھی خاصا دلچسپ رہا۔

۸ بج چکے تھے اور اب دیہاتی پروگراموں کا آخری حصہ یعنی دیہاتی ناٹک کا پروگرام تھا۔

ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پردہ اُٹھا۔ عورت نے ناچنا شروع کیا۔

"میں تو اوڑھ چُندریا آئی ہوں میلے میں"

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ گانا احد نامی مشتاق احمد صاحب نے پیش کیا تھا۔ ویسے بھی گانا حسب موقع تھا اور پیش کرنے کا انداز بہت اچھا تھا اس لئے لوگ جھوم اُٹھے۔ اس کے بعد گاؤں کے چھوٹے بچے منگتی، کلو اور چندا نے ایک گیت اور ایک نظم جو بچوں کے شاعر محمد شفیع الدین نیر صاحب کی لکھی ہوئی تھی پڑھی۔

وہ نظم قرضے سے متعلق تھی۔

قرضے نے جان گھلائی رے
قرضے نے [illegible] رے

اس کے تھوڑی ہی دیر بعد ایک دیہاتی بابو لال اسٹیج پر آیا اور اپنی سارنگی پر لپک لپک کر گانے لگا۔

کا کروں کت جاؤں میری بیرن بھینیا

اور لوگ اس کو سن کر جھوم جھوم گئے۔

ناٹک کوئی مسلسل قصہ یا کہانی نہیں تھی بلکہ دیہات کی مختلف قسم کی دلچسپیوں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا تھا۔

پھر جمن میاں دیہاتی عورت کا بھیس بدل کر آئے اور مرد جس کا کام عبدالستار صاحب نے کیا تھا اسٹیج پر آ گئے اور عورت نے ناچ کر گانا شروع کیا۔

چل بے نکھٹو گواریا تیرے سنگ جاؤں گی

اور مرد نے ناچ کر خوشامدانہ انداز میں گزارش کی۔

آ میری پیاری شہزادیہ میرے سنگ چل تو ہی

کہاں تک اس ناٹک کی تفصیل آپ کو بتائی جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ناٹک کا ہر گانا اور ناچ اپنی جگہ بہت دلچسپ اور پسندیدہ تھا۔

اب احمد علی ایک دیہاتی عورت کا بھیس بدل کر آئے اور انھوں نے اپنے جواری خاوند کی حاضرین سے یوں شکایت کی۔

سیاں ناش کا کھلاڑی گھر کو کر دیا چپڑا

دوسری دیہاتی عورت کا پارٹ جمن نے ادا کیا جس نے خوب مٹک مٹک کر ناچنا شروع کیا۔ اور اس کے بعد یوں گانے لگی۔

مورے پیّوں پیّوں چلا رے دیکھا جائے

اور حاضرین جھوم جھوم گئے۔

اس کے بعد ایک دیپک ناچ عبدالستار نے کیا اور سپیرے کا ناچ مشتاق صاحب نے کیا۔ یہ دونوں ناچ سچ مچ بہت ہی عمدہ ناچ تھے اور اس پر حاضرین نے خوب خوش ہو ہو کر تالیاں بجائیں۔

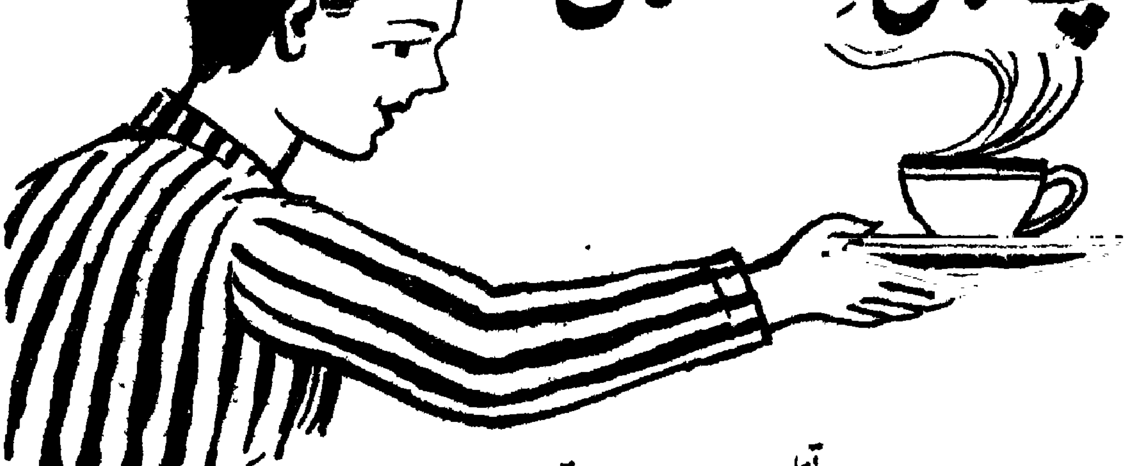
آخر میں بچوں نے ایک گیت گایا۔

آ اوری سنوریا، جا اوری بجریا، لا اوری چندریا کھادی کی
جے بولو مہاتما گاندھی کی

ان پروگراموں میں اشفاق خاں، رام سرن، عبدالمجید، مینڈھا، معصوم علی، نیاذر خاں، منصور صدیق، رسول خاں، نورو، بابو اور قادر وغیرہ نے خاص طور پر دلچسپی لی اور اس کو کامیاب بنایا۔

انیس احمد

آپ کا ٹی اسٹال



جامعہ میں جو تعلیمی میلہ ہوا تھا. اس میں اور چیزوں کے ساتھ ساتھ دکانیں اور ہوٹلیں بھی سجائی گئی تھیں۔ جو مہمان میلہ دیکھنے آتے تھے۔ جامعہ کے طالب علم ان کی رہنمائی کرتے تھے۔

آئیے! اب ہم آپ کو ایک مہمان اور ایک بچّے کا مکالمہ سنائیں جو میلہ میں ہوا تھا۔

لڑکا:۔ السلام علیکم

مہمان:۔ وعلیکم السلام۔ بھئی ہم آپ کا میلہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ ہمیں میلہ دکھا سکیں گے۔

لڑکا:۔ ضرور! تشریف لائیے۔ دیکھئے! یہ ہمارے مدرسے کی نمائش ہے۔ اس میں سب لڑکوں کا کیا ہوا ہے۔ وہی پوسٹر بناتے ہیں وہی مضمون لکھتے ہیں اور وہی پمفلٹ تیار کرتے ہیں۔ البتہ ہمارے استاد صرف اصلاح دیتے ہیں۔

مہمان:۔ بہت خوب! آپ لوگ تو بہت اچھا کام کرتے ہیں۔

لڑکا:۔ یہ دیکھئے سامنے میلہ بازار ہے۔ اس میں مختلف دکانیں اور مختلف ہوٹل وغیرہ ہیں۔

مہمان:۔ ہم کچھ ناشتہ کرنا چاہتے ہیں۔

لڑکا:۔ آئیے! ہم آپ کو اپنے ہوٹل میں لے چلیں۔

مہمان:۔ کیا بچے بھی ہوٹل لگاتے ہیں؟ تو تو ہم ضرور چلیں گے۔

لڑکا:۔ ہم نے اپنے ہوٹل کا نام "آپ کا ٹی اسٹال" رکھا ہے۔

مہمان:۔ بھئی واہ! بڑا اچھا نام تلاش کیا۔

لڑکا:۔ دیکھئے! یہ سب ہمارے ساتھی کام کر رہے ہیں۔ کوئی صاحب پھل بیچ رہے ہیں تو کوئی صاحب بسکٹ۔ یہ دیکھئے آپ کے لئے چائے آئی۔ اور کہئے کیا کیا چیزیں منگاؤں؟

مہمان:۔ کچھ پھل وغیرہ منگا دیجئے۔ ہمیں تو یہ دیکھ کر تعجب ہو رہا ہے کہ یہاں کے بچے کس محنت اور شوق سے کام کرتے ہیں۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ بچے کس طرح اتنی بڑی ہوٹل اور وہ بھی اتنی اچھی طرح چلا لیتے ہیں۔

لڑکا:۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ہم صرف میلہ پر ہی یہ کام نہیں کرتے۔ ہمیں تو باقاعدہ یہ سب کام بتائے جاتے ہیں۔ ہم اپنے مدرسے میں خوانچہ چلاتے ہیں۔ کچھ ہمارے ساتھی کتابوں کی دکان میں کام کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہم بچوں کا بینک بھی چلاتے ہیں۔

مہمان:۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ایک طرف تمہاری پڑھائی کا کام بھی قابل تعریف ہے اور دوسری طرف تم یہ ہوٹل بھی بہت اچھی طرح چلا رہے ہو۔ ہر چیز قاعدہ اور سلیقے سے لگی ہے۔ ریڈیو کا بھی انتظام کیا ہے۔ ہر میز پر ایک مینو رکھ دیا ہے تاکہ بغیر پوچھے سب چیزوں کی قیمت معلوم ہو جائے۔ اور بھئی چائے تو واقعی لاجواب کی ہے۔ شہر کے ہوٹل والے بناتے تو لاجواب کی ہیں۔ مگر وہ لاجواب نہیں ہوتی۔ تمہارا ہوٹل دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ تمہارے سب ساتھیوں کو مبارکباد۔

لڑکا:۔ تشریف لائیے۔ اب بچوں کا مشاعرہ شروع ہونے والا ہے۔

مہمان:۔ اچھا اب ہم یہ مشاعرہ دیکھیں گے۔

ایک تماشائی

"رکشا بندھن"

(بچوں کا ایک ڈرامہ)





جامعہ کے اس تعلیمی میلے میں جو ابھی حال میں ۱۳ر اکتوبر سے ۲ر نومبر تک ہوا ہے، سب سے اچھا کوئی اگر پروگرام تھا تو وہ چھوٹے بچوں کا ڈرامہ تھا جو رکشا بندھن، کے نام سے ۲ر نومبر کی رات میں ہوا تھا۔ یہ ڈرامہ اول تو جامعہ کے استاد اور بچوں کا مل کر تیار کیا ہوا تھا، اور دوسرے یہ کہ یہ اپنے سامنے کوئی مقصد اور پیام بھی رکھتا تھا۔ اور پھر اس پر مزید یہ کہ تفریح اور دل چسپی کے لحاظ سے سب ڈراموں سے بہتر تھا اور یہی رائے سب حاضرین اور دیکھنے والوں کی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بچیوں کا رنگین ساڑیوں میں اسٹیج پر آنا اور اپنے بہن بھائیوں کے ہاتھوں میں راکھی باندھنا اور ماتھے پر تلک لگانا ایسا دلکش منظر تھا، جس پر سب کے سب واہ واہ کرتے تھے پھر اس بچے کی تقریر جو ہمایوں کا پارٹ ادا کر رہا تھا، اپنی بے باکی اور نڈرتا کے لحاظ سے سب سے زیادہ قابل تعریف تھی۔

ڈرامے کی کہانی یہ ہے کہ میواڑ کی سلطنت پر بہادر شاہ کی فوج نے گجرات

سے حملہ کر دیا ہے۔ راجپوتوں کو فتح کی امید نہیں ہے اور وہ اپنی مدد کے لئے مغلوں کے بادشاہ ہمایوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں، جن سے کچھ ہی پہلے ان کے راجہ رانا سانگا کی لڑائی ہو چکی تھی۔ رانا سانگا کی بیوی کرماوتی، ہمایوں کو راکھی بھیجتی ہے یعنی اُسے اپنا بھائی بناتی ہے۔ ہمایوں کا مغلی خون جوش میں آجاتا ہے اور وہ دشمن کی بیوی کا بھائی بننا قبول کر لیتی ہے، اور میواڑ پر آنچ آنے نہیں دیتا ہے، بلکہ ایک مسلمان بادشاہ بہادر شاہ کے مقابلہ میں اپنی فوجیں بھیجتا ہے، اور اس طرح راجپوتوں کو فتح ہوتی ہے، اور یہی نہیں بلکہ بہادر شاہ کو اپنی گجرات کی سلطنت سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ پھر بھی ہمایوں اس سے مطمئن نہیں ہوتا ہے، رانا سانگا کی بیوی کرماوتی جو اس جنگ میں کام آجاتی ہے، اس وقت ہمایوں اس کی چتا کو اپنی آنکھوں سے لگاتا ہے، اور اس طرح بہن کا پورا حق ادا کرتا ہے۔

اب ناٹک کے بعض بعض حصّوں کو ملاحظہ کیجئے اور دیکھئے کہ ڈراما اپنے مقاصد اور اپنی زبان اور طرز ادا کے لحاظ سے کس پایہ کا ہے۔

جب کرماوتی ہمایوں کو طے کر لیتی ہے اور اسے راکھی بھیجتی ہے تو بعض مخالفوں کے جواب میں وہ کہتی ہے:

"ہمایوں بہادر ہے۔ اسے بھائی بنانا آتا ہے۔ ایسے بہادر کی بہن بننے سے فخر کی بات اور کیا ہو سکتی ہے! مسلمان بھارت کے دشمن نہیں ہیں۔ ہندوستان کی اس لہلہاتی باڑی کو سینچنے میں ان کا بھی خون پسینا شامل ہے۔ ہماری طرح بھارت ان کی جنم بھومی ہو چکی ہے۔ وہ ہمیں بہن سمجھیں اور ہم انھیں بھائی۔ یہی صحیح راستہ ہے"

اسی طرح کرماوتی کی راکھی قبول کرتے وقت ہمایوں کے بعض خیر خواہ اُسے اس خطرے سے ڈراتے ہیں اور وہ ان کے جواب میں کہتا ہے۔

"افسوس کہ تم اس راکھی کی قیمت نہیں جانتے۔ چھوٹے چھوٹے دو دھاگے

جانی دشمن کو بھی محبت کی زنجیروں میں جکڑ دیتے ہیں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میواڑ کی بہادر مہارانی نے مجھے بھائی بنایا ہے اور بہادر شاہ سے میواڑ کی حفاظت کے لئے میری مدد چاہی ...... ساری سلطنتوں سے بڑھ کر ایک اور سلطنت بھی ہے، وہ ہے انسانیت کی سلطنت، محبت کی سلطنت۔ سکندر نے اتنی بڑی سلطنت قائم کی، کیا ہوئی وہ سلطنت؟ لیکن جنھوں نے دلوں کو جیتا، وہ آج تک زندہ ہیں اور لاکھوں کروڑوں دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔

آخر میں ہمایوں جب شیر خاں کی بنگال سے بڑھتی ہوئی فوج کا مقابلہ کرنے کے لئے کرماوتی کی چتا سے رخصت ہوتا ہے، اس وقت جن شریف جذبات کا اظہار کرتا ہے، وہ بھی سننے کے قابل ہیں:-

"بہن! مجھے معاف کرو، میں تمہارا نالائق بھائی ہوں۔ بہت کوشش کرنے پر بھی میں تمھیں بچا نہ سکا، پر تمھارے میواڑ کو تمھارے دشمن سے چھین کر پھر میواڑیوں کو سونپ جاتا ہوں۔ مجھ پر مصیبت آپڑی ہے۔ ہمایوں مصیبت سے ڈرتا نہیں، مقابلہ کرنا جانتا ہے۔ بہن! تم نے جس طرح راجپوتوں کو مرنا سکھایا ہے۔ مجھے بھی حق کے لئے جینا سکھا دو۔ جس طرح تم تپتی ہوئی آگ میں جل مریں، مجھے بھی تکلیفوں کی آگ میں جلتے رہ کر مسکرانا سکھا دو۔ چاہے جتنی مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹے، پر میں ہمت نہ ہاروں محبت اور انسانیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑوں۔

(کچھ دیر خاموش رہتا) مگر بہن! دل میں ایک کسک، بے بسی کی ایک آہ، چھپانے کے لئے جا رہا ہوں۔ افسوس! تمھاری راکھی کا حق ادا نہ کر سکا!

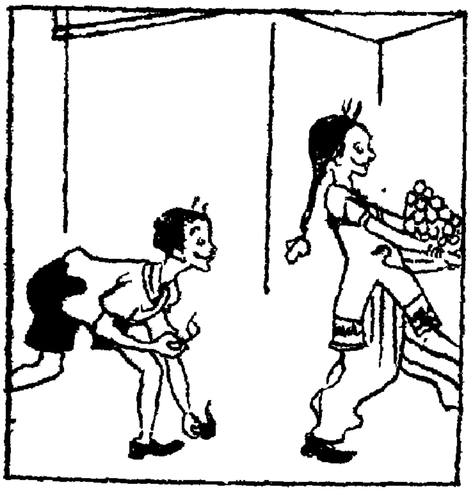
ڈرامے کے خاص کردار

۱۔ ہمایوں ...... اظہار عالم
۲۔ رانی کرماوتی ...... نفیس بانو
۳۔ مہاراجہ بکرمادیت ...... نسیم اختر
۴۔ ہندو بیگ ...... خواجہ شوکت
۵۔ تاتار خاں ...... اقبال

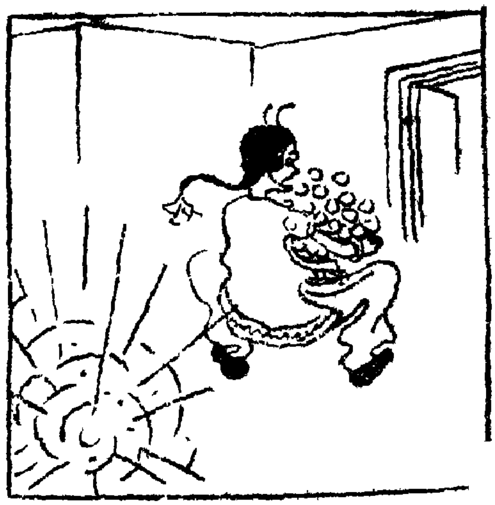
کالو مینا کی کہانی



(۱) آج تو مزے ہیں



(۲) یہ پٹاخا چھڑاتا ہوں



(۳) فٹاک



(۴) ارے رے رے

حفیظ اقبال سلطان شاہی

انصاف

کسی زمانے میں ایک بڑے مُلک پر ایک بادشاہ حکومت کیا کرتا تھا۔ وہ بہت انصاف پسند اور فرض شناس تھا۔ اپنی رعایا کا خیال اپنے بچوں سے زیادہ رکھتا۔ اُن کے دُکھ درد کو اپنی تکلیف سمجھتا۔ اسی وجہ سے رعایا اُسے دل و جان سے چاہتی تھی۔ اگر کبھی کوئی دُشمن اُس پر حملہ کرتا تو فوج کے علاوہ خود رعایا اُس کے مقابل ڈٹ جاتی اور دُشمن کو اپنے یہاں سے مار بھگاتی۔ رعایا میں ہر دلعزیزی کی وجہ سے دُشمن اُس پر کبھی حملہ کرنے کی جُرأت نہ کرتے تھے۔ بادشاہ بھی بیرونی خطروں سے بے فکر ہوکر قوم و ملک کی بہتری اور بہبودی کے لئے اچھے اچھے کام کیا کرتا تھا۔ اُس میں سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ وہ بڑا منصف تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس کا فیصلہ ہمیشہ درست ہوتا۔

ایک دفعہ اُس کے دربار میں ایک بہت ہی پیچیدہ مقدمہ پیش ہوا۔ واقعات یہ تھے کہ رام پرشاد نامی ایک شخص نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اور اُس پر الزام لگایا تھا کہ وہ اُس کے اور اُسکے چھوٹے بھائی کے درمیان جھگڑا کراتی ہے۔ رام پرشاد کی بیوی بادشاہ کا پاؤں پکڑکر خوب روئی اور کہنے لگی "بادشاہ سلامت، آپ تو انصاف پسند ہیں۔ میرے مقدمے کا فیصلہ کر دیجئے اور مجھ پر غلط الزام

کاٹے گئے ہیں۔" بادشاہ نے اُس عورت کو دلاسا
دیا۔ بادشاہ نے اُس کے شوہر رام پرشاد کو بلوا بھیجا۔
ـــ جب وہ آیا تو بادشاہ
نے اُس سے اپنی بیوی کو گھر سے نکالنے کی وجہ
دریافت کی۔ رام پرشاد نے کہا کہ "حضور جس وقت
ہماری فوج بھٹنڈا میں مقیم تھی۔ اُس وقت میرا
چھوٹا بھائی کشن پرشاد بھی میرے ساتھ تھا جب
وہ گھر آنے لگا تو میں نے اپنے چھوٹے بھائی سے
ایک ہیرا بھجوایا تھا کہ میری بیوی کو دے دینا۔
جب میں گھر آیا اور اپنی بیوی سے وہ ہیرا طلب
کیا تو اُس نے کہا کہ کشن پرشاد نے مجھے ہیرا نہیں
دیا۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کشن پرشاد سے
پوچھا تو اُس نے کہا کہ میں نے دو آدمیوں کی گواہی
میں وہ ہیرا اسے دے دیا۔ میں نے گواہوں سے
پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ہاں ہمارے سامنے کشن
پرشاد نے تمھاری بیوی کو وہ ہیرا دیا۔ اس پر میں نے
اپنی بیوی کو ڈرایا دھمکایا مگر وہ اقرار نہیں کرتی تھی
میں نے اُسے تین دن کی مہلت بھی دی کہ تم نے
جس کو دیا ہے بتلا دو میں چھوڑ دوں گا ورنہ گھر سے
نکال دوں گا۔ لیکن اس پر بھی اس بدذات عورت
نے اُس کا نام نہ بتایا جس کو اُس نے وہ ہیرا دیا۔
اسی وجہ سے میں نے اُسے گھر سے نکال دیا ـــ اب
حضور ہی انصاف کریں کہ کس کی غلطی ہے ـــ"

بادشاہ رام پرشاد کے بیان کو غور سے سنتا رہا جب
اُس کا بیان ختم ہو گیا تو اُس نے کشن پرشاد کو بلا
بھیجا۔ جب وہ آیا تو بادشاہ نے اُس سے پوچھا
کہ کیا تم نے وہ ہیرا رام پرشاد کی بیوی کو دیدیا۔
تو اُس نے قسم کھا کر کہا کہ ہمارے سامنے کشن
پرشاد نے وہ ہیرا شانتی دیوی (رام پرشاد کی
بیوی کا نام) کو دیدیا۔ بادشاہ ایک عجیب الجھن
میں پھنس گیا۔ اور اس معاملے پر غور کرنے کے
لئے اُس نے عدالت دوسرے دن تک کے
لئے برخاست کر دیا۔ اور خود سوچنے لگا کہ یہ
تو عجیب مسئلہ ہے بیوی کہتی ہے کہ میں نے دیکھا
تک نہیں، بڑا بھائی کہتا ہے کہ میں نے ہیرا
بھجوایا۔ چھوٹا بھائی کہتا ہے کہ اس نے دو گواہوں
کے سامنے وہ ہیرا اُس عورت کو دیدیا۔ اب
ان سب میں کون سچا ہے اور کون جھوٹا ـــ
بادشاہ بہت دیر تک سوچتا رہا، آخر کار ایک
ترکیب اُس کے ذہن میں آئی، چونکہ ابھی بہت
دن باقی تھا۔ اُس نے دربارِ عام کی منادی کرائی
تھوڑی دیر میں ہزاروں آدمی اپنے محبوب بادشاہ

کے دربار میں حاضر ہوگئے۔ بادشاہ نے دربار میں تھوڑا موم منگوایا۔ اور بڑے بھائی رام پرشاد کو الگ لے جاکر ہیرے کی شکل کا بنانے کو کہا۔ بڑے بھائی نے موم سے ہیرے جیسی شکل بنا دی۔ بادشاہ نے اُسے ایک بکس میں بند کر دیا اور رام پرشاد کو علیحدہ کمرے میں بند کر دیا۔ اُسکے بعد اس نے چھوٹے بھائی کو بلایا۔ اور اُس سے بھی اسی طرح ہیرے کی شکل بنانے کو کہا۔۔۔ اُس نے بھی ہیرے کی شکل موم سے بنا دی۔ بادشاہ نے چھوٹے بھائی کو بھی دوسرے کمرے میں بند کر دیا۔ اور وہ دونوں موم کی شکلوں کو نکال کر دیکھا تو دونوں ایک جیسے تھے۔ بادشاہ نے اُن دونوں شکلوں کو بکس میں تالا لگا کر بند کر دیا۔ اور اُس کے بعد دونوں گواہوں میں سے ایک گواہ کو بلایا اور اُس سے بھی ہیرے کی شکل بنانے کو کہا۔ درحقیقت گواہوں نے ہیرے کو دیکھا نہ تھا اس لئے وہ جس طرح دل میں آیا توڑ مروڑ کر ایک عجیب سی شکل بنا کر دیدی۔ بادشاہ نے اس کو بھی محفوظ رکھ دیا۔ اور گواہ کو تیسرے کمرے میں بند کر دیا۔ اُس کے بعد اُس نے دوسرے گواہ کو بلایا اور اس سے بھی ہیرے کی شکل بنانے کو کہا۔ وہ بادشاہ کا منہ تکنے لگا۔ بادشاہ نے کہا" کشن پرشاد نے جو ہیرا تمہارے سامنے شانتی دیوی کو دیا تھا، اُس کی شکل کیسی تھی، اس موم سے بناکر بتاؤ" گواہ حیران ہو گیا مگر کیا کرتا جس طرح دل میں آیا ایک شکل بناکر دیدی۔ جب یہ چاروں ختم ہوگئے، تو بادشاہ نے عورت کو بلایا اور کہا" شانتی دیوی، تم کو جس شکل کا ہیرا کشن پرشاد نے دیا تھا۔ اس کی شکل اس موم سے بناؤ۔۔۔" عورت بادشاہ قدموں پر گر پڑی اور کہنے لگی "بادشاہ سلامت میں نے ہیرا دیکھا ہی نہیں تو شکل کیسے بناؤں۔۔۔؟" بادشاہ بہت خوش ہوا۔ اُسے قدموں سے اُٹھایا اور اُن چاروں کو کمرے سے بلوایا۔ جب وہ چاروں جمع ہوگئے، تو بادشاہ نے اپنا فیصلہ سارے درباریوں سنایا۔

"تم لوگ جانتے ہو کہ دھوکہ دینا اور جھوٹ بولنا کتنا بڑا پاپ ہے، جسے انسان اور بھگوان دونوں معاف نہیں کر سکتے۔ اس شخص کشن پرشاد نے اپنے بھائی سے جھوٹ بولا اور دھوکا دیا۔ وہ اس طرح کہ اُس نے وہ ہیرا جو کہ رام پرشاد نے اپنی بیوی کو دینے کے لئے دیا تھا اُسے نہ دیا۔

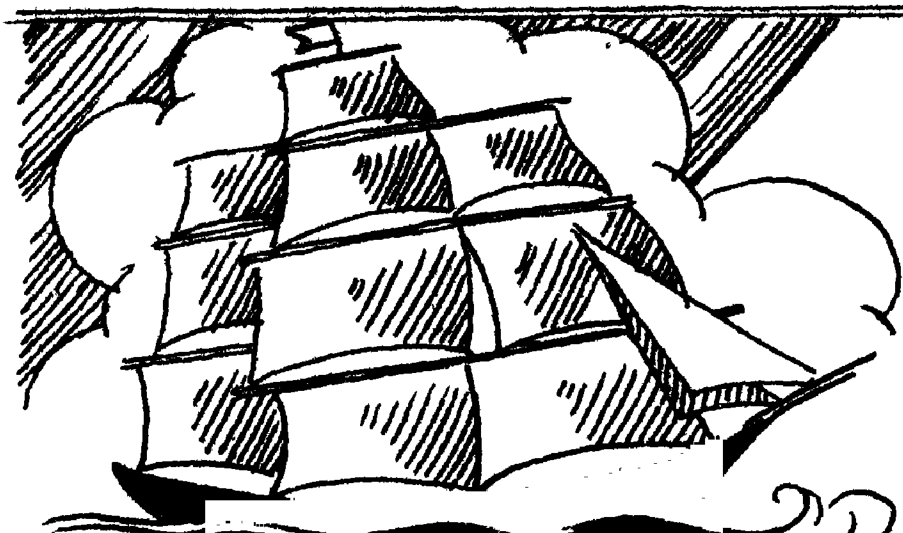
بلکہ بیچ دیا اور اُس کے پیسے رکھ لئے۔ اور یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اُس نے درحقیقت وہ ہیرا اپنی بھابی کو دے دیا، اُس نے دو دغابازوں کو کچھ روپیہ دے کر ہمنوا بنا لیا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ چوں کہ ان دونوں نے ہیرے کی شکل عمر بھر نہ دیکھی تھی اس لئے اُنھوں نے ہیرے کی شکل یوں بنائی (موم کی شکل دکھاکر) اگر ان دونوں گواہوں کے سامنے وہ ہیرا دیا جاتا تو وہ بھی اُس کی شکل دیکھتے اور ویسے ہی بناتے۔ لیکن چونکہ ایسا نہیں کیا گیا تھا وہ ویسی شکل بنانے میں ناکام رہے۔ اس لئے میں دونوں گواہوں کو جھوٹی شہادت دینے کے جُرم میں دو سال قید کی سزا دیتا ہوں۔ اور کشن پرشاد کو دھوکہ بازی کے جُرم میں سات سال کی قید۔ رام پرشاد سے کہتا ہوں کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے گھر لے جائے اور اُسے خوش رکھنے کی کوشش کرے۔" تمام رعایا بادشاہ کے اس فیصلے سے خوش ہو گئی۔ تالیوں کی گونج میں بادشاہ نے کشن پرشاد سے حقیقت پوچھی۔ اس نے سچ سچ سب حال بتا دیا اور اور کہا کہ میں نے وہ ہیرا لالہ گھنشام داس کو تین ہزار روپے میں بیچ دیا ہے۔ بادشاہ نے ہیرا منگوا کر رام پرشاد کے حوالے کر دیا اور لالہ گھنشام داس کو بھی چوری کا مال خریدنے کے جُرم میں ایک سال قید بامشقت کی سزا سُنائی۔ رام پرشاد بہت خوش ہو گیا۔ بادشاہ کے سامنے اُس نے بیوی سے معافی مانگی اور ہنسی خوشی اپنے گھر روانہ ہو گیا۔ تمام درباری خوشی کے نعرے بلند کرتے ہوئے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

صفحہ ۳۹ کا بقیہ

گئے۔ ان ہی سفرناموں کو پڑھ کر ایک دن کولمبس کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا اور وہ نئی دنیا کی کھوج میں نکل پڑا۔

امریکہ کی تلاش کا سہرا بے شک کولمبس کے سر ہے لیکن کیا مارکوپولو کو بھلایا جا سکتا ہے

ستیہ پال ودیا النکار



مارکوپولو

اٹلی کے شمال مشرق کے کونے پر ایک خوبصورت شہر ہے، جس کا نام وینس ہے۔ آج سے تقریباً سو سال پہلے اس شہر میں ایک آزاد حکومت تھی۔ آئیے آج ہم آپ کو اس شہر کے ایک مشہور سیاح مارکوپولو کی کہانی سنائیں

بارھویں صدی عیسوی کی بات ہے وینس کے دو تاجر جو آپس میں بھائی بھائی تھے پیسہ کمانے کی دُھن میں دنیا کے سفر کے لئے نکلے۔ ان کے ساتھ ایک چھوٹا لڑکا بھی تھا جس کا نام مارکوپولو تھا۔ وہ دونوں بھائی بلقان ممالک سے ہوتے ہوئے بحر اسود پہنچے اور پھر اُسے پار کر کے روس کے جنوبی حصے میں آئے۔ وینس سے بحر اسود جاتے ہوئے مارکوپولو کے دل میں بلقان ممالک کے نت نئے نظاروں نے ایک گہرا اثر چھوڑا۔ اس کے باپ اور چچا جس وقت تجارت کی بڑی بڑی تجویزوں میں اُلجھے ہوتے، مارکوپولو کسی اور ادھیڑ بن میں لگا رہتا۔

اس زمانے میں چین میں قبلائی خاں کی حکومت تھی اور اس کے سفیر سے مارکوپولو کے کے باپ اور چچا کی جنوبی روس میں ایک جگہ ملاقات ہوئی۔ اس سفیر نے ان دونوں بھائیوں کو قبلائی خاں کی طرف سے چین آنے کی دعوت دی۔ یہ دونوں بھائی جب مارکوپولو کو

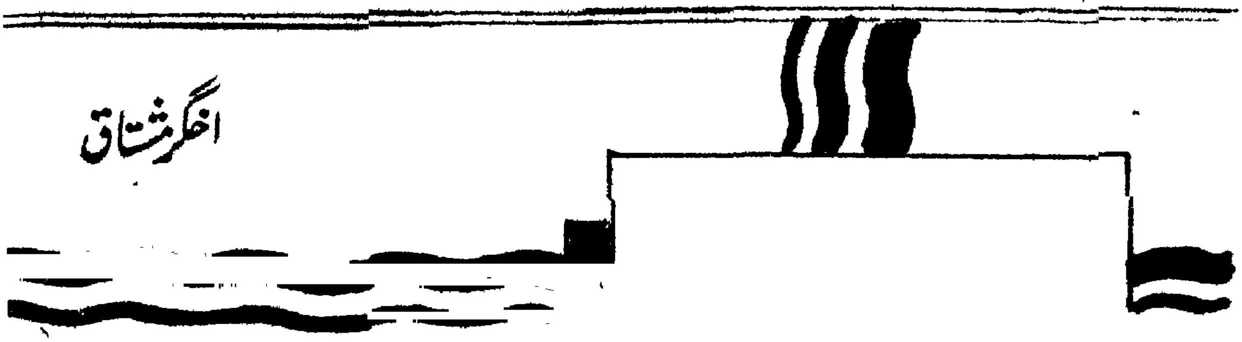
ے کر چین پہنچے، تو قبلائی خاں نے ان کا
ڑا شاندار استقبال کیا۔ اس نے یورپ
کے لوگوں کے بارے میں بہت کچھ سُن
رکھا تھا۔ وہ ان لوگوں کے رہن سہن، رسم و
رواج اور مذہب کے بارے میں پوری
معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش
تھی کہ کم از کم سو چُنے ہوئے آدمی یورپ
سے آئیں اور چین میں ہمیشہ کے لئے بس
جائیں۔ یہ کام انھوں نے ان دونوں بھائیوں
کو سونپا اور خاص کر اسی کام کے لئے انھیں
وینس واپس بھیجا۔ لیکن ان دنوں چونکہ یورپ کے
حالات ایسے نہ تھے کہ اتنے دور کے سفر پر
کوئی کمر باندھتا۔ مارکوپولو پیچھے کیسے رہتا وہ
اپنے والد اور چچا کو اکیلا چھوڑ کر چین چل دیا۔
مارکوپولو پہلے فلسطین پہنچا اور وہاں سے
عراق آیا۔ عراق میں مارکوپولو کو کچھ ہندوستانی
تاجر ملے۔ اور انھوں نے اسے سمندر کے
راستے سے ہندوستان جانے کا مشورہ دیا۔
مارکوپولو کو صرف سفر ہی تو نہیں کرنا تھا، اُسے
تو دنیا دیکھنی تھی۔ وہ پہلے ہی فارس اور پامیر
ہوتا ہوا چینی ترکستان پہنچا اور اس کے بعد
گوبی کے ریگستان کے کنارے چین جا پہنچا۔

چین میں مارکوپولو ۲۴ سال رہا۔ اس
نے وہاں کی زبان اچھی طرح سیکھ لی۔
قبلائی خاں کی نظروں میں وہ اتنا بڑھا کہ
اسے کئی اونچے سرکاری عہدوں پر رکھا گیا
اور ہوتے ہوتے ایک دن وہ ایک صوبے
کا گورنر بنا دیا گیا۔

آخر اُسے گھر کی یاد نے ستایا۔ نہ
جانے اُس نے دنیا کے کتنے ملک دیکھے
اور کتنے تجربے کئے۔ دولت کی اس کے پاس
کمی نہیں تھی۔ اب وہی مارکوپولو جب گھر
واپس پہنچا۔ تب لوگوں نے اُسے پہچانا تک
نہیں۔ اس کی اونچی اونچی باتیں سن کر لوگ
حیرت سے مسکرا دیتے۔ اس نے جب چین
کی بے شمار دولت کا نقشہ کھینچا تو لوگوں نے
اس کا نام "ملیونی" رکھا جس کے معنی ہیں
"لاکھوں اور کروڑوں میں باتیں کرنے والا"

۱۲۶۵ء میں وینس اور جینوا میں لڑائی
چھڑی۔ مارکوپولو قیدی بنا دیا گیا۔ قید خانوں
میں دنیا کی اچھی سے اچھی کتابیں لکھی گئی
ہیں۔ مارکوپولو کے سفرنامے بھی وہیں لکھے

(بقیہ صفحہ ۴۷ پر)



اخگر مشتاق

مختصر کہانیاں



۱

سڑک پر پتھر

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کسی گاؤں کے پاس پکی سڑک پر ایک بھاری پتھر پڑا ہوا تھا۔ ہر چند آنے جانے والوں کو اس کی وجہ سے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ دن میں تو جیسے تیسے سبھی اس سے بچ کر نکل جایا کرتے تھے۔ لیکن رات کو اکثر لوگ اس سے ٹکرا جاتے تھے۔ کبھی کوئی گھوڑے پر سے گر پڑتا کبھی کوئی اپنی گاڑی الٹا لیا کرتا۔ لیکن اس پتھر کو کوئی سڑک پر سے نہ ہٹاتا۔ ایک مرتبہ گاؤں کے سرپنچ کے گھوڑے کے ٹھوکر لگی اور وہ نیچے آ رہے۔ ان کا پیر زخمی ہو گیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک بنیا بیلوں کے ٹھوکر کھا جانے کی وجہ سے اپنی گاڑی سے ایسا سر کے بل گرا کہ مرتے مرتے ہی بچا۔ ایک رات چوکیدار بھی ٹھوکر کھا کر اس بری طرح زخمی ہوا کہ کئی دن تک چوکیدار کے بیوی بچے اس کی جان کی چوکیداری کرتے رہے۔ غرض نہ آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا نہ حادثوں کا۔

آخر ایک دن ادھر سے ایک غریب

کسان گذرا اور اُس نے پتھر کو دیکھتے ہی ارادہ کر لیا کہ اِسے ڈھکیل کر سڑک کے کنارے کر دینا چاہیئے۔ جیسے ہی اُس نے پتھر کو اپنی پوری قوت سے ڈھکیلنا شروع کیا۔ دیکھتا کیا ہے کہ پتھر کے نیچے ایک سونے کا ڈبّا رکھا ہے۔ جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

"یہ اُس کے لئے ہے جو اِس پتھر کو ہٹائے گا۔"

کوئی چیز نئی

ایک کمپنی کے دفتر میں کئی کلرک کام کرتے تھے۔ کمپنی کے مالک کو ایک کلرک سے بڑی شکایت تھی۔ کیونکہ وہ اکثر کام پر دیر سے آیا کرتا۔ آخر ایک دن کمپنی کے مالک نے کلرک کو خبردار کرتے ہوئے کہا "اگر تم نے اپنے اس غلط طریقے میں تبدیلی نہ کی تو تمھارے حق میں بُرا ہوگا۔" کلرک نے جواب دیا "حضور دفتر دیر سے پہنچنے میں میری کوئی غلطی نہیں البتہ میری گھڑی قصور وار ہے جو صحیح وقت نہیں بتاتی۔" اُس دن تو مالک یہ جواب سُن کر خاموش ہو گیا لیکن دوسرے ہی دن کلرک کے پھر دیر سے آنے پر جھنجھلا اُٹھا اور کلرک سے بولا "تمھیں یا مجھے کو، کوئی چیز نئی رکھنی ہوگی۔" کلرک نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوال کیا۔ "حضور نئی چیز کا کیا مطلب؟" مالک کمپنی نے کہا "تمھیں کل نئی گھڑی رکھنی ہوگی یا مجھے نیا کلرک۔"

کلرک اب نہ صرف اپنا کام ہی محنت سے کرنے لگا بلکہ دوسرے کلرکوں سے پانچ منٹ پہلے دفتر آنے لگا۔

دو راجہ

دو راجہ جنگ کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ ان میں سے ایک راجپوت تھا جو بڑا شریف اور معزز تھا دوسرا بڑا اوچھا اور شیخی باز تھا۔ دوسرے نے اپنے لشکر میں ایک عام اعلان کیا کہ میرے مقابل کا سر جو میرے

پاس لائے گا اُسے ایک لاکھ روپیہ دیا جائے گا۔ ساتھ ہی اُس نے پہلے راجا کو اس مضمون کا ایک خط بھی بھیج دیا۔

"تم کہتے ہو، تمھارا سر میرے پاس لانے والے کو میں نے ایک لاکھ روپیہ انعام رکھا ہے۔"

راجپوت نے اس خط کا جواب یہ دیا۔

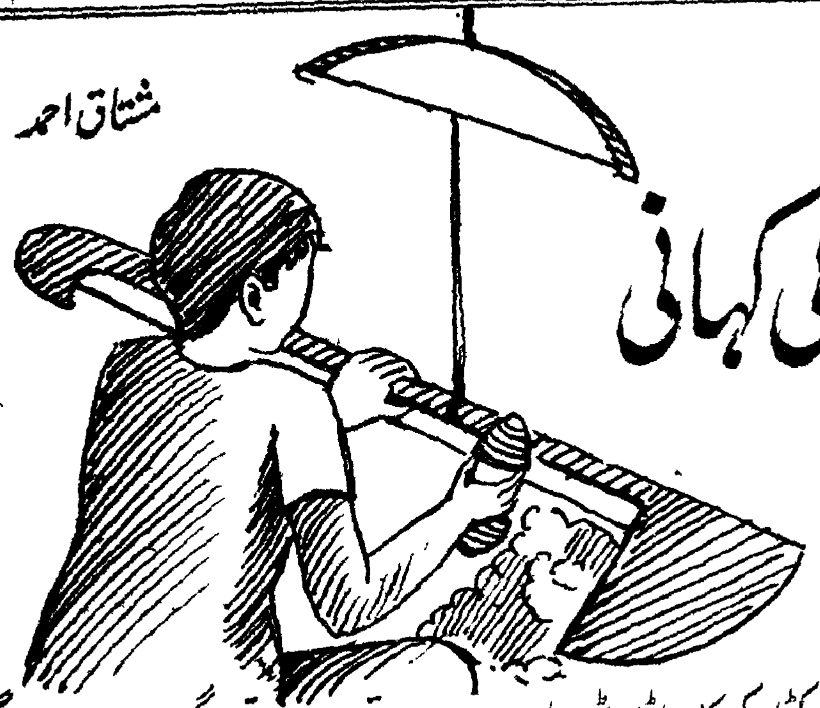
"تم راجا ہو، لیکن تمھارے سر کی میں نے کوئی قیمت نہیں رکھی۔ تمھارا سر میرے پاس لانے والے کو ایک پائی بھی نہ دی جائے گی۔"

برائی اکثر برائی کرنے والے ہی کے سر آ پڑتی ہے۔

انوکھا سودا

ایک غریب مزدور ایک مٹھائی کی دوکان پر کھڑا مٹھائیوں کی خوشبو سے بڑا خوش [illegible] دوکان دار نے موقع غنیمت سمجھ [illegible] مزدور سے سوال کر دیا "لاؤ پیسے [illegible] کی خوشبو سے

بہت خوش ہو چکے۔" مزدور بچارا گھبرا گیا، لیکن قریب ہی ایک پنڈت جی کھڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے انہوں نے مزدور سے کہا "ذرا دو چار پیسے ہاتھ میں لے کر بجا دینا مٹھائیوں کی خوشبو سونگھنے کی قیمت ان پیسوں کی آواز ادا کر دے گی۔



روئی کی کہانی

مشتاق احمد

کئی روز سے کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے۔ دن تو جیسے تیسے گذر جاتا ہے مگر رات کو دانت بجنے لگتے ہیں۔ جبھی تو میں نے جلدی جلدی اپنا لحاف اور گدا کرایا۔ کئی روز کے بعد ایسا گرم بستر ملا۔ آج رات کو جب میں اپنے گرم گرم بستر میں لیٹا تو پھر کیا تھا میں نے خراٹے لینے شروع کر دئے۔ ابھی ذرا دیر ہی ہوئی تھی کہ میرے کانوں میں دھیمی دھیمی آواز آئی، جیسے کوئی کہہ رہا تھا کہ "تم جس آرام سے میرے اوپر سو رہے ہو تمھیں معلوم ہے کہ میں کون ہوں، کہاں کی رہنے والی ہوں۔ اور کہاں پیدا ہوئی اگر سننا چاہتے ہو تو سنو۔

میں پہلے ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی، بڑے سُکھ چین سے زندگی گذار رہی تھی۔ رات کی خوبصورت دودھ سی چاندنی مجھے نہلاتی دھلاتی۔ میرا مالک مجھ سے بڑی محبت کرتا۔ حالانکہ وہ خود بھی غریب تھا لیکن سچ پوچھو تو وہ اپنے بال بچوں کی طرح میرا بھی خیال رکھتا۔ اس طرح تقریباً سات مہینے تک میں بڑے مزے میں ہنستی

کھیلتی بڑھتی رہی۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ جن ہاتھوں نے مجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا وہی میری جان لینے پر تیار ہو گئے۔

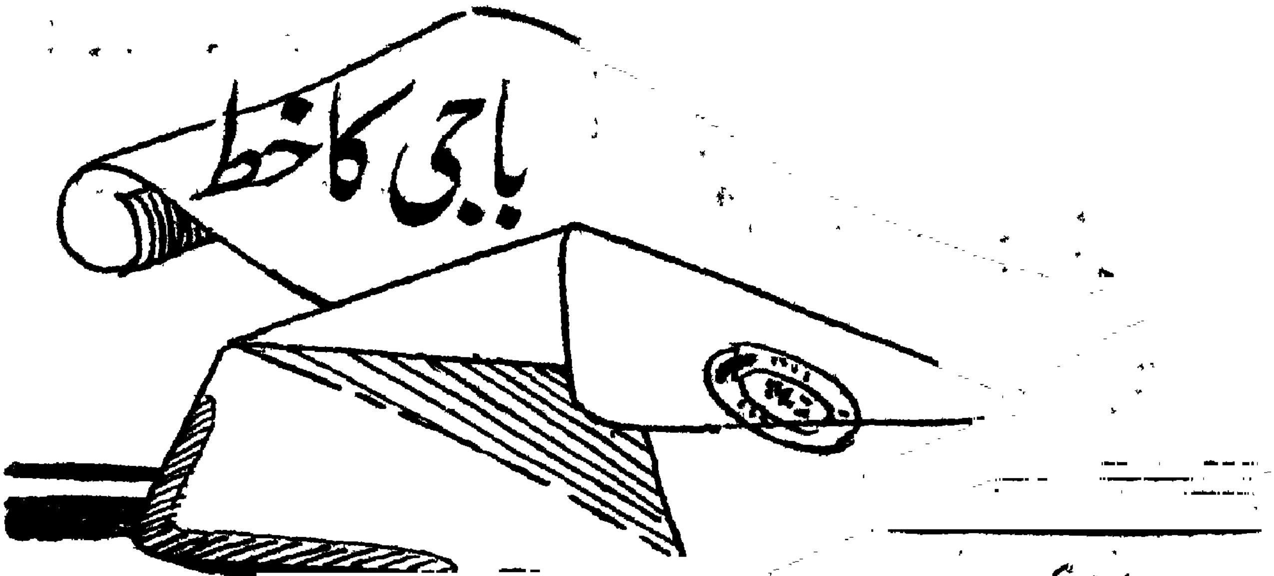
ایک دن اس نے مجھے نوچ کر گھر سے بے گھر کر دیا اور ایک گاڑی میں ڈال کر اپنے گھر لے گیا۔ اگلے دن میں ایک اندھیری کوٹھری میں ڈال دی گئی۔ وہاں میرا دم گھٹا جاتا تھا اور مجھے اپنا میدان یاد آتا تھا جہاں میں تاروں کی چھاؤں میں لہلہاتی تھی۔ جی تو چاہتا تھا کہ یہاں سے نکل بھاگوں مگر مجبور جو تھی، کیا کرتی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ جگہ بھی مجھے راس آ گئی اور میں سوچنے لگی کہ اب زندگی کے باقی دن یہیں گذر جائیں۔ مگر میرے مالک کو میرا اس طرح رہنا بھی نہ بھایا اور اس نے مجھے مئی اور جون کی دھوپ میں ڈال دیا۔ میں اس کڑی دھوپ میں جھلس کر رہ گئی۔

پھر اسی پر بس نہیں ہوا مجھے ایک لکڑی کی چرخی میں ایسا دھر کے دبایا کہ میری ہڈی ہڈی الگ ہو گئی۔

کچھ دن بعد مجھے ایک گاڑی میں بھر کر پاس کے شہر میں لائے۔ میرے دل میں کتنے دن سے یہ آرزو تھی کہ میں بھی شہر دیکھوں۔ آج وہ موقع مل ہی گیا۔ پھر جب میں شہر میں آئی تو شہر دیکھ کر دنگ رہ گئی، ہر طرف تانگے اور موٹریں دوڑتی ہوئی نظر آئیں۔

یہ بھیڑ دیکھ کر میں بہت گھبرائی لیکن اب تو میرے سامنے کوئی راستہ نہ تھا۔ گاڑیبان مجھے بھیڑ بھاڑ میں سے نکالتا ہوا لے جا رہا تھا۔ آخر وہ گاڑی ایک بڑی توند والے بنئے کی دکان کے سامنے رکی۔ مجھے اس بنئے کے سپرد کر دیا گیا۔ اور میں ایک کونے میں ڈال دی گئی۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہے کچھ دن مزے میں گذر جائیں گے۔ مگر مجھے وہاں بھی چین نہ ملا۔ لالہ کی دکان میں ایک صاحب آئے اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے میں گھر والوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی، مگر وہاں بھی مجھے چین نصیب نہ ہوا۔ مجھے ایک دُھنئے کے یہاں بھیج دیا گیا۔ اس کم بخت نے میرے ساتھ جو سلوک کیا وہ میں تمھیں کیا بتاؤں۔ اس

ے پاس ایک کمان سی چیز تھی جس کو لے
ر وہ میرے اوپر ٹوٹ پڑا اور میرا سارا
سم دھنک کر رکھ دیا۔ میرے جسم کا رواں
رواں الگ ہو گیا اس کی چوٹ سے سارا
سم پھول گیا۔ میری یہ حالت ہو گئی کہ جس
نے مجھے پہلے دیکھا تھا وہ پہچان بھی نہ سکتا
تھا۔ آخر خدا خدا کر کے مجھے اس کپڑے میں
جس کو لحاف کہتے ہیں بھر دیا گیا۔ تم آرام
سے لیٹے ہو۔ تمھیں کیا معلوم کہ مجھ پر کیا
گذری۔ لیکن مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے
کہ خیر مجھ پر جو بیتی سو بیتی لیکن میری وجہ
سے تم آرام پا رہے ہو۔ میرے لئے
یہی کیا کم ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے اور
ساتھی کسی کپڑے کے کارخانے میں چلے
گئے، ان کے بارے میں تم ان سے خود
پوچھنا، مجھے کبھی کبھی تمھارے کپڑوں پر
تو شک ہوتا ہے کہ کہیں ان میں ہمارے
ساتھی تو نہیں۔ خیر میری کہانی تو تم نے
سن لی، اب رات زیادہ ہو گئی ہے تم
سو رہو۔



پیاری بچیو!

اس سے پہلے آپ کو چند ابتدائی ٹانکے بتائے تھے۔ امید ہے کہ آپ نے اس کی خوب مشق کر لی ہو گی۔

یہاں دو نمونے دئے جا رہے ہیں جن میں وہی ٹانکے ہیں جو آپنے سیکھے ہیں۔

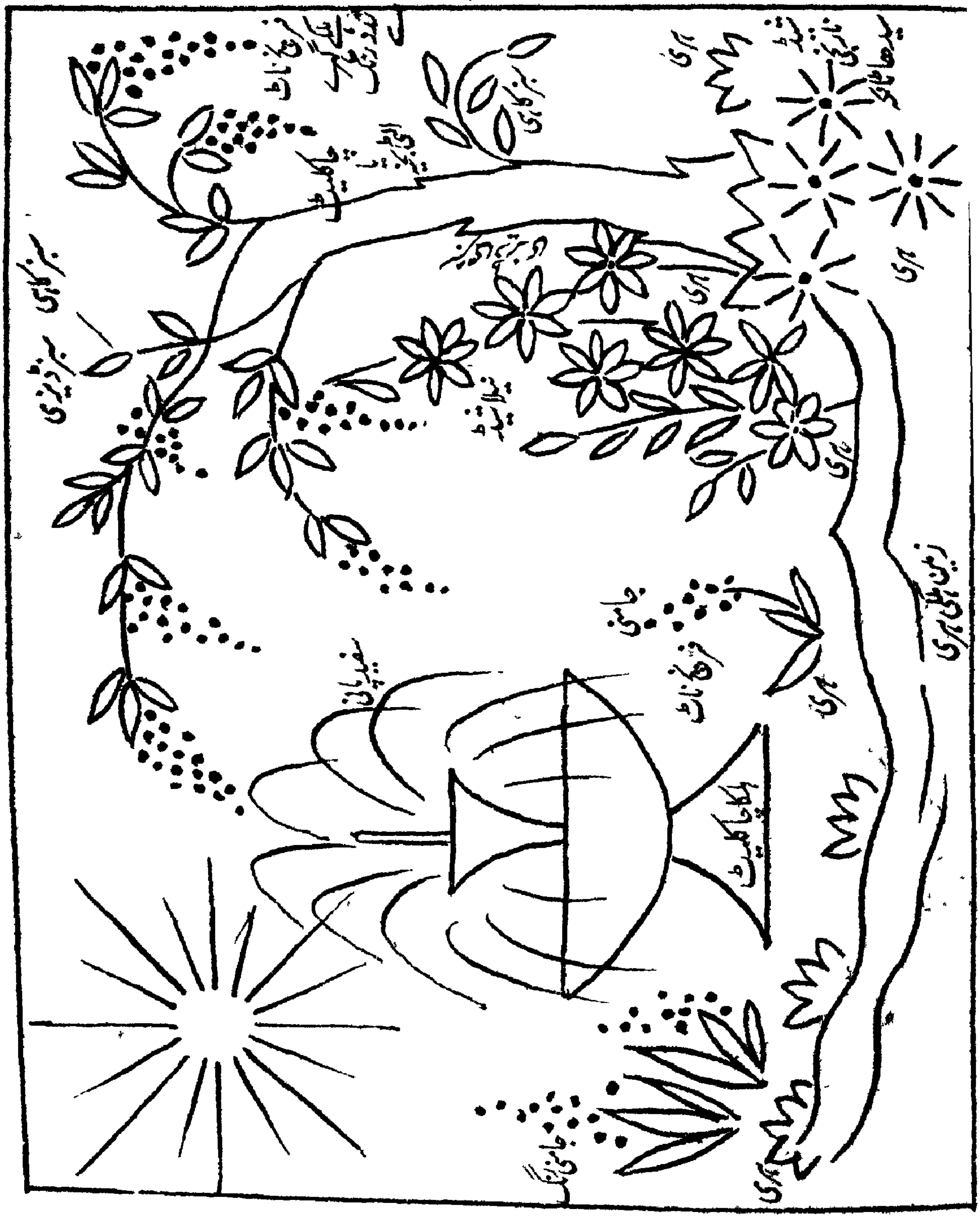
جب آپ لوگ یہ نمونے بنا لیں گی تب اور ٹانکے دئے جائیں گے پہلا نمونہ ایک سینری ہے۔ اسے آپ میز پوش، تکیہ کے غلاف وغیرہ پر بنائیں۔ بنانے کے لئے۔ اچھے قسم کی شیڈ دار تارکشی ہونی چاہیئے۔

تین ٹانکے اور دئے گئے ہیں۔ جو بہت آسان ہیں۔ پھر بھی ٹانکے اور رنگ نمونہ پر لکھ دئے ہیں۔ دیئے ہوئے رنگوں سے اگر آپ نے بنائی تو یہ سینری بہت خوبصورت معلوم ہو گی۔

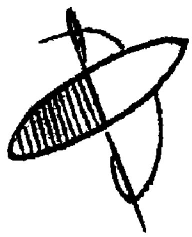
دوسرا نمونہ اون رکھنے کی تھیلی یا سفید قمیض کے دامن پر بنائیں۔ اس میں بھی وہی ٹانکے اور رنگ دئے گئے ہیں۔

ایک ٹانکہ اور دیا گیا ہے۔ جسے ساٹن اسٹیچ کہتے ہیں۔ یہ بہت سادہ

نمونہ نمبر ۱



ٹانکہ سے۔ اس سے پتی
بھر جاتی ہے جو چیز
بھی بھر کے بنانی ہو
اس کڑھائی سے بنائیں۔



امید ہے دونوں نمونہ پسند آ گئے ہونگے صفائی کا خیال رہے۔ نمونہ (۲) اگر کسی رنگین کپڑے پر بنے تو بھی اچھا معلوم ہوگا اون رکھنے کی تھیلی کسی رنگین کپڑے کی بنائیں تاکہ کم میلی ہو۔

نمونہ نمبر ۲





پہلا دوست۔ آٹا اور مہنگا ہو گیا ہے۔ اب کیا ہوگا؟

دوسرا۔ ہونے دو مہنگا ہو گیا ہے تو کیا ہے۔ ہم تو روٹی خریدتے ہیں۔

ایک شخص دوسرے کا سامان اپنے گھر میں اٹھا کر لا رہا تھا۔ مالک نے ٹوکا تو کہنے لگا "بھائی میں بیوقوف ہوں"۔ اس نے کہا "اگر بیوقوف ہے تو اپنا مال دوسرے کے گھر میں کیوں نہیں رکھ آتا"۔ اس نے جواب دیا کہ "پھر تو میں بہت بڑا بیوقوف بن جاؤں گا"۔

ماسٹر۔ کیا ثبوت ہے کہ گرمی سے چیزیں بڑھتی ہیں؟

طالب علم۔ گرمیوں میں دن بڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے چیزیں بڑھتی ہیں۔ اسی طرح سردیوں میں دن سکڑ کر کم ہو جاتا ہے اس لئے سردیوں میں چیزیں سکڑ کر کم ہو جاتی ہیں۔

ایک دیہاتی فلم دیکھ رہا تھا۔ سامنے پردے پر کار آتی ہوئی نظر آئی۔ دیہاتی نے اپنے پاس والی سیٹ کے آدمی سے کہا "بھیا ہٹ جاؤ سامنے سے موٹر آ رہی ہے"۔

مریض۔ تیس سال سے مجھے ہمیشہ رات کو نیند آتی رہی ہے۔ مگر پرسوں سے رات کو آنکھ کھل جاتی ہے۔ میری نبض دیکھئے اور مجھے کوئی اچھی سی دوا دیدیجئے۔

ڈاکٹر۔ تم کیا کرتے ہو۔
مریض۔ میں پھیرے دار ہوں۔

شریر لڑکا۔ (بال کٹواتے ہوئے) خلیفہ میاں! کیا آپ نے کبھی گدھے کی حجامت بھی بنائی ہے۔

حجام۔ جی نہیں، یہ پہلا اتفاق ہے۔

استاد۔ تمھارے والد کہاں گئے ہیں۔
طالب علم۔ جی وہ لکھنؤ گئے ہیں۔
استاد۔ کیا دورے پر گئے ہیں۔
طالب علم۔ جی نہیں ریل پر۔

ماں۔ بیٹا! زیادہ بادام نہ کھاؤ گرم ہوتے ہیں۔

بیٹا۔ نہیں امی میرا منھ تو آج تک نہیں جلا۔

مریض۔ ڈاکٹر صاحب! میرا علاج کیجئے میں اتنا موٹا ہو گیا ہوں کہ اپنے بوٹ کھولنے کے لئے بھی نہیں جھک سکتا۔

ڈاکٹر صاحب۔ تو پھر آپ بوٹ کے بجائے سلیپر پہنا کیجئے۔

استاد۔ چور کی پہچان کیا ہے۔
طالب علم۔ اس کی داڑھی میں تنکا ہوتا ہے۔

مجسٹریٹ۔ تم کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔

ملزم۔ نہیں حضور میں مر جاؤں گا۔

استاد۔ قربانی کس پر واجب ہے۔
شاگرد۔ دُنبے پر۔

رحمان اعظم

عبدالحلیم ندوی

--- اور بیچارہ مرا پڑا تھا

کوریا کا نام تو آپ نے سُنا ہے نا؟ وہی ملک جہاں پچھلے دنوں بڑی گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ اور جو اب بند ہو چکی ہے۔ اور کوریا کے دونوں حصّوں میں یعنی اتری اور دکھنی کوریا میں صلح صفائی کی بات چیت ہو رہی ہے۔ وہی ملک جہاں ہندوستان کی فوجیں قیدیوں کی رکھوالی کے لئے بھیجی گئی ہیں۔ آیئے آج آپ کو وہاں کے ایک شہر سئول کی ایک بہت دلچسپ کہانی سنائیں۔

یہ قصہ ان دنوں کا ہے جب سئول پر سخت بم باری ہو رہی تھی۔ چنانچہ جب لڑائی بند ہوئی اور گرے پڑے مکانوں کا ملبہ صاف کیا جانے لگا تو ایک گھر میں ایک لڑکا ملا۔ جو نہ معلوم وہاں کتنے دنوں سے پڑا تھا۔ پاس ہی اس کے ماں باپ بھائی بہن اینٹوں کے ڈھیر کے نیچے دب کر مر چکے تھے۔ پر یہ ایک کھمبے کی آڑ کی وجہ سے بچ گیا تھا۔ سپاہیوں نے بہتیرا اس سے نام پوچھا پر وہ نہ بولا آخر انھوں نے اس کا نام "کیم" رکھ دیا۔ اور اپنے خیمہ میں لے آئے۔ انھیں

میں ایک سپاہی تھا جس کا نام "اوربلی" تھا۔ یہ بڑا ہمدرد آدمی تھا۔ اس نے لڑکے کو لے لیا، اور اپنے پاس رکھنے لگا۔ دوا علاج کرنے سے اس نے بولنا شروع کر دیا۔ اور آہستہ آہستہ جو ڈر اس کے دل میں سوار ہو گیا تھا ختم ہو گیا۔ اب کیا تھا کچھ ہی دنوں میں میاں کِم دھما چوکڑی کرنے لگے۔ تھے تو ذرا سے بس صرف سات سال کے، پر بڑے چالاک اور نٹ کھٹ۔ جونہی صبح ہوئی اور سارے سپاہی ورزش کرنے میدان پہونچے۔ آپ بھی نیکر قمیض ڈاٹ سینہ تانے لفٹ رائٹ کرتے میدان پہونچ لئے، اور کپتان کے برابر کھڑے ہو، الٹی سیدھی ورزش شروع کرتے، جسے دیکھ کر سپاہیوں کے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑ جاتے۔ ان کی ان حرکتوں کی وجہ سے سارے سپاہی انھیں بہت پیار کرنے لگے۔ ایک دن کیا ہوا کہ "اوربلی" سپاہی لڑائی کے میدان میں گیا صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے شام، پر وہ اپنے خیمہ میں لوٹ کر نہ آیا۔ ادھر جوں جوں رات ہوتی جاتی کِم بھیا پریشان ہوتے جاتے کہ آخر سپاہی آ کیوں نہیں رہا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک لاری خیمہ کے سامنے آ کر رکی۔ اور چار سپاہی اندر سے کسی کو زخمیوں کی چارپائی پر ڈالے اترے۔ کِم نے بڑھ کر دیکھا تو وہ اس کا دوست "اوربلی" سپاہی تھا۔ خون میں لت پت، بے ہوش، بیچارہ کِم اپنے دوست کی یہ حالت دیکھ کر رونے لگا۔ اتنے میں فوجی ڈاکٹر آ گیا اس نے اور "اوربلی" کو آلہ لگا کر دیکھا اور دوسرے سپاہیوں سے بولا "اسے خون پہنچانے کی بڑی ضرورت ہے، چار جوان سپاہی لائے جائیں تاکہ ان کا خون لے کر اس کے جسم میں پہونچا دیا جائے، ورنہ یہ مر جائے گا۔ فوراً چار سپاہی آ گئے۔ ڈاکٹر جونہی سوئی لے کر ان کی بانہہ میں لگانے چلا، میاں کِم پیچھے سے ڈاکٹر کے سامنے آ کھڑے ہوئے اور بولے ڈاکٹر صاحب آپ مری بانہہ سے پہلے خون لے کر لگا دیجئے

ڈاکٹر میرا دوست بچ جائے گا، ڈاکٹر نے کمی کی پیٹھ ٹھونکی اور بولا ' بیٹے تمہارا خون کم ہے، تم بیمار ہو جاؤ گے۔ تم رہنے دو، ہم ان سپاہیوں سے خون لے لیں گے۔ اور ڈاکٹر نے سپاہیوں سے خون لے کر اوربلی کے جسم میں پہونچا دیا، اور پھر اُسے بیماروں کے خیمے میں بھجوا دیا۔

دوسرے دن جب سب سپاہی ناشتہ کرنے کے لئے گئے، تو کمی میز پر موجود نہ تھا، سب کو فکر ہوئی کہ کہاں چلا گیا۔ بڑا ڈھونڈا پر پتہ نہ چلا، ایک نے کہا کہ لاؤ زرا بیماروں کے خیمہ میں تو دیکھیں۔ وہاں جو پہونچا تو کیا دیکھتا ہے کہ اوربلی سپاہی بے خبر سو رہا ہے اس کے سامنے میز پر ایک چھوٹی سی شیشی رکھی ہے، اس میں کچھ لال سی چیز جھلک رہی ہے، اب جو اس نے شیشی کو اٹھا کر غور سے دیکھا تو وہ خون تھا۔ اور پاس ہی زمین پر خون کے دو ایک قطرے بھی پڑے تھے، جو دور تک ٹپکتے چلے گئے تھے، سپاہی ان قطروں کی سیدھ میں چل پڑا، قطرے خیمہ کے پچھلے دروازے کی طرف ٹپکتے چلے گئے تھے۔ سپاہی جب خیمہ کے پچھلے دروازہ پر پہونچا تو اس کے اچنبھے کی حد نہ رہی اس نے دیکھا کہ کمی وہاں زمین پر پڑا ہے، اس کی داہنی کلائی کی رگ کٹی ہوئی ہے، اور خون بہہ بہہ کر جم گیا ہے۔

وہ سمجھ گیا کہ میز پر شیشی میں جو خون تھا اسی کا تھا، واہ کتنا اچھا بچہ ہے یہ۔ اپنے دوست کی خاطر اپنی رگ کاٹ کر خون دے دیا۔ واہ رے بہادر بچے واہ۔ اور اس نے لپک کر گود میں اٹھا لیا۔ پر وہ تو مر گیا تھا۔



پیامی معمہ ۲۶ کا شاندار نتیجہ

صحیح حل

(۱) ڈھول - (۲) سکھ - (۳) امریکہ - (۴) محبت - (۵) نان - (۶) مات

اس بار صحیح حل ۶ موصول ہوئے لہذا مبلغ تیس روپے کا پہلا انعام بحساب ۵ روپے فی کس تقسیم کردیا گیا

(۱) مشتاق احمد - ایرنپورہ (۲) بلقیس جہاں - کانپور (۳) شوکت حسین - پٹنہ (۴) کلیم اللہ - انچپور (۵) ادریس احمد - جمشید پور (۶) شریف الحسن - لکھنؤ

ایک غلطی والے ۲۳ حل موصول ہوئے۔ لہذا مبلغ ۲۰ روپے کا دوسرا انعام ۱۴ آنے فی کس تقسیم کردیا گیا۔

(جگہ کی کمی ہونے کے باعث اس بار پھر ایک غلطی میں انعام پانے والوں کے نام شائع نہیں کئے جا رہے ہیں)

پیامی معمہ ۲۵ میں انعام پانے والوں میں سے جن حضرات کا انعام اب تک نہ پہنچا ہو۔ وہ براہِ کرم فوراً اپنا مفصل پتہ دفتر کو لکھدیں۔ تاکہ انکا انعام روانہ کردیا جائے اس بار بہت سے انعامات منی آرڈر پتہ ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے واپس آگئے ہیں۔

کپتان پیامی معمے

۵۰ روپے کے نقد انعامات

ایک کوپن کے ساتھ جتنے حل چاہیں بھیج سکتے ہیں۔۔۔

فیس داخلہ فی حل ایک آنہ ٹکٹ کی صورت میں اور پانچ حلوں کی فیس ۴ آنے

پہلا انعام بالکل صحیح حل پر ۳۰ روپے۔ دوسرا انعام ایک غلطی پر ۲۰ روپے

حل اور فیس بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۸ دسمبر ۱۹۵۳ء

پیامی معمہ نمبر ۲۷

نمبر	۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷
۱		ا	ر				
۲		ا		ی			
۳	م			ل			
۴		ل	م				
۵	ع		ا	د	ت		
۶	ب	ی		ا	ر	ی	
۷	ا		ی	ر			

(۱) ــــ اگر سخت ہو تو بہادر سے بہادر آدمی کا بھی دل توڑ دیتی ہے۔ (ہار - مار)

(۲) جس میں ــــ نہیں وہ باغ کیا؟ (پانی - مالی)

(۳) تھکے ہارے کو ــــ پر خوب ہی نیند آتی ہے۔ (محل - منزل)

(۴) اس کے اچھے استعمال سے دنیا کافی ترقی کر سکتی ہے۔ (فلم - علم)

(۵) ــــ کرنے سے انسان کو بھی تسلی ہوتی ہے۔ (عبادت - عیادت)

(۶) ــــ اگر طویل ہو تو مستقل مزاج آدمی بھی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ (بیکاری - بیماری)

(۷) ــــ آدمی تو عام طور پر پریشان ہی رہتے ہیں۔ (امیر - اسیر)

ٹوکن پیامی معمہ نمبر ۲۷

نام ....

پتہ ....

ٹوکن پیامی معمہ نمبر ۲۷

نام ....

پتہ ....

Regd. No. D. 96.
DECEMBER 1953.



ھء

ادھر
ان
یں
ری
پاہی
ڈالے
ل کا
لت
ت
یں
کو
ں
ضرور
پہنچا



نفرنس میں
مد قدوائی
ے ہیں



طاھر نہر
بیت بازی کے م
میں شعر پڑھ رہے ہیں
ہے